

شعاع
پاکستانی

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک
پاکستان (سالانہ) — 800 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ — 8000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 9000 روپے



مستقل سلسلے

اکتوبر 2012
جلد 27 شمارہ 2
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع کا اکتوبر کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

موجودہ دور میں جبکہ ذرائع ابلاغ بے شمار ہیں اور باخبری کوئی مسئلہ نہیں رہی ہے تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عام آدمی بھی حقائق سے باخبر ہوتا، اس میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی اور معاشرے میں مثبت تبدیلی آتی لیکن یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ میڈیا عوام میں کوئی مثبت سوچ پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔

میڈیا عوام کو حقائق پیش کرتا ہے۔ عوام کا حق ہے کہ وہ سچائی کو جانیں اور پرکھیں لیکن کچھ نامعلوم وجوہات یا خوف کی بنا پر اگر پورا سچ سامنے نہیں لا سکتے تو بہتر ہے کہ ذہنوں کو الجھانے سے گریز کیا جائے۔ وہ جھوٹ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے جس میں کچھ سچ کی آمیزش ہو۔

تہذیب، شائستگی، حسن کلام، اعلیٰ ذوق ہماری تہذیب و روایت کا حصہ ہیں۔ اگرچہ اب بہت سی روایتیں اور اخلاقی قدریں دم توڑتی جا رہی ہیں لیکن بیشتر گھرانوں میں آج بھی ہمارے مذہبی ارکان کی پوری طرح پابندی کی جاتی ہے اور تہذیب و شائستگی ہماری زندگیوں کا حصہ ہے۔

میڈیا آزاد ہے لیکن اس آزادی کا مطلب مادر پدر آزاد ہونا نہیں ہے۔ آج ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اور بین الاقوامی طور پر دنیا تبدیلی کے جس عمل سے گزر رہی ہے اس میں ہمیں اپنی شناخت کو برقرار رکھنا ہے۔ اگر اپنے معاشرے میں حسن، نیکی، خیر اور بھلائی، تہذیب و شائستگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں میڈیا کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ صرف مذہبی انتہا پسندی ہی خطرہ نہیں ہے۔ لبرل انتہا پسندی بھی اتنا ہی بڑا خطرہ ہے۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول ۔ جنت کے پتے،
- فائزہ افتخار کا مکمل ناول ۔ میرا ساجن سب سے سوہنا،
- صائمہ اکرم چوہدری کا مکمل ناول ۔ ابن آدم،
- نازیہ انجم اور فرحانہ ناز ملک کے ناولٹ،
- ثریا انجم، بشریٰ احمد، صبا اسلام اور سعدیہ عمر عمران کے افسانے،
- عالیہ بخاری کا ناول تکمیل کے مراحل میں،
- ٹی وی فنکار شہزاد شیخ سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- بشریٰ سید رحمان کرتا ۔ معروف ادیب اشفاق احمد کی کتاب پر تبصرہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع آپ کو کیسا لگا؟ ہم اپنی محنت اور کوشش میں کتنے کامیاب رہے؟ اپنی رائے سے ضرور مطلع کیجیے گا۔

آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

اسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں
اور ان کے درمیاں جو ہیں مکینوں اور مکانوں میں

ہوا چلتی ہے باغوں میں تو اس کی یاد آتی ہے
ستارے چاند سورج ہیں سب اس کے نشانوں میں

اسی کے دم سے طے ہوتی ہے منزل خوش نصیبی کی
وہ نام اک حرف نورانی ہے ظلمت کے جہانوں میں

اسی کے پاس اسرار جہاں کا علم ہے سارا
وہی برپا کرے گا حشر آخر کے زمانوں میں

وہ کر سکتا ہے جو چاہے وہ ہر اک شے پہ قادر ہے
وہ سن سکتا ہے ان کو جو ہیں دل کے خزانوں میں

بچا لیتا ہے اپنے دوستوں کو خوف باطل سے
بدل دیتا ہے شعلوں کو مہکتے گلستانوں میں

منیر اس حمد سے رتبہ عجب حاصل ہوا تجھ کو
نظیر اس کی نہ ملے شاید پرانی داستانوں میں

منیر نیازی

نعت رسول مقبول ﷺ

اک مہر بے خودی ہے محمد کے شہر میں
سامان آگہی ہے محمد کے شہر میں

پھولوں میں رقص آور فضا میں ہے نکہت
محفل سی اک سجی ہے محمد کے شہر میں

چمکے ہلال بھی یہاں مثل مہ تمام
دنیائے چاندنی ہے محمد کے شہر میں

عشق رسول میں ہے ہر اک لمحہ مشکبار
مہکار ہر گھڑی ہے محمد کے شہر میں

روضے کے قرب اور تجلی کے نور سے
ہر گام روشنی ہے محمد کے شہر میں

خوشبو درود کی جو ہوا نذر مصطفیٰ
پھیلی گلی گلی ہے محمد کے شہر میں

کہتے ہیں زائرین مدینہ سدا یہاں
تکمیل آدمی ہے محمد کے شہر میں

بشریٰ اعجاز

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

ادھار کا بدلہ

حضرت عبداللہ بن ابو ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے غزوہ حنین کے موقع پر تیس ہزار یا چالیس ہزار قرض لیا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم (غزوہ سے واپس) تشریف لائے تو انہیں قرض ادا کر دیا' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تیرے گھر بار میں اور تیرے مال میں برکت عطا فرمائے۔ ادھار کا بدلہ (قرض کی) ادائیگی اور شکریہ ادا کرنا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ ضرورت کے وقت قرض لینا جائز ہے۔

2۔ اچھے طریقے سے ادائیگی کا مطلب یہ ہے کہ بروقت ادائیگی کی جائے۔

3۔ جیسی چیز لی ہو' اس سے بہتر ادا کرنا بھی حسن اخلاق میں شامل ہے' لیکن اگر یہ پہلے سے طے ہو اور قرض خواہ اس کا مطالبہ کرے تو یہ سود ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔

4۔ قرض ادا کرتے وقت قرض خواہ کو دعا دینا اور اس کا شکریہ ادا کرنا بھی اچھے طریقے سے ادائیگی میں شامل ہے۔

قرض خواہ کو (سخت بات کہنے کا) حق ہے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرض واپس مانگنے آیا' یا کسی اور مالی حق کا مطالبہ کرنے آیا۔ اس نے کچھ (نامناسب) الفاظ کہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی تنبیہ کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"رک جاؤ! قرض والے کو اپنے ساتھی (مقروض) پر اختیار ہوتا ہے' جب تک وہ ادائیگی نہ کرے۔"

حق

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا ایک بدو (اعرابی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کسی قرض کا تقاضا کرنے آیا' جو آپ کے ذمے تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت لہجے میں بات کی حتیٰ کہ یہاں تک کہہ دیا۔ اگر آپ ادا نہیں کریں گے تو میں آپ کے ساتھ سخت رویہ اختیار کروں گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے ڈانٹا اور کہا۔

"تجھ پر افسوس! کیا تجھے معلوم نہیں تو کس سے مخاطب ہے؟" اس نے کہا۔

"میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم نے حق والے کا ساتھ کیوں نہ دیا؟"

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا۔ "اگر تمہارے پاس کھجوریں ہیں تو ہمیں قرض دے دو' ہماری کھجوریں آئیں گی تو ہم تمہارا قرض ادا کر دیں گے۔"

انہوں نے کہا۔ "میرے ماں باپ آپ پر قربان اے اللہ کے رسول! میں (حکم کی تعمیل کروں گی۔"

انہوں نے آپ کو (کھجوریں) قرض دے دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کا قرض ادا کیا اور اسے کھانا کھلایا۔ اس نے کہا۔

"آپ نے مجھے پورا حق دے دیا' اللہ آپ کو پورا دے۔"

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ایسے لوگ بہترین ہوتے ہیں۔ وہ قوم پاک نہیں ہوتی جس میں کمزور کو پریشان کیے بغیر اس کا حق نہ دیا جائے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ قرض خواہ کو سختی کا حق حاصل ہے لیکن افضل یہی ہے کہ تقاضا کرنے میں بھی نرمی کی جائے اور مقروض کو مناسب مہلت دے دی جائے۔

2۔ جاہلوں کے غلط رویے کا جواب سختی سے نہ دیا جائے بلکہ برداشت کیا جائے۔

3۔ حق دار کو اس کا حق اور قرض خواہ کو اس کا قرض بن مانگے ادا کرنا چاہیے۔ یہ انتظار نہ کیا جائے کہ وہ جب مانگے گا تب دے دیں گے۔

ادائیگی کی طاقت رکھنے والا

حضرت عمرو بن شرید رحمتہ اللہ اپنے والد (حضرت شرید ثقفی رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ادائیگی کی طاقت رکھنے والا ٹال مٹول کرے تو اس کی بے عزتی کرنا اور اسے سزا دینا جائز ہو جاتا ہے۔"

(امام ابن ماجہ رحمتہ اللہ کے استاد) علی بن محمد طنافسی رحمتہ اللہ نے فرمایا۔ بے عزتی کرنے سے مراد اس کی شکایت کرنا اور سزا سے مراد قید کرنا ہے۔

فوائد و مسائل :

1۔ قرض بروقت ادا کرنا ضروری ہے۔ معقول عذر کے بغیر تاخیر جائز نہیں۔

2۔ اگر مقروض وقت پر قرض ادا نہ کرے تو اس کے خلاف حکمران یا قاضی سے شکایت کی جا سکتی ہے۔ حاکم اور قاضی کا فرض ہے کہ حق دار کو اس کا حق دلوائے۔

3۔ اگر مقروض واقعی قرض ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے مزید مہلت دی جائے یا قرض معاف کر دیا جائے یا بیت المال سے اس کی مدد کی جائے۔ بیت المال کا نظام موجود نہ ہونے کی صورت میں دوسرے لوگوں کا فرض ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کے ذریعے اس کی مدد کریں۔

4۔ جن جرائم میں حد نہیں' ان میں مجرم کو تعزیر کے طور پر قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔

5۔ حضرت ہرماس بن حبیب رحمتہ اللہ اپنے والد (حضرت حبیب بن ثعلبہ) سے اور وہ ہرماس کے دادا (حضرت ثعلبہ تمیمی عنبری رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا میں اپنے ایک مقروض کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا۔

"(یہ جانے نہ پائے) اس کے ساتھ رہو۔" پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم شام کے وقت میرے پاس سے گزرے تو فرمایا۔

"اے بنی تمیم کے بھائی! تمہارے قیدی کا کیا بنا؟"

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے مسجد میں حضرت عبداللہ بن ابو حدرد رضی اللہ عنہ سے ان کے ذمے اپنے قرض کی واپسی کا تقاضا کیا۔ ان کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر میں ان کی آوازیں سن لیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکل کر ان کے پاس تشریف لائے اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو آواز دی۔ انہوں نے کہا۔

"اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اپنے قرض میں سے اتنا معاف کر دو۔" اور ہاتھ سے نصف کا اشارہ کیا (کہ آدھا قرض چھوڑ دو)۔

انہوں نے کہا۔ "میں نے معاف کیا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (ابن ابو حدرد رضی اللہ عنہ سے) فرمایا۔

"اٹھو اس کا قرض ادا کرو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ قرض خواہ مقروض سے قرض کی واپسی کا تقاضا کر سکتا ہے۔

2۔ دو آدمیوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو صلح کرا دینی چاہیے خاص طور پر وہ شخص جس کو جھگڑنے والوں پر کسی قسم کی فضیلت حاصل ہو اور اس کی عزت مانی جاتی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ جھگڑا ختم کرا دے۔

3۔ صلح کے لیے صاحب حق اپنا کچھ حق چھوڑ دے تو بہت ثواب کی بات ہے۔

قرض دینا

حضرت قیس بن رومی رحمۃ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا حضرت سلیمان بن اذنان رحمۃ اللہ نے حضرت علقمہ رحمۃ اللہ کو ان کا وظیفہ (تنخواہ) ملنے تک کی مدت کے لیے ایک ہزار درہم قرض دیا۔ جب انہیں وظیفہ ملا تو انہوں (سلیمان) نے ان سے سختی سے (قرض کی واپسی کا) تقاضا کیا۔

علقمہ رحمۃ اللہ نے ادائی کر دی لیکن انہیں ناراضی محسوس ہوئی (کہ اتنی سختی سے تقاضا کیا ہے) چند ماہ ٹھہر کر وہ (پھر) ان کے پاس آئے اور کہا۔

"مجھے تنخواہ ملنے تک ایک ہزار درہم قرض دے دیں۔"

انہوں نے کہا "ہاں (میں بڑی خوشی سے آپ کا) احترام کرتے ہوئے (آپ کو قرض دیتا ہوں۔)"

پھر اپنی بیوی سے کہا "اے ام عتبہ! تمہارے پاس جو مہر بند تھیلی ہے' وہ لے آؤ۔" وہ لے آئیں تو (علقمہ سے) کہا۔

"قسم ہے اللہ کی! یہ آپ کے وہی درہم ہیں جو آپ نے مجھے ادا کیے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک درہم بھی ادھر ادھر نہیں کیا۔"

علقمہ رحمۃ اللہ نے کہا "کیا خوب! آپ نے مجھ سے جو سلوک کیا اس کی کیا وجہ؟"

انہوں نے کہا "(اس کی وجہ) وہ حدیث تھی جو میں نے آپ سے سنی۔"

انہوں نے کہا "آپ نے مجھ سے کون سی حدیث سنی؟"

سلیمان نے کہا "میں نے آپ (علقمہ) کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو مسلمان دوسرے مسلمان کو دوبار قرض دیتا ہے' وہ ایک بار اتنا صدقہ کرنے کے برابر ہو جاتا ہے۔"

علقمہ رحمۃ اللہ نے فرمایا۔ "مجھے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے (واقعی) اسی طرح حدیث سنائی تھی۔"

قرض کا ثواب

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "معراج کی رات میں نے جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا۔ "صدقے کا ثواب دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔"

میں نے کہا "اے جبریل! کیا وجہ ہے کہ قرض صدقے سے بھی زیادہ فضیلت کا حامل ہے؟"

انہوں نے کہا "اس لیے کہ سائل (بعض اوقات) سوال کرتا ہے' حالانکہ اس کے پاس (اس کی ضرورت کا مال) موجود ہوتا ہے جبکہ قرض لینے والا ضرورت (اور مجبوری) کی حالت ہی میں قرض لیتا ہے کیونکہ قرض کی واپسی تو ضروری ہے اس لیے مجبوری کے وقت ہی لیا جاتا ہے۔"

مقروض سے تحفہ لینا

حضرت یحییٰ بن ابو اسحاق ہنائی رحمۃ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔

"ایک آدمی اپنے بھائی کو مال بطور قرض دیتا ہے' پھر وہ (مقروض) اسے کچھ تحفہ دے دیتا ہے (کیا یہ مناسب ہے)؟"

انہوں نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم میں سے کوئی شخص جب (کسی کو) قرض دے' پھر (مقروض) اسے تحفہ دے یا سواری کے لیے جانور پیش کرے تو (قرض خواہ کو چاہیے کہ) وہ اس پر سواری نہ کرے اور نہ وہ (تحفہ) قبول کرے' سوائے اس کے کہ ان دونوں میں پہلے سے تحفے تحائف کا یہ سلسلہ جاری ہو۔"

فوت شدہ کی طرف سے قرض کی ادائیگی

حضرت سعد بن اطول جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کا بھائی فوت ہو گیا اس نے تین سو درہم (ترکہ) چھوڑا اور بال بچے بھی چھوڑے۔ انہوں نے چاہا کہ یہ مال اس کے بیوی بچوں پر خرچ کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارا بھائی اپنے قرض کی وجہ سے قید ہے اس لیے اس کا قرض ادا کرو۔"

تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول! میں نے اس کا (سارا) قرض ادا کر دیا ہے' سوائے دو دینار کے۔ ایک عورت ان کا دعوا کرتی ہے لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت (گواہ وغیرہ) نہیں ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اسے دو وہ سچی ہے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ بیوی بچوں پر خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مال ان کے حوالے کر دیا جائے یا اس سے ان کی ضروریات پوری کی جائیں کیونکہ مرنے والے کے ترکے میں سے بیوی کا حصہ مقرر ہے' جو باقی بچے وہ بچوں کا ہے۔

2۔ وراثت میں بعض افراد کا حصہ مقرر ہے انہیں حصہ دینے کے بعد باقی مال قریبی رشتے داروں کو ملتا ہے۔ انہیں "عصبہ" کہتے ہیں۔ عصبہ افراد میں بیٹا' بھائی پر مقدم ہے۔

3۔ ترکے کی تقسیم قرض کی ادائیگی کے بعد ہوتی ہے۔

4۔ عورت کا یہ دعوا تھا کہ مرنے والے کے ذمے اس کے دو دینار تھے۔ حضرت سعد بن اطول رضی اللہ عنہ اپنے اطمینان کے لیے گواہی طلب کرتے تھے۔ عورت کے پاس گواہی نہ تھی۔ اس قسم کی مشکلات سے بچنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ قرض کا لین دین تحریر میں لانا چاہیے اور گواہ بھی مقرر کیے جائیں۔

5۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ عورت کا دعوا درست ہے' اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دو دینار دلوا دیے۔

6۔ قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں فوت ہونے والے کو اللہ کے ہاں قید کیا جاتا ہے' لیکن یہ قید صرف جنت میں داخلے سے رکاوٹ ہے' اس کی وجہ سے وہ جہنم کا مستحق نہیں بن جاتا۔ واللہ اعلم۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے والد حضرت عبداللہ بن حرام انصاری رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو ان کے ذمے ایک یہودی کا تمیں وسق غلہ قرض تھا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس سے مہلت مانگی تو اس نے مہلت دینے سے انکار کر دیا' تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ یہودی سے ان کی سفارش کر دیں۔

"چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لے جا کر یہودی سے بات چیت کی (اور یہ پیش کش کی) کہ ان پر جو قرض ہے' اس کے بدلے وہ ان کی کھجوروں کا سارا پھل لے لے تو اس (یہودی) نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو مہلت دینے کا کہا تو اس نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھجوروں کے باغ میں تشریف لے گئے اور درختوں کے درمیان چلے' پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

"پھل اتارو اور اسے اس کا حق پورا دے دو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد انہوں نے پھل اتار کر تمیں وسق کھجوریں اس (یہودی) کو دے دیں اور بارہ وسق

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کھجوریں بچ گئیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس واقعہ کی خبر دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو جابر رضی اللہ عنہ نے حاضر خدمت ہو کر اطلاع دی کہ انھوں نے اس (یہودی) کو پوری ادائیگی کر دی ہے اور جو مقدار بچ گئی تھی وہ بھی بتائی' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عمر بن خطاب کو بھی یہ بات بتاؤ۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر انھیں یہ بات بتائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا۔

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس (باغ) میں چل رہے تھے تو مجھے اسی وقت یقین ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس پھل میں ضرور برکت عطا فرمائے گا۔"

فوائد و مسائل:

1۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔

2۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد پر اور بھی بہت سے لوگوں کا قرض تھا۔ ان کے بارے میں دوسری احادیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ یہودی ان قرض خواہوں میں سے ایک تھا۔

3۔ اس یہودی کے سوا دوسرے قرض خواہوں کو ادائیگی کرتے وقت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماپ کر ہر ایک کو اس کا قرض ادا کیا تھا۔

4۔ کھانے پینے کی چیزوں میں یہ برکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے جو متعدد مواقع پر ظاہر ہوا۔

5۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایمان اتنا زیادہ تھا کہ انھیں معجزہ ظاہر ہونے سے پہلے ہی یقین ہو گیا کہ یہ واقعہ یوں پیش آئے گا۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت اور شان کا اظہار ہوتا ہے۔ "وسق" ساٹھ صاع کے برابر ہوتا ہے۔ جس کی کل مقدار ہمارے پیمانے کے اعتبار سے تقریباً چار من بنتی ہے۔

تین کاموں کے لیے قرضہ لینے والا

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قیامت کے دن مقروض سے قرض وصول کیا جائے گا' جب وہ (مقروض ہو کر) فوت ہو جائے مگر جو شخص تین کاموں کے لیے قرض لیتا ہے (وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔)

وہ شخص جس کی اللہ کے راستے میں (جہاد کرنے کی) قوت کم ہو جاتی ہے تو وہ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل کرنے کے لیے قرض لیتا ہے۔

(دوسرا) وہ شخص جس کے پاس کوئی مسلمان فوت ہوتا ہے اور اس کے پاس قرض لیے بغیر اس کے کفن دفن کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اور (تیسرا) وہ شخص جسے اپنے بے نکاح رہنے کی صورت میں (گناہ میں ملوث ہونے کا خطرہ محسوس کر کے) اللہ سے خوف آتا ہے' وہ اپنے دین (میں خرابی) کے ڈر سے (قرض لے کر) نکاح کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان (تین قسم کے افراد) کا قرض ادا کر دے گا۔"

☆

جاوید شیخ کے صاحبزادے معروف فنکار

شہزاد شیخ سے ملاقات

شاہین رشید

جب میں کالج یونیورسٹی میں تھا تو میں نے سوچا تھا کہ میں پڑھائی سے فارغ ہو کر کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو جوائن کر لوں گا۔۔۔ مگر پھر اچانک ہی ایک دن دل چاہا اداکاری کرنے کا۔ مگر سوچا کہ ایسے۔۔۔ نہیں اس کے بارے میں کچھ پڑھ کر اس طرف آؤں گا۔ چنانچہ میں نیویارک امریکہ گیا اور وہاں اداکاری کا کورس کیا۔ کورس کے دوران ہی مجھے اداکاری میں مزا آنے لگا۔ کیونکہ بہت ساری چیزیں سیکھنے کو ملیں تو میں نے سوچا کہ ضرور ٹرائی کرنا چاہیے۔ پھر جب میں پاکستان آیا اور سب کو پتا چلا کہ میں اداکاری کے بارے میں پڑھ کر آیا ہوں اور کچھ کرنا بھی چاہتا ہوں تو مجھے جو پہلا سیریل ملا اس کا نام "ڈربہ" تھا اور آپ یقین کریں کہ نہ صرف اسے پسند کیا گیا بلکہ میری اداکاری کو بھی بہت پسند کیا گیا اور بس پھر اداکاری کی شروعات ہو گئیں۔"

☆ "پھر افسوس ہوا ہو گا کہ جلدی آیا آنا اس فیلڈ میں؟"

* "نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے اور ابھی بھی میں اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتا۔ میں آج بھی جب سیٹ پہ جاتا ہوں اور اپنے سینئرز کو دیکھتا ہوں۔ ان سے ملتا ہوں۔ ان کو کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتا ہوں۔ بہت گنجائش ہے اس فیلڈ میں۔"

☆ "جانا ایڈورٹائزنگ میں تھا' آ ادھر گئے۔ آگے کیا ارادہ ہے؟ جو تھکے ادھر مزا آ رہا ہے تو اس کو مستقل رکھنا ہے؟"

* "بات مزے کی نہیں ہے۔۔۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ جو چیزیں مجھے پڑھائی گئیں اور پھر اس فیلڈ

عموماً "شوبز کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں نئے لوگ کم اور نسل در نسل لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ آج زیادہ تر فنکار معروف فنکاروں کی اولادیں ہیں۔۔۔ لیکن صرف شوبز میں ہی ایسا نہیں ہوتا بلکہ تقریباً ہر پروفیشن میں ہی ہوتا ہے۔

جاوید شیخ فلم ٹی وی کا ایک جانا پہچانا نام۔ پہلے دن کی طرح آج بھی شوبز میں مقبول ترین ہیں۔ اب ان کے فرزند بھی اس فیلڈ میں اپنی پہچان بنانے میں مصروف ہیں۔ شہزاد شیخ کو اس فیلڈ میں آئے ابھی زیادہ ٹائم نہیں ہوا ہے۔ مگر انھوں نے اپنی پُرکار منس سے سب کو بہت متاثر کیا ہے۔

"بنٹی کی آئے گی بارات" میں رقصم اور "ڈربہ" بہن کے مقبول ترین سیریلز ہیں اور شہزاد کی پرفارمنس بھی بہت عمدہ رہی۔

☆ "کیسے ہیں شہزاد اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

* "مصروفیات تو بہت زیادہ ہیں ماشاء اللہ سے۔"

☆ "اور اڈز ریوا اکشن بھی کام ہے؟"

* "جی ہاں ماشاء اللہ بڑے بڑے پروڈکشن ہاؤسز کے ساتھ کام جاری ہے ایک فلم بھی سائن کی ہے۔"

☆ "شہزاد۔۔۔ آپ جاوید شیخ صاحب کے بیٹے ہیں۔ اس لحاظ سے تو آپ کو بچپن سے ہی اس فیلڈ میں آ جانا چاہیے تھا' کیا پڑھائی کی وجہ سے دیر سے آئے؟"

* "ہاں کچھ پڑھائی کی وجہ تھی اور کچھ میں نے اس فیلڈ میں آنے کے لیے اپنا ذہن بھی سیٹ نہیں کیا تھا۔ کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اداکاری کی طرف آؤں گا۔

میں آکر جو کچھ میں نے کیا تو میں یہ کہوں گا کہ اداکاری بھی ایک فل ٹائم جاب ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ پارٹ ٹائم ایکٹنگ کر رہے ہیں اور پارٹ ٹائم کچھ اور۔ اگر آپ کوئی کام کر رہے ہیں تو آپ کو اپنی پوری توجہ کے ساتھ وہ کام کرنا ہوتا ہے اور میں اپنی پوری توجہ کے ساتھ یہ کام کر رہا ہوں اور اب جبکہ میں نے اداکاری شروع کر دی اور مجھے اچھا بھی لگ رہا ہے اور سیکھنے کو بھی مل رہا ہے تو میں نے سوچا کہ اب اگلے پانچ سال میں صرف اپنی ایکٹنگ کو دوں گا اور اس کے بعد اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولوں گا اور کمرشلز اور ڈائریکشن پر توجہ دوں گا۔"

☆ "فلمیں بھی کریں گے پاکستانی یا باہر کی؟ کیونکہ پاکستان کی فلم انڈسٹری تو بالکل بیٹھ گئی ہے؟"

* "فلموں میں کام ضرور کروں گا۔ اب ہمارے ہاں بھی اچھی فلمیں بننا شروع ہو گئی ہیں اور کچھ فلمیں تو ایسی ہیں کہ جب وہ ریلیز ہوں گی تو لوگ ان کو بہت پسند کریں گے۔ آپ دیکھیں گی کہ ایک دو سالوں میں سینما ہاؤسز کی رونقیں بحال ہو جائیں گی اور بہت ہی اچھی فلمیں دیکھنے کو ملیں گی۔"

☆ "مثلاً" کس طرح رونقیں بحال ہوں گی؟"

* "بہت سارے ایسے لوگ ہیں۔ جو ہماری فلم انڈسٹری میں انویسٹ کرنا چاہتے ہیں اور آپ کی یہ بات کہ ہماری فلم انڈسٹری ٹھپ ہو گئی ہے یا بیٹھ گئی ہے تو ایسا نہیں ہے۔ انڈسٹری ٹھپ یا ناکام نہیں ہوئی بلکہ ہم نے خود سینما ہاؤس جانا چھوڑ دیا ہے اس لیے فلمیں بننا بند ہو گئی ہیں۔"

(جانا اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ فلمیں متاثر نہیں کر رہیں۔ اب انڈیا کی فلمیں ریلیز ہوتی ہیں تو لوگ جاتے ہیں نا۔)

☆ "پہلا ڈراما سیریل آپ کا "ڈمبر" تھا۔ کیا ریسپانس ملا تھا؟"

* "جی پہلا ڈراما سیریل ڈمبر تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس فیلڈ میں مجھے متعارف کرانے والا یہی سیریل تھا کیونکہ اس کے بعد ہی مجھے آفرز آنا شروع ہوئیں اور آپ کو بتاؤں یہ 13 اقساط پر مبنی تھا جو پہلے "آگ ٹی وی" سے چلا پھر لوگوں کی فرمائش پر اسے جیو سے بھی چلایا گیا۔"

☆ "اچھا۔ ویسے اداکاری بور کام نہیں؟ بڑی تھکن ہے۔ پھر وقت بھی بہت لگتا ہے ایک ڈرامے میں یا سیریل میں۔"

* "نہیں بالکل بھی بور نہیں ہے۔ ہاں جب میں اس فیلڈ میں نہیں آیا تھا تب مجھے یہ کام بور لگتا تھا۔ اب ظاہر ہے ایسا نہیں ہے۔"

☆ "اس فیلڈ کی پہلی کمائی کیا تھی؟"

* "جیو کے سیریل ڈمبر کے مجھے 75 ہزار روپے ملے تھے اور یہ میری اپنی ذاتی کمائی تھی تو مجھے بہت ہی اچھا لگا تھا۔ کچھ گھر والوں پہ، کچھ اپنے اوپر اور کچھ کھانے پینے میں خرچ کر دیے تھے۔"

☆ "فیوچر پلاننگ کیا ہے۔ اس فیلڈ میں کہاں تک جانا ہے؟"

* "مجھے اس فیلڈ میں اگلے پانچ سال تک اداکاری ہی کرنی ہے۔ یہ میرا فیوچر پلان ہے۔ پھر اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولوں گا۔ آگے اللہ مالک ہے، جو وہ کروانا چاہے۔"

☆ "ملک سے باہر کافی عرصہ آپ نے گزارا۔ دل چاہا مستقل قیام کو؟"

* "میرے پاس گرین کارڈ ہے امریکہ کا۔ لیکن سچ پوچھیں تو میرا ابھی بھی دل نہیں چاہا وہاں رہنے کو۔ بے شک ان میں بہت اچھی باتیں ہیں مگر پھر بھی اپنا ملک اپنا ہی ہے۔ ویسے بنیادی طور پر ہم بہت جذباتی قوم ہیں۔ تہواروں کے موقعوں پر ایک ہو جاتے ہیں اور پیچھے ایک دوسرے کی کاٹ کرتے ہیں اور جلدی غصے میں آجاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

☆ "ہمیں ایک ہونے میں دوسرے ملکوں سے سبق سیکھنا چاہیے؟"

* "بالکل جی۔ اسلام کہتا ہے کہ ایک دوسرے سے پیار محبت سے رہیں۔ ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔ جھوٹ نہ بولیں، کم نہ تولیں۔ یہ سب باتیں باہر ہیں۔ آپ کسی اسٹور میں چلے جائیں وہ مسکرا کر باتیں کرتے ہیں۔ اچھی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ قطار میں کھڑے ہو کر ڈسپلن کے ساتھ آپ خریداری کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ زیبرا کراسنگ کا خیال رکھتے ہیں۔ بہت سی اچھی باتیں ہیں ان میں جو ہم میں نہیں ہیں۔"



☆ "ڈراموں میں انسان کی اپنی شخصیت کتنی انوالو ہوتی ہے؟ کیا آپ کی شخصیت کا انعکاس ہوتا ہے؟"

* "جناب۔ دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو اوریجنل ہو۔ مثلاً" ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اسکرپٹ اوریجنل ہے یا یہ اداکاری اوریجنل ہے۔ ہم انسان ہیں۔ ہم ہمیشہ دوسروں کی چیزوں کی کاپی کرتے ہیں۔ جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو اسی انداز اور اسی زبان میں باتیں کرتے ہیں جن میں ہمارے والدین اور ہمارے بہن بھائی کرتے ہیں۔ اس طرح اسکول میں جو پڑھایا جاتا ہے اسے اسی طرح ری ایکٹ کرتے ہیں ہم۔ اس لیے اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اوریجنل ہو، اسی لیے جب ہم اداکاری کر رہے ہوتے ہیں تو لاشعوری طور پر کوئی نہ کوئی کردار ہمارے ذہن میں بیٹھا آجاتا ہے۔ جس کو ہم نے دیکھا ہوا ہوتا ہے اور ہم تو کریئیشن بھی کسی کو دیکھ کر ہی کرتے ہیں۔"

☆ "ماشاء اللہ! تم اب اچھے خاصے مشہور ہو گئے ہو کیا محسوس کرتے ہو کہ اب عام لوگوں کی طرح لائف گزارنا مشکل ہو گیا ہے؟"

* "نہیں مجھے بالکل بھی مشکل نہیں ہوتی کیونکہ میں عام لوگوں کی طرح ہی ہوں اور عام لوگوں میں ہی اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ یہ میرا پروفیشن ہے۔ جس طرح اور لوگوں کے مختلف پروفیشن ہوتے ہیں۔"

☆ "لوگ آپ کو پہچان کر کیا کہتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں اداکاری کی یا آپ کی؟"

* "لوگ پہچان کر مجھ سے ہیلو ہائے کرتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں کہ آپ کے ابا کیسے ہیں۔"

☆ "اچھا۔ کبھی دل چاہتا ہے کہ آپ کو لوگ آپ کی وجہ سے پہچانیں؟"

* "شروع میں مجھے یہ بات محسوس ہوتی تھی اور



خاص طور پر اس وقت جب لوگ مجھے میری والد کی وجہ سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ تو میرا دل چاہتا تھا کہ لوگ مجھے میری حیثیت میں پہچانیں۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ میں اگر باہر والوں کی نظر سے دیکھوں تو میرے والد ان کے لیے ایک "ٹی کون" ایک ہیرو ہیں۔ ہماری پہچان ہیں' ہماری شان ہیں تو جب اس چیز کا احساس ہوا تو پھر ان کے حوالے سے پہچان اچھی لگنے لگی۔"

☆ "شوبز کو کیسا پایا۔ اچھی فیلڈ ہے یا بہت اچھی فیلڈ؟"

* "بچپن سے اس فیلڈ کو دیکھ رہا ہوں۔ اگرچہ کام دیر سے شروع کیا۔ جہاں تک بہت اچھے کی بات ہے تو ہر وہ فیلڈ اچھی ہے جب انسان خود اچھا ہے۔ انسان ہی اس فیلڈ کو بدنام بھی کرتا ہے اور انسان ہی اس فیلڈ کو اچھا ثابت کرتا ہے اور ایسا ہر فیلڈ میں ہوتا ہے۔"

☆ "وہ فضول خرچ ہیں؟"

* "جی! بالکل جو کماتا ہوں' خرچ کر دیتا ہوں۔ پیسہ جمع ہوتا ہی نہیں ہے۔ شاید یہ میری بری عادت ہے۔"

☆ "اپنے والد کی طرح مشہور ہونا چاہتے ہیں یا ان سے بھی زیادہ کی خواہش ہے؟"

* "میرے خیال میں میرے والد عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔ ان سے زیادہ شہرت تو شاید ہی حاصل کر سکوں۔ فخر سے کہتا ہوں کہ یہ میرے والد صاحب ہیں۔ بس میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے کہ میرے والد فخر سے کہہ سکیں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔"

☆ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ کب کہاں جنم لیا؟"

* "میری فیملی کو تو آپ لوگ سب ہی جانتے ہیں۔ میں 26 ستمبر 1982ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ ستارہ لیبرا ہے اور قد چھ فٹ دو انچ ہے۔ میں نے کمپیوٹر سائنس میں گریجویشن کیا ہے اور فلم میکنگ اور ایکٹنگ میں کورسز کیے ہیں۔ میری شادی ان شاء اللہ دسمبر 2012ء میں ہو رہی ہے۔ میری ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔"

☆ "شادی پسند سے طے ہوئی ہے؟"

* "جی! میری بھی اور میرے گھر والوں کی پسند سے یعنی لو+ارینج۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شہزاد شیخ سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ اپنی مصروفیات سے ہمیں وقت دیا۔

دستک
دستک
دستک

شاہین رشید



رؤف لالہ

★ "کیسے ہیں رؤف لالہ صاحب؟"

* "ویسا ہی ہوں جیسا پہلے تھا۔"

★ "لگتا ہے۔۔۔ آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگتا ہے آپ کے برجستہ جملے بہت محظوظ کرتے ہیں۔"

* "اچھا!۔۔۔ بہت مہربانی ہے آپ کی۔۔۔ یہی بات ہے کہ میں نے کبھی سوچ سمجھ کر جواب نہیں دیا نہ کوئی فلسفہ جھاڑنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ سیدھا سادہ انسان ہوں۔ بناوٹ نہیں ہے مجھ میں۔"

★ "یہ تو ہے۔۔۔ کیا بچپن سے ہی اتنے بذلہ سنج ہیں؟"

* "جی! بچپن سے ہی ایسا ہوں اور یہ ہنر اللہ کا ہی دیا ہوا ہے۔ بہت شکر گزار ہوں اپنے رب کا۔"

★ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

* "کیا بتاؤں۔۔۔ آپ پوچھتی جائیں۔ میں بتاتا جاؤں گا۔ اب مجھے کیا معلوم کہ آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔"

★ "تو پھر یہ بتائیں کہ آپ کو لالہ کیوں کہتے ہیں جبکہ آپ کا نام تو عبدالرؤف ہے۔"

* "میرا شناختی کارڈ والا نام تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ عبدالرؤف ہے اور لالہ مجھے میرے سب لوگ پیار سے کہتے ہیں۔"

★ "اور شناختی کارڈ پر آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟"

* "اس پر تو کبھی غور ہی نہیں کیا۔ امی کہتی ہیں کہ جس دن تمہاری خالہ کا بیٹا پیدا ہوا تھا اس کے دوسرے دن میں پیدا ہوا تھا۔ اب وہ کب پیدا ہوا تھا مجھے نہیں معلوم۔ اب آپ پوچھیں گی کہ کس شہر میں پیدا ہوا تھا تو آدھا کراچی میں تو آدھا ڈھاکہ میں۔"

★ "یہ کیسے ممکن ہے؟"

* (ہنستے ہوئے) "مطلب یہ ہے کہ پیدا تو ڈھاکہ میں ہی ہوا تھا مگر دس دن کے بعد کراچی آ گیا تھا۔ تو دس دن کا بچہ تو نہیں۔۔۔ ایسا ہی ہوا ناں کہ پیدا ہوا نہ ہوا۔"

★ "ماشاء اللہ فربہ ہیں مگر بھی بھلے لگتے ہیں۔ تعلیم کہاں تک حاصل کی؟"

* "تو کیا آپ نے میرے کپڑے سلوانے ہیں۔۔۔ (ہنستے ہوئے) اور یہاں تک تعلیم کی بات ہے تو میں نے الحمدللہ انٹر تک تعلیم حاصل کی ہے اور وہ بھی پیلے اسکول سے۔"

★ "انٹر تک؟۔۔۔ لوگ ڈگریاں لے کر کہتے ہیں الحمدللہ اور آپ انٹر تک پڑھ کر الحمدللہ بول رہے ہیں؟"

* "اس زمانے کا تو انٹر بھی بہت ہے۔ اردو میڈیم میں پڑھائی کی اور جیسا ابھی بتایا کہ پیلے اسکول کا پڑھا ہوا ہوں وہی پیلا اسکول جس کی دیواروں پر دوا خانوں کے نام لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔"

★ "آپ کتنے بہن بھائی ہیں اور کیا وہ بھی اس فیلڈ میں ہیں؟"

"پانچ بہنیں ہیں۔۔۔ اور دو بھائی۔۔۔ ویسے سب شادی شدہ ہیں۔ اپنی زندگی مزے میں گزار رہے ہیں۔"

★ "شادی پسند کی کی آپ نے؟"

* "گھر والوں نے ارینج کی تھی۔ لو شادی کے بعد کیا۔ شادی سے پہلے مجھے ٹائم ہی نہیں ملا کسی سے محبت کرنے کا اور کسی لڑکی کو دیکھنے کا۔ لڑکیوں کے پاس تو بہت ٹائم تھا مجھے دیکھنے کا اور میں یہی سوچتا تھا کہ خوب صورت انسان ہوں تو سب دیکھیں گے ہی اور ویسے بھی لڑکیوں کا کام ہی دیکھنا ہوتا ہے یا ٹی وی دیکھتی ہیں یا فلمیں دیکھتی ہیں یا پھر لڑکے دیکھتی ہیں۔ بس محبت مجھے شادی کے بعد اپنی بیوی سے ہی ہوئی۔"

★ "شوبز کی فیلڈ بڑی خطرناک ہے۔ کبھی دوسری شادی کا خیال آیا؟"

* "دوسری شادی کا خیال آیا تھا اور کرنے ہی لگا تھا کہ بیگم نے منع کر دیا کہ ایسا نہ کریں میں اپنے آپ کو چینج کر لوں گی تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اگر اپنے آپ کو چینج کر لو تو مجھے کیا ضرورت ہے دوسری شادی کرنے کی۔"

★ "شوبز میں کیسے آئے؟"

* "رکشے میں آیا تھا۔"

★ "اچھا۔۔۔ رکشے میں کس نے بٹھایا تھا؟"

* "میں خود بیٹھا تھا۔ کیونکہ میں پانچ نمبر تھا اور شوبز میں نے 1978ء میں جوائن کیا۔ کسی کی سفارش سے نہیں آیا تھا بلکہ اتفاقاً آیا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ ایک اسٹیج ڈرامے کی ریکارڈنگ دیکھنے گیا تھا۔ وہاں اس موقع پر ایک آرٹسٹ نہیں آیا تھا تو مجھے کسی نے کہا کہ بیٹا! اس جگہ پر آپ کھڑے ہو جائیں۔ بچپن سے ہی فربہ تھا اور انہیں ضرورت ہی ایک گول مٹول بچے کی تھی تو بس جو پرفارم کرنے کو کہا گیا وہ میں نے پرفارم کر دیا۔ کام پسند آیا اور لوگوں نے بھی تعریف کی تو بس پھر سلسلہ چل پڑا۔۔۔ اور اب پینتیس سال ہو گئے ہیں اس فیلڈ سے وابستہ ہوئے۔"



★ "اور شاید آپ کو پہلے ہی ڈرامے پہ ایوارڈ بھی ملا تھا؟"

* "جی ہاں۔۔۔ پہلے ڈرامے میں سیکنڈ ایوارڈ ملا اور سیکنڈ ڈرامے میں فرسٹ ایوارڈ ملا۔۔۔ اور تیسرے ڈرامے میں تھرڈ ایوارڈ ملا۔ تو بس انہی حوصلہ افزائی ہوئی کہ میں نے اس فیلڈ کو اپنا لیا۔۔۔ ورنہ مجھے تو پائلٹ بننے کا شوق تھا۔ کاغذ کے ہوائی جہاز بنا بنا کر اڑایا کرتا تھا۔ میں اپنے رب کا بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے عزت بھی دی ہے۔ مقبولیت بھی دی ہے اور عزت کی روٹی بھی دی ہے۔"

ذوالقرنین حیدر

★ "کیسے ہیں ذوالقرنین حیدر صاحب۔۔۔ اپنے نام کو اپنے لیے کتنا خوش نصیب سمجھتے ہیں؟"

* "الحمدللہ ٹھیک ہوں اور نام کے لحاظ سے اس طرح خوش نصیب ہوں کہ یہ نام قرآن پاک میں سے دیکھ کر رکھا گیا"

★ "زندگی پر نام کا اثر ہوتا ہے کیا؟"

* "میرا خیال ہے کہ نام کا اثر انسان کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ جب آپ کسی کا نام پکارتے ہیں تو اس کے گرد اس نام کے تاثر کا ایک ہالہ بن جاتا ہے۔ یہ باقاعدہ ریسرچ سے معلوم ہوا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ نومولود کا نام بزرگوں سے پوچھ کر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ بلا سوچے سمجھے رکھے ہوئے نام بعض اوقات شخصیت کے لیے بھاری بھی ہو جاتے ہیں۔"

★ "نام کا شخصیت پر اثر پڑتا ہے تو اگر نام کو یا تو مختصر کرکے پکارا جاتا ہے یا پھر پیار میں بگاڑ دیا جاتا ہے۔ تو ایسا ہونا چاہیے؟"

* "ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ مگر ہمارے یہاں یہ رسم بھی آرہی ہے کہ "نک نیم" ضرور رکھا جاتا ہے۔ مجھے میرے گھر والے اور دوست یار "ذولی" کے نام سے ہی بلاتے ہیں۔"

★ "لیکن عام حلقوں میں تو ایسا نہیں ہے؟"

* "جی! عام حلقوں میں ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ میری شناخت میری پہچان "ذوالقرنین" ہی ہے۔ شوبز کے لوگ مجھے ذوالقرنین کے نام سے ہی جانتے پہچانتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے دادا جان کہا کرتے تھے کہ نام پورا لینا چاہیے کیونکہ ادھورا نام یا بگاڑ کر لینے سے مفہوم بدل جاتا ہے۔"

★ "گزرے زمانے میں لوگوں میں آپس میں بہت محبتیں ہوا کرتی تھیں۔ اب ایسا کیوں نہیں ہے؟"

* "اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ سچی بات ہے کہ اب تو ایک افراتفری کی سی کیفیت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ محلے میں کسی کو کوئی پریشانی ہوتی تھی تو ہم پورے محلے سے اکٹھے ہو کر ان کی مدد کیا کرتے تھے اور محلے میں سب فیملی کی طرح رہتے تھے۔"

★ "اب تو دیوار سے دیوار ملی ہوتی ہے اور لوگوں کو ایک دوسرے کا پتا نہیں ہوتا۔"

* "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب تو ایک ہی گھر میں ہوتے ہوئے یہ پتا نہیں ہوتا کہ ہماری اوپر کی منزل میں کون ہے۔"

★ "اور ایسا بھی تو ہوتا تھا کہ والدین کے لیے سب بچے یکساں ہوتے تھے۔ ایک جیسا پیار، ایک جیسا خیال۔ اب شاید یہ رویہ بھی بدل گیا ہے۔"

* "رویے بدلے ہیں مگر بہت زیادہ نہیں۔۔۔ اور میں چونکہ خود اولاد والا ہوں تو یہ ضرور کہوں گا کہ کبھی کبھار کسی بچے کی ادائیں بہت اچھی لگتی ہیں اور اس پر زیادہ پیار آجاتا ہے۔ لیکن اگر منصفانہ طریقے سے دیکھیں یا بٹوارے کے حساب سے دیکھیں تو میرا خیال ہے سو فیصد برابری ہوتی ہے۔"

★ "بچپن میں بہت ایکٹو تھے۔ کالج کے زمانے میں بھی ایکٹو ہے یا کچھ ایکٹویٹی تبدیل ہوئی؟"

* "بالکل۔۔۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان بدلتا رہتا ہے۔ کالج کے زمانے میں ڈراموں میں اداکاری کا شوق شروع ہو گیا اور میرے جتنے بھی دوست تھے وہ بھی فن کے شوقین تھے۔ ہم کچھ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں نے اسکرپٹ لکھا اور دیگر دوستوں نے پیسے جمع کرکے "تھیوسوفیکل ہال" میں اسٹیج پلے کیا۔ لوگوں کو گھر گھر جا کر کارڈ دیے۔ جس نے پیسے دیے دیے لے لیے۔ جس نے نہیں دیے ہم نے تقاضا نہیں کیا۔ ہال فل تھا اور لوگوں نے اسے بے انتہا پسند کیا۔ ڈرامے کا نام "آئے دن بہار کے" تھا اور بس اس کے بعد سلسلہ چل پڑا۔ یوں تھیٹر سے ٹی وی تک کا سفر آج تک جاری ہے۔"

★ "آپ کے بچے اس فیلڈ میں ہیں؟"

* "میرے بچے اس فیلڈ میں نہیں ہیں اور میری کوشش بھی یہی ہے کہ میرے بچے اس فیلڈ میں نہ آئیں کیونکہ شوبز کا اختتام کوئی بہت اچھا نہیں ہے۔



لیکن پھر بھی اگر وہ آنا چاہیں گے تو میں انہیں منع نہیں کروں گا۔"

سلمیٰ ظفر

★ "کیسی ہیں آپ اور ڈراموں کی کیا مصروفیات ہیں؟" آج کل اسکرین پہ آپ ہی آپ ہوتی ہیں؟"

* "ڈراموں کی مصروفیات ہی بہت زیادہ ہیں۔۔۔ اسکرین پہ ہوتا بھی تو آپ کی اور ناظرین کی محبت کی وجہ سے ہے۔ اگر آپ لوگ پسند نہیں کریں گے تو ہمیں کون پوچھے گا۔"

★ "آپ اتنی اچھی پرفارمر ہیں۔ بھلا آپ کو کون پسند نہیں کرے گا۔ آپ نے کبھی ماڈرن عورت کے رول نہیں کیے؟"

* (ہنستے ہوئے) "ہاں واقعی مجھے کبھی ماڈرن رول آفر نہیں ہوا۔ لیکن اگر ہوتا تو شاید بہت اچھے طریقے سے کر بھی لیتی۔"

★ "آج کل "کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" دوبارہ دکھایا جا رہا ہے۔۔۔ کچھ زیادہ جلدی شروع نہیں ہو گیا؟"

* "ہاں۔۔۔ جلدی تو ہوا ہے۔ لیکن لوگوں کی فرمائش بھی ہوگی یہ سب سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔"

★ "حقیقت سے کتنا قریب تھا؟"

* "میں تو سمجھتی ہوں کہ بہت قریب تھا۔۔۔ بھئی! بڑے گھرانوں، جاگیرداروں اور وڈیروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو لوگ ان کے قریب رہتے ہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں ان کے بارے میں۔"

★ "اور آج کل کیا کیا پروجیکٹ ہیں؟"

* "پروجیکٹ تو بہت ہیں۔۔۔ اب تو مجھے خود بھی یاد نہیں کہ کتنے پروجیکٹ ہیں۔ بس مجھے تو کام کرنا ہے۔"

★ "گھر جانے کا وقت مل جاتا ہے؟"

* (ہنستے ہوئے)۔ "ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ آرام بھی تو بہت ضروری ہے اور اتنا ٹائم تو مل ہی جاتا ہے کہ بندہ آرام کر لے۔"

"چلیں پھر بات ہوگی۔"

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا

زاویہ

مصنف: اشفاق احمد

تبصرہ: آمنہ زریں

انسانی ذہن کی بلند پرواز جستجو کی فضا میں۔ دریافت کا سوال تلاش کرنے کے لیے جن پروں پر انحصار کرتی ہے۔ وہ حیرت کا نام رکھتے ہیں۔ کھلی آنکھ تو ہر ایک کی ہے۔ مگر مشاہدے کے لیے حساس دل اور بیدار دماغ کی ہم نوائی لازم ہے۔

جستجو کا اضطراب اسے بے خطر تجربات سے گزرنے کی جرات عطا کرتا ہے۔ اور نئے تجربوں سے گزرنا اس کے خیال کو تازگی' بیان کو سادگی اور لہجے کو دل میں اتر جانے والی تاثیر عطا کرتا ہے۔

اشفاق احمد کی ہمہ جہت ذات اور شخصیت کے کئی تعارف اور کئی مقام ہوں گے۔ مگر مجھے ان سے محبت زاویہ پڑھ کر ہوئی۔ اور بیان کی گئی صفات سے مزین ان کی ذات نے اس کتاب کے ذریعے جو آسانی مجھے اور مجھ جیسے بہت سوں کو عطا کی۔ ایک احسان کا درجہ رکھتی ہے۔

خود فراموشی کی کیفیت سے نکال کر امید' یقین' جستجو کے عمل پر آمادہ کر دینے والی اس کتاب کا درجہ میرے لیے خاصا بلند ہے۔

"کوشش' جدوجہد' تگ و دو' بھاگ دوڑ یہ ساری کی ساری آپ کے اندر انا اور تکبر پیدا کر رہی ہیں۔ اسی لیے ہمارے یہاں حکم ہے کہ آپ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسلام میں مقابلے کی یہ صورت بالکل منع ہے۔ ایک ہی اجازت ہے اور وہ ہے تقویٰ کے لیے آپ اس میں مسابقت کر سکتے ہیں۔"

• مسابقت اور مقابلے سے آپ کو روکا گیا ہے اور تقویٰ' نیکی' اچھائی کے لیے آپ کو ابھارا گیا ہے کہ ہاں! یہاں پر جتنا مقابلہ ایک دوسرے کا کر سکتے ہو کرو۔"

"ہم سوچے سمجھے بغیر چلتے تو کچھ بات منہ سے نکال دیتے ہیں اور پھر اپنے تکبر میں اضافہ کرنے کے لیے اس چیز کو طرۂ امتیاز بنا لیتے ہیں جو آپ کے کمال کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ بچوں کے نمبر آجانا' آپ کا خوش شکل ہونا' آپ کا چہرا اچھا ہونا' رنگت گوری ہونا' یہ محض عطائے خداوندی ہے۔ اس کو تم اپنی تلوار بنا کر لوگوں کی گردنیں نہ اتارتے رہو۔"

"احترام آدمیت" سے لیے گئے یہ اقتباس اس تفصیل کا اجمال ہے جو آج کل "اسٹیٹس سمبل" کے نام پر اختیار کیے جانے والے رویے' اس پر کیے جانے والے فخر اور ان تمام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اس معاشرتی خلا کا باعث بن چکے ہیں جس نے ہماری اقدار' ہمدردی کے احساس اور وضع داری کو شدید ٹھیس پہنچائی ہے۔

حقوق العباد کی اہمیت اپنے انداز میں اجاگر کرتے ہوئے وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ اللہ سے قربت اختیار کرنے کا آسان راستہ اس کی مخلوق کی مدد کرنا ہے' اس کے لیے آسانی پیدا کرنا ہے۔

"میرا اچھا موسم ہے اور بڑے اچھے دن ہیں' لیکن جو خوشی دلوں کے اندر ناچتی ہے اور چہروں پر رقص کرتی ہے وہ عام لوگوں میں مفقود ہے۔ پتا نہیں' اس کی کیا

وجہ ہے؟ کسی اکانومسٹ سے دریافت کریں تو وہ اپنی تمام عملیت کے باوجود یہ نہیں بتا سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہماری انسانوں کی بھری پڑی دنیا میں ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مغموم' ملول' پریشان اور دردمند رہتا ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ دن بھی کچھ سکھانے کے لیے ہوتے ہیں اور جب آدمی سیکھ جاتا ہے تو بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت بڑی باتیں آپ کے سامنے آجاتی ہیں' بشرطیکہ آپ غور کریں۔"

جمعے کے دن سے محبت ہماری معاشرت کا حصہ ہے اور اس دن میں اللہ کا فضل تلاش کرنے کی نئی جہت اس کتاب کے ذریعے ہمارے سامنے آئی ہے۔ اصل شرک وہ ہے جب اللہ کے کیے ہوئے کام میں بندہ نقص نکالے کہ یہ کیا ہوا ہے؟ یہ ٹھیک نہیں ہے' فلاں کام میری مرضی کے مطابق نہیں ہوا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ خرچ کرو۔ روپیہ ایک جگہ پر پڑا نہ رہے' کیونکہ یہ کھاد کا جو ڈھیر ہوتا ہے۔ "روڑی" جسے کہتے ہیں' اگر اسے کھیتوں میں پھیلا دیا جائے تو یہ سونا ہے اور اگر اسے ایک جگہ پر جمع رکھا جائے تو یہ بدبو کا گھر ہے۔ کوئی گاؤں اس کے قریب بس نہیں سکتا۔ یہی دولت کا حال ہے کہ جس اس کو پکڑ کر رکھ لیا میرے جیسے لوگوں نے اکاؤنٹ بھی کھول لیا۔ تو پھر جب دولت گھومتی نہیں ہے' لوگوں کے ہاتھوں میں تو مشکل پڑ جاتی ہے۔ اللہ کہتا ہے "خرچ کرو۔"

"میرے ایک اور دوست لاہور میں جی پی او کے پاس کھڑے ہو جاتے تھے اور کار میں جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر نفرت کا اظہار کرتے اور کہتے "ان کی شکلیں دیکھو' اس کی پکوڑے جیسی ناک ہے اور کتنی اعلا درجے کی کار میں جا رہی ہے۔" میں نے کہا "آپ کیا کریں؟" کہنے لگے "بس میرے جی میں آتا ہے کہ میں اسے توپ سے اڑا دوں۔" "توپ سے اڑانے والی ذہنیت اپنی اپنی جگہ پر ہم سب میں ہے'

لیکن اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔"

"رضائے الٰہی" سے لیے گئے یہ اقتباس اللہ کی طرف سے کی گئی تقسیم اور اس پر راضی رہنے یا ناخوش رہنے والوں کا بیان ہے۔ کتاب کے مختلف ابواب میں اس نکتے پر بحث کی گئی ہے کہ انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ فضل الٰہی پر تنقید یا تبصرہ کرے۔ اس کا کام اطاعت' شکر گزاری اور تسلیم و رضا ہے اور یہ اس کے سفر کو آسانی عطا کرنے والی صفات ہیں۔

"وہ مومن جو ماضی کی یاد میں مبتلا نہ ہو اور مستقبل سے خوف زدہ نہ ہو' اس کو "صاحب حال" کہتے ہیں کہ جو حال اس کو عطا کیا گیا ہے' اس کے مطابق زندگی بسر کرے اور خوش و خرم' بڑی چاہت کے ساتھ بسر کرے اور جب تک اس کو اس کا تحفہ دیا گیا ہے' اس کو ساتھ لے کر چلے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے پاس اس قسم کا زمانہ آگیا ہے جو خود تو ناسازگار نہیں ہے' اس نے ہماری سوچ کو' ہمارے رویے کو بہت ساری ناسازگاری میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اور یوں میں یہ سمجھتا ہوں زندگی کے اس حصے میں پہنچ کر جب تک اللہ کا ساتھ نہ ہو اور اللہ کو اس طرح سے نہ مانا جائے' جس طرح سے ماننے کا حق ہے۔ صرف کتابی طور پر نہیں۔ مثلاً "میری خرابی یہ ہے' میں اس کا ایمان داری سے اعتراف کرتا ہوں اور مجھے بڑا دکھ بھی ہے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں' لیکن کتابی طور پر۔ میری ماں کہتی تھی کہ نماز پڑھو' لیکن میں نے کبھی یہ ارادہ یا تہیہ نہیں کیا کہ میں اس کے ساتھ ایک ربط باہمی قائم کروں گا۔ لفظ خدا' خدا نہیں ہے' خدا تو اور ہے نا' جو لکھا ہوا ہوتا ہے یا جو ہم گاتے ہیں' ٹی وی پر خدا کا نام لیتے ہیں' وہ ایک اور چیز ہوتی ہے اور اس کا تجربہ ہونا' اس کو زندگی کے اندر سے گزارنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"

رضا پر راضی رہنا۔ سکون قلب کا نسخہ ہے۔ گو کہ اس پر قدم رکھنا آسان نہیں ہے۔ مگر چلتے جانے کے لیے قدم رکھنے کی شرط تو مسلک ہے۔ اور وہی نکتہ کہ اللہ کے نظام۔ اللہ کے فضل' اس کی کی گئی

تقسیم پر اعتراض کرنا فضول بھرا راست ہے۔ جس کی منزل کبھی بانخوشی ہے۔ فاصلہ بھی کٹھن ہے۔

"میں یہ سمجھتا ہوں حکومتیں تو بڑی بے معنی اور لایعنی سی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی بنا پر ہی، ایک دوسرے کی مرضی پر ہی انسان ہی کرتے ہیں۔ وہی ایک دوسرے کو سہارا دے سکتے ہیں۔ حکومتیں بھی نہیں دے سکتیں۔ لوگ یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے یہاں یہ چیز بتدریج کم ہو رہی ہے اور ہمیں ایسے مراکز کی اور ایسے ڈیروں کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں چاہے ہمیں تعلیم نہ ملے، جہاں چاہے ہم کو کوئی ہنر سکھائی جائے، جہاں چاہے ہم کو درس نہ ملے، لیکن لوگوں کی تکریم ضرور ہو اور یہ نہ کیا جائے کہ یہ صاحب علم نہیں ہے اس لیے ہم عزت نہیں کرتے۔ ہم یہ کہیں گے، چونکہ یہ انسان ہے اور یہ حضرت آدم کی اولاد ہے اس لیے ہم اس کی عزت ضرور کریں۔"

گفتگو سے کام آگے بڑھتا نہیں ہے۔ صرف بحث کرنا، نقص نکالنا کسی مسئلے کو حل نہیں کر سکتا، جب تک کہ عملی طور پر اس کے حل کی کوشش نہ کی جائے۔ محض گفتگو کے جال ڈالنا اور اس کے مضمرات سے بے خبر بھی رہنا۔ اس باب میں ہمیں اس محسن سے آگاہی اور عمل کی تحریک ملتی ہے۔

مسعود لک کہنے لگے۔ "یہ ٹوسٹر کی زندگی جو ہے یہ کامیاب آدمی پیدا کرتی ہے اور سینک لگنے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان کے اندر جو رویہ ہے وہ بڑا گندی گندی پڑے رہنے کا انداز ہے۔ ہاتھ ملتے رہتے ہیں، ڈٹ کر بیٹھ نہیں سکتے کہ آپ پاکستانی ہیں اور آپ کا ایک فخر جیسا کیسا بھی فخر ہے۔" تو میں نے کہا۔ "بھئی! ہمارا کیا فخر ہے، ہم تو بالکل شرمندہ ہیں۔ مثلاً "ہم میں کیا خوبی ہے۔" اس نے کہا۔ "دنیا کی واحد قوم ہے جو بڑی مہمان نواز ہے۔ ٹھیک ہے! ہم غریب ہیں، چھوڑ رہے ہیں اپنی روایات، لیکن آپ سیالکوٹ جائیں، کہیں گے جی! کھانا کھا کے جائیں۔" ہمارے امریکہ میں نہیں ہے، انگلینڈ میں نہیں ہے، آپ اس پر فخر کر سکتے ہیں۔"

"میں اور آپ اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے خدا ہم کو اس قسم کی مصیبت میں یا اس قسم کے عارضے میں مبتلا نہ کر۔ اگر ہمارے اوپر کبھی کوئی مشکل وقت آئے تو ہم وہاں سے بھاگ جائیں اور پھر اس کا ذکر نہ کریں کہ آتا ہے وقت اور پھر گزر جاتا ہے۔ بڑا انسان بننے کے لیے انسان کو وہ مثبت پہلو پیش کرنا چاہیے جو اس کی زندگی کے ساتھ چل رہا ہے۔"

"بعض اوقات کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے کہ پشیمانی جو اس کی ہے وہ خود بڑی اچھی دعا بن جاتی ہے۔ کوئی شرمندگی ہوتی ہے اور اس شرمندگی کو مٹانے کے لیے وہ اللہ کے حضور میں اپنے تخیل میں جو لمحات میسر آتے ہیں اسے ٹالنے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھ سے یہ کوتاہی ہو گئی تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن دعا مانگنا مشکل یوں ہے کہ دعا مانگنے والا آدمی سب سے پہلے اپنی ذات کے آگے کھڑے ہو کے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ میں نہایت نالائق، کم ظرف، جھوٹا، متکبر، کمینہ، گھٹیا آدمی ہوں، مجھ سے کوتاہیاں ہوئی ہیں اور اب ان کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے ایک سہارا چاہ رہا ہوں اور اللہ کے واسطے مجھے سہارا عطا کیا جائے۔"

دعا۔ دل کا سہارا۔ دعا کریں کہ دعا کا سلیقہ ہمیں آجائے اور ہماری دعاؤں کو کبھی پلٹایا نہ جائے۔

"ہم اگر آپ غور کریں گے تو مصائب اور مشکلات اتنی ہی شدید ہوتی ہیں، جتنا کہ آپ نے ان کو بنا دیا ہوتا ہے اور وہ آپ کی ساری زندگی کا ایک حصہ ہوتی ہیں، ساری زندگی نہیں ہوتیں۔ بندہ یہ سمجھتا ہے کہ ساری کی ساری میری زندگی ہے اور وہ برباد ہو گئی، تباہ ہو گئی۔ تو جب مشکلات اور مصیبتیں آتی ہیں تو اگر آپ ان کو غور سے دیکھیں اگر ان کا ایک حصہ بالکل ایک چھوٹا سا فریکشن آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، لیکن ہم نے وہ دھبا پھیلا کر اتنا وسیع تر کر لیا ہوتا ہے کہ پھر وہ ہمارے اختیار میں نہیں رہتا اور پھر وہ پھیلا ہوا دھبا ہمارا حکمران بن جاتا ہے اور جہاں جہاں چاہتا ہے ہم کو اٹھائے پھرتا ہے۔"

انسان کا نکتہ نظر ہی اس کا طرز زندگی بن جاتا ہے اور یہ خیال کی بدولت ہے۔ تو جب کبھی زندگی میں منفی رویے در آنے لگیں تو ان کے پیچھے بھی خیال کی قوت کارفرما ہوتی ہے۔ گویا خیال ایک ایسی معمولی چیز نہیں کہ جسے بے لگام چھوڑنا خالی از نتیجہ ٹھہرے۔

"خدا میاں نے انسان کو ایک کیفیت دی جو دوسروں کو، کسی جان دار کو نہیں دی۔ انسان کا ایک وجود جو ہے وہ جسم ہی جسم نہیں ہے۔ اس کے اوپر ایک اور چوبارہ بھی ہے، جو Intellect کا چوبارہ ہے۔ وہ چوبارہ جو آپ کو مجبور کرتا ہے کہ آپ سوچوں کی یخ بستہ رات کو کوئی اوئی بائیسکل چلاتے ہوئے نصرت فتح علی خان کا گانا سننے جائیں، وہ تقاضا ہے بلے بیٹھیں، بھی ہم سنا ہوں نہیں سننے جاتی۔ شیر نے ترنج تک قوالی میں شرکت نہیں کی بند کرتا ہے۔ اس کی آرزو ہے، جو مرضی کریں۔ یہ جو انٹلیکٹ ہے ذہن کا چوبارہ، اس کے اوپر ایک اور ہے اور وہ روح کا چوبارہ ہے۔ وہ ہمارا بند پڑا ہے۔ گندی کوئی پھوس اس میں پڑی ہے، پرانا ٹوٹا ہوا چرخا ہے۔ شیشے اس کمرے کے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ کنڈی اس کی مستقل بند ہے۔ کبھی کبھی کوئی کوئی اوپر چڑھتا ہے اور وہ آواز دے کر پوچھتا ہے کہ یہ کس کا ہے چوبارہ۔ تو پیچھے سے آواز آتی ہے کہ اپنا ہے، تو کہتا ہے اس کو کھولیں۔ وہ کہتی ہے نہ جی بہت! گندہ ہے۔ اس میں گند پھوس بھرا ہوا ہے۔ اس کو کھولنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ تو یہ ارادہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر چڑھنے والے انسان کا ہوتا ہے کہ کیا میں اس کوٹھڑی کو کھولوں یا نہ کھولوں۔ اب یہ فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔"

زندگی ہی وہ زر بے بدل ہے، جس کے ذریعے ہم نظر آنے والی دنیا سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، قطرے سے سمندر ہو سکتے ہیں اور زندگی ہی وہ اصل سکہ ہے، جو اگلی زندگی کا ہمیشہ باقی رہنے والا سرمایہ خرید سکتی ہے۔ زندگی کی قدر و قیمت، خالق کائنات سے محبت کی جستجو، موجود مسائل سے نبرد آزما ہونے کی قوت، دعا اور عقیدے کی طاقت، نظر کو ایک مختلف سمت اور خیال کو نئی جہت عطا کرنے والی کتاب پڑھنے کا تجربہ کچھ نیا سیکھنے اور جاننے کی سرشاری سے لبریز ہے۔ جو ہمارے ذہنوں کو پیدا کردہ جھوٹے موٹے مسائل کی گرہ اس سہولت سے کھول دیتا ہے کہ مدتوں سے سوچ کے بند کواڑ کھول کر یقین، محبت اور عمل کی روشنی ذہن کو منور کر دیتی ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اشفاق صاحب کے اس احسان کے بدلے، ان کے ساتھ معاملات میں آسانیاں ہی آسانیاں عطا کرے۔

(آمین)

سمیرا گل ہمراہ محمد عثمان

آسیہ منیر

پہلے میں آپ کو اپنا تعارف کروا دوں۔ میں ہوں آسیہ منیر سمیرا گل کی بیسٹ فرینڈ۔ میرے اور سمیرا کے گھر کے بیچ محض ایک دیوار ہے۔ ہماری دوستی تین سال کی ہوئی تو عثمان بھائی بھی اس میں شامل ہو گئے۔ اس طرح میں اور سمیرا پندرہ سال کے ساتھی ہیں۔ جب کہ عثمان بھائی اور ہمارا ساتھ بارہ سال پرانا ہے۔

ہمارا بچپن ایک ساتھ کھیلتے اور شرارتیں کرتے ہوئے گزرا ہے۔ ہماری اس تکون میں دو لوگوں کی دوستی محبت میں بدل گئی۔

جی! آپ ٹھیک سمجھے۔ یہ ان کی لو میرج ہے اور میں اس محبت کی روداد سے اکلوتی گواہ بلکہ نامہ بر جو بھی سمجھ لیں۔

یہ اکتیس مارچ کی بات ہے۔ میں دروازے میں کھڑی تھی۔ باجی صبح نے مجھے آواز دے کر بلایا اور ایسی خبر سنائی کہ مجھے اچھلنے پہ مجبور کر دیا۔

عثمان بھائی کے گھر والے شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آ رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بھنگڑے ڈالوں۔ خوشی ہی اس قدر تھی۔ ان کو دروازے میں چھوڑ کر میں اندر بھاگی۔

محترمہ کچن میں بیٹھی شامی کباب کی ٹکیاں بنا رہی تھیں اور چہرہ خوشی سے لال گلابی ہو رہا تھا۔ ہاتھ الگ کانپ رہے تھے۔ گھنٹہ بھر بیٹھ کر ہم نے کام نمٹانے کے ساتھ ساتھ خوب باتیں کیں۔ ماضی کی باتیں، بچپن کے قصے وہ بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"آسیہ! کیا سچ میں وہ لوگ آ رہے ہیں۔"

دونوں ہی اپنے اپنے محاذوں پر خوب ڈٹ کر لڑے تھے۔ آخر جیت محبت کی ہی ہوئی۔ ہمارے عثمان بھائی میں کوئی کمی نہیں۔ خوب صورت، شریف، باکردار، پڑھے لکھے، مہذب، اعلا سوچ کے حامل، غرض تمام خوبیوں سے لیس ہیں۔ بس مسئلہ ذات برادری کا تھا اور سمیرا جیسی روشن خیال لڑکی محض ذات برادری کے چکر میں الجھ کر محبت قربان نہیں کر سکتی تھی۔

"وہ اس وقت میں آ رہے ہیں۔ میرے گھر والے۔" عثمان بھائی اطلاع دے چکے تھے۔ میں اٹھ کر گھر بھاگی۔ نیا جوڑا استری کیا۔ میک اپ تھوپ کر واپس لوٹی تو مہمان آ چکے تھے۔

صبح باجی کے ساتھ مل کر میں نے کھانا لگوایا۔ غرض ان کی خاطر مدارت میں لگی رہی۔ سمیرا آنکھوں سے مجھے بار بار اشارہ کر رہی تھی۔ پھر مجھے ترس آ گیا اور میں نے جا کر بتایا۔

"مبارک ہو! مورخہ تیس اپریل شام سات بجے آپ کو رخصت کر دیا جائے گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے۔ ایک ایک دن ہم تینوں نے گن گن کر گزارا۔ اس دوران شاپنگ اور شادی کی تیاریوں میں بھی بہت مصروف رہے۔

شادی سے تین روز قبل عثمان بھائی کے گھر والوں نے ڈھولک رکھوائی تھی۔ ان کے اور ہمارے گھر میں دو گھر حائل ہیں۔ میں روز تک سک سے تیار ہو کر ڈھولک بجانے چلی جاتی تھی۔

انتیس اپریل کو عثمان بھائی کی مہندی تھی۔ سفید شلوار سوٹ پر پیلا دوپٹا گلے میں ڈالے ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو میں وہ خاصے جچ رہے تھے۔ سب نے انہیں مہندی لگائی۔ گانے گائے لڑکوں نے ڈانس کیا۔

سمیرا کے گھر ایسا کچھ اہتمام نہ تھا۔ ہم نے برات بجا بجا کر گانے گائے۔ اس کے تیل لگایا۔ پھر شام کو اس کے مہندی لگائی۔ ساتھ ساتھ ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ بھی چل رہی تھی۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ چھت پہ جا کر عثمان بھائی کو دیکھ لے۔ ہم نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا۔

اگلے روز بارات تھی۔ اس روز سمیرا نے سرخ عروسی لہنگا پہنا تھا۔ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

پانچ بجے بارات کا ٹائم تھا مگر حسب روایت وہ سات بجے آئی۔ ہم پھولوں کی پتیاں لیے استقبال پہ کھڑے تھے۔ دولہا صاحب نے گلی میں قدم رکھا اور لائٹ داغ مفارقت دے گئی۔ سخت غصہ آیا۔ واپڈا والوں کو کوستے ہوئے جنریٹر آن کرنے گئے۔ وہ خراب تھے لیکن عین موقع پہ ایک بھی نہ چل کر دیا۔ سخت کوفت ہوئی۔ ایک تو گرمی اس پہ یہ لوڈ شیڈنگ۔

بارات اندھیرے میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پہ پہنچی۔ سمیرا نے سادگی پہ زور دیا تھا سو شادی سادگی سے ہو رہی تھی۔ عثمان بھائی بلیک شیروانی میں سمیرا سے زیادہ پیارے لگ رہے تھے۔ سب نے ہی دولہا کو خوب سراہا۔

اس کے بعد نکاح ہوا۔ اس لمحے ان دونوں کے جو تاثرات تھے، وہ میں بیان کرنے سے یوں قاصر ہوں کہ بار بار پوچھنے پر بھی دونوں نے کچھ اگل کر نہ دیا۔ ہمارے عثمان بھائی ڈائیلاگ بازی میں ماہر ہیں لیکن اس بارے میں انہوں نے بھی منہ سے بھاپ تک نہ نکالی۔

کچھ دیر بعد رخصتی کا شور اٹھ گیا۔

قرآن کے سائے اور بزرگوں کی دعاؤں کے حصار میں وہ رخصت ہوئی۔ ایک گھنٹے بعد میں اور باجی شمع بڑا کیک اور مٹھائی لے کر ان کے پیچھے پہنچ گئے۔ تب تک ان کا فوٹو شوٹ ہو چکا تھا اور مختلف رسموں کے



بعد انہیں حجلہ عروسی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ بڑی نزاکت کے ساتھ کچھ سمٹ کر شرماتے ہوئے تازہ پھولوں کے درمیان مسہری پہ بیٹھی تھی۔ اور عثمان بھائی سالیوں کے نرغے میں پھنسے نیگ دے رہے تھے۔

ناشتا لے جانے میں بھی میں پیش پیش تھی۔ جب سب لوگ ناشتا کر رہے تھے تو میں اس کے کان میں گھسی پوچھ رہی تھی کہ عثمان بھائی نے کیسے تعریف کی تھی۔ تھوڑی بہت شاعری تو وہ کرتے ہی ہیں۔ میں نے سوچا ایک آدھ غزل تو کہہ ہی دی ہو گی لیکن جناب! انہوں نے بس اتنا کہا۔

"پیاری لگ رہی ہو۔"

خیر قصیدہ گوئی تو اب وہ عمر بھر کرتے ہی رہیں گے۔

دوسرے ہی دن شام کو ولیمہ تھا اور اس روز سمیرا نے ہلکے فیروزی رنگ کا لہنگا پہنا تھا اور کل کی نسبت وہ آج زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی بلکہ دونوں ساتھ ساتھ اتنے حسین اور خوب صورت لگ رہے تھے کہ میرے دل سے بار بار دعا نکل رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش و خرم اور آباد رکھے۔

زندگی کا یہ نیا سفر انہیں بہت بہت مبارک ہو۔ آمین۔



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع ۔ 37 ۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ کی صحت، عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعا گو ہیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیں اور ہمارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور وہ لوگ جو ہمارے پاک وطن کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، ان کو نیست و نابود کردے۔ (آمین)

پہلا خط اسلام آباد سے یاسمین گل کا ہے، لکھتی ہیں

شعاع کا ایک اور خوب صورت شمارہ ہاتھ میں آیا اور ہاتھ میں آتے ہی دل شاد کر گیا۔ ٹائٹل نہایت اچھا لگا، لیکن ٹائٹل سے زیادہ اچھی لگی "اک نئی منزل ملے"۔ بیٹا کی بے ساختگی، چھوٹے چھوٹے مربوط سین، کیا کمال کا ناول لکھ رہی ہیں فائزہ جی۔ اس بار ایک گزارش ہے کہ اپنی روزی کی مصروفیت میں ہم قارئین کو نہ بھول جائیے گا۔ ڈرامے اپنی جگہ، مگر جو مزا کہانی پڑھنے میں آتا ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں آتا۔ "دیوار شب" کی یہ قسط پڑھ کر بے اختیار دعا نکلی کہ عالیہ بخاری اب مدارا، معاذ اور حورا کو کسی اینڈ تک پہنچا دیں۔ انداز تحریر بلاشبہ بہت خوب صورت ہے، مگر پلیز۔ "جنت کے پتے" نمرہ احمد ہمیشہ کی طرح منفرد لکھ رہی ہیں، لیکن کہیں کہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اردو کا ناول نہیں، بلکہ کسی انگریزی تھرلر کا اردو ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ پزل باکس اور ان پہ لکھی پہیلیاں۔ ڈان براؤن کے کسی ناول جیسی لگ رہی تھیں۔ نمو نے حیا کے اندر تبدیلی کا عمل بہت خوب صورت دکھایا ہے، ایسی تبدیلی جو آہستہ آہستہ وقوع پذیر ہوتی ہے اور اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ "دل کو ہارے بغیر نور نہیں ملتا" کیا خوب صورت بات بتائی ہے آپ نے ہمیں نمو جی!

اب بات کروں گی سائرہ رضا کے ناول کی۔ سائرہ رضا تو بہت جلد میری فیورٹ رائٹرز میں شامل ہو گئی ہیں۔ اس قدر زبردست منفرد سا انداز ہے ان کے لکھنے کا اور اتنے ہی زبردست ان کے اس ناول کے کردار۔ الفت جیسا کردار میں نے ایک بار نہیں، دو تین بار اس ناول کو دیکھا اور ہر بار الفت کے بارے میں پڑھ کر یہی سوچا کہ انسان کے بارے میں جو کچھ رب تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے وہ کس قدر سچ ہے۔ جلد باز، ناشکرا، جھگڑالو، ظالم، بے راہ رو۔ جسے اللہ کی ہدایت نہ ملے، وہ پھر الفت جیسا ہی ہوتا ہے۔ اور اللہ بھی انہیں ہی ہدایت دیتا ہے جو اس کی ہدایت کے طالب ہوتے ہیں، جو توبہ کرتے ہیں، "غلطی" تسلیم کرتے ہیں۔ اکمل اور اظہر جیسے۔ جن کے دل بدلتے ہیں... لیکن الفت جیسے، جن کے دل و دماغ پر مہر لگ چکی ہو۔ اس کے دل تک وہ روشنی پہنچ ہی نہ پائی...... وہ اندھیرے میں بند، خود کو عقل کل سمجھنے والی، دنیا کی ٹھوکر کھا کے بار بار بدلنے والی اور الفت کا دل بھی نہیں بدلتا تھا۔ اکمل سعید کو کوئی رتبہ، کوئی عزت دینے کو جس کے لیے دل مانتا، اس کے لیے پھر اس نے بھیک بھی مانگ لی۔ میری سمجھ میں تو یہی آیا ہے۔ دل کی مانتے چلے جاؤ، بلا چوں و چرا تو حاصل "الفت" کے انجام جیسا ہوتا ہے اور اگر دل کو مار کر، جھکا کر اس سے باتیں منواؤ تو حاصل "حکمت عملی" جیسا ہوتا ہے۔ موسم کے پکوان بھی اچھے لگے۔ ایک مشورہ ہے آپ کے لیے۔ اگر کھانوں کی تراکیب کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت ان کی غذائیت اور غذائی اجزا کے بارے میں بتا دیا جائے تو بہت فائدہ ہوگا۔

ج: پیاری یاسمین! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ بہت اچھا تبصرہ کیا آپ نے۔ ہمارے دفتر کے فون خراب ہیں۔ آپ اپنا فون نمبر بھجوا دیں۔ ہم فون کر کے آپ کے افسانوں کے بارے میں بتا دیں گے۔

مدیحہ جاوید نے سرگودھا سے لکھا ہے

اگست کا شمارہ کمال کا تھا۔ سرورق پہ ماڈل کا انداز بہت اچھا لگا۔ نمو جی! آپ نے تو قلم اٹھانے پہ مجبور کر دیا۔ کوئی اتنا اچھا کیسے لکھ سکتا ہے؟ اب آتے ہیں فائزہ جی کی طرف۔ کمال کر دیا آپ نے فائزہ جی۔ بیٹا کا کردار اور ماں کے مذاق دل کو بھائے۔ ویسے یہ کمال کس شہر کے باسی ہیں؟ مطلب یہ جنہیں اور ہم پاکستان کے نہیں لگتے۔ کرداروں کے نام "دل موم کا دیا" کمال۔ کچھ دل کو نہیں لگی۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔ عائزہ خان کا انٹرویو بھی پسند آیا۔ شاہین جی سے درخواست ہے کہ FM 96 کے آر جے شہر خان کا انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں۔ ساتھ نواز خان اور حنا الطاف کا انٹرویو بھی پلیز شائع کریں۔

ج: مدیحہ! ہمیں افسوس ہے "دل موم کا دیا" آپ کے دل کو نہیں لگی۔ تھوڑی سی مختلف انداز کی کہانی تھی اور ایک کردار پر لکھی گئی تھی۔ آپ کی فرمائشیں شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

تنزیل زہرہ نے شہداد پور سے لکھا ہے

سرورق قابل تعریف تھا۔ فہرست میں ام طیفور کا نام دیکھ کر ذہن میں فوراً "جھاڑا لگا ہوا" کہ یہ تو وہی رائٹر ہیں جنہوں نے "کچی جنی جنج" لکھ کر قارئین کو کافی متاثر کیا تھا۔ "دیدہ بینا" سادہ تحریر تھی، لیکن پڑھتے ہوئے مزہ آرہا تھا۔ سائرہ رضا کی تحریر "دل موم کا دیا" میں الفت کا کردار منفی سہی، لیکن اس کی بے لگام زبان نے جو وقت بے وقت پھلجھڑیاں چھوڑیں تو ہم مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ "ستارہ شام" دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ افسانے بلاشبہ اس بار بہترین تھے۔ "دو ٹکے کا نوٹ" آنیز نیری جی کی ایک پر اثر تحریر تھی۔ ان کی تحریر ہمیشہ دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اتنے عرصے سے صرف افسانے لکھ رہی ہیں، کوئی ناول کیوں نہیں لکھتیں؟ "تعجب ہے" ام مریم کے افسانے کا پلاٹ بکھرا بکھرا لگا۔ سمیرا حمید کی تحریر "تکمیل" بھی اچھی طرز کی ایک منفرد تحریر تھی۔ "اک نئی منزل ملے" میں بیٹا کا ماڑ کو سرخ ہو جانے کے بجائے نظر انداز کرنا اچھا لگا۔

ج: تنزیل! آنیز نیری سے ہر بار فون پر ہم بھی یہی پوچھتے ہیں کہ مکمل ناول کیوں نہیں لکھتیں؟ اور ان کا عذر ہر بار یہی ہوتا ہے کہ فرصت نہیں ملتی۔ شفا ابھی بہت چھوٹی ہے، اس کے کام ہوتے ہیں۔ افسانہ بھی ہم نے شدید اصرار کر کے لکھوایا ہے۔

عالیہ تحمل لکھتی ہیں

جولائی کا شمارہ کافی اچھا تھا۔ لیکن رمضان اور عید کی مصروفیت کی وجہ سے لیٹر نہیں لکھ پائی۔ کہانی لکھی تھی اس کے بارے میں بتا دیں۔ نمرہ احمد کا ناول بہت پر اسرار ہے۔ ان کی کہانی میں مزہ آرہا ہے۔ عالیہ بخاری کے کیا کہنے۔ کافی دلچسپ ہو گیا۔ "دیوار شب" آپا گی جیسے افراد نہ جانے کب ٹھیک ہوں۔ "ستارہ شام" میں مزا نہیں

اعتذار

آمنہ ریاض کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے جن کے قدموں تلے جنت تعمیر ہوتی ہے وہ ایک بچی کی والدہ محترمہ بن گئی ہیں۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے ان کو دلی مبارک باد اور ان کی پیاری بچی کے لیے دعائیں۔

اسی وجہ سے آمنہ ریاض اس ماہ "ستارہ شام" کی قسط نہیں لکھ پائیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ ان کے ناول کی قسط شامل ہوگی۔

آرہا۔ ساجدہ رضا کا دل موم کا دیا بہت اچھا تھا۔ لیکن ایسی عورتیں کہاں ہوتی ہیں ہم نے تو آج تک نہ دیکھیں۔ فائزہ افتخار کی سنڈریلا کسی کام کی نہیں مطلب بیٹا کا کردار اچھا نہیں البتہ رومان دلچسپ ہے۔ ام طیفور اور ام مریم قرۃ طاہر کے افسانے اچھے تھے۔

ج: پیاری عالیہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا تبصرہ متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے آپ کی کہانی شائع نہیں ہو سکی آپ محنت کرکے مزید لکھیں۔

شہناز گل شمینہ احمد تحصیل علی پور مظفر گڑھ بستی نرالی والا سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

شعاع بہت ہی خوب صورت اور معیاری رسالہ ہے۔ اس ماہ کا ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ خاص طور پر ماڈل کا لباس اور اس کا رنگ بہت اچھے تھے۔ جس تحریر نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ ہے نمرہ احمد کا "جنت کے پتے" میرا اندازہ ہے کہ جہان سکندر ہی عبدالرحمن پاشا کا سوتیلا بھائی ہے۔ اب ہم اپنا تھوڑا سا تعارف کروا دیتے ہیں۔ ہم ضلع مظفر گڑھ تحصیل علی پور موضع علی پور والی قادرہ باد بستی نرالی والا میں رہتے ہیں۔ میرا نام شمینہ احمد ہے۔ میں نے اسکول آٹھ تک پڑھا ہے اور شہناز میری کزن ہے۔ اس نے پوری پانچ کلاس پڑھی ہیں۔ میں اپنے گاؤں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ ہمارے گاؤں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ آپی توک نگر شفاء اللہ خان دو کھڑی کا انٹرویو ضرور شائع کیجئے۔

ج: شہناز اور شمینہ خط لکھنے کا شکریہ۔ آپ کی لکھائی بہت خوب صورت ہے، بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

صائمہ فیاض لابد عادل قصور سے شریک محفل ہیں لکھتی ہیں

میرے ضلع کا نام قصور ہے لیکن ہم رہتے عادل کے قریب ہیں۔ وہاں ہماری زمین ہے۔ ہمارے شہر کا نام رادھا کشن ہے۔ ہمارے گھر کے پاس تین نہریں بہتی ہیں۔ میں آٹھ سال سے شعاع پڑھ رہی ہوں۔ ہم دو بہنیں اور پانچ بھائی ہیں۔

اب بات ہو جائے ستمبر کے رسالے کی جو بڑھ کر میں نے اپنی کزن کے پاس بھیج دیا ہے۔ سب سے پہلے جنت کے پتے پڑھا۔ واہ کیا شاندار اسٹوری ہے۔ فائزہ ہمیشہ ہی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مجھے بیٹا اور ماہ رخ کے کردار بہت پسند ہیں۔ "ستارہ شام" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ میری بہن کو دل موم کا دیا اچھی لگی۔ میری بہن نے اسکول میں نہیں پڑھا۔ لیکن رسالے پڑھ کر اس نے اردو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ پہلے میں کہانیاں سناتی تھی۔ اب خود پڑھتی ہے۔ ہمارے گھر ٹی وی نہیں ہے۔

ج: پیاری صائمہ! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کی بہن ماشاء اللہ اتنی ذہین ہے کہ اس نے رسالے پڑھ کر اردو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ملتان پو رملتان سے صدف ناز انصاری لکھتی ہیں

بے شمار اخبارات، میگزین اور ڈائجسٹ پڑھے، لیکن شعاع کا معیار سب سے اعلیٰ و منفرد پایا۔ آپی! میری عمر 16 سال ہے۔ گزشتہ ساڑھے تین سال سے شعاع زیر مطالعہ ہے۔ علاوہ ازیں کم و بیش اتنے ہی عرصے سے بچوں کے ادب سے منسلک ہوں اور متعدد تحاریر تخلیق کر چکی ہوں۔ مزید برآں اسی شعبے میں سینئر لکھاری کے اعزاز میں ایوارڈز جیت چکی ہوں۔ حال ہی میں ماہ رمضان کے موقع پر مقامی آرگنائزیشن کے زیر اہتمام منعقدہ تقریری مقابلے میں پہلی پوزیشن بھی حاصل کی ہے۔

ج: پیاری صدف! کامیابیوں پر ہماری جانب سے دلی مبارک باد۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں، قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کنزہ نقوی نے شہداد پور سے لکھا ہے

ستمبر کا شمارہ ہاتھ آیا۔ ٹائٹل گرل بہت پیاری لگی۔ خاص کر اس کے سوٹ کا ڈیزائن بہت زبردست لگا۔ "جنت کے پتے" بہترین ناول ہے۔ جہان عبدالرحمن پاشا کا بھائی ہے یہ جان کر کافی حیرت ہوئی۔ آنٹ ریاض کا

"ستارہ شام" بھی بہترین جا رہا ہے۔ اس بار صفحات بھی زیادہ تھے۔ اس کے بعد بات کرتے ہیں ہوک نئی سنڈریلا کی۔ واقعی فائزہ افتخار کی آپ کی سنڈریلا بہت ہی کیوٹ ہے۔ ہم بیٹا کی شرارتیں بہت انجوائے کرتے ہیں اور اس بار پلیز "ہم سفر" کی ماہرہ خان کا تفصیلی انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج: آپ کا پچھلا خط شائع نہ ہو سکا۔ اس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔ ماہرہ بہت اچھی اداکارہ ہیں۔ اگر انہوں نے انٹرویو دیا تو ضرور شائع کریں گے۔

فتح پور ضلع لیہ سے اقراء عروج نے لکھا ہے

زبردست، زبردست، خوب صورت فراک والی ماڈل۔ سنڈریلا فائزہ افتخار تو ہمیں بچپن میں ہی لے گئیں۔ دیدہ بینا ام طیفور نے جس طرح لکھی ہے یہ کہانی بھی بہت زبردست۔ الفت کا کردار بہت عجیب تھا۔ آگ نہ بجھ میں آنے والی لڑکی بھی بہت اچھی۔ ایک بات اس کی اچھی لگی کہ دیتا ہے وہ نہیں رہتا تو نہ وہ دکھیں اور سے تو ل ہی جائے گا۔ مکمل ختم "سمیرا حمید" نے اچھا افسانہ لکھا ہے۔ شاعری پیچھے رہ گئی ہے راستی۔

ج: پیاری اقراء! شعاع پسند آیا بہت شکریہ۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ الفت کا کردار واقعی عجیب و غریب تھا اور دلچسپ بھی لیکن حقیقی زندگی میں یہ کردار اپنے متعلقین کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ خصوصاً "ایک عورت جو گھر کی بنیاد ہوتی ہے اس کی ذرا سی غلطی پورا گھر تباہ کر دیتی ہے۔

مقدس اور حامد قمر نے لکھن وال گجرات سے شرکت کی لکھتی ہیں

ٹائٹل گرل کا اسٹائل متاثر کن تھا۔ نمرہ احمد اور فائزہ افتخار بڑے اچھے طریقے سے ناولٹ خوب صورت کلمات کے ساتھ بڑھا رہی ہیں۔ تنزیلہ ریاض اپنے قسمت سے بھرپور افسانوں کے ساتھ ہمیشہ شعاع کی جان رہی ہیں۔ ایسا نہیں کہ باقی افسانے اچھے نہیں تھے بلکہ سب اپنی اپنی جگہ اچھے تھے۔ اب اپنے گاؤں کا احوال۔

لکھن، رام، جبل تین ہندو بھائی تھے۔ جن کا اتفاق بے مثال تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ان کے اتفاق کی بنا پر ہمارے گاؤں کا نام لکھن وال اور ساتھ والے دونوں گاؤں کا نام رالے اور جبل پور رکھ دیا گیا۔ باقی دونوں گاؤں چھوٹے ہیں مگر لکھن وال بڑا ہے۔ اس کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور لکھن وال کلاں اور خورد کا نام دیا گیا ہے۔ کلاں رقبے کے لحاظ سے اور خورد آبادی کے لحاظ سے بڑا ہے۔ ویسے دونوں گاؤں میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ یہاں گورنمنٹ بوائز گرلز ہائی اسکول ہیں جہاں پر دور دراز کے علاقوں کے لوگ اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ الغرض ضروریات زندگی کی ہر آسائش موجود ہے۔ تازہ ہوا اور تازہ سبزیوں کے ساتھ گاؤں کی شہرت یہاں پر موجود دریاؤں کی وجہ سے بھی ہے۔ لیکن شعاع جلال پور جٹاں (شہر) سے لانا پڑتا ہے۔ گاؤں میں اسپتال، گیس اور واٹر سپلائی کی سہولت موجود ہے۔

ج: مقدس اور حنا! آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے گاؤں میں ساری سہولیات مہیا ہیں۔ خصوصاً تعلیم کے لیے اسکول اور علاج معالجے کے لیے اسپتال کی سہولت ورنہ ہمارے ہاں بڑے قصبوں میں تو قدم قدم پر اسکول اور اسپتال ہیں، لیکن گاؤں کی بہتری کی طرف نہ حکومت توجہ دیتی ہے نہ وہاں کے منتخب نمائندوں کو خیال آتا ہے۔ خصوصاً "سندھ" کا تو بہت برا حال ہے۔

تحسین فاطمہ نے چک 13 ماڑی مسعود وال سے لکھا ہے

"جنت کے پتے" نمرہ احمد کی تو کیا بات کرنی بہت لاجواب تحریریں ہوتی ہیں ان کی خواتین میں مصحف نے بہت متاثر کیا اور اب "جنت کے پتے" بھی بہت متاثر کر رہا ہے۔ حیا کی تبدیلی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ کیونکہ ہم لڑکیاں اکثر ہیروئن کی کاپی کرنا پسند کرتی ہیں۔ بہت اصلاح ہوتی ہے اس طرح لڑکیوں کی۔ اس کے بعد فائزہ کے ناولٹ کی طرف گئے تو بے پایاں خوشی ہوئی۔ جب رومان اور بیٹا گفتگو کرتے ہیں تو چہرے سے مسکراہٹ جاتی ہی نہیں۔ ساجدہ رضا کا مکمل ناول بھی بہت اچھا تھا۔ افسانے میں "مکمل ختم" نخشب پسند آئے۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے "زیوار شب" بھی بہترین ناول ہے۔ "ستارہ شام" بھی زبردست ہے۔ ام طیفور کا ناولٹ بھی ٹھیک تھا۔

ج: تحسین! شازیہ چودھری کی وفات مئی 2004ء میں ہوئی تھی۔ جس ناول کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے۔

وہ کتابی شکل میں آچکا ہے۔ مکتبہ عمران ڈائجسٹ سے مل سکتا ہے۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عظمیٰ، اصغر، صبیحہ، ارشد گاؤں چھوکر خورد ضلع گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

شاعر نے یہ شعر یقیناً میرے لیے ہی لکھا ہے کہ "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" بہت دفعہ دل چاہا کہ خط لکھا جائے اور لکھنے بھی بیٹھے لیکن وہی ازلی سستی آڑے آتی رہی۔
سرورق پہ ماڈل کا لباس بہت زبردست تھا۔ اسی طرح کے مکمل لباس والا کریں، اچھا لگتا ہے۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح نمرہ احمد بازی لے گئیں۔ میں ہر دفعہ ان کی تحریر پڑھ کر دنگ رہ جاتی ہوں۔ سائرہ رضا بہت اچھا اضافہ ثابت ہو رہی ہیں۔ سلسلے وار ناول ہمیشہ کی طرح اچھے لگے۔ ہاں فائزہ افتخار کی کہانی میں ان کا مخصوص انداز کہیں گم ہے۔ ان کا وہ بے ساختہ پن کہیں مفقود ہے جو ان کا خاصہ رہا ہے۔ کنیز نبوی کا افسانہ بالکل سچائی پہ مبنی تھا۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح منفرد لکھا۔

ج: عظمیٰ اور صبیحہ! آپ نے اس بار سستی کو بالائے طاق رکھ کر ہمیں خط لکھ ہی دیا۔ بہت اچھا لگا۔ اب اس سستی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں اور ہر ماہ ہمیں خط لکھیں اور شعاع کے دیگر سلسلوں میں بھی شرکت کریں۔

عروج انجم نے بیٹ فقیریاں پنجاب سے لکھا ہے

نمرہ احمد کا ناول بہت تجسس لیے ہوئے ہے۔ نعیمہ ناز سے کہیں ناں کہ ناول کے محاوروں اور نصیحتوں والے ناول لکھیں۔ ناول کے نت نئے محاورے جو در اصل پرانے مگر متروک ہونے کے باعث نئے لگتے ہیں، ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں۔

ج: پیاری عروج! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا بھیجا ہوا لطیفہ کسی اور نام سے شائع ہو گیا۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ نعیمہ ناز شادی کے بعد گھرداری کے جھمیلوں میں الجھ کر رہ گئی ہیں۔ ہمیں بھی ان کا دیر انداز بہت پسند ہے اور شدت سے ان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے ان تک پہنچا رہے ہیں۔

صبا رشید بھٹی نے پسرور ضلع سیالکوٹ سے شرکت کی ہے

خواتین ڈائجسٹ سے میرا تعلق سات سال پرانا ہے اور ہر گزرتا دن اس تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر کر رہا ہے۔ اتنا خوب صورت ناول لکھنے پر نمرہ کو مبارک باد۔ نمرہ آپ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ جہان سکندر عبدالرحمن پاشا کا بھائی ہے۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پہیلی کا جواب جان کر تو بے ساختہ نمرہ کو داد دینے کو دل چاہا۔ ویری گڈ۔ فائزہ کی باقی تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی زبردست ہے۔ "ستارہ شام" اور "دیوار شب" بہت اچھے جا رہے ہیں۔ "دل موم کا دیا" سائرہ رضا کی ایک اچھی کاوش تھی۔ افسانے تو سب ہی لاجواب تھے لیکن کنیز نبوی بازی لے گئیں۔ ایک فرمائش کرنا چاہوں گی کہ 90ء کی دہائی کی یادگار تحاریر کو دوبارہ شائع کیا جائے۔

ج: پیاری صبا! 90ء کی دہائی کی خوب صورت اور یادگار تحریریں شائع کرنے کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔ ضرور پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سائرہ، منظور، شبنم، تحمینہ، ایمن، رفعت گاؤں پتلانی والا تحصیل و ضلع ملتان سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

اس بار کا ٹائٹل ہمیں بہت پسند آیا ہے۔ یہ خط لکھنے کی اصل وجہ نمرہ احمد کا مکمل ناول "جنت کے پتے" اور فائزہ افتخار کا ناول "اک نئی سنڈریلا" ہے۔ یہ دونوں ناول اتنے اچھے ہیں کہ ہمارے پاس ان کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ رہے ہیں۔ افسانوں میں سب سے زیادہ اچھا افسانہ "موہنجے کا آتری" اور "وہ تخت ہے" ہے۔ مکمل ناول "دل موم کا دیا" سائرہ رضا نے اچھا لکھا۔ ناولٹ "بیوہ" ام طیفور کی اچھی کاوش تھی۔ مستقل سلسلوں میں ہمیں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں، "شاعری کی بولتی ہے" اور "تاریخ کے جھروکوں سے" ہمیں بہت پسند ہے۔ براہ کرم ان کا سلسلہ جاری رکھیں۔ براہ کرم ایف ایم (ملتان) 101 کے RJ آصف اور کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج: سائرہ، منظور، تحمینہ، ایمن اور رفعت! آپ پچھلے دس سال سے شعاع کی قاری ہیں۔ اتنی طویل خاموشی کیوں؟ یہ تو بہت زیادتی ہے ہمارے ساتھ کہ اتنا طویل عرصہ ہم آپ کی رائے نہ جان سکے۔ اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

شائستہ یاسمین اور شگفتہ یاسمین کراچی سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

نبیلہ ابر راجہ اور نبیلہ عزیز کمال ہیں۔ بھئی اور ہاں زندگی کیا کہوں۔ دل تو کر رہا ہے کہ ان کے ہاتھوں کو چوم لوں۔ اور ہاں نمرہ جی آپ کی تو بات ہی الگ ہے۔ ایک گزارش ہے کہ حیا اور جہان کو الگ نہیں کیجئے گا۔ ہاں سب سے اہم بات تو بتائی نہیں۔ ٹائٹل گرل اتنی پیاری اور اس کے پیچھے کا منظر لاجواب۔

ج: شائستہ اور شگفتہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نبیلہ عزیز کی تحریر آپ جلد ہی پڑھ سکیں گی۔ آپ کی بہن 95ء سے باقاعدگی سے شعاع پڑھ رہی ہیں۔ ہماری جانب سے ان کا شکریہ بھی ادا کر دیں۔

حنا حلیم اعوان گاؤں آخون باجہ کی تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

ناول کے بیک گراؤنڈ میں ڈھلتے سورج کا پانی میں جھلملاتا عکس اک پل کو مبہوت سا کر گیا۔ "جنت کے پتے" جس قدر منفرد لوکیشن اور چونکا دینے والے ٹائٹل نمرہ اپنی کہانیوں کے لیے چنتی ہیں، کہانی کے کردار بھی اس سے بڑھ کر خوب صورت ہوتے ہیں۔ چمک دار لمبے بالوں اور نرم و ملائم جلد والی حیا سلیمان سے ہمیں سچ مچ عشق ہو گیا ہے۔ "دیوار شب" میں تایا گل اور سلمان کی بے حسی اور خود غرضی پر بہت دکھ ہوا۔ کیا کوئی بہن اپنی سگی بہن کے لیے بھی جانتے بوجھتے گڑھا کھود سکتی ہے؟ "ستارہ شام" انتہائی دلچسپ موڑ پر آن ٹھہرا ہے۔ "دل موم کا دیا" سائرہ رضا نے بہت عمدہ تحریر کیا۔ باقی سبھی سلسلے اور تحریریں ایک دم پرفیکٹ تھیں۔ عائشہ گل کیا وہی ہیں جنہوں نے قلم "تجربے پیار میں" "کلام کیا تھا؟" آپی پلیز حسن ملکہ میں اب ابرار الحق کو بھی بلوا لیجئے۔ آپ سے ریڈیو کے ڈی جے زکی کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی۔ جو ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ پلیز 101 کراچی کے عدیل عباسی اور اکبر کے عباسی کے انٹرویوز لیں جلد از جلد۔ آپی کیا نادیہ جہانگیر کی کوئی بہن مریم جہانگیر کالم لکھتی ہیں؟

ج: پیاری حنا! عائشہ گل نے قلم میں کالم نہیں کیا۔ نادیہ جہانگیر کی کوئی بہن کالم نہیں لکھتی ہیں۔

حوریہ خان نے کراچی سے لکھا ہے

شعاع حسب معمول 3 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل گرل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ (ہمیشہ کی طرح) ٹائٹل کے بعد سب سے پہلے نمرہ احمد کے شاہکار "جنت کے پتے" کی طرف دوڑی۔ اللہ کرے بس جہان اور حیا ساتھ رہیں۔ (آمین) اس کے بعد "اک نئی سنڈریلا" پڑھا۔ واؤ بہت ہی اچھی کہانی ہمیشہ کی طرح فائزہ افتخار نے کچھ الگ لکھا ہے۔ خصوصاً "عینا" کی کیوٹ باتیں بہت ہنسی آتی ہے پڑھ کر۔ "دیوار شب" میں کہانی کچھ آگے بڑھی ہے۔ اچھی قسط تھی۔ "ستارہ شام" سست روی کا شکار ہے۔ پلیز اس کے صفحات تھوڑے بڑھائیں۔ افسانوں میں "تکمیل ختم" بہت اچھا لگا۔ حقیقت پر مبنی تھا۔ "وہ تخت ہے" بھی اپنے آس پاس کی ہی کہانی لگی حقیقت سے قریب۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول "دل موم کا دیا" ناول اچھا تھا۔ مگر کہانی کا پلاٹ تھوڑا پرانا لگا۔ مگر ناول کے الفاظ کا چناؤ و خوبصورتی نے بے حد متاثر کیا۔ اس کے علاوہ بھی باقی تمام سلسلے بہت ہی اچھے لگے۔

ج: پیاری حوریہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

کشمالہ گل اور مہرین گل نے کراچی سے لکھا ہے

"دیوار شب" میں کچھ خاص تغیر نہ ہوا۔ "ستارہ شام" بھی یوں ہی رہا۔ بس اینڈ میں سسپنس تھا۔ "جنت کے پتے" رلا بھی گیا اور الجھا بھی گیا۔ جہان تو بہن پھپھو کا بیٹا ہے۔ وہ تو پاشا کا بھائی نہیں ہو سکتا ہے۔ کہیں بھتیجا تو نہیں اور یہ ولید کی گھٹیا حرکات دل چاہا سر توڑ دوں "اسکارف والے فیصلے اور منگنی کی رسم" دل کھل اٹھا۔ "اک نئی سنڈریلا" فائزہ آپی آپ نے تو رلا دیا ہے۔ کبھی دل ہار کے حق میں ووٹ دیتا ہے تو کبھی رومان کے فیور میں۔ "فائزہ آپی جادو کے زور سے رومان کو بھی دولت مند بنا دیں اور پھر عینا کا اس کے ساتھ کپل بنا دیں۔
فائزہ جی! ایک بھی جادوئی منتر مجھے بھی دے دیں ان شعاع کے دل کو تسخیر کرنے کا سکھا دیں۔
تحریریں شائع ہونے کے لیے جادوئی منتر کی نہیں محنت کی ضرورت ہے

رابعہ انور نے گاؤں آنڈھا ضلع جہلم سے لکھا ہے

ناول پہ چلی ناول بہت کیوٹ لگی۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی باتیں تو ہوتی ہی پیاری ہیں۔ "جنت کے پتے" کہانی ابھی جاری ہے۔ نمو کی نیکسٹ قسط میں یہ مت لکھیے گا جہان اور پاشا دونوں بھائی ہیں دونوں ایک میلے میں گم ہو گئے تھے۔ افسانوں میں کنیز نبوی کا افسانہ بہت بہت ہی اچھا لگا۔ کنیز اوی قربان یہ اگین ہی گریٹ بلاٹ بھی دونوں اچھے تھے۔ مکمل فائزہ آپی آپ کی تو بات ہی الگ ہے۔

نئی رائٹرز کوئی بھی متاثر نہیں کر سکی ہے۔ سائرہ رضا کا ناول مجھے اچھا نہیں لگا۔ خط آپ کے میں نورین شفیع کا خط بہت اچھا لگا۔

ج: رابعہ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے گاؤں کا نام صحیح شائع نہ ہو سکا۔ شعاع پر تبصرے کا شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی تعریف اور تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

تسلیم سولنگی کلثوم سولنگی ضلع وہاڑی تحصیل میلسی وہ کوٹ سے لکھتی ہیں

جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ ہے نمرہ احمد کا "جنت کے پتے" اور فائزہ افتخار کا "ایک نئی سنڈریلا" بہت اچھا لگا۔ اس ناول میں حیا کا کردار بہت اچھا ہے۔ خاموش رہ کے بھی بہت کچھ کر جاتی ہے اور مہر تو زبردست لگتی ہے۔ اس کے علاوہ باقی ناولز اور افسانوں کی کہانیاں زبردست تھیں۔ میں چھٹی یا ساتویں کلاس میں تھی جب سے شعاع پڑھ رہی ہوں اور اب تو ایف اے کر چکی ہوں۔ اور پلیز ایک ریکویسٹ ہے لازمی پوری کرنا۔ 103 مست ملتان کے آر جے شفقت عباس کا انٹرویو تصویر کے ساتھ شامل کرنا۔

ج: پیاری تسلیم شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

شمینہ مبارک نے چودھالی موڑ راولپنڈی سے لکھا ہے

شعاع، خواتین اور کرن کو پڑھتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا یہ تو مجھے یاد نہیں، لیکن اس کو پڑھنے کی وجہ سے جو گالیاں، کوسنے اور جھڑکیاں پڑتی تھیں وہ ابھی بھی ضرور یاد آجاتی ہیں۔ جب ویسی ہی باتیں اپنے میاں جی سے سننے کو ملتی ہیں۔ بس اماں کی گالیاں بے لاگ اور کھلی ڈلی ہوتی تھیں اور میاں جی ٹھہرے شریف سے بندے تو وہ ذرا مہذب انداز میں سرزنش کرتے پائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ شمینہ ہی کیا جو ان کی باتوں پر کان دھرے۔ سو وہ اپنا کام (یعنی سنانا) اور میں اپنا کام (یعنی شمارے پڑھنا) کیے جا رہے ہیں۔ کبھی وہ چپ کر جاتے ہیں اور کبھی میں شرم کر لیتی ہوں۔ (صرف دو چار دن) اس کے بعد پھر وہی روٹین۔ اب اس بات سے آپ کو میری محبت کا تو پتا چل ہی گیا ہو گا۔

شمینہ آپ کی محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ آپ شعاع اور خواتین کے لیے ہر خط لکھیں۔ ہم ان شاء اللہ ضرور شائع کریں گے۔

انیلا قیصر گل کا پیدوال ضلع خانیوال سے شعاع پر تبصرہ لکھتی ہیں

ہم نے شعاع کا باقاعدہ مطالعہ پیر کامل سے شروع کیا جب پیر کامل ختم ہوا تو فرحت آپی کے ناول کی پہلی قسط شائع ہو گئی۔ فرحت اشتیاق کا ناول شائع ہو اور ہم نہ پڑھیں؟ آگے یوں ہوا کہ فرحت آپی کا ناول ختم ہوا تو ہالہ ملک کا شروع ہو گیا اور یہ تک ہالہ ملک ایک اچھی لکھاری تھیں لیکن اب وہ خواتین اور شعاع کے لیے ناپید ہو چکی ہیں۔ سوہا ملک کا ناول پڑھا؟ اس کے بعد شعاع کے عادی ہوئے اور یوں تب سے اب تک مسلسل شعاع آ رہا ہے اور ہم پڑھ رہے ہیں۔ بہت افسوس کے ساتھ کہوں گی کہ شعاع اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ یہ نہیں کہ یہ اب برا ہو گیا ہے۔ بلکہ اب شعاع کا کچھ ادھورا پن سا لگنے لگا ہے، پہلے سا مزہ محسوس نہیں ہوتا۔ ویسے اوور آل شعاع اچھا ہے۔ آتی ہوں اس ماہ کے شمارے کی طرف۔ سب سے پہلے بات کروں گی رسالے کی جان اور میرا پسندیدہ ترین ناول "دیوار شب" ریکویسٹ ہو گی۔ عمیرہ پلیز خیام کو مزید ٹھوکریں مت کھانے دیجیے گا۔ نمرہ احمد کا ناول "جنت کے پتے" بلاشبہ ایک زبردست اور یاد رہ جانے والا ناول ہے۔ بہت اچھا لگا ترکی کے بارے میں اتنا کچھ جان کر۔ ام طیفور کی "دیدہ ور" کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ البتہ "دو ٹکے کا کوئی" اور "تکمیل ختم" اچھی کاوش ہونے کے ساتھ تلخ حقیقت بھی تھی۔ "دل موم کا دیا" سائرہ رضا ویری ویل ڈن "بہت اچھا" بلکہ بہت بہت اچھا لکھا۔ گمگشتہ صبر اور الفت کی ہمیں بھی بہت اچھی مزاد جزا

بہت افسوس سے کہوں گی کہ فائزہ افتخار کا سنڈریلا والی وہی کہانی محسوس ہوتی ہے جو بچپن سے سنڈریلا کی دیکھتے آ رہے ہیں۔ پلیز فائزہ آپی اس کو جلدی ختم کر دیجیے گا۔ "تاریخ کے جھروکوں میں سے" مجھے بہت پسند ہے۔ پلیز اپنا شعاع یا خواتین کے کسی بھی سلسلے کو بند نہ کیجیے گا۔ اپنا میں نے آج سے قریباً پانچ سال پہلے 100 کراچی کے DJ عاطف مظفر، نشتی علی اور مظفر احمد کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی۔ اب تو FM نشتی اور مظفر احمد بھی نہیں رہے پر پلیز اب عاطف مظفر کا انٹرویو ہی ڈالیے۔ بیشتر اس کے وہ بھی ریڈیو چھوڑ جائیں۔ اپنا آپ سے ایک ناول کے بارے میں پوچھنا تھا اگر آپ کو معلوم ہو تو پلیز ضرور بتائیے گا۔ ہم نے مارچ 2005ء کے شعاع میں افشاں آفریدی کے ناول "مہیا دل" بھی عجیب شے ہے کی پہلی اور دوسری قسط پڑھی ہے۔ اپنا اس ناول کی تیسری اور آخری قسط نہیں پڑھ سکے۔ اس کہانی کا اینڈ مختصراً بتا دیں۔ اگر آپ کو یاد ہو کرداروں کے نام تیمور علی، جلال، زری، چھو، شہریار وغیرہ تھے۔ اگر آپ کے پاس اپریل 2005ء کا شعاع کا شمارہ ہو تو ہمیں دستیاب کیجیے۔

ج: پیاری انیلا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ بہت شکریہ۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ انٹرویو میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ انٹرویو دینا نہیں چاہتے اس لیے آپ کی فرمائش پوری کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ انیلا آپ اپنی کہانی دوبارہ بھجوا دیں۔ وہ اصلاح طلب تھی۔ پرانی کہانی کے بارے میں بتانا مشکل ہے۔ افشاں آفریدی کے ناول کا انجام ہمیں یاد نہیں۔ آپ کا خط شائع کر رہے ہیں کسی قاری بہن نے بھجوایا تو شائع کر دیں گے۔

صالحہ اور اقصیٰ میرپور آزاد کشمیر سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

ناول اچھا تھا۔ سب سے پہلے "دیوار شب" پڑھا۔ عمیرہ بڑی خوب صورتی سے اختتامی مراحل پر رواں دواں ہے۔ خیام نے زندگی میں بہت محرومیاں دیکھی ہیں اب اسے رمشہ سے محروم مت کیجیے گا۔ "مستانہ شام" بہت چل رہا ہے۔ نمرہ احمد بھی بہت خوب صورتی سے کہانی کو آگے کی طرف بڑھا رہی ہیں۔

ج: صالحہ اور اقصیٰ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صدف گل نے ملتان سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا یہ پرچہ ہماری بہت رہنمائی کر رہا ہے۔ اگر میں تعریف لکھنے لگوں گی تو بہت سارے صفحات بھی کم پڑ جائیں گے۔

اس خط کو لکھنے کی اصل وجہ نمرہ احمد کی کہانی "جنت کے پتے" ہے۔ آپی میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے اتاروں۔ خصوصاً ان لائنوں کو پڑھ کر "جب حیا مسجد میں بیٹھی ہوتی ہے اور ترک لڑکا آ بیٹھتا ہے" اف اس سکنے کا ایک ایک لفظ میرے دل میں ترازو کر گیا۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے بھی اللہ نے انگوٹھے جتنا نور دیا ہے جو جلتا بجھتا جلتا ہے۔"

ج: پیاری صدف! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

لیلیٰ خالد، موبل خالد اور صنوبر خالد نے ڈی جی خان سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

کیا ہی ٹائٹل تھا (ویل ڈن) سب سے پہلے ہم پہنچے اپنی موسٹ فیورٹ رائٹر یعنی کہ نمرہ احمد کے ناول کی طرف۔ نمرہ آپ کی تعریف کے لیے ہمارے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ پھر اپنا دوسرا فیورٹ ناول پڑھا یعنی عمیرہ کا "دیوار شب" اس میں سالار کا کریکٹر بہت بہت ہے۔ اور فائزہ افتخار آپ کا ناول بھی بہت اچھا ہے۔ (ایک نئی سنڈریلا) اور باقی افسانوں میں سب سے اچھا تکمیل ختم سمیرا حمید کا تھا اور آمنہ ریاض اور سائرہ رضا نے بھی اچھا لکھا۔

ج: لیلیٰ، موبل اور صنوبر! آپ تینوں بہنوں کو شعاع پسند آیا بہت شکریہ۔



عالیہ بخاری

خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ [illegible] بائی نگینہ نگار اور دلدار بائی نے اس کی پرورش [illegible] سے کی ہے پھر بھی وہ اس زندگی سے نفرت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے۔ [illegible] کرتا ہے۔ [illegible] ہو جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ [illegible] بھی اٹھا لاتا ہے [illegible] کوئی پریشانی نہیں ہے۔ سالار [illegible] خیام کو چھوڑتا ہے۔ [illegible] حیران کن ہے۔ [illegible] کئی روز تک [illegible] پڑتا ہے۔ وہ [illegible] کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ [illegible] کے ساتھ بھی [illegible] پیچھے رہ جانے والی [illegible] ہوتا ہے۔
رہبہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے [illegible] ہیں جبکہ بھائی معاذ [illegible] ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی [illegible] معاذ اور رہبہ کے لیے دعا گو ہیں۔

قسط نمبر 56



اس کی بکھری مسکراہٹ، آنکھوں کا گدلا پن اور چہرے کو چھوتے غلیظ ہاتھ۔

اور سب کچھ اتنا قریب کہ۔۔۔

بے جان ہوتے ہوئے ہاتھ پاؤں کے باوجود اس نے راہ فرار تلاش کرنا چاہی، مگر بے سود۔

وہ اس طرح کھڑا تھا کہ اگر وہ اٹھ کر کھڑی بھی ہوتی تو لامحالہ اس سے ٹکرا جاتی۔

"میں نے کہا تھا کہ اسے روک لو۔ چھوڑ دے اس کیس کا پیچھا، اسی میں سب کا بھلا تھا۔ مگر نہیں سمجھ میں آیا تم لوگوں کے۔ ٹکڑے سے بڑا وکیل۔ گواہیاں، ثبوت کوئی کسر نہیں رہنے دی سالار نے میرے گلے میں پھانسی کا پھندا فٹ کرنے کے لیے۔"

اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔ مگر لہجے کی ٹھنڈک میں بڑا دل بٹھا دینے والا احساس تھا۔

کیتی نے اپنی ساری ہمت کو جمع کرنا چاہا۔

"سالار نے صرف انصاف چاہا ہے۔ ذاتی دشمنی نہیں ہے ان کی کسی سے۔ ایک خونِ ناحق کا حساب مانگا ہے بس۔"

"اس نے صرف خود کو عذاب میں ڈالا ہے۔ سمجھیں۔" نبیل کے چہرے کی وہ مکروہ مسکراہٹ بھی ختم ہو گئی۔ "اور میری کھلی دشمنی مول لی ہے۔ کچھ نہیں بگاڑ سکا ہے وہ میرا۔ چار دن بعد جج ذاتی شہادتوں کی بنا پر کیس خارج کرے گا۔ خرید چکے ہم اسے۔ قصہ ختم۔"

اس نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑے۔ "چاہو تو سارے زمانے کو بتا دو، ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔"

اپنی فتح کی خوشی اس کے چہرے پر سرخی بن کر چھا رہی تھی اور چہرے کے نقوش عجیب سے انداز میں پھیل رہے تھے۔ ظلم، فرعونیت، کمینگی کی آخری حدوں کو بھی پار کر جانے والے اس طبقے کے ہر شخص کی شکل ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔

بھیانک۔ خوف زدہ کرنے والی۔

وہ اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر۔۔۔

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔" کیتی کی آواز میں نمایاں کپکپاہٹ تھی۔

"یہ بھی پتا چل جائے گا چند دن کی بات ہے، صرف کیتی آرا۔ اپنی فتح کا جشن میں بہت دھوم دھام سے منانے والا ہوں۔ ایک بڑا سیلیبریشن۔ جس میں پرفارمنس دکھانے کے لیے الماس بے قرار ہے۔ تیاریاں شروع کر چکی ہے وہ اور اس کی ماں گل ناز جان۔ تم چاہو تو نگینہ اور صندل کو بھی بلا لیتے ہیں... پیسہ دیکھ کر بھاگی چلی آئیں گی۔"

اس بار وہ ہنستے ہوئے جس طرح اس پر جھکا تھا، کیتی سہم کر بالکل کھڑکی سے جا لگی تھی۔

"راستہ دو۔" ناروا اچھالی گئی ذلت نے اس سے فی الوقت نگاہ ملانے کی بھی جرأت چھین لی تھی۔

نبیل نے دلچسپی سے اس کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو دیکھا۔ "ابھی سے اپنے آنسو ضائع مت کرو کیتی آرا۔ بہت موقعے ملنے والے ہیں تمہیں رونے کے لیے۔ اتنے کہ آنسو کم پڑ جائیں گے تمہارے پاس۔"

لاؤنج کے بوجھل سناٹے میں کھڑی کیتی آرا نے شدت سے خدا کو یاد کیا۔

"سالار نے جو کرنا تھا کر لیا۔ آج سے میرا اعلان جنگ ہے، سالار سے، تم سے۔ اور اس کمینے رنجو سے۔ کسی منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا میں تم لوگوں کو۔ گھر شہر کیا۔ دنیا چھوڑنے کی آرزو کرو گی تم اور تمہارا ایک ایک پل ہتک آمیز ہو۔"

کچھ دور کچن میں کوئی شیشے کا برتن چھناکے کے ساتھ گرا تھا۔ ایک ساتھ ہی بہت سی ملی جلی آوازیں اور قدموں کی چاپ۔

نبیل ایک جھٹکے سے مڑا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

لاؤنج پر چھایا وحشت کا آسیب سمٹ کر کیتی آرا کے دل میں براجمان ہوا۔

دونوں بازوؤں کو آپس میں پھنسائے، سہمی وہیں کاؤچ پر بیٹھی بری طرح کانپ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر ابا نے سر کرسی کی پشت سے ٹکایا۔

"سو ایک بار پھر ثابت ہوتا ہے کہ خود انسان کی زندگی سے بڑھ کر کچھ بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔"

"جس وقت وہ پہلی بار آیا۔ اس دن سے آج تک وہ میرے لیے پراسرار تھا۔ لیکن کبھی بھی اتنا نہیں جتنا کہ آج اپنی حقیقت کھلنے کے بعد۔"

ان کے سامنے بیٹھا معاذ بہت سنجیدہ تھا اور فکر مند بھی۔

"انسان اپنے ماضی سے مکمل طور پر کٹ کر، محض حال میں کیسے جی سکتا ہے ابا! ایسے جیسے کسی بغیر جڑ کا درخت۔ اور وہ کب سے اس تکلیف کو جھیل رہا ہے۔ اپنائیت کے ایک چھوٹے سے حوالے کے بھی بغیر۔ وہ دکھ جس کا کوئی ازالہ نہیں۔ اور بے قصور اس کے حصے میں آیا۔"

معاذ کی آواز دھیمی اور دکھ سے بوجھل تھی۔

"لوگ زندگی کی کتاب سے ان چاہے ورق، بے دردی سے پھاڑتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ ان پر لکھی تحریر ان مٹ ہے۔ مجھے یوسف کمال سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، جو کچھ اس نے خیام اور اس کی مظلوم ماں کے ساتھ کیا، وہ ظلم کی بدترین شکل ہے۔ ایک چھوٹے سے معصوم بچے کے ساتھ دنیا کی بھیڑ میں اکیلی کھڑی رہ جانے والی ماں کے بارے میں ایک بار بھی سوچو گے تو اس سارے سسٹم پر لعنت بھیجنے کو دل چاہے گا۔ جہاں مجرم کوئی اور ہے اور سزا کوئی اور بھگتتا ہے۔"

ابا کے لہجے کا دبا دبا سا غصہ نمایاں ہو رہا تھا۔ معاذ خاموشی سے ان کی طرف دیکھے گیا۔ یوسف کمال سے مل کر سیدھا وہ ابا کے پاس آیا تھا اور اسے حیرت ہو رہی تھی کہ آج کے دن کی دوسری مصروفیات یکسر فراموش ہو گئی تھیں۔

"پیسے کے بل پر بیٹی عشرت کو اپنے لیے جائز کرنے والے، عزت کے نام نہاد ٹھیکے دار، ایسے پتا نہیں کتنے بچے اپنے حصے میں آئے جہنم کو جھیلتے ہوں گے۔ یہ صرف خیام کا ہی رونا کب ہے۔"

"مگر سب لوگ ایک سے بھی تو نہیں ہوتے ہیں ابا۔ سالار نے بھی تو کیتی سے شادی کی پورے عزت و احترام کے ساتھ۔ کیتی بھابھی بھی اسی خاندان کا حصہ ہیں۔ یوسف کمال نے مجھے بتایا کہ وہ کیتی سے مل چکے ہیں لیکن اسے کچھ بتانے کی ہمت نہیں کر سکے۔"

"جو شخص اپنی اولاد کو اپنانے کی ہمت نہیں کر سکا اس سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ سالار جیسے صاحب کردار سے کیا مقابلہ ہے بھلا۔"

"اب آپ بتائیں کہ کیا کرنا چاہیے؟ خیام کو ایک دم یوسف کمال کے سامنے کھڑا کر دیا تو پتا نہیں وہ اس بات کو کس طرح لے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پھر کہیں اتنی دور نہ چلا جائے کہ ہم اسے ڈھونڈ بھی نہ سکیں۔"

"کل اسکول کی اوپننگ ہونے دو۔ پھر دیکھتے ہیں۔" معاذ نے غور سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔

"جو ہوا وہ کتنا بھی برا سہی، لیکن خیام کے لیے اب ایک خوشگوار تغیر بہت ضروری ہے۔ خدا کرے کہ وہ اپنے

باپ کو پورے دل کے ساتھ معاف کر سکے۔"
"جی بس!" معاذ ہلکے سے مسکرایا۔
جتنے بوجھل دل کے ساتھ وہ واپس گھر آیا تھا اس میں اب اضافہ تھا۔
ابا کے ساتھ بات کر کے ہمیشہ اسے ایسا ہی تجربہ ہوتا تھا۔ وہی تھے جو مشکل سے مشکل صورت حال میں بھی اس کی تسلی اور رہنمائی کا ذریعہ بنتے تھے۔
وہ اپنی اس خوش قسمتی پر بہت بہت شکر گزار رہا تھا۔ مگر آج خیام کی محرومی کو لے کر دل بہت بری طرح دکھا۔ ہوش کے پہلے قدم سے لے کر آج تک محرومی کی ایسی بدترین شکل۔
کس کس موقع پر وہ کس تجربے سے گزرا ہوگا۔
ابا نے اس کے چہرے پر آئی اداسی کو بجا طور پر محسوس کرتے ہوئے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"ہوتا ہے... اور ہوتا رہے گا۔ اللہ اسی طرح کی مثالوں سے اپنے بندوں کو آزماتا بھی ہے اور سمجھاتا بھی ہے۔ چلو تمہارے کرنے کے لیے آج بہت کام ہیں۔ سالار سے بات ہوئی؟"
"جی مختصر۔ آج کیس کی سماعت ختم ہوئی... چار دن بعد فیصلہ ہے۔ سالار خوش اور مطمئن تھے۔"
"خدا کرے کہ انصاف ہو سکے۔"
"آپ کو شک ہے کیا۔" وہ کمرے سے نکلتے نکلتے رکا۔
"اتنا کچھ دیکھ لینے کے بعد بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ یہاں انصاف آسانی سے مل جاتا ہے تو میری دعا ہے کہ اللہ تمہاری خوش فہمی کی لاج رکھے۔"
وہ افسردگی سے مسکرائے۔ معاذ چند لمحے خاموش کھڑا ان کی طرف دیکھتا رہا۔
"لیکن ابا! یہاں انصاف میں کتنی ہی رکاوٹ سہی قدرت کا نظام تو اپنی جگہ ہے۔ وہاں سے تو ہر فیصلہ پوری طاقت اور انصاف کے ساتھ نافذ ہوتا ہے۔"
"ہاں... ایسے چند فیصلوں کا میں کب سے منتظر ہوں پورے یقین کے ساتھ۔" وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔
اس بار معاذ نے کمرے سے نکلنے میں جلدی کی تھی۔ ابا چند لمحے وہیں کھڑے رہے۔
لوہے کے دروازے سے آتی دھوپ کی لکیر کے اس پار آج بھی گہری خیالی دھند کا راج تھا۔

✲ ✲ ✲

جویا نے اندر آتے ہوئے آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا مگر سلمان کے ہنسنے کی آواز پھر بھی اندر تک آ رہی تھی۔ کافی عرصے سے وہ عجیب ہسٹیریکل سے انداز میں ہنسنے لگا تھا۔ چوڑا منہ کھول کر، پھیپھڑوں کی پوری طاقت کے ساتھ۔ زویا کہتی تھی کہ وہ اس لیے خود اتنی زور سے ہنسنے لگا ہے تاکہ دنیا اس پر نہ ہنس سکے۔
آج اس طرح کے قہقہے لگانے کا جواز بھی ملا تھا۔ سو وہ حق بجانب تھا۔ پیچھے ٹیکسی رکنے کی آواز کے ساتھ ملی جلی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی تھی ذرا سا جھکی تو ٹیکسی سے اترتی آپا گل اور ان کے شوہر نظر آ گئے۔ آج ان کے ساتھ دونوں بچیاں بھی تھیں... بہت عرصے بعد ان دونوں کو دیکھا تھا۔ جویا کو وہ خاصی بڑی لگیں۔
جدید تراش کے سوٹ اونچی ایڑی کے جوتے۔
مٹھائی کا ڈبہ... پھولوں کا ہار اور آپا گل کا نیا جوڑا ابھی کل ہی سنا تھا کہ وہ ناراض ہو کر گئی تھیں۔ مگر آج انہیں فوراً ہی آنا پڑا... وہ بھی خوش خوش۔

کھڑکی بند کر کے وہ چپ چاپ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ کئی قدموں کی چاپ سیڑھیوں اور پھر صحن میں سنائی دینے لگی۔ مبارک سلامت کا ایک ملا جلا سا شور۔
وہ یونہی چپ چاپ بیٹھی رہی جانتی تھی کہ اس کا وہاں کوئی کام نہیں ہے۔
چند ہی منٹ بعد آپا گل کی دونوں بیٹیاں اس کے کمرے میں تھیں۔
"آپ یہاں بیٹھی ہیں ہم سمجھے شاید بازار گئی ہیں۔"
"نہیں... میں نے چھوڑ دیا ہے۔" وہ انہیں دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔
"اچھا کیا... اب تو آپ کی شادی بھی ہونے والی ہے... فرید انکل نوکری تھوڑی کرنے دیں گے آپ کو... امی بتا رہی تھیں کافی پیسے والے ہیں۔"
"تم لوگ آج بہت دن بعد آئیں یہاں؟"
"یہاں آ کر موڈ نہیں آتا... آپ کا پرانا والا گھر اچھا تھا۔ کتنی چیزیں تھیں وہاں... یہاں تو ہر وقت گرمی رہتی ہے۔ پتا نہیں آپ لوگ کیسے رہتے ہیں۔"
جویا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
یہ آپا گل کی بیٹیاں تھیں... ان ہی کی طرح منہ پھٹ اور سخت دل۔
"گرمی تو آج بھی ہے۔"
"مگر کم!" ان میں سے بڑی والی نے اپنے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے کیا۔ تب ہی جویا نے اس کے بے تحاشا بڑھے ناخن، نیل پالش اور چہرے پر بھی میک اپ کی تہ کو نوٹ کیا۔
وہ بڑی جلدی کافی بڑی ہو چکی تھیں۔
"پھر آج نانا ابو بھی تو رہا ہو گئے کتنے عرصے بعد۔ امی کہہ رہی تھیں نانا وغیرہ اب ایک بڑے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے والے ہیں۔ امی کہتی ہیں اب ہم پھر سے آیا کریں گے اور اب تو آپ بھی نہیں ہوں گی یہاں۔"
جویا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"کیوں، میرے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"
ان دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی مشورہ کیا۔
"کچھ نہیں... بس ایسے ہی... آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں... نانا سے بھی نہ ملیں گی کیا۔"
"میں مل چکی ہوں، جب وہ گھر آئے تھے۔" وہ اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ آگے مستقبل میں آپا گل کی بیٹیوں کو جھیلنا بھی اتنا ہی کٹھن ہونا تھا جتنا کہ آپا گل کو... اسے ابھی سے اندازہ ہوا تھا... وہ دونوں بھی بور ہو کر سامنے والی دیوار کے ساتھ جا کھڑی ہوئیں جہاں سے نیچے والوں کا صحن اور سامنے گلی نظر آتی تھی۔
زویا کچن میں چائے بنا رہی تھی... وہ اسی کے پاس چلی آئی۔ "میں بنا دیتی ہوں۔"
"نہیں بنا لوں گی، تم رہنے دو، سارا دن سے تھکی ہو۔"
"یہ تو روٹین کے کام ہیں زویا! کرنے ہی ہوتے ہیں۔" وہ وہیں اسٹول پر بیٹھ گئی۔
زویا چپ چاپ ٹرے میں رکھے کپوں میں چینی اور دودھ ملا رہی تھی۔
ابھی تھوڑی دیر میں چائے کا پکا ہوا قہوہ، دودھ، چینی کے اس مکسچر میں مل کر ایک مہکتے مزے دار سے ذائقے میں بدل جانے والا تھا... ساری کڑواہٹ دور۔
"کیا سیدھا سادہ سا فارمولا تھا، کاش..."
"تمہیں کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے جویا! تمہارے لیے سب کچھ روٹین ورک کا ہی حصہ

ہے۔ اپنے حصے کا بوجھ، دوسروں کا بوجھ، دوسروں کی ذمہ داری، یہاں تک کہ اپنی قربانی۔ کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم۔ خود کو بہت عظیم۔ اعلا سب سے الگ۔" ندا کی آواز دھیمی تھی مگر لہجہ بے حد تلخ۔ جویا نے یوں ہی ان سنا کرنا چاہا۔

وہ آج کل یوں ہی چلتے پھرتے باتیں سنانے لگی تھی۔ شاید اسے غصہ دلانے کے لیے۔

"سلمان بھائی، آپا گل شاید سب اتنے برے نہ ہوتے اگر تم ایک بار اپنے حق کے لیے کھڑی ہو جاتیں، تمہاری جیسے نے ان کی ہمت بڑھا دی۔ وہ اپنے زعم میں اتنا بڑھ گئے ہیں کہ۔" وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ سو خود کو کنٹرول کرکے چائے کے کپوں میں چمچ چلانے لگی۔

"ہم نے ان کے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا جویا! پھینک دیتیں ساری ذمہ داریاں ابا نے کندھوں سے، سلمان بھائی چاہے بھیک مانگتے۔"

"وہ بھیک بھی نہیں مانگ سکتے تھے ندا۔" اس بار اس نے تیزی سے ندا کی بات کاٹی تھی۔ ندا نے حیرت سے اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا۔

"بھیک مانگنا بھی بڑی مشقت ہے، سردی گرمی کو اپنے سر لینا، بھاگ دوڑ، جھڑکیاں۔ اور سلمان بھائی کو عورتوں کی کمائی کھانے میں کوئی شرم پہلے ہی سے نہیں تھی۔ وہ کیسے بھیک مانگتے۔"

اس کے کہے کسی ایک لفظ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"مگر پھر بھی۔ یہ فریدالدین تو حد ہے، بلکہ ظلم ہے۔ تم آواز کیوں نہیں اٹھا رہی ہو۔ میں ہوں نا۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے پتا ہے، میں اپنی قسمت سے نہیں لڑ سکتی ہوں ندا۔ پہلے یہ غلطی کر چکی ہوں۔ سارے گھر کو بھگتنی پڑ رہی ہے آج تک۔"

"گھر والوں نے اپنا کیا بھگتا ہے۔ ابا کا جیل جانا، آپا کا ایک ایک شے کا بک جانا، سلمان بھائی کی طلاق، یہ سب ان کے اپنے قصے ہیں۔ تم کیوں بہت سی باتوں کو ملا رہی ہو، چیزوں کو الگ رکھو۔"

"تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ لے جاؤ ورنہ پھر ابالنی پڑے گی۔" جویا نے نرمی سے اس کی توجہ دلائی تو وہ سخت برا مان گئی۔

"تم بھی چلو نا۔ وہاں بیٹھ کر فریدالدین کی تعریف سنو گی تو بہت اچھا لگے گا تمہیں بھی۔ ابو جب سے آئے ہیں اسی کا قصیدہ پڑھے جا رہے ہیں۔" ندا کہتی ہوئی تیز قدموں سے کمرے کی طرف چلی گئی۔

جویا اس کے ساتھ ہی کچن سے نکل کر آئی تھی۔

کمرے کے چوپٹ کھلے دروازے سے اظہار صاحب سامنے ہی بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ بڑی حد تک کمزور ہو چکے تھے۔ اتنے مہینوں کی سخت زندگی کے بعد ان کی ذہنی حالت بھی یقیناً متاثر تھی۔ وہ ان کے سامنے صرف چند منٹوں کے لیے گئی تھی۔ اسے آج بھی ڈر تھا کہ اسے دیکھ کر وہ اسی نفرت اور غصے کا اظہار کریں گے لیکن ان کی آمد کے اولین لمحوں میں جو جذباتی سی ہلچل تھی۔ اس میں وہ شاید اس پر دھیان نہ دے سکے تھے مگر یہ محض اس کا خیال تھا۔

"جویا سے پوچھ تو لیا ہے نا تم نے گل۔ اسے فریدالدین کے رشتے پر اعتراض تو نہیں ہے۔"

ندا جب اندر گئی تو وہ آپا گل سے پوچھ رہے تھے۔ ندا نے ایک نگاہ ان پر اور آپا گل پر ڈالی اور خاموشی سے چائے سرو کرنے لگی۔

آپا گل کو ان کی خراب صحت یا ذہنی حالت کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چند لمحے جو انہوں نے خاموشی کے لیے تھے وہ محض اپنا بیان ترتیب دینے کے لیے۔

اظہار صاحب ایک بار پھر اپنا سوال دہرا رہے تھے اور شاکرہ امی کی امید بھری نگاہیں ان پر جمی تھیں۔

"دیکھیں ابو! اب اگر جویا کو اعتراض ہوتا بھی ہے تو ہمارے پاس فریدالدین کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کو ہاں بھی آپ سے اجازت کے بعد ہی کی گئی تھی اور دوسرے آپ کی ضمانت بھی اتنی جلدی وہی کروانے والے ہیں۔ انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ آپ کے کیس میں گنجائش نکالی۔ ورنہ دوسرے وکیلوں نے تو صرف پیسہ ہی کھایا ہے۔" تازہ احسان کا تذکرہ سب سے ضروری تھا۔ "اور جویا کے انکار و اقرار سے کہیں زیادہ اب سوال گھر کی بچی کھچی عزت کو سنبھالنے اور سالوں پریشانیوں کو حل کرنے کا ہے۔ سو وہ سب بہت آسانی سے فریدالدین حل کر رہے ہیں؟"

اظہار صاحب کے اگلے کئی سوالوں کے جواب ایک ساتھ مل گئے تھے سو آگے پوچھنے کے لیے کچھ خاص رہا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے چائے کا کپ منہ سے لگا لیا۔

سلمان نے بہت غور سے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے تھے۔

"اور ابو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جو بڑی مشکل سے آپ کی ضمانت ہوئی ہے، کینسل ہو گئی تو۔ پورے پانچ لاکھ جمع کروائے ہیں فریدالدین نے۔"

"خدا نہ کرے۔" کپ اظہار صاحب کے ہاتھوں میں کانپا۔ جیل میں گزرا وقت کسی بڑے آسیب کی مانند دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

"میں نے تو بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ فریدالدین بھلا آدمی ہے۔ خوش رکھے گا جویا کو۔" چائے کا دوسرا گھونٹ انہوں نے پورے اطمینان سے لیا۔

ندا نے آخری کپ سلمان کے سامنے رکھا۔

"وہ شخص جویا کے جوڑ کا نہیں ہے۔ میں پھر کہتی ہوں کہ اس ظلم سے باز آ جاؤ۔ کیا بگاڑا ہے اس نے تم لوگوں کا۔" شاکرہ امی کی کانپتی ہوئی آواز پر ساری ہی گردنیں ان کی طرف مڑیں۔

"پانچ لاکھ کا بندوبست کرکے ہم اسے واپس کر دیں گے۔ اتنی بڑی رقم تو نہیں ہے یہ سب جس کے لیے۔"

"اچھا تو پہلے میرے کل دیے پندرہ سو روپے ہی دے دیں۔ جو میں نے مٹھائی بانٹنے میں کرایہ میں خرچ کیے ہیں۔"

آپا گل نے ڈھٹائی سے شاکرہ امی کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ تو انہوں نے بنا کچھ کہے تکیے کے نیچے دبے بٹوے میں سے پندرہ سو روپے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھے۔ "یہ لو۔ بس!"

"ارے کیا کر رہی ہو، واپس کرو امی کو۔ یہ کیا حرکت ہے گل!"

آپا گل کے میاں کچھ شرمندہ ہو کر منع کر رہے تھے مگر وہ وصول کرکے اپنے پرس کی زپ بند کر رہی تھیں۔

"آپ مت بولیں۔ یہ ہمارا آپس کا حساب ہے۔"

اکبر بھائی اپنا کپ اٹھا کر باہر نکل گئے۔

"چلو ایک قصہ تو ختم ہوا۔ ڈرو اس وقت سے آپا گل! جب امی تمہارے ہاتھ پر پانچ لاکھ روپے بھی رکھوا دیں۔ پھر تو تمہارے پاس دو ہی راستے رہ جائیں گے۔" سلمان بڑی کمینگی سے ہنسے جا رہا تھا۔

آپا گل کے ماتھے پر آیا بل اور بھی گہرا ہوا۔

"کون سے دو راستے؟"

"وہی خودکشی کرنے کے۔" وہ پھر سے ہنس پڑا۔ "اتنی جلدی بھول گئیں۔ صرف چوبیس گھنٹے میں۔ چ چ چ۔ عمر کے ساتھ تمہاری یادداشت بھی جواب دینے لگی ہے۔ جب ہی کہتا تھا کہ دماغ پر ہر وقت زور مت ڈالا کرو۔ خرچ

"ہو گیا تو پھر کہاں سے لاؤ گی؟"

وہ مستقل مذاق اڑانے کے موڈ میں تھا۔ اور اسے بالکل خیال نہیں آیا تھا کہ باہر بیٹھے اکبر بھائی بھی یہ سب سن رہے ہیں۔

تپاگل کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

اپنی عزت نفس انہیں بے حد عزیز تھی۔

"میں نے غلط نہیں کہا تھا جویا کی شادی فرید الدین کے ساتھ ہی ہوگی۔ اتنے شریف اور نیک انسان کے ساتھ وعدہ خلافی کر کے خدا کے غضب کو دعوت مت دو تم لوگ۔ پہلے ہی کیا کم مصیبتیں ہیں۔" وہ اونچی آواز میں بول رہی تھیں۔

زویا وہیں دروازے کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھی تھی۔

اس تاریک سیاہ منظر نامے میں روشنی کی کسی ایک کرن پھوٹنے کی خبر۔ مگر یہاں ہر آنے والا پل تیرگی کا احساس بڑھاتا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔ ارے کچھ میرا ہی لحاظ کر لو، کتنے عرصے بعد آیا ہوں تم سب کے بیچ۔" اظہار صاحب حسب عادت اونچی آواز میں بولنا شروع ہوئے تھے۔

"آپ سلمان کو نہیں دیکھ رہے، کتنا بدلحاظ ہو گیا ہے۔ ایک تو ہم نے یہاں اسے سر آنکھوں پر بٹھا رکھا ہے۔ ورنہ تو یہ گھر سے نکل کر کوئی ٹھکانا نہیں تھا اس کے پاس، بھوکا مرتا اگر اس کو ہم سہارا نہ دیتے۔"

"کچھ تو شرم کرو تپاگل۔" سلمان ایک دم سنجیدہ ہوا تھا۔

"میں تمہارا دیا نہیں کھا رہا ہوں۔ عمر بھیا کی کمائی پر پل رہا ہے اور خود تم بھی مہینے کے تیس دن اس گھر کی روٹی کھاتی ہو۔ اس لیے آئندہ مجھے تو یہ طعنہ دینا نہیں، سمجھیں۔"

اکبر بھائی دروازے کی چوکھٹ میں آکھڑے ہوئے تھے۔

"اور کتنی بے عزتی کرواؤ گی بہن۔ اب چلتی ہو یہاں سے یا میں اکیلا ہی چلا جاؤں۔"

وہ اٹھ کر چلے جاتے، لیکن سلمان نے بڑھ کر انہیں منا ہی لیا۔

"میرا اور تپاگل کا معاملہ ہے سلمان بھائی! آپ کی تو میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ لیکن آپ خود ایمان داری سے کہیں کہ میں غلط ہوں یا تپاگل۔"

اکبر بھائی نے جواباً ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر جھکا لیا تھا۔

"اچھا بس اپنا دل صاف کر لو۔ ورنہ کچھ بھی تسلی سے نہیں ہو سکے گا۔ اب کیا پروگرام ہے تمہارا تپاگل؟ میں اب حالات کی بہتری چاہتا ہوں۔ وہ بھی فوری طور پر، کر دو بس۔"

آہستہ آہستہ وہی ٹھوک بجانے والی کیفیت اظہار صاحب کے لہجے میں ابھر رہی تھی۔ جو صرف تپاگل کے حق میں جاتی تھی۔

تپاگل آنسو صاف کرتے ہوئے ہلکے سے مسکرائیں۔

"فرید الدین فلیٹ کی چابی لے کر آنے والے ہیں۔ تاکہ سب چل کر دیکھ لیں۔ میں اور اکبر تو کل رات دیکھ آئے ہیں۔ کشادہ اور ہوادار فلیٹ ہے اور اگلے سے اگلے جمعہ وہیں سے جویا کا نکاح اور رخصتی عمل میں آجائے گی۔ سادگی سے کیے گئے کام میں برکت بھی ہوتی ہے۔"

"بے شک، بے شک۔" اظہار صاحب کا لہجہ عقیدت سے بوجھل ہوا۔ زویا نے گردن موڑ کر باہر صحن میں دیکھا۔

وہ ابھی بھی وہیں کرسی پر بیٹھی تھی جہاں تو بھی دھوپ اور گرما لیے تھا۔ اس کے پیر دھوپ میں جل کر سرخ ہو رہے تھے اور وہ کم از کم اپنی کرسی کھسکا کر پیچھے تو کر ہی سکتی ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کر رہی۔

زویا نے بے چینی سے پہلو بدلا اور کمرے کا دروازہ برابر کیا۔ اب کم از کم وہ نظر تو نہیں آرہی تھی۔

"بس ہو گیا فیصلہ۔ اب اس پروگرام میں کوئی ردوبدل نہیں ہوگا اس کے بعد آخر زندگی کے کچھ اور بھی کام کرنے ہیں۔ میں کسی سے کوئی اعتراض نہیں سنوں۔" انہوں نے باری باری سلمان اور شاکرہ ای کی طرف دیکھا تھا۔

"ارے کیسے منہ بولوں 'ہاں ہاں' میں۔ اچھا لڑکا ہوتا تو میں کبھی منع نہ کرتی۔ جویا کے ساتھ اتنا برا مت کرو، سارا بوجھ، ساری ذمہ داریاں اٹھا کر چل رہی ہے میری بچی۔ کوئی حرف شکایت نہیں۔"

تپاگل نے بے ساختہ ناک چڑھایا۔ "اپنی گولیاں بھی تو نہیں کھاتیں کہ سو ہی رہیں۔ بس بولی جا رہی ہیں۔"

بیچ کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ چپچپاتی آنکھوں والا فرید الدین پورے حق کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا ہوا ٹھیک جویا کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"دھوپ میں کیوں بیٹھی ہو میری جان۔ سارا رنگ روپ جلا جا رہا ہے تمہارا۔" اس کے پاس رومانٹک ہونے کا حق کچھ پہلے آ ہی چکا تھا۔ سو وہ ٹھہرے ٹھہرے میٹھی آواز میں کہہ رہا تھا۔

جویا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے کرسی پیچھے کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ کچھ بوکھلا کر پیچھے ہوا۔

"بیمار ہو کیا؟ اتنی کمزور ہو رہی ہو۔" اس بار وہ بھی چونکا تھا اور اس تشویش میں اپنائیت نہیں، کچھ اور ہی احساس تھا۔

جویا نے بنا کچھ کہے وہاں سے گزرنا چاہا مگر وہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام چکا تھا۔

"دیکھنے تو دو خود کو۔ کتنے دن بعد دیکھا ہے اپنے سامنے۔ حالانکہ خوابوں میں تو روزانہ ہی ساتھ ہوتی ہو سجل بھر کر۔"

جویا کا ہاتھ پوری قوت کے ساتھ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ فرید الدین کے ہاتھ سے اس کا دوسرا ہاتھ خود بخود چھوٹ گیا تھا۔ پہلے تپاگل کی دیوار پر ٹنگی بیٹیوں نے مڑ کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے سامنے کے بند دروازے کو کھول کر تپاگل اور سلمان باہر آگئے تھے۔

"کیا ہوا خیریت۔ کچھ گرا کیا؟ بڑے زور کی آواز تھی۔" تپاگل نے ہڑبڑا کر ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔

جویا کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے اندر چلی گئی مگر ان چند سیکنڈوں میں ہی تپاگل نے اس کا موڈ بھانپ لیا تھا۔

"بیڑا غرق! پتا نہیں اب کیا کر کے چھوڑے گی۔" ایک ساتھ ہی بہت سارے دل دہلا دینے والے وہموں نے انہیں گھیر لیا تھا۔

"کچھ نہیں ایسے ہی بات کر رہا تھا، شرما گئیں۔" فرید الدین نے خود کو بروقت سنبھالا تھا لیکن اس وقت اگر وہ جلتے توے کو ہاتھ لگا کر بھی کہتا کہ کچھ نہیں تھا۔ تو تپاگل کو ایک فیصد بھی یقین نہیں آنا تھا۔

انہوں نے ایک نگاہ اپنی دونوں بیٹیوں پر ڈالی جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے منہ پر ہاتھ رکھے اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش میں عجیب مضحکہ خیز دکھائی دے رہی تھیں۔

"آپ یہاں دھوپ میں کیوں کھڑے ہو گئے فرید بھائی۔ اندر چلیں۔ یہاں تو سب آپ کا انتظار کر رہے تھے کب سے۔"

"ہاں دراصل میں گاڑی بھی لے کر آیا ہوں، تاکہ سب چل کر فلیٹ دیکھ لیں۔"

وہ ان کے ساتھ چلتا ہوا کمرے تک گیا۔ یہاں سب ہی دروازے میں آکھڑے ہوئے تھے اور اپنے اپنے طور

پر مطلب معنی اخذ کرنے میں مصروف۔
"تو بس چلتے ہیں۔ دیر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" تاپاگل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وقت کے بالکل مختصر سے وقفے میں وہ سارا منظر بالکل بدل کر رکھ دیں۔
"کون کون چلے گا بھئی؟" خود کو بشاش ظاہر کرنے کی وہ مسلسل کوشش کر رہی تھیں۔
افتخار صاحب، سلمان اور وہ خود اور وہ ان کی بیٹیاں مل کر ایک گاڑی کی سواری سے زیادہ تھے۔ اکبر بھائی دیکھ چکے تھے، سو صورت حال کو ذرا خاموشی سے نکل کر کچن میں جا چکی تھی۔
خاموش ساکت بیٹھی شاکرہ آپا سے پوچھنا کسی نے بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔
اس بچھڑنے سے قافلے کے ساتھ جاتے فریدالدین نے ایک بار پھر پلٹ کر تایا کے کمرے کی طرف دیکھا۔
اس کے چہرے پر الجھن تھی یا فکر۔
تاپاگل کی گھبراہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

نبیل کا گلاس ایک بار پھر بھرنے لگا تھا۔ زرتاج نے ایک تنبیہہ کرتی نگاہ نبیل پر ڈالی۔
"تم بہت پینے لگے ہو نبیل اور وہ بھی گھر میں۔ سالار نے دیکھ لیا تو پتا نہیں وہ کیا حشر کرے گا، یاد ہے نا ایک بار اس نے تمہارے دوستوں کے سامنے کیا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ نہ صرف کراکری بلکہ کمرے کا قیمتی فرنیچر اور کارپٹ پورے بکھروا دیے تھے۔"
زرتاج کے لہجے میں گھبراہٹ تھی "اندر سے لاک ہوئے کمرے" کو بھی انہوں نے ایک بار سے ڈبل چیک کیا تھا۔
نبیل نے ناگواری سے انہیں دیکھا اور ہاتھ میں تھاما ہوا گلاس ایک سانس میں پیتا چلا گیا۔
"تم بہت وہمی ہوتی جا رہی ہو زرتاج اور بزدل بھی۔ کچھ سال پہلے والا رعب دبدبہ کھو سا گیا ہے۔"
ایک ٹھنڈی سانس زرتاج نے دل کی گہرائیوں میں دبائی۔
"کیا ہوا؟" وہ ان کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوری کمینگی کے ساتھ مسکرایا۔
"کچھ نہیں۔" وہ اس کے قریب آ بیٹھی تھیں۔
سامنے رکھی میز پر دونوں پاؤں پھیلائے وہ پورے مالکانہ استحقاق کے ساتھ اس عالی شان بیڈروم میں بیٹھا تھا۔ زرتاج کو آج کل وہ زمانہ شدت سے یاد آنے لگا تھا جب انہوں نے نبیل سے نئی نئی شادی کی تھی۔
اس وقت وہ یکسر مختلف تھا۔
ہاتھ باندھے غلام "جو ان کے تھوکے کیا جوتے چاٹنے کو بھی تیار رہتا تھا۔ ایک آنکھ کے اشارے سے بندھا تھا اور اب بلی کی امانت کو چارہ لگانے والا محاورہ اب ٹھیک سے سمجھ میں آیا تھا۔
"لگتا ہے تمہیں مجھ پر سخت غصہ آ رہا ہے۔" مسکراتے ہوئے وہ سو فیصد درست اندازہ لگا رہا تھا۔
"نہیں تو۔ آج تو میرے لیے بہت خوشی کا دن ہے۔" خود پر بمشکل قابو پاتے ہوئے وہ مسکرائیں۔ "آخرکار اس منحوس کیس سے اب تمہاری جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ رہی ہے جس نے ہماری نیندیں اڑا رکھی تھیں۔"
"میری نہیں صرف تمہاری۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے ایسی چیزوں سے نمٹنا اچھی طرح آتا ہے۔" شراب اور اختیار دونوں کا خمار اس کے لہجے اور لفظوں میں اترا تھا۔
"یہ بات مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے نبیل۔" اس بار ان کی سرد مہری ظاہر ہو ہی گئی۔

نبیل نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً "ناراض تھیں اور انہیں مزید ناراض رکھنا بالکل بھی عقل مندی نہیں تھی۔
"مجبوری ہے۔ مجھے ایسا کرنا پڑا۔ لیکن یہ بہت ضروری تھا زرتاج۔ سالار بری طرح میرے پیچھے پڑا ہے اور اس بار تو اس نے میری گردن میں پھانسی کا پھندا فٹ کرنے کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ اگر تم ساتھ نہ دیتیں تو بات بہت بڑھ جاتی۔" وہ سرک کر ان کے قریب آیا۔
"میں تمہارا ساتھ ویسے بھی دیتی۔ اگر تم اتنے گھٹیا طریقے سے بلیک میل نہ کرتے۔ آخر اتنے سالوں سے بھی تو میں نے کبھی کسی مسئلے میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑا ہے۔ تو اس بار کیسے چھوڑ دیتی۔ مگر تم نے تو اپنا پھندا میرے بیٹے کے گلے میں فٹ کرنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ اور نہ ہی میں یہ کبھی بھولوں گی۔"
ان کی نگاہ نبیل کے چہرے پر جمی تھی۔
"اور وہ یقیناً" بالکل گدھا ہے۔ جو اس پہلی کامیابی پر اس سانپ جیسی آنکھوں والی عورت کی دشمنی مول لینے چلا ہے۔ "گلاس بوتل سب ایک سائیڈ پر رکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھا۔
"میں سنعان کے لیے برا نہیں چاہتا تھا زرتاج۔ لیکن میں سالار کے ہاتھوں شکست بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ یہ کیس پورا میرے خلاف جا رہا تھا۔ حالانکہ تم نے اسے دبانے میں لاکھوں روپیہ خرچ کر ڈالا تھا۔ پھر بھی یہ اپنی جگہ قائم رہا۔ یہ تو تم کو پتا ہے نا۔" وہ ان کا ہاتھ تھام چکا تھا۔
زرتاج نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا تو اس نے اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر لی۔ "میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں زرتاج۔ اپنی ساری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"
"میں کیسے یقین کر لوں اس بات کا نبیل جو شخص اپنی مصیبت کو ٹالنے کے لیے مجھے میرے ہی بیٹے پر قتل کا مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ ایک دس سال پرانے معاملے پر پولیس کانفرنس بلانے کے لیے تیار رہے۔ وہ کیسے آگے کی زندگی میں مجھ سے وفادار رہے گا۔"
"آگے ایسے کوئی مسائل نہیں آئیں گے ہماری زندگی میں۔ سنعان یہاں خوش باش رہتا رہے گا۔ اور ہم دونوں یہاں۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔ آئی سویر، بہت پیار کرتا ہوں میں تم سے زرتاج۔"
بہت عرصے بعد نبیل اس والہانہ محبت کا اظہار کر رہا تھا۔
زرتاج نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
نبیل ساتی۔
ان کی زندگی کے یہ دونوں اہم کردار کتنی گہری مماثلت رکھتے تھے۔ دونوں کی بدکرداری ثابت تھی۔ اور دونوں ہی کو بچانے کے لیے وہ جان مال پر کھیلی تھیں۔
"میرے اعصاب بہت تھک گئے ہیں نبیل۔ یہ سب آسان نہیں تھا۔ کروڑوں خرچ ہوئے ہیں اور ذہنی اذیت الگ۔ یہ کیس بھی بالکل ٹھنڈا جا رہا ہے۔ اوپر سے یہ سالار اور کیتی آرا۔ میری زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی ہے شاید۔"
انہوں نے تھک کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اور آنکھیں بند کیں۔ ان کے گلابی چہرے پر اب چھائیاں نمایاں ہو رہی تھیں اور چہرے اور آنکھوں کے گرد گہری ہوتی لکیریں اب کسی میک اپ کے نیچے چھپنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔
وہ اتنی نڈھال اور بیزار لگ رہی تھیں کہ نبیل کا ان کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہا۔ مگر اگلے چند سال اور

انہیں برداشت کرتا تھا اس نے بروقت خود کو یاد دلایا۔
"خود کو سب فکروں سے آزاد کر لو ابھی۔ اب میں سب سے نمٹ لوں گا۔ یہ اب سالار نواب کی بار اس طرح رسوا ہو کر یہاں سے جائے گا کہ ساری عمر اس شہر کا رخ بھی نہیں کرے گا۔ یقین کرو میرا۔ بس کچھ دن اور۔ تم یہ شکلیں بھی نہیں دیکھو گی اپنے آس پاس۔" مدھم آواز میں بڑی ہی مضبوط یقین دہانی تھی۔
زرتاج کی آنکھیں ایکدم کھل گئیں۔
"سچ کہہ رہے ہو!"
"تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی ان کی رسوائی کا تماشا!"
"کیا کرنے والے ہو؟" زرتاج کی آنکھوں اور چہرے پر خوشی کی چمک اتری۔ "کیا کرنے والے ہو تم ان کے ساتھ؟"
"وہ ابھی رہنے دو۔ ریلیکس کرو۔ جو تم چاہتی ہو اس سے بڑھ کر ہوگا۔ مجھ پر یقین ہے نا!"
زرتاج کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
"ہاں اگر ایسا ہو جاتا ہے نبیل! تو مجھے نہیں پتا کہ میں تمہارے لیے کیا کچھ کر جاؤں گی۔ سات خون معاف ہوں گے تمہیں میری طرف سے۔" "یہ دو نام، دو شکلیں گم ہو جائیں میری زندگی سے۔ بس۔ میں پھر سے جی اٹھوں گی۔"
"تو بس سمجھو کہ اب یہ شکلیں گم ہیں ہمیشہ کے لیے۔" ایک بھرپور یقین دہانی اس سخت اعصاب شکن دور کے خاتمے کا سبب بنی تھی۔
"وہ یقیناً ایسا کر گزرے گا" جو ان جیسی عورت کو سرپرائز کر چکا ہے۔"
پہلی بار انہیں نبیل کی اس کمینگی پر بھی پیار آیا جس سے وہ اور پہلے تک وہ سخت نفرت میں مبتلا تھیں۔
انہوں نے بڑی محبت سے نبیل کی طرف دیکھا۔ "آج رات ہم ایک شاندار سا سیلیبریشن رکھیں گے صرف ہم دونوں کے لیے اس گھر سے دور۔"
"میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔" نبیل کے چہرے پر بڑی بھرپور مسکراہٹ تھی۔
"پتا نہیں کون احمق ہوتے ہیں جو زندگی کو پریشانیوں اور مسائل کے دھارے پر چھوڑے رکھتے ہیں۔"
اور اس مضبوط ناموں ماحول میں پورے غرور کے ساتھ اب وہ زمانے پر ہنس سکتا تھا۔ دل کھول کر وہ ہنستا چلا گیا۔
زرتاج تیار ہونے چلی گئی تھیں۔
باہر لاؤنج میں سے آتی ہوئی قدموں کی آہٹ پر اس نے یوں ہی پلٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سالار کے فیملی ڈاکٹر اندر آ رہے تھے۔ سالار ان کے ساتھ تھا اور اس کی فکرمندی چہرے سے عیاں تھی۔
"کیا ہوا؟ یہ ڈاکٹر کیوں آیا ہے؟" زرتاج اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں۔
نبیل نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ "لگتی آرا بیمار پڑ گئی ہیں شاید۔" مذاق اڑاتا سا انداز۔
زرتاج بے ساختہ ہنس پڑیں۔ "ضرور تم نے ہی کچھ کیا ہے۔"
نبیل نے گہری سانس لی۔ زرتاج کا موبائل بج رہا تھا۔ وہ ابھی کھڑکی میں ہی کھڑی تھیں۔
"میرا فون دینا نبیل۔" "آج بہت اچھا دن ہے۔ ضرور کوئی اور بہت اچھی خبر ابھی میری منتظر ہے۔"
بنا پلٹ کر دیکھے انہوں نے کہا تھا۔
پر یقین مسرور کھنکتا ہوا لہجہ۔

نبیل نے ڈریسنگ ٹیبل پر بجتا ہوا فون بڑی لاپروائی سے زرتاج کو تھمایا تھا۔
مگر اس بار ان کا اندازہ بالکل غلط نکلنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

محرابوں والے آرائشی برآمدے کے نیچے گلی میں بھرپور جگمگاہٹ تھی۔
پھولوں کی تیز دل فریب مہک، کچھ فاصلے پر بیٹھکوں پر سنکتے کباب تکوں کی مزے دار سی خوشبو، تندور میں پکتی روٹیوں کی گرماہٹ سب ہی کچھ مل کر ہوا کے جھونکوں کو بوجھل کیے دے رہے تھے۔
نگینہ نے نیچے جھانکتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ گلناز الیاس کے دو پرانے ملازم ہوتے بڑے بڑے شاپر اٹھائے برابر کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اور نیچے سیڑھیوں کے ساتھ کھڑی گاڑیوں کی لائنیں مہمانوں کے اسٹیٹس کی گواہی دے رہی تھیں۔
وہی ایک سا منظر۔
"آہ!" ایک جلی جلی سی سانس نگینہ کے لبوں سے آزاد ہوئی اور اس نے دانستہ رخ موڑا۔
کوئی دن تھے جب گلناز کے چوبارے تلے کھڑی گاڑیاں اسے سر سے پیر تک جلا کر راکھ کر دیتی تھیں۔ گلناز کی اونچی کمائی اور عیش و عشرت بھرا طرز زندگی کا اپنی مشقت بھری پھٹکار زدہ زندگی سے موازنہ ہر سال ان کے آنسو رلاتا رہا۔ مگر اب نہیں۔
فرق اس کا اور گل ناز کا نہیں تھا۔ طلعت ستارہ اور رعنائی بولدار کا تھا۔
تصویر کے دو انتہائی مختلف رخ۔
فن کی میراث کو زندگی کا سرمایہ سمجھنے والی طلعت ستارہ کا فلسفہ زندگی اب کہیں جا کر اس کے سمجھ میں تھوڑا تھوڑا آنے لگا تھا۔
پانی پر تیرتے اس پتے کی طرح جس کا ایک رخ تر اور دوسرا خشک۔ اس ماحول کا لازمی حصہ بن کر بھی وہ بالکل الگ تھلگ تھیں۔
معاشی بدحالی کے بدترین دور میں بھی انہیں اس کا ایکسٹرا میں ڈانس کرنا قبول تھا۔ مگر اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ ان کا سارا سرمایہ افتخار آج بھی ان کا کلاسیکل بیک گراؤنڈ تھا۔ رقص، موسیقی، اعلیٰ پائے کے اساتذہ کا کلام۔ آج بھی اگر وہ فیروزہ کے صدمے سے نہیں نکلی تھیں تو وہ صرف ایک بیٹی کی جدائی کا رونا نہیں تھا۔ ایک اعلیٰ پائے کی فنکارہ کا مٹی میں مل جانا بھی تھا۔
گلی کے سارے گھروں کی بالکونیاں، دریچے، رنگ بھری روشنیوں سے جھلملائے جا رہے تھے۔
نیم تاریک برآمدے میں کھڑی نگینہ نے خالی خالی نگاہوں سے اطراف کو دیکھا۔
وہ سب جو اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھیں۔
اور وہ بھی جو خاموشی سے گمنامی کے اندھیروں میں اتر گئیں۔ سب کی زندگیوں کے اپنے جواز، اپنی مجبوریاں، اپنے دلائل۔
اور کون ہے اس بھری دنیا میں جو سوال اچھالنے کی جرأت کر سکے۔
وہ تلخی سے مسکرا دی۔
محلہ رائج الوقت آئٹم نمبروں سے گونج رہا تھا۔
وہ نمبر جن کا بجنا اس گھر میں آج بھی ممنوع تھا اور جنہیں سن کر طلعت ستارہ کانوں کو ہاتھ لگاتی تھیں مگر یہی سب

یہاں کی خوشحالی کی گارنٹی بھی ہوتے تھے۔

اس نے ان سب کو کبھی بھی دل سے بُرا نہیں سمجھا تھا۔ یہ وہ طریقہ زندگی تھا' جو معاشرے کی بھرپور سرپرستی میں رائج تھا۔ رواں دواں تھا۔ پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ۔ اپنی اچھائی اور برائی رویوں کو اپناتے ہوئے' زمانے کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر ان کے گھرانے کی طرح بیچ بیچ کی جینے والی زندگی سے شاید کہیں بہتر۔

"کہیں اماں ساری زندگی ایک منافقانہ طرز عمل پر تو کاربند نہیں رہیں..... کیا ان کا کبھی دل نہیں چاہتا ہوگا کہ وہ بھی بیٹے کی اپنی دلہن کو دیکھیں جو ہر آنے والے کے مہرے سے سرے پر ان کی بہن دیکھتی ہیں۔"

ایک ہی بد کمالی تھی جیسے نانی ستارہ کا نیولر سے بے حد محبت کرنا۔

تھی اور صندل پر خیام کو ترجیح بھلا نہ ہو جیسے۔

اپنی ہوس میں اٹری باتوں کی لڑیوں کو اس نے کان کے پیچھے کرتے ہوئے خود کو شرم دلائی۔

"پیسے کا تو اماں نے وہ عروج دیکھا ہے کہ آج بھی وہ کسی کو نصیب نہیں ہے۔ بڑی بات ان کے اصول۔ ان کا صبر' روایت سے جڑے رہنے کی مضبوطی ہے..... اور جو بھی ہے ان ہی کی جوتیوں کا صدقہ۔" اس کا دل ایک دم ہی بھر آیا۔

ہتھیلی سے رگڑ کر آنکھیں خشک کیں اور واپس اندر حرکت گئی۔ صندل "استاد فراغت بیگ" کے کمرے میں بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ آج وہ بڑی دیر سے ان کے پاس بیٹھی نہ جانے کون سے مسائل حل کر رہی تھی۔

نگینہ کو یہ کر اچھا لگا..... کم از کم اپنی خود ساختہ تنہائی سے تو باہر آ رہی تھی۔

نانی ستارہ نے نکلتے ہوئے دروازے سے نگینہ کو اندر آتا دیکھ کر اپنی حساب کتاب کی کاپی تکیے کے نیچے سرکائی۔

"بہت دیر بعد دکھا تمہیں' کہاں تھیں شام سے؟"

"آج بہت دن بعد گھر سے نکلی تھی نا اماں..... آتے آتے تھک گئی۔ ذرا دیر کے لیے لیٹی تو پھر آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھی ہوں۔"

سادہ سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ ان کی پائنتی کی طرف بیٹھی۔

نانی ستارہ نے ذرا غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی تھکن کے آثار تھے۔

آج وہ اسٹوڈیو گئی تھی۔ کام کے سلسلے میں اپنے پرانے تعلقات کو چیک کرنے کے لیے۔

"کچھ نہیں کیا بنا؟" نانی ستارہ نے اس کے چہرے سے اندازہ لگانا چاہا۔

"لوگ اب صندل کی ماں کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں اماں۔ کہتے ہیں کہ صندل نے کچھ عرصے میں خاصا نام بنا لیا ہے بظاہر عزت دے کر ملے۔ مگر کام کے لیے منہ سے بھاپ تک نہ نکالی۔"

"تم خود سے خواہش کا اظہار کر دیتیں۔ اس میں کوئی برائی نہیں..... آرٹسٹ تو ساری عمر آرٹسٹ رہتا ہے اور جن کے بچے فیلڈ میں کام کر رہے ہیں۔ کیا وہ ماں باپ گھر بیٹھ گئے ہیں....."

نانی ستارہ کو اس کا ہار کا سا انداز اچھا نہیں لگا۔ نگینہ کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری۔

"ٹھیک کہتی ہیں آپ..... میں تو سوچ رہی تھی کہ اگر انڈسٹری والے نہیں پوچھ رہے تو بہتر ہے کہ ٹی وی کا رخ کیا جائے۔ آج کل وہاں کام بھی زیادہ ہو رہا ہے اور معاوضہ بھی اچھا مل رہا ہے۔ مگر میں کون سی اتنی زیادہ رہی ہوں۔" نانی ستارہ نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

"یہ بھی اچھا ہے۔ سالار سے بات کرتی ہوں۔ اس کے ریڈیو ٹی وی پر تعلقات بھی بہت ہیں۔"

"نہیں اماں۔" وہ ان کے خاموش ہوتے ہی تیزی سے بولی۔ "سالار سے نہیں..... اچھا نہیں لگتا۔ پتا نہیں گیتی کو شرمندگی ہو میرے کام پر..... سالار بھی تو آخر بیاہا آدمی ہے۔ کوئی اسے حوالہ دے..... میں خود ہی کچھ کر لوں

ہوں۔"

اس کے چہرے اور انداز میں اضطراب تھا۔ نانی نے ہمدردی سے اس کو دیکھا۔ وقت کے ساتھ وہ بھی تو بدلی تھی۔

مصلحتوں' جوانوں کو ٹھوکر پہ ساری زندگی رکھنے کے بعد گیتی کی شادی ایک خاموش سے بدلاؤ کا سبب بنی تھی۔

"گیتی سے بات ہوئی تمہاری؟"

"نہیں..... وہ تین دن پہلے ہوئی تھی۔ میں خود زیادہ نہیں کرتی۔ بے خیالی میں کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکل جائے اور وہ بے چاری ہماری وجہ سے پریشان ہوتی رہے۔"

"ٹھیک تو ہے۔" نانی نے دھیرے سے کہا۔ "مگر پھر بھی کبھی سوچتی ہوں کہ اگر سالار ہمارا کوئی مستقل بندوبست کروا دے تو..... مگر ہمت جواب دے جاتی ہے کچھ کہتے ہوئے۔"

"میں تو دعا کرتی ہوں کہ اللہ صندل کو عقل دے کہ....." صندل کو آتا دیکھ کر انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" وہ قریبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ آج بہت دنوں بعد اس نے خود سے گھر والوں میں کوئی دلچسپی ظاہر کی تھی۔ پہلے استاد جی اور اب.....

نگینہ ہلکے سے مسکرا دی۔

"ایسے ہی ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے!"

مگر وہ اس سے نہیں نانی ستارہ سے مخاطب تھی۔

"آپ نے کیا میرے سلسلے سے کوئی بات کی تھی؟"

"نہیں تو' حالانکہ میرا ارادہ تھا مگر نگینہ نے منع کر دیا۔" نانی ستارہ نے فی الفور نگینہ کو بچانا چاہا۔

کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی چھائی۔

نگینہ کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ شاید اسے یہاں سے اٹھ جانا چاہیے تھا۔

مگر وہ فی الفور اس کا ارادہ بھانپ چکی تھی۔

"مجھے آپ سے بات کرنا ہے امی۔" اس کا لہجہ اور چہرہ دونوں ہی بے تاثر تھے۔

نگینہ کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ "ماں صدقے' کیا بات کرنا ہے۔"

"آپ بلال کے پاس گئی تھیں۔ میری طرف سے معافی مانگنے اور درخواست کرنے کہ کوٹھی کی فروخت کے پیسے میں سے کچھ پیسہ دے دے مجھے معاف کر دے۔ اگلی فلم میں مجھے چانس دے دے۔" اس کی نگاہ نگینہ کے چہرے پر جمی تھی۔

"کون بدذات کہتا ہے کہ میں وہاں گئی تھی۔ یوں ہی جھوٹا الزام لگا رہا ہے۔ ہے کون؟ نام تو بتاؤ؟"

اس کا بھولی سی ایکٹریس ہونا کام آیا تھا۔ مگر وہ ثبوت لیے ہوئے تھی۔

"مجھے خود بلال نے فون کر کے بتایا ہے۔"

نگینہ کے لب خم ہوئے اور نگاہ نے صندل کے چہرے سے نانی ستارہ کی طرف سفر کیا۔

وہی تھیں جو اسے صندل کے پھٹ پڑنے والے غصے سے بچا سکتی تھیں۔

"اور آج آپ نے پھر اسٹوڈیو کا رخ کیا تھا۔ کام مانگنے کے واسطے۔"

صندل کی انکوائری ختم نہیں ہوئی تھی۔

"ملنے گئی تھی پرانے لوگوں سے..... گھر میں پڑے پڑے دل گھبرا رہا تھا' مجھے کیا ضرورت تھی کام مانگنے کی۔ ساری عمر کام ہی کیا ہے۔ اب تو دل بھر گیا ہے میرا۔"

نگینہ نے خود پر قابو پالیا تھا۔ سو اس الزام کی سنگینی کو کم کرنا آسان ہوا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ گئی تھیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ اس کے چہرے سے ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ناراض ہے یا نئی ستارہ ملنے سے کنفیوز ہے۔

"چلو اگر گئی بھی تھی تو کیا جرم کر دیا اور کام بھی اگر کرے گی تو اس میں کیا برائی ہے۔ آخر کتنی آئی ہیں پہلے بھی ٹی وی پر دیکھو تو ساری پرانی اداکارائیں نظر آتی ہیں۔ آج کل وہ خود اپنے وقت کی نامور ہیروئین تھیں۔ آج بھی وہی کیریکٹر رول کر رہی ہیں۔ تو نگینہ بھی کرے گی تو کون سا فرق پڑنے والا ہے۔"

"فرق تو بڑا ہے نا! اور یہ آپ بھی جانتی ہیں اور امی بھی۔ ناموروں کی اپنی دنیا ہوتی ہے، وہ جہاں جاتے ہیں اپنی دنیا ساتھ لے جاتے ہیں۔ کوئی سوال کوئی انگلی نہیں اٹھتی۔ لیکن امی بے چاری۔"

نگینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ خود کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں اترتی نمی نگینہ سے چھپی نہ رہ سکی۔

"مجھے پتا ہے کہ اب آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی۔" اس نے ہتھیلی سے رگڑ کر آنکھیں خشک کرنا چاہیں۔

"کسی اور کا نہ سہی نگینہ کا خیال کر لیں۔ بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ وہاں شہر میں عزت نام کما کر بیٹھا ہے اس کا شوہر۔ کیا کہیں گے لوگ۔ یہ ہے سالار کی ساس۔"

نگینہ کا سر خود بخود جھکا تھا۔

"مجھے پتا ہے کہ آپ قصوروار نہیں ہیں، میں ہی ناشکری ہوں مگر نگینہ بہت کرتی ہے، امی اتنا خود پر اٹھائے گئے سوال نہیں برداشت کر سکے گی۔ رو رو کر جان ہلکان کر لے گی یا پھر۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو تو اپنی زندگی جی لینے کا حق ملنا ہی چاہیے نا امی!"

صندل نہیں روئی، وہ گم سی تھی اور چہرے پر پانی کے چمکتے چند قطرے۔

☆ ☆ ☆

سالار نے گیتی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

بخار ابھی بھی تیز تھا۔

تھوڑی دیر پہلے دی جانے والی دوا کا اثر ابھی پوری طرح نہیں ہوا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے برف ملے پانی میں سے اس نے دوسری پٹی نکال کر اس کے ماتھے پر رکھی۔ گیتی کی آنکھیں تھوڑی سی کھلیں۔

سالار محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہلکے سے مسکرایا۔

گیتی کی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"اب ایک آنسو نہیں بس۔ آج رو رو کر کتنا تیز بخار چڑھا چکی ہو پہلے ہی۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر خود کو پرسکون نہیں رکھو گی تو بخار آسانی سے اترنے والا نہیں ہے۔" اس پر جھکتے ہوئے وہ کچھ نرمی سے سمجھا رہا تھا بالکل ہی رائیگاں جا رہا تھا۔

گیتی کی آنکھوں سے ایک نہ ختم ہونے والی برسات جاری تھی۔ سالار نے بہت تشویش سے اس کے بھیگے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ آج جب وہ کورٹ سے واپس آیا تھا تو وہ اسے تیز بخار میں جلتی ہوئی ملی تھی اور اسے دیکھتے ہی وہ جس طرح اس کے کندھے سے لگ کر روئی تھی۔ سالار اب تک اس کے لیے کوئی وجہ نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔

اور وہ خود سے کچھ بتانے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی۔

"خود کو سنبھالو گیتی۔ تھوڑا سا کچھ کھا لو۔ آج سارا دن گزر گیا ہے۔ تمہیں کھائے پیے بغیر۔"

فی الحال آنسوؤں کا سبب پوچھنے کے بجائے وہ اس کی طبیعت کی بحالی کی فکر میں لگا ہوا تھا۔
کیتی نے چونک کر دیکھا۔ وہ بے حد فکرمندی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"ایسے ہی ہمت ہارتی رہو گی تو طبیعت اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔ اپنا نہ سہی میرا ہی خیال کرو پلیز۔ میں کہاں برداشت کر سکتا ہوں تمہاری ذرا سی بھی تکلیف یار۔"
اس کی آنکھوں اور لہجے میں محبت کا یقین اور شہر لو تھا اور اس کی موجودگی کا احساس سکون آمیز!
اس سخت اعصابی تناؤ میں بھی کیتی نے دل کو ٹھہرا ہوا محسوس کیا۔
"آپ نے بھی تو نہیں کھایا ہے۔ جب سے آئے ہیں میری پریشانی میں لگے ہوئے ہیں۔" وہ شرمندہ سی ہوئی۔

"تمہاری پریشانی میں تو میں ساری عمر بخوشی لگا رہوں گا۔ بس تم میرے پاس رہو۔ میرے لیے کافی ہے۔ بہت شکر گزار قسم کا انسان بن چکا ہوں میں تم سے شادی کے بعد۔" کیتی کے ماتھے سے خنک ہوتی پٹی کو ہٹاتے ہوئے وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"بس اب اور نہیں!" کیتی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہ رہی تھی۔ "آپ کھانا کھالیں پہلے پلیز اور اس طرح مت کیا کریں کہ اگر میں ذرا سا بیمار پڑ جاؤں تو اپنا خیال بھی نہ کریں۔"
"میرا خیال رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس لیے بیمار پڑنے سے پہلے سوچ لیا کرو کہ میرا کیا حال بن سکتا ہے تمہارے بغیر!"
اس کے پیچھے تکیے رکھتے ہوئے اس نے تیزی سے کیتی کی بات کاٹی تھی۔
"ایسا تو نہ کہیں نا!" کیتی نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ "بیمار تو آدمی کبھی بھی پڑ سکتا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ بھی۔"
وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتا ہوا انٹر کام پر کچن میں کچھ کھانے کی ہدایت دے رہا تھا۔
کیتی چپ چاپ اس کی پشت کو دیکھے گئی۔
"کتنا بھلا اور پیارا شخص تقدیر نے اس کی قسمت میں لکھا تھا اور جو ابا" وہ اس کے لیے کیا تھی۔
تہمت، بدنامی، ذلت، بدنصیبی۔
نچلے ہونٹ کو دانت تلے سختی سے دباتے ہوئے اس نے ان گھٹی گھٹی سسکیوں کو اندر ہی کہیں اتارا۔ وہ پھر سے اس کے پاس آکر بیٹھ چکا تھا۔
"کیا دیکھ رہی ہو۔" محبت سے کیتی کے چہرے کو چھوتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔
کیتی نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔ سالار نے بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔
اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ آج ہمیشہ سے زیادہ پریشان اور دکھی تھی۔ مگر وہ پوری کوشش سے مستقل نظر انداز کیے جا رہا تھا۔
پچھلے کئی دنوں سے وہ اسی طرح فکرمند اور آنکھوں میں آنسو لیے کئی بار نظر آئی تھی۔ مگر کچھ بتانے کے لیے تیار بھی تو نہیں۔
مگر آج تو کچھ زیادہ ہی۔
"اب میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا کیتی! اس وجہ کو میں خود ڈھونڈ نکالوں گا۔ جو تمہارے لیے دکھ کا سبب بنی ہے۔ میری محبت کا تقاضا بھی ہے اور اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض بھی کہ اس نے تمہاری نگہبانی مجھے سونپی ہے۔" گہری خاموشی کے ساتھ اس نے خود کو یاد دلایا۔ کیتی نے خود پر جمی اس کی نگاہ سے کنفیوز ہو کر ذرا سا رخ

موڑا تھا۔
دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ ملازم کھانے کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔
سالار ٹرے لے کر اندر مڑنے لگا تھا کہ وہ جھجکتے سے بولا۔
"آپ سے کچھ بات کرنی تھی سر!"
"ہاں کہو!" سالار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"کچھ ہوا ہے سر۔ میرا مطلب ہے کہ زرتاج میڈم اور نبیل صاحب گھبرائے ہوئے ہیں۔ پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں یہی بات آپ کو بتانا چاہ رہا تھا۔"
یہ ایک خاموش طبیعت اور وفادار ملازم تھا۔ جس نے کچھ بھی مالک کے علم میں لانا ضروری سمجھا تھا۔
"شکریہ تمہارا اجمل! ابھی دیکھ لوں گا کیا ہوا ہے۔ اگر کوئی بھی آتا جاتا ہے تو مجھے آکر بتا دینا۔" اس نے نرمی سے ملازم کو ہدایت دی اور دروازہ بند کر کے اندر چلا آیا۔
"کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں۔ آج عدالت میں دلائل ختم ہو گئے ہیں۔ چار دن بعد فیصلہ آنا ہے۔ شاید اس لیے مخالف کیمپ میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اجمل یہی بتا رہا تھا کہ زرتاج میڈم اور نبیل بڑے پریشان ہیں آج۔ چھوڑو تم کھانا کھاؤ۔ یہ ہمارا درد سر نہیں ہے۔ جس نے جو ظلم کمایا ہے۔ وہ اس کے انجام سے کیسے بچ پائے گا۔" وہ سو فیصد پر یقین تھا۔
کیتی خاموش نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔
"آپ کو لگتا ہے کہ اسے ضرور سزا ملے گی!"
"ہاں ایک سو دس فیصد! سارے ثبوت اس کے خلاف ہیں۔ روزی نبیل کی دوسری منکوحہ تھی۔ یہ بات ثبوت کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے اور اس کا پچھلا ریکارڈ بھی اس کی بدکرداری اور غنڈہ گردی کے واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ وہ انتہائی گھٹیا درجے کا شخص ہے۔ ہم نے سنا نہیں کہ اس نے زری کو آپی کی سمن کو کئی بار فروخت کرنے کی کوشش کی۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ۔"
"نبیل کی کمینگی کے اور کتنے ثبوت درکار تھے آخر؟ اور اس جیسے کتنے بھیانک لوگ معاشرے میں دندناتے پھرتے ہیں۔ کھلے عام انسانیت کی یوں تذلیل کرتے ہیں کہ روح کانپ اٹھتی ہے۔!"
کیتی کا اس سارے سسٹم پر چیخیں مار کر رونے کا دل چاہا! جہاں قانون کی سرپرستی میں ہر ظلم روا ہے۔
سالار اس کی پلیٹ میں کھانا نکال رہا تھا۔
"ظالم ہمیشہ ضرورت سے زیادہ بے خوف ہوتا ہے اور اسے کبھی نہیں لگتا کہ کوئی اس سے بھی پوچھنے والا ہے۔ یہ خدا سے منکر لوگوں کا شیوہ ہے کیتی۔ ظلم کرنے کے لیے بڑھنے والے ہاتھوں سے کہیں پہلے ان کے دلوں سے خدا کا خوف نکل چکا ہوتا ہے ورنہ اتنے بڑے پہاڑ کیسے ڈھائے جا سکتے ہیں۔" کچھ جذبات سا ہو کر وہ ذرا خاموش ہوا۔ روزی کی معصوم ہنسی، بھولا بھالا چہرہ اور للواتی شاید وہ زندگی بھر بھی بھولنے والا نہیں تھا۔
"مبارک ہیں وہ لوگ جن کے دل میں رائی برابر بھی خوف خدا ہے۔" سالار کی آواز دھیمی پڑ رہی تھی۔
"اور وہ اس بے حد پیارے شخص کو اس دکھ سے کیسے بچا سکتی ہے۔ جو وہ چار دن بعد نبیل کو کسی سڑک کے فٹ پاتھ پر آزاد دیکھ کر جھیلے گا۔" حلق میں اٹکتے نوالے کو پانی کے ساتھ کیتی نے بمشکل اتارا تھا۔
"نظر چند دن اور۔ جتنی بھی بھاگ دوڑ کر لیں یہ لوگ نبیل اب بچنے والا نہیں ہے کسی بھی صورت۔!"
"دھکا چکا ہے!" کیتی نے خود کو کہنے سے روکا تھا۔

"فیصلے کے بعد راجو زری کو لے کر اپنے گاؤں چلا جائے گا۔ اور میں تمہیں لے کر اپنی سسرال۔ بہت دن ہو گئے وہ ہیں تو سوچتی ہوں گی کہ میں تمہیں لے کر فرار ہو چکا ہوں۔ کہیں دور۔" وہ مسکرا رہا تھا اور اس کا دل رکھنے کے لیے گیتی بھی۔

"بس اتنا ذرا سا۔" وہ اسے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے دیکھ کر اس کی پلیٹ میں مزید کچھ ڈالنے لگا تھا، مگر گیتی نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"بس واقعی اب اور نہیں، پھر کھاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے پھر چائے پیتے ہیں۔" اسے کھانے کے بعد چائے کی عادت تھی۔

وہ گیتی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہ رہا تھا، لیکن بار بار اپنے ذاتی کاموں کے لیے ملازموں کو نیچے اوپر کی دوڑ لگوانا بھی اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا۔

سیڑھیوں پر اسے اترتے دیکھ کر عبدل تیزی سے اس کے قریب آیا۔ "آپ نے کیوں تکلیف کی سر میں اوپر آ کر لے جاتا۔"

"کوئی بات نہیں عبدل۔ بہت شکریہ تمہارا۔ اب ذرا چائے لے آؤ پلیز!" وہ کہتا ہوا مڑنے لگا تھا کہ کسی عجیب سے احساس نے اسے رکنے پر مجبور کیا۔

کون تھا جو گھٹے گھٹے سے انداز میں رو رہا تھا۔ بہت بے قراری کے ساتھ؟

"میڈم زرمگ کے بیٹے کا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا ہے لندن میں۔ مجھے نبیل صاحب کے ملازم نے بتایا ہے، ابھی ابھی۔ بتانے ہی آ رہا تھا میں آپ کو۔"

"کیا؟" سالار نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ملازم کا سر جھٹکے سے اثبات میں ہلا تھا۔

"او خدا!" وہ چند لمحے عجیب متضاد سی کیفیت میں گھرا وہیں کھڑا رہا۔

"مامی!"

جسے اس نے آخری بار تب دیکھا تھا، جب وہ ایک نو عمر سا لڑکا تھا۔ بے حد لاڈلا "خود سر" اپنی ماں کی شہ پر ہر کسی کی بے عزتی کرنے والا۔

وہ جب زرمگ اس سے مالی کے جوتے پالش کروانے اور کپڑے استری کرنے سے لے کر ہمیں کی جھوٹی پلیٹ کی بخشش کیا کرتی تھیں اور وہ تیز تیز دھڑکتے دل کے ساتھ خوف میں گھرا ہر وہ کام کیے جاتا تھا جس کا حکم تھا۔ پھر بھی بری طرح پٹتا تھا۔

ایک طویل عرصے بعد اچانک ہی زندگی کے اس تاریک ترین دور نے لاؤنج کی سیڑھیوں پر اسے گھیرا۔

وہ سارا وقت مجبوراً بھولنے سے بھی یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رونے کی وہ آواز اب بلند ہو رہی تھی۔

سالار نے ایک گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کیا اور نیچے اتر گیا۔ لاؤنج کے بڑے صوفے پر بیٹھی ہوئی زرمگ کی روتی ہوئی حالت اسے کچھ فاصلے سے ہی نظر آ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔ لوح چہرے کی کرختگی میک اپ بہہ جانے کے بعد اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ نبیل ان کے قریب کھڑا موبائل پر کوئی نمبر ملا رہا تھا۔

"کتنی دیر ہو گئی۔ تم سے ایک سیٹ کنفرم نہیں کروائی جا رہی ہے۔ وہاں پتا نہیں کیا قیامت گزری ہے۔" سالار نے انہیں چلاتے ہوئے سنا تھا۔

وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب آ کر ٹھہرا۔

"آپ چاہیں تو میں آپ کی ابھی پہلی فلائٹ سے سیٹ کنفرم کروا سکتا ہوں۔"

زرمگ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ یقیناً" کروا سکتا تھا! "اس وقت وہ اتنی پریشان تھیں کہ پہلا خیال انہیں یہی آیا تھا۔

"مجھے پاسپورٹ دے دیجیے۔ میں آپ کے جانے کا انتظام کروا دیتا ہوں جلد سے جلد۔" نبیل کو قطعی نظر انداز کر کے وہ صرف زرمگ سے مخاطب تھا۔

وہ اس کے باپ کی بیوی رہ چکی تھیں اور سالار اس کے باپ کی ہی اولاد تھا۔

صرف یہی ایک سوچ سالار کو مدد کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر رہی تھی۔

زرمگ نے اپنا چہرہ خشک کرتے ہوئے ایک لمحے کو کچھ سوچنا چاہا۔

تب ہی نبیل بڑھ کر ان دونوں کے بیچ آ کر کھڑا ہوا تھا۔

"ہمارے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا سمجھتے ہو جھوٹی ہمدردی دکھا کر احسان کرو گے۔ دفع ہو جاؤ!" سالار کی اٹھی ہوئی انگلی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"مت بھولو کہ کسی کو بھی دفع ہونے کا کہنے کا حق صرف میرا ہے اس لیے کہ یہ میرا گھر ہے۔"

زرمگ ہسٹریکل ہو رہی تھیں۔ "یہ گھر میرا ہے۔ میرے سالار کا ہے اور کسی کا نہیں۔ وہ آ گیا تو تمہیں دھکے دے کر باہر نکال دے گا۔ سب کچھ چھین لے گا، کچھ نہیں چھوڑے گا تمہارے پاس وہ۔ اب بس اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آؤں گی۔ تم نے سمجھا کیا ہے خود کو سالار، نفرت ہے مجھے تم سے تمہاری بیوی سے، برباد ہو گے تم لوگ —"

ان کی چیخوں سے گھر گونج رہا تھا۔ سالار خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"خود کو سنبھالو زرمگ۔ دیکھو تمہیں ابھی سفر بھی کرنا ہے اس طرح کیسے۔" خود نبیل کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

"انہیں نکالو یہاں سے نبیل۔ میں ان کی شکلیں نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"کل کے بعد یہ خود اپنی شکلیں نہیں دیکھنا چاہیں گے۔ کاش آج تمہیں نہ جانا پڑتا تو تم دیکھتیں کہ اس اسکول ایڈمنٹ میں کیسے منہ چھپانا پڑے گا سالار کو۔"

اس نے اپنی ہی بات سے بھرپور مزہ لیا تھا۔

زرمگ نے کچھ سنا تھا اور کچھ نہیں بھی۔

"مجھے فون دو میں خود بات کر لیتی ہوں۔ مجھے جانا ہے آج ہی۔" انہوں نے جھپٹنے کے سے انداز میں نبیل سے فون چھینا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



بشریٰ احمد

بھول بھلیاں

"توبہ! تم لڑکیوں کو دوستیاں گانٹھنے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ تمہاری سہیلیوں کا حلقہ تو دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔"

ابھی ابھی غالب بھائی اسے اس کی ایک سہیلی کی برتھ ڈے پارٹی سے لے کر لوٹے تھے اور گھر آکر اپنی حیرت کا اظہار کررہے تھے۔ وہاں "تقریباً" درجن بھر لڑکیوں سے تحریم نے یہ کہہ کر تعارف کروایا تھا کہ یہ اس کی بہت اچھی سہیلیاں ہیں۔

اس کی بچپن کی سہیلیوں سے تو غالب بھائی بخوبی آگاہ تھے۔ اس کی بیسٹ فرینڈ ارشین تو گویا اب ان کے گھر کا ایک فرد ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا گھر بھی قریب تھا اور وہ دونوں کلاس فیلو بھی تھیں۔ تحریم کا آدھا دن اس کے گھر گزرتا تو ارشین کا باقی آدھا دن۔ مگر جب سے تحریم کالج گئی تھی، اس کی بہت سی نئی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ اگرچہ بیسٹ فرینڈ کا رتبہ ابھی بھی ارشین کو ہی حاصل تھا لیکن ارشین نے گھر کے قریب ترین کالج میں داخلہ لیا تھا جبکہ وہ اپنے اچھے نمبروں کی بنیاد پر شہر کے بہترین کالج میں داخلے کی اہل ٹھہری تھی جو گھر سے "نسبتاً" فاصلے پر واقع تھا۔ پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری غالب بھائی کے کندھوں پر آن پڑی۔

چھوٹی اور اکلوتی لاڈلی بہن کی اچھی تعلیم کے پیش نظر وہ یہ ڈیوٹی بخوشی نبھا رہے تھے لیکن مسئلہ تب پیدا ہوتا جب تحریم اپنی نئی نئی سہیلیوں کے ہاں جانے کی ضد کرتی۔ جانے کیوں لڑکیوں کو اپنی سالگرہیں منانے کا اتنا خبط ہوتا ہے۔ ہر ہفتے تحریم اپنی کسی سہیلی کی برتھ ڈے پارٹی میں مدعو ہوتی۔ اماں ابا کی طرف سے انہیں لڑکیوں کے گھر جانے کی اسے قطعی اجازت نہ تھی۔ ہاں اگر غالب بھائی ساتھ جانے پر تیار ہوجاتے تو وہ انہیں منا کے اجازت دلوا ہی دیتیں۔ غالب بھائی بھی چھوٹی بہن کی خوشی کے پیش نظر اسے ساتھ لیے لیے پھرتے البتہ گھر آکر کانوں کو ہاتھ ضرور لگاتے تھے۔

"مجھے تو لگتا ہے آدھے شہر کی تو ممی لڑکیوں سے تو دوستی گانٹھ ہی چکی ہوگی۔"

"ہاں آدھی لڑکیوں سے میں اور باقی آدھی لڑکیوں سے ارشین۔"

تحریم کھکھلائی تھی۔ ارشین اس سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ اس نے بھی ہنستے ہوئے اس کی بات کی تائید کی۔

"ہاں میری طرح ان کے گھر میں بھی ایک کاٹھ الو بستا ہے نا۔" غالب بھائی ہنس پڑے تھے۔ ان کا اشارہ ارشین کے بھائی احمر کی طرف تھا۔ وہ بے چارہ بھی بہن کا ستایا ارشین کو موٹر سائیکل پر بٹھائے ادھر ادھر گھمانے پر مجبور تھا۔ کبھی کسی سہیلی سے نوٹس چاہیے ہوتے تو کبھی کسی کی والدہ کی عیادت تو کبھی کسی کی بہن کی منگنی میں شرکت۔ دونوں سہیلیوں کی سوشل ایکٹیویٹیز کی کوئی حد نہ تھی۔

ارشین کا بھائی احمر اس سے ڈیڑھ برس چھوٹا تھا تو کبھی کبھار زچ ہو کر انکار بھی کرتا لیکن تحریم شکر کرتی کہ غالب بھائی بالکل نخرا نہیں کرتے اسے اس کی سہیلیوں کے ہاں لے جاتے ہیں۔ وہ بہت مخلص لڑکی تھی اپنی تمام سہیلیاں اسے بہت عزیز تھیں۔

کامیابی سے تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے یونیورسٹی جا پہنچی۔ بہت سی سہیلیاں بچھڑ گئی تھیں، حتیٰ کہ سہیلیاں مزید بن چکی تھیں۔ پرانی سہیلیوں سے وہ ٹیلی فون پر رابطہ قائم رکھتی تھی۔ اس کے نزدیک دوست بنانے سے زیادہ دوستی نبھانا اہم ہے۔ البتہ وہ اور ارشین قریب قریب گھر ہونے کی وجہ سے دوستی کے ایسے اٹوٹ بندھن میں بندھی ہوئی تھیں کہ گزرتے ماہ و سال بھی ان کی دوستی پر کوئی فرق نہ ڈال سکے۔

ارشین پڑھائی میں بس درمیانے درجے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس نے بی اے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہا اور گھر بیٹھ کر امور خانہ داری میں مہارت حاصل کرنے لگی۔ اسے خود تو شادی کا شوق تھا ہی، گھر والے اسے پیا دیس سدھارنے کے لیے اس سے زیادہ بے تاب تھے۔

رانیال اشرف، ارشین کا دور پرے کا کزن تھا۔ وہ ہی اس کا نصیب ٹھہرا۔ تحریم نے ارشین کی شادی میں دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اپنی مشکل ترین پڑھائی کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس نے چند دن صرف اور صرف ارشین کے نام کر دیے۔ کبھی اس کے ساتھ بازاروں کی خاک چھان رہی ہوتی۔ کبھی اسے لیے بیوٹی پارلر کے چکر کاٹتی۔ اس کے جہیز کے کپڑوں کی پیکنگ، مایوں، مہندی کے لیے ارشین کے گھر کے ہال کمرے کی منفرد سی سجاوٹ... غرض ارشین کی شادی کا ہر کام تحریم کی بدولت پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اس کی رخصتی پر تحریم نے اتنے نیر بہائے کہ دلہن بنی ارشین کو خود اسے چپ کروانا پڑا۔ بہرکیف ارشین رخصت ہو کر لاہور سے سیکڑوں میل دور شجاع آباد جیسے چھوٹے شہر میں جا بسی۔

مہینوں بعد وہ میکے آئی تو ماں، باپ، بہن بھائیوں سے مل کر جھٹ تحریم کے گھر کا رخ کر لیا۔ تحریم کا ماسٹرز مکمل ہو گیا تھا اور آج کل وہ گھرداری سیکھنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

ثاقب بھائی کی چند سال پیشتر شادی ہو چکی تھی۔ ان کی بیگم [illegible] بھی بہت اچھی تھیں۔ انہوں نے ہی اپنی پیاری سی نند کے لیے اپنے خالہ زاد کزن کا انتخاب کیا تھا۔ شرجیل... مکینیکل انجینئر تھا۔ [illegible] بھابھی کے انتخاب کو سب نے سراہا۔ خوبرو شرجیل، تحریم کے دل میں بھی اتر گیا۔ اس نے خوشی خوشی شرجیل کے نام کی انگوٹھی ہاتھ میں پہن لی۔ شادی چند مہینوں بعد ہونا طے پائی تھی۔ اس نے ارشین کو فون کھڑکا دیا کہ وہ شادی سے کم از کم چند روز پہلے اس کے پاس رہنے آ جائے۔

"چند روز پہلے؟" ارشین اس کی بات سن کر عجیب سے انداز میں ہنس پڑی۔

"کیوں اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ تمہاری بیسٹ فرینڈ ہوں۔ تمہاری شادی پر میں نے بازاروں کے چکر کاٹ کاٹ کر اپنی جوتیاں گھسا دی تھیں۔ اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں ہر صورت آنا ہے۔" اس نے مان بھرے لہجے میں دعویٰ جتلایا۔

"تمہارا احسان تسلیم ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ جس وقت جو تمہاری حیثیت تھی، اس میں اور میری موجودہ حیثیت میں بہت فرق ہے۔ اگر تمہاری شادی مجھ سے پہلے ہوتی تو یقیناً میں اسی جوش و خروش سے شرکت کرتی جس طرح تم نے میری شادی میں کی لیکن اب میں ایک ذمہ دار اور مجبور شادی شدہ عورت ہوں۔ اگر میں نے تمہاری شادی میں شرکت کے لیے ہفتہ بھر بھی پہلے جانے کی اجازت مانگی تو میرے سسرال والوں کے علاوہ میرے سرتاج محترم بھی مجھے ایسی حیرت سے تکیں گے کہ جیسے میں نے کوئی بہت انوکھی بات کر دی ہو۔ بہرحال میں کوشش کروں گی کہ شادی سے ایک دو دن پہلے پہنچ جاؤں۔" ارشین کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا ارشین؟ رانیال بھائی تمہارے ساتھ اچھے ہیں نا؟ تمہارا خیال تو رکھتے ہیں؟" اسے اپنی فکر چھوڑ کر ارشین کی فکر دامن گیر ہو گئی۔

"ہاں ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ رانیال بھی بہت اچھے ہیں۔" ارشین نے فوراً لہجے میں بشاشت پیدا کر کے اسے تسلی دی۔

آخر کار اس کی شادی کا وقت بھی آن پہنچا۔ اس کی آنکھیں منتظر رہ گئیں مگر اس کی بچپن کی سہیلی جو اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی، شادی میں شرکت کے لیے نہ پہنچی۔ البتہ اس کی یونیورسٹی فیلوز نے خوب رونق لگائی۔ ان میں سے کوئی ارشین کی کمی تو پوری نہ کر سکی تھی۔

اسے ارشین سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ اس کی مجبوری سمجھ چکی تھی۔ اس کے شوہر کو بیوی کے احساسات سے کوئی غرض نہ تھی۔ اس نے محض ایک سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے بیوی کو اتنی دور بھیجنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ ارشین نے اپنی امی کے ہاتھ اسے شادی کا تحفہ بھجوا دیا تھا اور اس کے سیل فون پر معذرت کا ایک میسج بھی۔

"شادی شدہ عورت کے لیے دوستی نبھانا بہت مشکل ہے تحریم! میری مجبوری سمجھ کر معاف کر دینا۔"

اور اس نے ارشین کو تو معاف کر دیا تھا مگر رانیال کا خوب ہی [illegible] چلا۔ ایسی جاہلانہ فطرت کے مرد زہر لگتے تھے اسے۔ شکر ہے شرجیل ایسا نہ تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی اسے اس کی نرم طبیعت کا اندازہ اچھی طرح ہو گیا تھا۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ دونوں میں ایک بات مشترک تھی کہ دونوں کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا بلکہ اس بات کی طرف ثاقب بھائی نے ہی توجہ دلوائی تھی کہ کسی سے زیادہ بارات شرجیل کے دوستوں پر مشتمل تھی اور شادی کے بعد دعوتوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خاندان والے تو پھر بھی جلد نمٹ گئے تھے، شرجیل کے دوستوں کی طرف سے دعوتوں کا سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہ آ رہا تھا۔ آخر کار اس نے تنگ آ کر کہہ ہی دیا۔

"پلیز شرجیل! فی الحال باقی دوستوں سے معذرت کر لیجیے۔ میرا معدہ مرغن کھانے کھا کھا کر اپ سیٹ ہو گیا ہے۔ اب گھر کا پکا ہوا ہلکا پھلکا کھانے کو دل کرتا ہے۔" شرجیل اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔

"خبردار لڑکی! ایسی کسی بات کی میرے دوستوں کو بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ دعوتیں تو ہمیں ہر صورت اٹینڈ کرنی ہیں۔ میرے دوستوں نے مجھے وارننگ دے رکھی ہے کہ میں شادی کے بعد بدل گیا تو وہ میرا حشر نشر کر دیں گے۔"

شرجیل کے انداز پر وہ بھی ہنس دی تھی۔ وہ واقعی دوستیاں نبھانے والا شخص تھا۔ اس کے دوست وقت، بے وقت آتے رہتے اور وہ ان کی بھرپور خاطر مدارت کا سامان کرتا۔

تحریم کی چھوٹی نند سامعہ نے تو اس کی شادی کے بعد باقاعدہ شکر منایا تھا کہ اب بھائی کے دوستوں کی خاطر تواضع کے لیے بھابھی آ گئی ہیں ورنہ اس کے بقول پہلے اسے کچن سے نکلنا ہی نصیب نہ ہوتا تھا۔ تحریم کو خیر شرجیل کے دوستوں کی خاطر مدارت سے کوئی الجھن نہ ہوتی تھی۔ شرجیل کے اکثر دوست چائے پر آتے اور کھانا کھا کر جاتے۔ تحریم نے خوشی خوشی کچن کی ذمہ داری سنبھال لی تھی بلکہ اس نے تو شرجیل کے اکثر دوستوں کی بیگمات سے خود بھی دوستی گانٹھ لی تھی۔ اس کی یہ بات نے شرجیل کو بہت خوش کیا۔

تحریم کو خود ایسے ہنس مکھ اور دوستانہ مزاج رکھنے والے میاں سے عشق سا ہو گیا تھا۔ زندگی اسے بہت خوب صورت لگنے لگی تھی اور چند مہینوں بعد ننھے مہمان کی آمد کی خوش خبری کیا ملی، شرجیل خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ وہ تحریم کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔

ننھے شافع کے آنے کے بعد تو گویا زندگی بالکل مکمل ہو گئی تھی۔ شافع دو مہینے کا تھا کہ شرجیل کے چچا زاد بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے اسے ملتان جانا پڑا۔ اس کی ساس جوڑوں کے درد کی وجہ سے لمبا سفر نہ کر سکتی تھیں۔ چھوٹی نند کے پیپرز تھے۔ وہ خود بھی گرم موسم اور چھوٹے بچے کی وجہ سے سفر سے گھبرا رہی تھی لیکن اویس، شرجیل کا نہ صرف کزن تھا بلکہ بہت اچھا دوست بھی۔

شرجیل کو دوستی کا مان تو رکھنا تھا۔ وہ تحریم اور شافع کو لے کر شادی سے تین دن پہلے ملتان پہنچ گیا تھا۔

شادی والا گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔
شانع کو رش کی عادت نہیں تھی۔ سو نہ صرف خود بے آرام ہو رہا تھا بلکہ رو رو کر تحریم کو بھی پریشان کر رہا تھا اوپر سے بلا کی گرمی اور لوڈشیڈنگ کا عذاب۔ چچا کے گھر جنریٹر کا انتظام تو تھا مگر جنریٹر پر ایئر کنڈیشنر نہیں چلتا تھا۔ حبس اور گرمی نے مہمانوں کو عاجز کر دیا تھا۔
چچا کے گھر والے خود تہیہ کر رہے تھے کہ آئندہ کسی بچے کی شادی کے لیے ان مہینوں کا انتخاب نہیں کریں گے۔ سر دست شادی تو کسی طرح ختم ہی گئی اور جس دن ولیمہ تھا اتفاق سے اسی روز اس کے سیل فون پر ارشین کی کال آ گئی۔
مدتوں بعد اس کی سہیلی نے اسے یاد کیا تھا۔ شانع سے پہلے تحریم خود مہینے میں ایک آدھ بار اس کو فون کر کے اس کی خیر خیریت لے لیتی تھی لیکن یہ بات بھی تھی کہ شانع کے بعد وہ اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اتنی مصروف رہتی کہ گھر والوں کو فون کرنے کا ٹائم نہ ملتا ارشین کا نمبر تو بعد میں آتا تھا۔ آج غیر متوقع طور پر ارشین کی آواز سنی تو بے ساختہ خوشی کا احساس ہوا۔
"شانع کے بعد تو تم نے بھلا ہی دیا ورنہ مجھے اطمینان تھا کہ چلو تمہاری بدولت ہماری دوستی یک طرفہ طور پر سہی پر قائم تو ہے۔ ہم تو سسرالی جھنجھٹوں میں ایسے پھنسے ہیں کہ اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔"
ارشین لمبے چوڑے سسرال کو بھگتتے بھگتتے عاجز آ چکی تھی اور برملا اعتراف کرتی تھی کہ ان دونوں کی دوستی کا سلسلہ صرف تحریم کی وجہ سے قائم ہے۔
"شانع نے ہی تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہم ملتان گئے ہوئے ہیں شادی میں اور یہاں کی گرمی میرے بیٹے سے برداشت نہیں ہو رہی۔" اس نے ارشین سے اپنی پریشانی شیئر کی۔
"تم ملتان آئی ہوئی ہو۔" ارشین تو سنتے ہی گویا اچھل پڑی۔
"چار دن ہو گئے ہیں آئے ہوئے اور ابھی دو تین دن مزید رہنا ہے۔" اس نے کوفت زدہ ہو کر جواب دیا۔ ملتان میں دور پرے کے کافی رشتہ دار بستے تھے اور ان کی ساس کا اصرار تھا کہ سب سے مل کر آنا ہے۔
"تم میرے اتنے قریب آ کر مجھ سے ملے بغیر جاؤ گی۔ شجاع آباد آخر ملتان سے دور ہی کتنا ہے۔"
ارشین اس کے ملتان میں موجود ہونے پر پرجوش ہو گئی تھی۔ دونوں کو ملے ہوئے اتنا عرصہ بھی ہو گیا تھا۔ وہ ارشین کی بات پر ایک لمحے کو چپ ہو گئی تھی کہ اس کے اپنے ذہن میں بہت بار یہ بات آئی تھی کہ وہ ارشین سے بھی ملنے جائے لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے ارشین سے رابطہ نہیں کیا کہ کہیں اس کے سسرال والے اس سے اور شرجیل سے بے رخی سے پیش نہ آئیں اور ارشین بے چاری کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ ارشین نے اپنے سسرالیوں کا کچھ ایسا نقشہ کھینچ رکھا تھا سو اس نے دل کی خواہش دل میں دبالی تھی مگر اتفاق سے آج ارشین کا خود ہی فون تھا۔ وہ اسے پر زور طریقے سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہی تھی۔
"لیکن راحیل بھائی اور تمہارے سسرال والے کہیں وہ..." اس نے متذبذب ہو کر کہنا چاہا۔
"خدا کا نام لو تحریم! راحیل اب اتنے بھی برے نہیں۔ میرے کہیں آنے جانے کے خلاف ضرور ہیں لیکن گھر آئے مہمانوں سے بہت عزت و احترام سے پیش آتے ہیں اور تو اور میرے سسرال والے مہمانوں کو فل پروٹوکول دیتے ہیں۔ سب دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں یار! مہمانوں کو تو اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں۔ تم کسی خدشے کو ذہن میں مت لاؤ۔ میں ابھی سے تمہاری کل کی دعوت کی تیاری شروع کر رہی ہوں۔ کل دوپہر کا کھانا تم نے یہاں ہی کھانا ہے بلکہ صرف دوپہر کا نہیں تم نے رات بھی یہیں رکنا ہے۔ تمہیں گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے نا تمہیں ساتھ والے گاؤں کی بھی سیر کرواؤں گی جہاں ہم لوگوں کی زرعی زمینیں ہیں۔" ارشین نے جھٹ پورا پروگرام ترتیب دے ڈالا۔
"رات رکنا تو خیر مشکل ہو جائے گا۔ بس ہم دوپہر کا کھانا تمہارے ہاں کھائیں گے اور شام کو واپس آ جائیں گے۔" تحریم نے پروگرام میں رد و بدل کر کے اسے آگاہ کیا۔
"اچھا ٹھیک ہے بابا! تم آؤ تو سہی۔ شرجیل بھائی کو میں خود منالوں گی۔ وہ تمہیں رات رکنے دیں گے۔" ارشین بہت پرجوش ہو رہی تھی۔ تحریم ہنس پڑی۔
"شرجیل کی اجازت کا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ تو ایک رات چھوڑ مجھے دو راتیں تمہارے ساتھ گزارنے کی اجازت دے دیں گے لیکن ہمارے پاس وقت کم ہے۔ یہاں ملتان میں شرجیل کے بہت سے ننھیالی عزیز بھی رہتے ہیں۔ ان سب سے مل کر جانا ہے۔" اس نے رسانیت سے آگاہ کیا۔
"اوکے چلو۔ ٹھیک ہے۔ لیکن کل کا پروگرام تو پکا ہے نا۔" ارشین نے اس کی مجبوری سمجھ لی تھی۔
"ہاں ہاں ان شاء اللہ۔"
اس نے اسے یقین دہانی کروا کر فون بند کر دیا کہ اسٹیج پر تصویر کھنچوانے کے لیے اس کے نام کی پکار پڑ رہی تھی۔ ولیمے کے فنکشن سے فراغت کے بعد اس نے شرجیل کو کل کے پروگرام سے آگاہ کیا تھا۔
"تم نے مجھ سے پوچھے بغیر پروگرام فائنل کر دیا۔" شرجیل نے اچنبھے سے پوچھا۔
"تو آپ نے کوئی منع تھوڑی کرنا ہے۔" وہ مان بھرے لہجے میں بولی۔
"منع کرنے والی بات ہو گی تو ضرور منع کروں گا۔ میں اتنی دور اور اتنی گرمی میں خجل خوار ہو کر کسی ایرے غیرے سے ملنے نہیں جا سکتا۔"
شرجیل کے سپاٹ سے انداز پر اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ شاید موسم کی گرمی اس کے دماغ پر بھی چڑھ گئی تھی ورنہ وہ تو بہت دھیمے لہجے میں بات کرنے والا شخص تھا۔
"ارشین میری بیسٹ فرینڈ ہے شرجیل! بچپن، لڑکپن اور پھر جوانی... ہماری عمر کا بڑا حصہ ایک دوسرے کے ساتھ گزرا ہے۔ وہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہے اور پھر اتنے خلوص سے اس نے مجھے انوائٹ کیا ہے میں کیسے اسے انکار کرتی۔" اس نے شرجیل کو رسانیت سے سمجھانا چاہا تھا۔
"دیکھو تحریم! بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تم اب ایک میچور شادی شدہ عورت ہو۔ اپنے بچپنا اور لڑکپن وغیرہ کی دوستیوں کو بھلا کر تمہیں ذمہ دار بیوی اور ماں ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔ دوستیاں نبھانا لڑکیوں کے لیے شادی سے پہلے کے چونچلے ہو سکتے ہیں۔ شادی کے بعد ایسی دوستیوں کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے ہامی ہی کیوں بھری۔ تم ابھی اپنی سہیلی سے فون کر کے معذرت کر لو۔ میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ کل شکور انکل وغیرہ کے ہاں جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی لیکن امی کی تاکید تھی ان کے ہاں تو جانا پڑے گا تم الٹا نئے نئے پروگرام سیٹ کر رہی ہو۔"
شرجیل کوفت اور بیزاری سے مخاطب ہوا تھا۔
تحریم چند لمحوں تک اسے بے یقینی سے تکتی رہی یکایک اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔
شرجیل کی اس پر نگاہ پڑی تو اسے اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہوا۔
"سوری یار! میں تم سے کچھ سخت بول گیا لیکن کیا کروں تم نے بات ہی اتنی بے تکی کی تھی کہ میرا میٹر گھوم گیا۔ شاید تھکن اور گرمی کی وجہ سے میں چڑچڑا پن کر بیٹھا۔ بس اگین سوری اور اپنی سہیلی سے میری طرف سے بھی معذرت کر لینا کہہ دینا ہمارے پاس وقت کم ہے ورنہ ضرور آتے۔"
شرجیل اب اسے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں سمجھا رہا تھا۔ تحریم کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور ارشین کو معذرتی میسج ٹائپ کرنے لگی۔
دوستیاں کرنا اور پھر انہیں نبھانا یقیناً "مردوں کا ہی وصف ہے۔ بہت بعد میں سہی مگر یہ حقیقت تحریم کو سمجھ آ گئی تھی۔
☼

ثریا انسا مجید

ایک سی زندگی

ہماری اماں خاصی پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ اتنی کہ ایک مشہور و معروف کالج میں پڑھاتی ہیں۔ مگر ہمارے ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے باتوں باتوں میں مختلف طریقوں سے ہمیں وہ ہی پچھلی صدی کی ماؤں والا سبق اچھی طرح سے ذہن نشین کرادیا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ شادی کے بعد ہمیں جس گھر میں قدم رکھنا ہے وہاں سے پھر اپنے قدموں پر نہیں بلکہ چار لوگوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر ہی نکلنا ہے اور یہ کہ جس اعلاوارفع شخصیت سے ہمارے دو بول پڑھا دیے جائیں' اس کے ہر قسم کے بول ہمیں اپنے ہونٹوں پر چپ کا قفل لگا کر انتہائی خندہ پیشانی سے سننے ہوں گے اور جب وہ کوئی فرمان جاری کر رہے ہوں تو ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بن کر ان کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہنا ہمارے فرائض میں شامل ہوگا۔ اس کے علاوہ نئے زمانے کا یہ خناس بالکل بھی ہمارے دماغ میں نہ سمانے پائے کہ عورتوں کے حقوق و درجات مردوں کے برابر ہونے چاہئیں' کیونکہ مردوں کی برابری کی خواہش رکھنے والی عورت نہ گھر کی رہتی ہے' نہ گھاٹ کی۔ گھر اور گھاٹ والی مثال سن کر ہمیں اپنا آپ بہت ہی حقیر سا لگنے لگتا۔ مگر ہم یہ سوچ کر صبر کر لیتے کہ گل و گلزار ہونے کے لیے دانے کو خاک میں ملنا ہی پڑتا ہے۔

"جب اللہ نے مرد کا درجہ بلند رکھا ہے تو بیوی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ ایک اسٹیپ نیچے رہے' تاکہ وہ سر اٹھا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھے۔ مرد کی عزت کرنے ہی عورت اپنا مقام بنا سکتی ہے۔"

اماں کا یہ عجیب و غریب فارمولا سن کر ہم پریشان ہو جاتے کہ اپنا کوئی مقام بنانے کے لیے ہمیں ہمیشہ ایک سیڑھی اپنے ساتھ رکھنی ہوگی۔ اسی قسم کے اور بھی بہت سے فرمودات وہ گاہے بگاہے ہماری سماعتوں میں انڈیلتی رہتی تھیں۔

ابا تو ہمارے بچپن میں ہی ایک حادثے کا شکار ہو کر انتقال کر گئے تھے تو اماں نے ہمیں تن تنہا ہی پروان چڑھایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پروان تو ہم جیسے تیسے چڑھ ہی گئے۔ مگر ہمارے ہمارے پر کٹے ہوئے تھے اور شخصیت کے معاملے میں ہم بالکل دبو اور ڈرپوک سے تھے۔ حالانکہ ہماری اماں خود تو بڑی دبنگ قسم کی خاتون تھیں۔ جب کسی کی طرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتیں تو وہ بے چارہ وہیں بھسم کر رہ جاتا۔ کم بولتی تھیں مگر جب کچھ کہتی تھیں تو ان کا لہجہ ایسا ہوتا تھا جیسے کسی سخت گیر پولیس آفیسر کا ہوتا ہے۔ اب پتا نہیں کہ ہمیشہ سے ہی ان کا انداز ایسا تھا یا اسکول' کالج میں پڑھا' پڑھا کر ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی ایک بار کہہ دیتیں' سننے والے کے پاس اس پر عمل کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہوتا تھا تو ہم بے چارے تو کسی شمار میں ہی نہیں تھے۔

انہوں نے ہمیں انسان بنانے کے لیے بڑے جتن کیے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے انسان ہونے کے معیار تک پہنچنا کم از کم کسی انسان کے بس کا روگ نہیں تھا اور پھر ہمیں انسان بنانے کے مشن میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئی تھیں۔ اس کا فیصلہ بھی وہ ہی کر سکتی تھیں۔ مگر ہمیں دیکھنے والے کبھی صاف لفظوں میں اور کبھی اشاروں اشاروں میں یہ ہی کہتے تھے کہ ہماری اماں نے ہمیں اکیسویں صدی میں گزشتہ صدی کا شاہکار اور کچھ لوگوں کے بقول "نمونہ" بنا دیا تھا۔ جبھی قمیص کا رواج ہوتو ٹخنوں تک لمبی قمیص اور جب سب شارٹ شرٹ پہنے ہوتے تو ہماری قدموں میں لوٹتی ہوئی قمیص ہماری خاص پہچان ہوتی۔ ہمارے نرم و ملائم ریشمی بال ہمیشہ کسی ہوئی چوٹی میں بندھے ہوتے۔ ناخن اس قدر گہرائی میں کٹے ہوئے ہوتے کہ اکثر لوگ بڑی کراہیت سے ہماری طرف دیکھتے کہ شاید ہم دانتوں سے ناخن کترنے کی عادت بد میں مبتلا ہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ صابن سے منہ دھونے کی اجازت تھی' ورنہ منہ دھونے کے بعد ہمارا چہرہ جس طرح سے جگمگا اٹھتا ہمیں ہر دم یہ ہی خوف رہتا کہ کہیں کسی روز صابن کے استعمال پر بھی پابندی نہ لگ جائے۔

یہ نہیں کہ یہ ساری پابندیاں صرف ہمارے لیے تھیں' وہ خود بھی بہت سادہ رہتی تھیں' کیونکہ جوانی میں ہی ہمارے ابا ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے تو اسی وقت سے انہوں نے لوگوں کی بے لگام زبانوں کے خوف سے بالکل سادہ رہنے کی عادت ڈال لی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس سادگی میں بھی وہ اس قدر خوب صورت لگتی تھیں کہ جو بھی ان کی طرف دیکھتا' چند لمحوں کے لیے اس کی نظریں ان پر ٹھہر سی جاتی۔ ان کا دبلا پتلا سراپا



اُڑتے اُڑتے سے رنگوں والے کپڑوں میں بھی ایک خاص جاذبیت کا حامل تھا۔ ہر قسم کے احساسات سے عاری آنکھوں اور لہجے کے روکھے پن کے باوجود ان کے چہرے پر نرمی کا جو تاثر تھا وہ ان کے نہ چاہنے کے باوجود لوگوں کو ان کی طرف مائل کرتا تھا۔ مگر وہ چند گنے چنے لوگوں کے علاوہ نہ خود کسی سے ملتی تھیں اور نہ ہمیں پاس کی اجازت تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے بے کار کی دوستیاں پالنے کی۔ لوگ جیسے نظر آتے ہیں' اندر سے ویسے ہوتے نہیں۔ لہٰذا ان سے دور رہنے میں ہی عافیت ہے۔"

اب ہم ان سے کیسے کہتے کہ یہ جو ہماری عمر کی آزاد پرندوں جیسی بے فکر اور پھولوں جیسی کھلی کھلی لڑکیاں ہیں ان کا شمار ان لوگوں میں نہ کریں۔ مگر ہم ان سے نہ تو یہ کہہ سکتے تھے اور نہ ہی ان کی ہدایت کے خلاف جا کر اپنے ساتھ پڑھنے والی ہنستی مسکراتی 'بات بے بات قہقہے اچھالتی' کسی لڑکی کے اس حد تک قریب جا سکتے تھے کہ کبھی اسے اپنے گھر بلا لیں یا کبھی خود اس کے گھر چلے جائیں۔ اگر کبھی ڈرتے ڈرتے کہیں جانے کی اجازت مانگتے تو جواب میں وہی ایک جملہ سننے کو ملتا۔

"یہ ملنا ملانا' گھومنا پھرنا شادی کے بعد ہی اچھا لگتا ہے۔"

وہ تو بڑے آرام سے اتنا کہہ کر اگلے دن کے لیکچر کی تیاری میں مشغول ہو جاتیں اور ہم بھی ہمیشہ کی طرح حزن و یاس کی تصویر بنے ان تمام کاموں کا شمار اپنی انگلیوں کی پوروں پر کرنے کی ناکام کوشش میں لگ جاتے جو ہمیں شادی کے بعد سر انجام دینے تھے۔ اسی لمبی ہوتی فہرست کی وجہ سے ہم اس خاص لمحے کا انتظار تھوڑی بے صبری اور زیادہ بے شرمی سے کیے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی اس خوف سے ہماری نیند اڑ جاتی تھی کہ اس انتظار میں وقت ہمارے ہاتھوں سے یوں نکلا جا رہا تھا جیسے بند مٹھی سے ریت۔ مگر اس سے پہلے کہ ہماری مٹھی خالی ہو جاتی اماں کی کولیگ کو ہم ان کے لائق فائق بیٹے کے لیے پسند آ گئے۔ اب کیسے پسند آ گئے' یہ بھی ایک غور طلب معاملہ تھا کیونکہ ہماری اماں اور مسز ہمدانی میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں تھی۔ مسز ہمدانی انتہائی خوش مزاج اور خوش پوش خاتون تھیں۔ زندگی جیسے خود ان سے جینے کا ڈھنگ سیکھتی تھی۔

وہ چار دفعہ اماں ہمیں اپنے ساتھ کالج لے کر گئیں تو ہم مسز ہمدانی سے ملے تھے اور ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے تھے۔ وہ کوئی خاص خوش شکل تو نہیں تھیں۔ مگر انہیں خوب صورت نظر آنے کا فن آتا تھا۔ ان کے کپڑوں کا اسٹائل اور رنگوں کا خوب صورت انتخاب ان کی قدرے سانولی رنگت کو جیسے نکھار سا دیتا اور پھر سلیقے سے کیا گیا ہلکا سا میک اپ ان کے چہرے کو کچھ اور روشن کر دیتا۔

وہ ان لوگوں میں سے تھیں جنہیں اپنی خامیاں چھپانے اور خوبیاں اجاگر کرنے کا ڈھنگ آتا ہے اور پھر ان کے بے ساختہ قہقہے جنہیں سن کر ایسا لگتا جیسے ان کے اندر سے حقیقی خوشی کے جھرنے پھوٹ رہے ہوں۔ ہم جب کبھی اماں کے ساتھ ان سے ملے ہمیں یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ ہماری ہر دم خاموش اور سنجیدہ رہنے والی اماں نہ صرف ان سے خاصی بے تکلف تھیں' بلکہ ان کا انداز ٹھیک ٹھاک دوستانہ ہوتا تھا۔ ہماری اماں اس قدر لیے دیے رہنے والی کہ بلا ضرورت کسی سے بات بھی نہ کریں اور مسز ہمدانی اتنی بے تکلف اور ملنسار کہ پل بھر میں کسی کو بھی اپنا گرویدہ کر لیں۔ حیران تو ہمیں ہونا ہی تھا اور جب ہم نے اماں کے سامنے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو کچھ لمحوں کے لیے وہ کسی خیال میں کھو گئیں اور پھر آہستہ سے بولیں۔

"کبھی کبھی اپنے اندر کی تنہائی اور خاموشی سے ڈر کر کچھ لوگ اپنے آس پاس بھیڑ لگا لیتے ہیں۔"

ان کا یہ فلسفیانہ بیان ہمارے سر پر سے گزر گیا۔ مگر مزید کچھ پوچھنا بے کار تھا کیونکہ وہ حاضر ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر ہو جانے والی کیفیت میں جا چکی تھیں۔

جس سے ان کی واپسی بڑی مشکل ہی سے ہوتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس روز صبح ہی سے آسمان پر گہرے سرمئی بادلوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ہوا میں نمی کا تناسب زیادہ ہونے کا اندازہ ریڈیو پر موسم کا حال جانے بغیر بھی کیا جا سکتا تھا اور چونکہ ہم نے اپنی اب تک کی زندگی اماں کی سنگت میں انتہائی بے رنگی اور بے کیفی میں بسر کی تھی تو ہمیں یہ موسم سخت بے ہودہ لگ رہا تھا۔ بس دل کیے چاہ رہا تھا کہ منہ تک چادر تان کر لیٹ جائیں' تاکہ شتر مرغ کی طرح ایک دوسرے کا تعاقب کرتے بادل نظر آئیں اور نہ ہی ٹھنڈی ہوا کی سرسراہٹ پریشان کرے۔ یوں بھی ہم اپنا ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد گہری یاسیت میں جا چکے تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد زندگی کا جو واحد مقصد تھا وہ یعنی تکمیل کو پہنچ چکا تھا اور اب ہماری اماں ہم سے اپنی انگلی چھڑا کر ہمیں جس راہ پر ڈالنے والی تھیں اس پر فی الحال ہمیں دور دور تک بھرے بھرے درختوں کی گھنی چھاؤں نظر آ رہی تھی' نہ ہی رنگین پھولوں کی خوشبو ہی بھر رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ منزل کے نشان واضح ہوئے تھے کہ جسے پانے کی خواہش سے ہمارے خوابوں اور خیالوں کی محفلیں سجتیں۔

اماں تو کالج گئی ہوئی تھیں اور ہم گھر کا تھوڑا بہت کام نپٹا کر اب اس انتظار میں تھے کہ وہ واپس آ جائیں تو ہم روٹیاں پکائیں۔ دروازے کے قفل میں چابی گھومنے کی ہلکی سی آواز آئی تو ہم جو صوفے پر نیم دراز انتظار کی گھڑیاں گن رہے تھے' سیدھے ہو بیٹھے۔ دروازہ آہستگی سے کھلا اور اماں بے آواز قدموں سے اندر داخل ہوئیں۔ ہماری پہلی نظر ان کے چہرے پر پڑی جو خلاف معمول کچھ روشن روشن سا لگا۔ دوسری نظر مسز ہمدانی کے مسکراہٹ بکھیرتے چہرے پر پڑنے کے بعد ساکت ہو گئی۔ کیونکہ ان دونوں کے عقب میں جو شخصیت تھی اس کا طویل سایہ ہماری اماں اور مسز ہمدانی پر سے ہوتا ہوا ہمارے چمکتے دمکتے فرش پر پڑ رہا تھا جو ہم نے اماں کی خوشنودی کے لیے صبح ہی جان سے صاف کیا تھا۔

دراز قامت مردوں کو ہم نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ مگر وہ صاحب اس حد تک لمبے چوڑے تھے کہ ہم سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے اور ہمارے اس طرح پیچھے ہٹنے پر وہ بھی ٹھٹک کر وہیں رک گئے۔

"آجاؤ بیٹا! رک کیوں گئے؟"

اماں نے اس قدر میٹھے لہجے میں کہا کہ اس مرتبہ ہم چونکا کر ان کی طرف مڑے۔ وہ اپنے لہجے سے بھی زیادہ میٹھی نظروں سے اس "جن" کی طرف دیکھ رہی تھیں جو دروازے کے فریم میں کسی تصویر کی طرح ایستادہ تھا۔ سانولی رنگت' جناتی سراپا۔ یہ تھی پہلی جھلک ہمارے ہونے والے مجازی خدا کی' جو ہماری نظروں کے رستے ہمارے حواسوں پر بجلی بن کر گری۔

☼ ☼ ☼

اس پہلی نظر نے جو قیامت ڈھائی تھی اس سے تو ہماری جان بچ کسی طور سنبھل ہی گئی۔ مگر جب اگلے روز ہماری اماں نے لڑکیوں کے اسائنمنٹ چیک کرتے کرتے اچانک ہماری طرف رخ کرتے ہوئے جو انکشاف فرمایا اس نے ہماری ذہنی اور جسمانی بنیادیں کچھ اس طرح ہلا ڈالیں کہ اگر ہم پر ان کی دعاؤں کا سایہ نہ ہوتا تو ہم اسی پل اس جہان فانی سے کوچ کر جاتے۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ ہم پتھر کے بے جان بت کی طرح بنا پلکیں جھپکائے' سانس روکے ان کی طرف دیکھتے رہ گئے اور وہ اپنی بات کر کے بڑی بے نیازی سے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

"میں نے تمہارا رشتہ آفاق کے ساتھ طے کر دیا ہے۔"

ہم نے یہ جملہ سنا اور اس کے بعد گھنٹوں ہمارے کان سائیں سائیں کرتے رہے۔ دیدہ دیا تقریباً" بیٹھا ہو گیا۔ کیونکہ ایک طویل و طویل سایہ ان کے سامنے

اور ختم ہو گیا۔ آفاق احمد صاحب کا جناتی وجود ہمارے مستقبل کے تمام خوابوں اور ارادوں کے درمیان اس طرح سے حائل ہوا کہ آنے والی زندگی کا تصور کرنا بھی محال لگنے لگا۔

"آفاق دو سال کا تھا' جب اخلاق احمد ہمدانی نے ایک مقابلتاً" زیادہ خوب صورت عورت کے چکر میں پڑ کر عذرا کو طلاق دے دی۔ حالانکہ اس بے چاری نے تو بہت منت سماجت کی کہ وہ بے شک دوسری شادی کر لے مگر عذرا سے اپنا رشتہ ختم نہ کرے' لیکن اس دوسری عورت کا یہی مطالبہ تھا کہ وہ اسی شرط پر شادی کرے گی کہ پہلے اخلاق احمد' عذرا کو طلاق دیں۔"

ہماری اماں چلتے پھرتے وقتاً" فوقتاً" ہمیں ہماری ہونے والی سسرال سے متعارف کرا رہی تھیں' جیسے ڈائجسٹوں میں چھپنے والی قسط وار کہانیاں یا پھر ٹی وی پر چلنے والے ہفتہ وار ڈرامے۔ ہم ٹکڑوں ٹکڑوں میں ملنے والی معلومات کی مدد سے اپنی آنے والی زندگی کے تانے بانے بن رہے تھے اور خود الجھتے جا رہے تھے۔

"عذرا نے اپنی ساری زندگی آفاق کے لیے وقف کر دی۔ اسے اعلا تعلیم دلوائی' زندگی کی ہر ضرورت بہترین انداز میں مہیا کی' تاکہ اسے کبھی باپ کی کمی محسوس نہ ہو اور اس کے جواب میں اس نے بھی ہمیشہ ایک سعادت مند اولاد کی طرح عذرا کی ہر خواہش کا احترام کیا۔"

اماں ہمیں مسز ہمدانی کی قربانیوں کے بارے میں اس طرح بتا رہی تھیں جیسے ہمیں پتا ہی نہ ہو کہ ساری زندگی اولاد کے لیے وقف کرنا کسے کہتے ہیں اور اکیلے رہ کر اولاد کی تعلیم اور اس کی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کیسے دن اور رات کا فرق بھولنا پڑتا ہے۔ انہوں نے خود ساری زندگی یہی کچھ کیا تھا۔ مگر اب مسز ہمدانی کی جدوجہد کو اس قدر جذب اور عقیدت سے بیان کر رہی تھیں جیسے انہوں نے خود یہ وقت نہ گزارا ہو۔

مسز ہمدانی کے بارے میں تو ہم جان گئے تھے۔ ہم خود ان کے صاحبزادے جیسے سعادت مند ہیں یا نہیں' اس کا پتا چلنا ابھی باقی تھا۔ اتنی فرماں برداری ہم نے بھی دکھائی تھی کہ اس پہاڑ جیسی شخصیت کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کے لیے بغیر کسی چوں چرا کے راضی ہو گئے تھے۔

"آفاق بہت سلجھے ہوئے مزاج کا مالک ہے۔ میں اس سے بہت بار مل چکی ہوں اور بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ پھر بھی اگر تمہیں کسی بات پر اعتراض ہو یا آفاق کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو بتادو۔"

اماں نے تمام مراحل طے کر لینے کے بعد جب ہم سے یہ سوال کیا تو ہمیں ان کے بھولپن پر بے ساختہ پیار آگیا۔ مگر نہ ہم اس پیار کا اظہار کر سکے' نہ ان سے جدائی کے خیال سے ان کے گلے لگ کر روایتی انداز میں چھم چھم نیر بہا سکے' کیونکہ ہماری اماں کو جذبات کا اظہار بچکانہ اور اوچھا لگتا تھا۔

جس طور سے ہماری پرورش ہوئی تھی اس کے نتیجے میں شادی کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہی ہونا چاہیے تھا کہ ہمیں اپنی مرضی کے کپڑے پہننے اور ہر جگہ آنے جانے کی آزادی مل جائے گی' مگر آفاق احمد صاحب سے رشتہ طے ہو جانے کے بعد ہمارے یہ معصوم خواب بھی خوف اور وحشت کے گھنے جنگلوں میں گم ہو گئے۔

ہماری اب تک کی زندگی میں کسی مرد کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ اپنے ابا کو ہم ان کی بڑی سی فریم شدہ تصویر کی حد تک جانتے تھے جو اماں نے اپنے کمرے میں ایسے زاویے سے لگا رکھی تھی کہ اندر داخل ہوتے ہی پہلی نظر اس پر پڑنی لازمی تھی۔ ابا کے خدوخال کے علاوہ ان کی شخصیت سے تھوڑا بہت تعارف اماں کی اس گفتگو سے ہوا تھا جو بہت خاص موقعوں پر بھیگی نظروں اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کیا کرتی تھیں اور جس سے ہم نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ہمارے ابا بہت نرم خو اور سادہ مزاج تھے۔

وہ پیچھے بھی تھے ہماری زندگی میں بس ایک یاد بن کر ہی شامل رہے۔ اس کے علاوہ اماں کے دونوں بھائی یعنی ہمارے ماموں تھے جو بہت پہلے دوسرے ملکوں میں جا بسے تھے اور کبھی کئی کئی سال کے بعد اگر کسی خاص ضرورت کے تحت اپنے ملک کا چکر لگانے پر مجبور ہو جاتے تو ہمیں تھوڑی سی دیر کو ہمارے گھر آتے اور ہم دونوں ماں' بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر کر ہمارا احوال دریافت کرتے اور ڈھیروں تحائف دے کر واپس چلے جاتے۔ کالج اور یونیورسٹی میں بھی ہم صنف مخالف کے سائے سے بھی دور رہے' کیونکہ ہمیں اپنی اماں کی آنکھوں میں چھپا خوف بخوبی نظر آتا تھا' جو ہمارے ہوش سنبھالتے ہی ان کے لاشعور میں بس گیا تھا اور جس کا اظہار وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر و بیشتر اپنی باتوں میں کر ہی جاتی تھیں۔ اور اب اچانک بغیر کسی پیشگی وارننگ کے اماں نے ہماری زندگی ایک ایسے شخص کے ساتھ منسلک کر دی تھی' جس کا ظاہری سراپا ہمارے ذہن میں صرف خوف جگا رہا تھا۔

شادی کے دن جس رفتار سے قریب آتے جا رہے تھے اسی رفتار سے ہمیں اپنا آپ کسی گہری کھائی میں گرتا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک ایسے سفر کا آغاز ہونے کو تھا جہاں سے واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہرچند کہ اماں اپنی عادت کے برعکس آج کل ہر وقت ہم سے مخاطب رہنے لگی تھیں۔ مگر ان کی باتوں کا محور چونکہ وہ ہی ذات ہوتی تھی جس کے خیال ہی سے ہمارے چہرے کی رنگت اڑتی جا رہی تھی۔ لہٰذا ان کی طرف سے ملنے والی غیر معمولی توجہ اور محبت ہمیں کوئی خوشی نہیں دے رہی تھی' بلکہ ہم تو کچھ ایسی لایعنی الجھنوں میں الجھ کر رہ گئے تھے کہ ہمیں اپنی اماں کا گھر چھوڑنے کا صدمہ بھی بھول گیا تھا۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ بہت جلد ہماری زندگی میں ایک ایسا بدلاؤ آنے والا ہے جس کے بارے میں سوچ سوچ کر ہمارا دماغ ہر سوچ سے عاری ہو چکا تھا۔

مگر اماں کے چہرے پر نظر آنے والا اطمینان روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رہنے لگی تھی اور پیشانی پر رہنے والی فکر و تردد کی لکیریں غائب ہو گئی تھیں اور یہ ہی بات ہماری ڈھارس بندھائے ہوئے تھی۔ آنے والے دنوں میں انہوں نے اس تیزی سے ہمارے جہیز کا سامان اکٹھا کیا کہ ہم ان کی شاہ خرچی بلکہ نفیس ترین انتخاب اور دن رات کی ان تھک بھاگ دوڑ پر نہ صرف انگلیاں اپنے دانتوں میں دبائے حیرت کا جیتا جاگتا مرقع بن گئے' بلکہ ایک نئی فکر میں بھی مبتلا ہو گئے کہ اگر حیران ہونے کا سلسلہ اسی طرح جاری و ساری رہا تو کچھ عجب نہیں کہ اس جناتی شخصیت کی زندگی میں شامل ہونے سے پہلے ہم اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے ہی محروم نہ ہو جائیں۔ مگر حیران ہونے کا یہ باب کبھی بند نہ ہو سکا۔ ابھی حیرت کے اور بھی بہت سے در وا ہونے تھے۔ یہ ہمیں اپنی شادی خانہ آبادی کے بعد پتا چلا۔

☼ ☼ ☼

ہمارے دل کے دھڑکنے کی رفتار اس گاڑی جیسی تھی جو کسی مشہور سیاسی شخصیت کی رہائش سے منسلک شاہراہ پر تھوڑے تھوڑے سے فاصلے سے بنے ہوئے اسپیڈ بریکرز پر جھٹکے لے لے کر آگے بڑھ رہی ہو۔

پھولوں اور خوشبوؤں سے آراستہ کمرے میں ہم سانس روکے اس چنگھاڑ کے منتظر تھے جو آفاق احمد ہمدانی کی کمرے میں آمد کے بعد گونجنے والی تھی۔ مدھم روشنی رومان پرور ماحول کے بجائے ڈراؤنی فلم کے منظر کی طرح لگ رہی تھی جس میں کسی بھی لمحے کوئی خوفناک وجود کسی اندھیرے کونے سے نکل کر حملہ آور ہونے والا ہو۔

اور پھر وہ لمحہ بھی آگیا۔

دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ ہم نے اپنی آنکھیں پوری قوت سے میچ کر کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔

☼ ☼ ☼

سنہرے خستہ پراٹھے' اشتہا انگیز خوشبو اڑا

آملیٹ، ملائی کے نازک سے پیالے میں دہی اور کیتلی سے نکلتی چائے کی بھاپ ہمارا دل چاہا کہ ہم سب کچھ بھول کر فوراً ناشتے پر ٹوٹ پڑیں کیونکہ ہم نے گزشتہ شب تو کیا کئی دنوں سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اس وقت یہ سادہ سا ناشتا بھی ہمیں کسی نعمت سے کم نہیں لگ رہا تھا مگر مسز ہمدانی یعنی ہماری ساس صاحبہ اخبار پڑھنے میں اس طرح گم تھیں کہ شاید انہیں ہم دونوں کی آمد کا بھی احساس نہیں ہوا تھا اور ان سے پہلے ہم ناشتے کی شروعات کر کے اپنی اماں کی تربیت پر حرف آنے کا موجب نہیں بننا چاہتے تھے۔ لہٰذا کسی قدر بلند آواز میں سلام کر کے انہیں اپنی اور میز پر سجے ناشتے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے۔ انہوں نے اخبار تہہ کر کے اپنے بائیں جانب رکھا اور انتہائی محبت سے ہمارے سلام کا جواب دے کر آفاق کی طرف دیکھا جو بہت دھیمی آواز میں سلام کرنے کے بعد مؤدب انداز میں کھڑے تھے۔

"کیا تمہیں بیٹھنے کے لیے باقاعدہ دعوت نامہ دینا پڑے گا؟"

ایک بالکل اجنبی آواز ہماری سماعتوں سے ٹکرائی اور ہم نے حیران ہو کر مسز ہمدانی کی طرف دیکھا۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ یہ آواز اور یہ لہجہ انہیں کا تھا۔ بلاشبہ یہ آواز انہیں لبوں سے برآمد ہوئی تھی جن کو ہم نے ہمیشہ خوش گوار لہجے میں بات کرتے اور مسکراتے دیکھا تھا۔ مگر اس وقت ان ہونٹوں پر ایک عجیب سا کھنچاؤ تھا اور لہجے میں ایسی تلخی جیسے وہ اپنے اکلوتے بیٹے سے نہیں بلکہ کسی ملازم سے مخاطب ہوں۔

آفاق بغیر کوئی جواب دیے آہستگی سے کرسی سرکا کر اس پر بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا اور وہ بے ساختہ اپنی پلیٹ پر نظریں جمائے غالباً مسز ہمدانی کے اگلے جملے کے منتظر تھے۔

"شروع کرو بیٹا!" مسز ہمدانی آفاق کے بجائے ہم سے مخاطب ہوئیں اور ہم نے بڑھ کر اپنی پلیٹ میں ڈھیر سارا آملیٹ نکال لیا۔

"تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جس طرح چاہے رہو۔" ان کے لہجے میں ایک بار پھر شہد کی سی مٹھاس گھل گئی تھی اور ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے کی کشش میں اضافہ کر رہی تھی اور ہم ان کے پل پل بدلتے رنگ دیکھ کر حیران تو تھے ہی مگر خوف زدہ بھی ہو گئے تھے۔

پھر ناشتے کے دوران خاموشی ہی رہی۔ مگر ہم نے دیکھا کہ انہوں نے کئی بار آفاق کی خالی ہوتی پلیٹ کو بھی کچھ نہ کچھ پُر کیا تھا اور آفاق نے اسکول کے بچوں کی سی تابعداری سے اپنی پلیٹ صاف کی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہم نے گزشتہ چند ماہ جس خوف کے زیر اثر بسر کیے تھے اب اس کا دور دور تک کوئی نشان باقی نہیں تھا۔ آفاق اپنے ظاہری سراپے کے برعکس بہت دھیمے مزاج اور نرم گفتار کے مالک تھے۔ وہ ہم سے اسی طرح پیش آتے جیسے ہم کانچ کے بنے ہوں اور ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ کر بکھر جانے کا خوف ہو۔

ہم اپنی اماں سے سنتے آئے تھے کہ نکاح کے دو بولوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس کی سچائی کا اندازہ ہمیں اپنی شادی کے بعد ہوا۔ چند ہی دنوں میں ہمارا دل آفاق کی محبت سے لبالب بھر گیا۔

ان کے لیے جو نرم سے وجود میں یوں جیسا معصوم بچہ تھا۔ ان کی آنکھوں سے محبت کی شعاعیں پھوٹتی تھیں اور تمام تر سادگی کے باوجود ان کی ذہانت کا اندازہ ان سے تھوڑی دیر بات کر کے ہی ہو جاتا تھا۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے اگر محبت نہ بھی ہوتی تو ان جیسا شریک زندگی ملنے پر فخر تو ہونا ہی تھا مگر ہمیں تو ان سے محبت ہو گئی تھی۔ بالکل افسانوں اور فلموں جیسی محبت۔ اور جب ہم سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے تو دل ہی دل میں اپنی اماں کو ڈھیروں دعائیں دیتے جنہوں نے ہمارے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا جو ہر لحاظ سے بلند قامت تھا۔

مسز ہمدانی جنہیں ممی کہنے میں ہمیں کئی دن لگے

چونکہ بہت ملنسار اور خوش اخلاق تھیں تو ان کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ لہٰذا شادی کے بعد دعوتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہر دعوت میں جانے سے پہلے ممی کی خواہش ہوتی تھی کہ ہم بالکل دلہنوں کی طرح تیار ہوں۔ کہاں تو ہم صابن سے منہ دھو کر گھنٹوں منہ چھپائے پھرتے تھے کہ کہیں اماں یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے اپنے رخ روشن کو مزید روشن کرنے کے لیے غیر اسلامی اشیا کا استعمال کیا اور کہاں اب یہ حال تھا کہ ہمارا چہرہ دن اور رات کے زیادہ تر اوقات میں میک اپ کے تمام تر لوازمات سے کچھ اس طرح آراستہ رہتا کہ ہمیں اپنی اصل شکل بھولنے لگی تھی۔ اسی خوف کے زیر اثر ہم ایک روز ذرا سادگی سے تیار ہوئے تو جہاں آفاق کی ستائشی نظریں ہمارے چہرے پر ٹھہری تھیں وہیں ممی کی پیشانی پر ان گنت شکنیں پڑ گئیں۔

"بیٹی اگر تمہیں اچھی طرح سے تیار ہونے کو کہتی ہوں تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ بیوی اگر سجی بنی ہو تو مرد کی نظریں ادھر ادھر نہیں بھٹکتیں اور تم کو تو کچھ زیادہ ہی خیال رکھنا ہوگا۔ ورنہ کسی وقت بھی اپنا اثر دکھا سکتی ہے۔"

ان کی الجھی ہوئی نظریں آفاق کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ آفاق کی سانولی رنگت میں سرخی جھلکنے لگی تھی۔ مگر کوئی رد عمل ظاہر کیے بغیر وہ اسی طرح خاموش کھڑے رہے۔ ہمارا دل چاہا کہ ہم اس منظر سے غائب ہو جائیں۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

دعوتوں کا سلسلہ ذرا تھما تو ممی نے ہم دونوں کے لیے شمالی علاقہ جات گھومنے کا پروگرام ترتیب دے لیا۔

"تم اپنی چھٹیاں تھوڑا اور بڑھا لو تاکہ آرام سے کچھ دن ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکو۔ اس طرح تم دونوں کو ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوگی اور اتنے دنوں کی تھکن بھی اتر جائے

گی۔"

وہ کسی قدر فکر مند نظروں سے آفاق کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور اس لمحے بالکل عام سی ماں لگ رہی تھیں' جسے اپنی اولاد سے وابستہ ذرا سی تکلیف کا بھی بغیر کچھ کہے اندازہ ہو جاتا ہے۔

"مگر ممی! ہمارے جانے سے آپ بالکل اکیلی ہو جائیں گی۔" آفاق نے انتہائی محبت سے ان کی طرف دیکھا۔

"تم میرے اکیلے ہونے کی فکر نہ کرو۔ تمام مردوں کی طرح اگر تم بھی یہ ہی سمجھتے ہو کہ عورت اکیلی نہیں رہ سکتی تو یہ خام خیالی اپنے دل سے نکال دو۔ مجھے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں' چاہے وہ بھائی ہو یا بیٹا یا پھر۔" وہ پل بھر کو رکیں۔

"میں نے اکیلے رہ کر تمہیں اس قابل بنا دیا تو آئندہ بھی اپنے بل بوتے پر زندہ رہ سکتی ہوں۔"

معمولی سی بات نے اچانک کیا رخ اختیار کر لیا۔ آفاق ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئے اور ممی ایک جھٹکے سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

اور ہم بے چارے تک تک دیدم دم نہ کشیدم۔

☼ ☼ ☼

ٹھنڈی ہوائیں' اونچے نیچے سرسبز راستے' شفاف پانی کا پتھروں سے ٹکرانے سے پیدا ہونے والا شور' جو کسی خوب صورت موسیقی سے کم نہ تھا اور پھر آفاق جیسے نرم مزاج اور خیال کرنے والے شوہر کا ساتھ...... ہمارا ہنی مون حقیقتاً" شہد کی طرح میٹھا اور چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی کی طرح روح کو سرشار کر دینے کی حد تک خوب صورت تھا۔

سارا دن قدرت کے حسین نظاروں سے آنکھوں کو سیراب کرنا اور رات کو دیر تک جاگ کر دنیا جہان کی باتیں کرنا۔ وقت کیسے گزر رہا تھا کچھ پتا ہی نہیں چلا اور واپسی کا دن قریب آ گیا۔

اس رات ہم نے آفاق کی پسند پر ہلکے نیلے رنگ کا نازک سی کڑھائی والا سوٹ پہنا اور ان کے ہی کہنے پر بال جن کی لمبائی اور خوب صورتی کا احساس خود ہم کو شادی کے بعد ہوا تھا' کھلے چھوڑ دیے تھے۔

سارا دن اونچے نیچے رستوں پر گھومنے کی وجہ سے کچھ تھکن کا احساس تھا اور اگلے دن واپسی کے خیال سے تھوڑی اداسی اور تھوڑی خوشی۔ ہمیں اندازہ تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد ہمیں اپنی عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز کرنا تھا اور یہ خیال ہمیں ایک بے نام سی گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ ممی کے لمحہ لمحہ بدلتے موڈ کی وجہ سے ہم اس وقت بھی حیران ہوئے تھے اور اب جب ہمیں واپس جا کر ان کے ساتھ رہنا تھا تو ہم یہ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ جب وہ آفاق سے اس قدر سخت لہجے میں بات کرتی تھیں تو پھر ہمارے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہو گا۔

آفاق بھی شام سے کچھ خاموش تھے۔

"آپ میرے ساتھ خوش تو ہیں نا؟" آفاق کی بھاری آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی تو ہم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ بھلا ان کو یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔

ان کی آنکھوں میں کسی گہری سوچ کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں اور وہ اضطراری انداز میں اپنی مٹھیاں بھینچ رہے تھے۔

"آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ ہم کتنے خوش ہیں۔" ہم نے بغور ان کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں ہمارا جواب سن کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی تھی۔

"ابھی تو ہماری زندگی کا آغاز ہوا ہے' آگے جا کر پتا نہیں آپ کی یہ خوشی قائم رہ سکے یا نہیں۔" انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟"

اس بار ہم نے بھی کسی قدر سنجیدگی سے سوال کیا تو انہوں نے آگے بڑھ کر ہمارے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"آپ کو ممی کے مزاج کا تھوڑا بہت اندازہ تو ہو گیا ہو گا مگر آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا یہ رویہ

صرف میرے ساتھ ہے۔" یعنی ساری دنیا کے ساتھ تو اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے ہی اس قدر پسند کی جاتی ہیں۔

ان کی آواز میں گہری اداسی گھل گئی تھی اور چہرے پر ایک کرب انگیز کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ہم نے حیرت اور دکھ سے اس لمبے چوڑے مرد کو دیکھا۔ وہ اس لمحے کسی معصوم بچے کی طرح لگ رہے تھے' جسے کسی ناکردہ جرم کی سزا ملی ہو۔

"ممی ایسا کیوں کرتی ہیں؟" ہم نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تو انہوں نے ایک جھٹکے سے ہمارے ہاتھوں پر سے اپنی گرفت ہٹالی۔

"کیونکہ میں اخلاق احمد ہمدانی کا بیٹا ہوں۔" انہوں نے ایسے کہا' جیسے کسی بہت بڑے جرم کا اعتراف کر رہے ہوں۔

"جس وقت ڈیڈی ہمیں چھوڑ کر گئے' میں بہت چھوٹا تھا' مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ ممی ہر وقت مجھے اپنے ساتھ لگائے رکھتی تھیں' شاید انہیں خوف تھا کہ ڈیڈی کہیں مجھے بھی ان سے چھین نہ لیں۔ وہ ہر وقت روتی رہتیں اور راتوں کو جاگ جاگ کر تسلی کیا کرتیں کہ میں ان کے پاس موجود ہوں۔ مگر جب ڈیڈی نے پلٹ کر میری خبر نہ لی تو رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ مگر ان کا رویہ میرے ساتھ اس قدر جارحانہ ہو گیا جیسے میں ان کی بھی نہیں' صرف اخلاق احمد ہمدانی کی اولاد ہوں۔ وہ اپنے رد کیے جانے کا انتقام دنیا بھر کے مردوں سے لینا چاہتی ہیں۔ کسی اور مرد پر ان کا کوئی اختیار نہیں تو صرف میری ہی ذات ان کی نفرت کا نشانہ بنتی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ انہوں نے میری ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کو میرے کہے بنا پورا کیا ہے۔ میں اگر ذرا سا بھی بیمار ہو جاؤں تو وہ رات رات بھر جاگ کر دعائیں کرتی ہیں۔ مگر پھر بھی انہیں ہر لمحے یہ احساس رہتا ہے کہ میں اسی باپ کا بیٹا ہوں جس نے انہیں محض اس لیے چھوڑ دیا کیونکہ اسے ان سے خوب صورت عورت مل گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت یہ ثابت کرنے میں لگی رہتی ہیں کہ وہ ہر لحاظ سے بہترین ہیں اور وہ واقعی بہترین ہیں۔ اگر وہ ڈیڈی کو بھول کر اپنی زندگی جینا شروع کر دیں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے اور ہمارا دل ان دونوں ماں' بیٹے کے لیے دکھ سے بھر گیا۔

"اور آپ کو پتا ہے کہ ممی نے میرے لیے آپ کا انتخاب کیوں کیا؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے نسبتاً" بشاش لہجے میں سوال کیا تو ہم نے ان کے بازو پر سے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کیونکہ آپ بہت خوب صورت ہیں اور ممی کو یقین ہے کہ ایسی حسین بیوی سے نظر ہٹا کر میں کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکتا۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا اور ہمیں اپنے اور قریب کر لیا۔

ہر شخص کو جینے کے لیے ایک ہی زندگی ملتی ہے' مگر وہ لوگ جن کو اپنی عملی زندگی کے آغاز میں کسی حادثے سے دوچار ہونا پڑے' وہ کبھی بے تحاشا محبت اور کبھی شدید نفرت کی وجہ سے دوسروں اور خصوصاً" اپنی اولاد کی زندگی بھی خود جینا چاہتے ہیں اور اس کوشش میں وہ کبھی کبھی اپنی اولاد کے ساتھ بہت زیادتی بھی کر جاتے ہیں۔

ہماری یعنی ماضی کی ارم فاطمہ اور حال کی مسز ارم آفاق کی زندگی کی دو اہم ترین خواتین' ایک ہماری ماں اور دوسری ہماری ساس جو اپنے اپنے خیالات کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اس قدر مماثلت رکھتی ہیں کہ ایک نے اپنی ساری زندگی کو دنیا کے خوف اور دوسری نے مردوں سے نفرت کی نذر کر دیا اور اپنے اس خوف اور نفرت کا سارا بوجھ اپنی اولاد پر ڈال دیا۔ مگر ہم یہاں سے واپس جانے کے بعد جب اپنی عملی زندگی کا آغاز کریں گے تو ہماری کوشش ہو گی کہ ہم چاروں کی زندگی ہر خوف اور نفرت کے جذبے سے آزاد ہو کر خوشیوں اور ایک دوسرے کے احترام سے عبارت ہو۔

☼



فرحانہ ناز ملک

علیشہ اور وہ

"آ..." حلق سے برآمد ہوئی یہ چیخ اتنی دلدوز اور وحشت ناک تھی کہ آسیہ کچن کا دروازہ کھولتے کھولتے پلٹ آئیں۔

"الٰہی خیر!" اس کا کمرہ دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ آسیہ نے تیز گام کی طرح چار چھ قدموں میں پاٹا۔

"کیا ہوا...؟"

اپنے بیڈ پر وہ سکتے کی کیفیت میں تھی۔ آسیہ نے حواس سنبھال کر پورے ساتھ ہی چاروں اطراف نظریں

ناولٹ

گھمائیں۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر ذرا کم حواس باختہ کردینے والا کچھ نہیں تھا۔

"میں پوچھ رہی ہوں چیخیں کیوں؟ کوئی چھپکلی دیکھ لی تھی کیا؟" اس کا سکتہ ٹوٹنے میں نہ آیا تو انہوں نے جھنجلاتے ہوئے باقاعدہ اسے جھنجھوڑ دیا۔

"یہ..." کہتے ہوئے اس نے اپنے سامنے رکھی تارا کی پریکٹیکل نوٹ بک اٹھا کر ان کے سامنے کردی۔ شکل دہلا دینے والی ہو رہی تھی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے آسیہ نے نوٹ بک کے کھلے ورق پر خاصے اشتعال سے نظر دوڑائی۔ جس پر مشہور زمانہ کارٹون ڈونلڈ ڈک بے حد مہارت سے بنایا گیا تھا۔

"یہ تم بتا رہی تھیں؟" انہیں فی الفور غصہ آگیا۔ یعنی میڈیکل کی سخت پڑھائی کا بہانہ اندر صلوٰتیں کی روح کو تسکین پہنچائی جارہی تھی۔

"یہ میں نے شہوار کو دی تھی کمپلیٹ کرنے کے لیے اس نے یہ بنا دیا۔"

آخری جملہ بعد میں ادا ہوا، آنسو پہلے نکل آئے۔ آسیہ نے مسکراہٹ دبائی۔

"اچھا بس۔ میں بات کروں گی شہوار سے۔ تم بھی اب لیٹو بہت رات ہوگئی ہے۔"

"آپ دیکھیں تو... یہ کوئی بات ہے۔ خود مجھے کہا بناؤں گا اور ایسی گھٹیا..."

"میں نے کہا نا صبح بات کروں گی اس سے۔ تم اب اپنا خون مت جلاؤ۔ سوجاؤ شاباش۔"

آسیہ نے خود ہی اس کے بیڈ پر پھیلی کتابیں سمیٹنا شروع کردیں۔ وہ خود بھی تھک چکی تھی مگر احتیاطاً تارا کی پریکٹیکل نوٹ بک چیک کرنے کا خیال آیا تو اندر ڈی ڈی مسکرا اٹھا۔

"آپ اس سے بات نہیں کریں گی۔ کل پہنچیں گی اور دیکھیے گا میں بھی اس کا وہ حشر کروں گی کہ سات پشتوں کو میرے نام سے ڈرائے گا۔"

آسیہ جب تک اس کا مال و متاع سمیٹ کر ماتھے پر بوسہ دے کر کمرے سے باہر نکلیں وہ اندر کی کھولن نکالتی رہی۔

کوئی مذاق تھا اس کی پریکٹیکل کی نوٹ بک تباہ کردی تھی۔ اگر وہ چیک کیے بغیر مس عائشہ کو تھما آتی تو۔ آگے کا منظر سوچنے سے پہلے وہ شہوار کی خیالی درگت بنانے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج اسد کا برتھ ڈے تھا اور ہمیشہ کی طرح وہ لاؤنج میں صوفے پر اداس بیٹھی اسد کی جدائی کے دنوں کا اعداد و شمار کرنے میں مصروف تھیں۔ جب جمیل صاحب ہاتھ میں موبائل تھامے، تیزی سے داخل ہوئے۔

"لیجیے۔ بات کیجیے اپنے لاڈلے سے، ہم سے تو بھی غیروں کی طرح ہوں ہاں کے علاوہ کچھ اور کہنا شان کے خلاف سمجھتا ہے۔" شائستہ کا چہرہ تن کی تن میں کھل گیا۔

"صاحبزادے کے لیے تو مما بھی آپ ہیں اور ڈیڈی بھی آپ۔" ٹھنڈی آہ کھینچتے ہوئے جمیل صاحب صوفے کے کنارے پر جا بیٹھے۔ شائستہ کے لیے اس طنز کی کیا اہمیت و حیثیت، جب اسد بات کر رہا ہو۔

"اسد میری جان!" ضبط کرتے کرتے بھی لہجہ روہانسا ہو گیا۔

"السلام علیکم مما! کیسی ہیں؟" اسد کی بھرپور مردانہ آواز ممتا کی تشنگی بڑھا گئی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا، وہ بات کر کے خوش و مطمئن ہونے کے بجائے اور بے چین و مضطرب ہو جاتی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو، خوش رہو۔ اب یاد آئی ہوں؟" ہلکا سا شکوہ اسد کے قہقہے میں دب گیا۔

"اصولاً" آپ کو یاد کرنا چاہیے تھا۔ آخر کو آج کا دن میرا ہے۔"

"کیا کروں۔ کتنی بار تو کوشش کی لائن ہی نہیں مل رہی تھی۔" وہ حسب عادت پشیمان ہو گئیں۔

"اٹس او کے۔ آپ کریں مس کریں، ایک ہی بات ہے۔" شائستہ کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ اسد کے چھوٹے چھوٹے جملے انہیں رلا دیا کرتے تھے۔ جمیل صاحب بیوی کے چہرے سے جذبات پڑھتے ہوئے محظوظ ہونے لگے۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اچانک ہی اسد کی طبیعت یاد آگئی۔ اسد کو دو دن پہلے بخار ہوا تھا۔

"اب تو بالکل ٹھیک ہوں مما! ڈونٹ وری۔"

"کیسے نہ فکر کروں، ذرا خیال نہیں رکھتے ہو اپنا۔" خفگی سے کہتے ہوئے جمیل صاحب کو بھنویں سکوڑ کر دیکھا۔ "بالکل اپنے باپ جیسے ہو، لاپروا اور سست۔" جمیل صاحب نے ضرورت سے زیادہ آنکھیں پھاڑ لیں۔ وہ مسکین خواہ مخواہ گفتگو کے بیچ آ گئے تھے۔

"پتا نہیں کب واپس آؤ گے۔ آج کل، آج کل سنتے سنتے اتنے سال ہو گئے ہیں۔"

"کوشش تو کر رہا ہوں مما۔ آپ بس دعا کریں۔"

"ساری دعائیں تمہارے لیے ہیں۔" شائستہ کا لہجہ محبت و شفقت سے مغلوب ہو گیا۔

"تھوڑی سی شہوار کے لیے بھی بچا رکھیں۔" جمیل صاحب کی سنجیدہ بڑبڑاہٹ اتنی تیز تو ضرور تھی کہ شائستہ تک پہنچ جائے۔

"اپنا خیال رکھنا، ٹھیک ہے، اللہ حافظ۔" موبائل آف کر کے جمیل صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے شائستہ نے حسب عادت انہیں گھورا۔

"آپ کا بھی جواب نہیں بیگم صاحبہ!" شائستہ نے آنکھیں سکوڑ کر ناگواری سے دیکھا۔

"شہوار جھوٹ نہیں کہتا۔ غلطی ایک کی ہے۔ آپ سارے گھر کو سمیٹ لیتی ہیں۔" شائستہ کی برہمی میں اضافہ ہو گیا۔ جمیل صاحب جانے بوجھتے شرارت پہ آمادہ رہے۔

"جیسے اب۔ طبیعت کا خیال آپ کا بیٹا نہیں رکھتا اور طاری ہی تمہیں اسے باپ سے۔"

"توبہ ہے۔" تنک کر وہ کھڑی ہو گئیں۔

"ذرا سی بات پکڑ کر بیٹھ گئے۔ پورے کے پورے عورتوں پر گئے ہیں۔" ناگواری بھری بڑبڑاہٹ جمیل

صاحب کو سلگانے پر مجبور کر گئی۔

"بیٹا مجھ پر۔ میں عورتوں پر۔ لاحول ولا۔" وہ بلند آواز میں بڑبڑائے۔

☼ ☼ ☼

شہوار کی خیالی درگت زیادہ دنوں تک نہیں بنانی پڑی۔ دو دن بعد وہ سامنے تھا۔ علینہ نے ضرورت سے زیادہ باچھیں پھیلا کر استقبال کیا تو اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔

"چائے۔" خالی مسکراہٹ نہیں، اگلے پل وہ لہرا لہرا کر زبردستی کی مہمان نوازی پہ اتر آئی تو شہوار کے دماغ میں ہنگامی سائرن گونجنے لگے۔

"آں۔ نہیں۔ میں۔" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہنے ہی نہیں دیا گیا۔

"کیوں نہیں۔ میں ابھی بنا کر لائی۔" وہ جھپاک سے کچن میں جا گھسی۔

"گڑبڑ ہے شہوار بیٹا!" پہلے وہ کچن کے کھلے دروازے کو مشکوک نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر جب آنکھوں کے سامنے چائے میں زہر کی پڑیا ملاتی علینہ لہرائی تو دل کڑا کر علینہ کے سر پہ جا پہنچا۔ وہاں چولہے پہ دودھ، پتی، چینی ایک ساتھ کیتلی میں ابل رہی تھی اور علینہ اسے کپ میں ڈالنے کے لیے سارے سامان سے لیس کھڑی تھی۔

"یہاں کیوں آ گئے؟ میں بس لا ہی رہی تھی۔" لہجے میں شیرینی ہی شیرینی تھی۔ خالصتاً "ان بیویوں جیسی جنہیں فرمائش پوری کروانے کے لیے ان ہتھیاروں کا استعمال کرنا بخوبی آتا ہو۔" شہوار کو آس پاس ہی نہیں پیٹ میں بھی گڑبڑ محسوس ہونے لگی۔

"اچھا میں باہر بیٹھا رہتا اور یہاں تم چائے میں ڈی ڈی ٹی یا چوہے مار دوا گھول لیتیں؟ میں یوں بے خبری میں اپنی جان دینے والا نہیں، شکل سے ضرور شریف اور معصوم لگتا ہوں مگر۔"

"چائے۔" اس کی نان اسٹاپ خود ستائی اور جتلاتی تقریر علینہ کی غراہٹ تلے دب گئی۔ وہ چائے کا لبالب کپ عین اس کی آنکھوں میں سامنے لے آئی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ گرم گرم چائے چھلک جاتی تو منہ قلفی منہ ہو جاتا۔

"اتنی کم عقلی سے صرف تم ہی سوچ سکتے ہو۔ میں یہاں نیک نیتی سے چائے بنانے آئی تھی۔ تمہاری طرح تخریب کاری کرنے کا نہ شوق ہے، نہ عادت۔ اب پکڑو چائے۔"

کپ ابھی تک خطرناک پوزیشن میں تھا۔ شہوار نے آنکھوں کے ڈیلے گھما کر عین سامنے کسی بندوق کی طرح تنے کپ کو دیکھا اور پھر انہی ڈیلوں میں الجھن سمو کر اس کی سوار کیسا حل کر رہا تھا۔ کپ پکڑ لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ مگر دماغ کے سائرن ہنوز بج رہے تھے۔

"تمہیں پتا ہے مجھے چائے کے نام پر یہ مشروب پینا بالکل پسند نہیں۔ میں صرف چائے پینے کا عادی ہوں۔" اس نے بچ کی راہ نکالنے کی لولی لنگڑی کوشش کی۔

"تمہیں بھی پتا ہے مجھے چائے کے نام پر مذاق پینا پسند نہیں۔" اس کا بے صوت اشارہ اس کی پسندیدہ چائے کی طرف تھا۔

"میں وہ دو پتی پیتی ہوں اور مشروب بنا کر پیتی ہوں اور مت بھولو ہمیشہ تمہیں بھی یہی پلاتی ہوں۔"

کہنے کے ساتھ ہی نہایت سفاکی سے اس نے پرچ کو ایسے تین جھٹکے دیے کہ اس پر رکھا کپ تو چھلکا ہی، شہوار کا دل بھی حلق میں آ گیا۔ عذاب کی موت مرنے سے بہتر تھا، چائے کا کپ لے لیا جائے۔ اگلے پل نہایت شرافت سے کپ تھاما۔ علینہ نے باقاعدہ ہاتھ جھاڑ کر اس کے جلے جی کو مزید آنچ دکھائی۔ کینہ توز نظروں سے اسے گھورنے کے بعد چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا اور اگلے ہی پل فوارے کی طرح باہر نکال دیا۔ علینہ ہونٹ سکوڑے، آنکھوں میں فتح کا نشہ لیے سنجیدگی سے گھورتی رہی۔

"یہ چائے ہے یا زہر؟" کپ سلیب پر پٹخ دیا۔ "نیت رہی تو تمہیں۔"

"نہ چائے نہ زہر، یہ سزا ہے۔" علینہ کے اطمینان میں سرمو فرق نہ آیا۔

"مجھے کیوں دی؟" نمک ملی چائے حلق کے ساتھ گویا زبان بھی جلنے کے بعد کڑوی کر گئی تھی۔

"کیونکہ تم اس کے حق دار ہو۔"

"ابھی بتاتا ہوں پھپھو کو۔" صدمے کی جگہ جھلاہٹ نے لی۔

"تمہیں نے بھی ابھی پریکٹیکل جوک کھلائی تھی ناں کو۔ ابھی آگئی عقل؟" شہوار کی جھلاہٹ فوراً رفوچکر ہوئی۔ ہونٹ مسکرا اٹھے۔

"اس پر تو تمہیں مجھے داد دینی چاہیے تھی۔ میں نے کتنا کمال کا پورٹریٹ بنایا تھا تمہارا۔"

اب کے جھلاہٹ علینہ پہ حملہ آور ہوئی۔

"داد تو تمہیں ماموں اور مامی دیں گے، جب میں ان کو بھی دکھاؤں گی۔ کسی دل کر رہا تھا تو نہ بناتے، ایسا گھٹیا مذاق تو نہ کرتے۔ مس عائشہ میری بے عزتی کر ڈالتیں۔"

آخری جملہ ہونٹ لٹکا کر ادا کیا۔ شہوار نے کچھ دیر دیکھنے کے بعد نرمی سے سوری کہہ دیا تو جیسے اس کا غم و غصہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ شہوار نے فریج سے پانی کی بوتل نکال کر گلاس بھرتے ہوئے اسے پھر سے شاکی انداز میں دیکھا۔

"ویسے ہو بہت بری تم۔"

"اتنی بہت کڑوی تھی؟" نرمی سے پوچھا گیا۔

"پی کر دیکھ لو۔" وہ چڑ گیا۔

"سوری۔" ہونٹ لٹک گئے۔

گلاس رکھنے کے بعد وہ قریب آ کر اس کی آنکھوں میں سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ اس کا یوں بھرپور انداز سے دیکھنا علینہ کا کام تمام کر رہا تھا۔ ابھی بھی وہ گھبراہٹ کا شکار ہونے لگی۔

"ہیجا چھوڑو۔ میں نے کدو کا حلوہ بنایا ہے" وہ چکرائی ہوں تمہیں۔" گھبراہٹ کو مصنوعی جوش سے چھپانا چاہا۔

"کدو کا حلوہ" شہوار نے منہ کے زاویے بگاڑے۔

علینہ فریج سے ڈش نکال لائی۔ شہوار نے اس کے ہاتھ سے ڈش لے کر سلیب پر رکھی اور نہایت اطمینان و فرصت سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"تم سے کس نے کہہ دیا میرے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔" مخمور دھیما لہجہ، علینہ کی گھبراہٹ عود کر آئی۔

"تمہیں ان پیچیدہ راستوں سے گزرنے کی ضرورت نہیں۔ تم ڈائریکٹ دل پر لینڈ کر چکی ہو ڈارلنگ۔" کبھی کبھی اس پر رومانس کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ علینہ بری طرح گھبرا گئی۔

"وہ مجھے لگتا ہے امی بلا رہی ہیں۔"

شہوار نے ہنستے ہوئے ہاتھوں پر گرفت مضبوط کر لی۔

"کیا مصیبت ہے، تم انسان ہو یا جنگلی۔" چھڑانے کی کوشش رائیگاں گئی تو وہ جھنجلا گئی۔ شہوار نے اب کے شرافت سے ہاتھ چھوڑ دیے۔

"بدتمیز۔" کچن چھوڑنے سے پہلے اس نے کہا۔

"آپ کی ہو نا پسند پہ۔" شہوار نے مخمور و مسرور کیفیت میں کہا۔

☆ ☆ ☆

"منو کھاؤ۔" فرائی مچھلی رغبت سے کھاتے ہوئے جمیل صاحب نے شائستہ سے چھیڑ خانی بھی برقرار رکھی ہوئی تھی۔

"آپ کے صاحبزادے کو ماں باپ پہ رحم آ ہی گیا۔"

"میرے صاحبزادے آپ کے کیا ہوئے؟" شائستہ قدرے خفا ہو گئیں۔ اسد سے ان کی بے پایاں محبت باتوں سے جھلک ہی جاتی تھی۔ ایسا صرف انہیں لگتا

تھا۔

"ڈیڈی! آپ میری ممی کو خواہ مخواہ مت تنگ کیا کریں۔" شائستہ کا پھولا ہوا چہرہ دیکھ کر شہوار نے گویا داد دی۔

"پھر کیا کروں؟" جمیل صاحب باز آنے والوں میں سے نہیں تھے۔

"میں بتاؤں؟" قبل اس کے کہ شائستہ کوئی جواب دیتیں، علینہ کی چہکتی آواز نے سب کو متوجہ کر لیا۔

"آپ اندر آ چکی ہیں۔" شہوار کی نگاہیں مسکرانے لگی تھیں مگر بظاہر سنجیدگی سے کہا۔

"السلام علیکم۔" زور دار سلام جھاڑتے ہوئے بے تکلفی سے ان کے درمیان بیٹھی۔

"وعلیکم السلام۔ آج ہماری بیٹی کیا لائی ہے؟" جمیل صاحب اس کی لائی ہوئی ڈش کا بے صبری سے معائنہ کرنے لگے۔

"شہوار! اپنا کوئی گھر ہے؟ جب دیکھو ہمارے گھر میں گھسی رہتی ہو۔" شہوار نے بلا ارادہ چھیڑا۔

"میرے ماموں، مامی کا گھر ہے، تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟" اس نے لاڈ سے شائستہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"شہوار! یہ الم غلم کھا کر میرے ڈیڈ کو جو بد ہضمی ہو گئی ہے۔" شہوار کا اشارہ اس کی ہنڈیا کی طرف تھا۔

"نہیں یار! بہت مزے کی ہے، کھا کر دیکھو!" جمیل صاحب یوں شوق سے کھا رہے تھے۔ جیسے پہلے کبھی ہنڈیا کھائی ہی نہ ہو۔

علینہ کا موڈ آف ہو گیا۔ جواب دینے کے بجائے ہونٹ بھینچ لیے۔ یعنی شدید ناراضی کا اظہار۔

"تمہاری یہ کوکنگ کلاسز میرے ممی ڈیڈی کے معدے تباہ کر دیں گی۔"

"ماں۔ سمجھائیے نا اپنے بیٹے کو۔" چیخ کر شائستہ سے مدد چاہی تو شہوار نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"شہری! اب چپ کرو۔ کیا اول فول بولے جا رہے ہو۔" شائستہ نے اصلی غصہ دکھا ڈالا۔ شہوار نے سنجیدگی سے علینہ کو دیکھا، پھر مکمل طور پر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کھانا کھا کر کھڑا ہوا اور اسے نظر انداز کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ علینہ کا دل جیسے سکڑنے لگا۔

"علینہ..." آنسو ٹپکنے ہی لگے تھے کہ شہوار کی آواز پر فوراً سر اٹھایا۔

"جانے سے پہلے میری دھن سنتی جانا، نئی بنائی ہے۔" وہ مسکرایا تو علینہ بھی مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

شہوار کا کمرا معمول کی طرح نفاست و قرینے کا آئینہ دار بنا ہوا تھا۔ اسے وہاں آ کر ایک عجیب و خوشگوار سا اپنا پن محسوس ہوتا۔

"شہری یہ اسد بھائی خاصے وحشت ناک لگتے ہیں۔" دیوار پر شہوار اور اسد دونوں کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔

"خبردار۔" اپنے گٹار کی تاروں کو چھیڑتا شہوار مصنوعی دھاڑا۔ "میرے بھائی کی شان میں گستاخی نہیں کرنا۔"

"یہ وہی بھائی ہیں، جنہوں نے بچپن میں دو بار تمہارا سر پھاڑا تھا اور دونوں مرتبہ بے قصور ثابت ہوئے تھے۔"

وہ چڑا رہی تھی۔ اسد کا چھپے خان روپ اسے کبھی نہیں اچھا لگا تھا۔ کزنز کے بیچ یوں رہتا جیسے کہیں کا راجہ اندر ہو۔ کزنز تو کیا شہوار کو بھی کسی گنتی میں نہیں رکھتا تھا۔ "میں... اور صرف میں" کے گرد اس کی دنیا تھی۔

"اب نہ وہ بچپن رہا، نہ وہ حالات۔" شہوار کے لہجے میں لاپروائی تھی۔

"اور ابھی تم اس گھر میں آئی نہیں ہو، ہم بھائیوں میں پھوٹ پہلے ڈالنے لگیں۔"

"بھائی چیچہ گیری چھوڑو اور اپنی یہ دھن سناؤ' مجھے گھر بھی جانا ہے۔ پہلے ہی دیر ہو گئی۔" علینہ نے ثبوت کے طور پر دو' چار جمائیاں بھی لے ڈالیں۔ ابھی وہ گلا کھنکار کے دھیمے سے گٹار کے سر چھیڑنے ہی لگا تھا کہ وہ چلائی۔

"یہ گھریزی کا جو متروک ہو چکا ہے میوزک۔ پھر سے کسی دھن تو نہیں بنا لی؟"

شہوار کو گٹار بجانا بھول گیا۔ ہمیشہ ہی رنگ میں بھنگ ڈالنے والی زبان بولتی تھی وہ۔ وہ پوری طرح سے ناراض ہو گیا۔

"قسم سے سن کر ایسے لگتا ہے جیسے میرے ارد گرد بدروحیں ناچ رہی ہوں۔"

پھولے ہوئے منہ کے ساتھ شہوار نے گٹار واپس رکھ دیا۔ علینہ کی ہنسی بھی زہر لگ رہی تھی۔

"سوری' سوری' سوری۔" ہنسی ضبط کرتے ہوئے اپنے کان پکڑ کر ایک ہی لفظ کی گردان کرتی وہ اس کے قریب پہنچی۔

"ہرگز نہیں۔ جاؤ اب۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔" وہ پوری سنجیدگی سے بولا۔

"کہا نا سوری' مذاق کر رہی تھی۔"

"تم اپنے پاس رکھو اپنا سوری' مجھے نہیں چاہیے' جہاں میں اپنے دل کی بات کہنے لگوں' تمہیں مذاق سوجھ جاتا ہے۔"

"آئندہ نہیں سوجھے گا۔ پکی۔ یہ دیکھو!" گٹار اٹھا کر اس کی گود میں رکھ دیا اور مزید لجاجت دکھائی۔

"اب مان بھی جاؤ' نہیں تو مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔" گٹار تھام کر شہوار نے اس کی پریشان صورت دیکھی اور اس کی چھوٹی سی ناک کھینچ کر گویا بدلہ چکایا۔

"میرا یہ سونگ تمہارے نام ہے۔"

دھن چھیڑنے سے پہلے اس نے جذباتیت سے کہا۔ علینہ کی جان میں جان آئی۔

☼ ☼ ☼

محبت کا یہ ان کہا احساس کسی خودرو پودے کی طرح کب ان دونوں کے دل کی زمین پر پروان چڑھا اور کیسے اس کی آبیاری ہوئی' انہیں نہ تو خبر ہوئی اور نہ ہی جاننے کی خواہش تھی۔ بس یہی کافی تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ ان کے بڑے بھی اس معصوم محبت سے آگاہ ہو گئے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے کتنے ضروری تھے' یہ بہت بچپن میں ہی سب کو سمجھا گئے تھے۔

جب اسد اور شہوار اپنے کزنز یا دوستوں کے ساتھ کوئی کھیل کھیلنا چاہتے تو علینہ بھی پہنچ جاتی۔ گھر میں وہ ایک ہی بچی تھی۔ آس پاس بھی اس کی ہم عمر کوئی لڑکی نہیں تھی۔ ایسے میں شہوار اور اسد سے قریبی رشتہ ہونے کی بنا پر وہ جب ان میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کرتی اسد رکاوٹ بن جاتا۔

"لڑکوں میں کھیلنے آئی ہو؟ تمہیں یہاں کوئی لڑکی نظر آ رہی ہے؟ ہم نے نہیں کھلانا تمہیں۔" بالحاظ مروت کے وہ اپنی عادت سے مجبور غصیلے لہجے میں کہتا تو علینہ کی ہنسی وہیں گم ہو جاتی۔ اسد سے مرعوبیت کی وجہ سے باقی بچے بھی اسے کھلانے سے انکاری ہو جاتے۔ وہ ایک طرف آنکھوں میں آنسو بھرے بڑی آس سے انہیں دیکھتی رہ جاتی۔ تب شہوار اس کی اتری صورت اور گیلی آنکھیں دیکھ کر نرم پڑ جاتا اور اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے دوستوں کو چھوڑ دیتا۔ اسد اور باقی بچوں کے ہتھے مذاق آ جاتا۔

"یہ بڑا ہو کر لڑکی بنے گا۔" شہوار ذرا بھی نہ جھجکتا پھر اسد خود ہی چڑ جاتا۔ کبھی علینہ کی شامت اس کے ہاتھوں ہو رہی ہوتی تو بھی شہوار کی خوامخواہ اور گستاخی ہوتی۔

شروع سے ہی وہ بہت ضدی اور خود پرست بچہ تھا۔ ماں باپ کی محبت پر صرف اپنا حق جتانے والا۔ شائستہ اگر شہوار کو اس کے سامنے "میرا چاند' میری جان" کہہ کر پکارتیں تو وہ شائستہ سے باقاعدہ ناراض ہو جاتا کہ آپ نے شہوار کو میری جان کیوں کہا' مجھے کیوں نہیں کہا؟ پہلے ہمیشہ ان دونوں کے لیے ایک جیسے کپڑے اور کھلونے لاتی تھیں۔ اسد اس پر بھی اعتراض کرتا پھر وہ مختلف لانے لگیں تو اسد کو شہوار کی

چیز پسند آ جاتیں مگر جب بھی اپنی چیز پر تو قابض ہو (جاتا) ساتھ ہی اس کی بھی چھپا لیتا۔ اس کی ضد ماننے میں شائستہ نے بھی پس و پیش سے کام نہیں لیا تھا۔ ایسا کرنے میں وہ شہوار کے ساتھ کتنی زیادتی کر جاتیں' یہ احساس جمیل صاحب کے بار بار دلانے پر بھی انہیں نہ ہوا۔ نتیجتاً" اسد خود سر اور ضدی ہو تا گیا تھا۔ شہوار کی چیزوں' کھلونوں پر ملکیت قائم کرنے کے بعد انہیں اپنے پاس بھی نہ رکھتا... توڑ پھوڑ دیتا' یا کسی اور کو دے دیتا۔ مگر شہوار کے پاس نہ رہنے دیتا۔

کئی بار اپنے قصور شہوار کے سر تھوپ کر اسے باقاعدہ سزا دلوائی۔ شہوار بھی بچہ تھا۔ پہلے بہت مظلوم ہوتا' روتا' کتنی دیر تک ملول رہتا مگر شائستہ اور جمیل صاحب اسے کسی نہ کسی طرح سے راضی کر لیا کرتے۔

بہت نامحسوس طریقے سے علینہ' شہوار کے چھوٹے موٹے دکھ اپنے دل پر لینے لگی تھی۔ اسد جو کھلونا شہوار سے چھینتا۔ علینہ وہی کھلونا شہوار کی برتھ ڈے پر اس کو گفٹ کر رہی ہوتی۔ اسد شہوار کو مارنے کے لیے لپکتا علینہ ڈھال بن جاتی۔ وہ علینہ کو دھکیلتا تو شہوار اسے سنبھالنے کو آگے بڑھتا۔ یوں اسد کے لیے علینہ بھی وہ چیز ہو گئی' جو شہوار کے نہیں' اس کے پاس ہونی چاہیے تھی۔

اب وہ ضد کرتا علینہ میری پارٹنر بنے گی۔ علینہ بدک جاتی۔ پر زور انکار کرتی۔ اسد شہوار کو دھمکاتا۔

"یہ میری نہیں بنے گی تو میں ماروں گا اسے۔" محض اس خوف سے کہ اسد' علینہ کو مارے نہیں' شہوار خود علینہ کی منت کرتا۔

"تم بھائی کی پارٹنر بن جاؤ۔ میں اور تم فل پارٹنر بن جاتے ہیں۔"

اور صرف شہوار کی خاطر وہ اسد کی پارٹنر بن جاتی۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کے پارٹنر واقف ہوتے کہ ایسا کرنے سے وہ دونوں بے توجہی سے کھیلتے تھے۔

یوں وقت گزرتا رہا۔ بچپن دور ہوتا گیا۔ اسد کی ضد' شہوار کا صبر اور علینہ کی جھنجلاہٹ برقرار رہی۔ یہاں تک کہ اسد اعلا تعلیم کے لیے لندن گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ شہوار اور علینہ کے دلوں میں نمو پاتے محبت کے خودرو پودے کو جڑیں پھیلانے کے لیے فضا موافق مل گئی۔

☼ ☼ ☼

اسد کی آمد کے دن بھی آ گئے۔ وہ شائستہ کو سرپرائز دینا چاہتا تھا مگر شہوار نے سختی سے منع کر دیا۔

"مام اتنی خوشی سنبھال نہیں پائیں گی۔" شائستہ کی ممتا کا ہر رنگ اسد نے دیکھا تھا اور ان کے مزاج سے آشنا تھا شہوار۔

اسد حیرت انگیز طور پر مان گیا۔ اسے ایئرپورٹ سے جمیل صاحب اور شہوار لینے گئے تھے اور اب وہ تینوں آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہو رہے تھے۔ جہاں شائستہ ابھی بھی چاروں اطراف ناقدانہ جائزہ لینے میں مگن تھیں۔ گھر کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ اس کی پسند ہر شے پر غالب تھی۔ شائستہ نے خود بھی اس کے پسندیدہ رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔

"مام! آپ یہاں ہیں' میں سمجھ رہا تھا بھائی کے استقبال کے لیے گیٹ پر آ جائیں گی۔"

شائستہ نے شہوار کا مذاق سنا کہاں۔ وہ تو یک ٹک اس کو دیکھے جا رہی تھیں۔ قابل رشک قد و قامت' دلکش خدوخال' قیمتی لباس۔ شائستہ کی آنکھیں بہنے لگیں۔

"ارے مما! ایسا روتا بسورتا ویلکم؟" اسد نے ہنستے ہوئے انہیں خود سے لگایا' وہ کھل کر رونے لگیں۔ اسد ان کے سر کو نرمی سے سہلانے لگا۔

"میرا بیٹا آ گیا؟" وہ اسد کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر جیسے خود کو یقین دلانے لگیں۔

"بالکل پورا کا پورا۔ اور مما اندر تو آنے دیں۔ آپ نے تو دروازے پر ہی روک لیا۔" وہ لوگ ابھی لاؤنج کے دروازے سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ اسد کے احساس دلانے پر شائستہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئیں۔

"تمہاری ممانی۔" اسد نے اچانک شائستہ کے گرد بانہیں حائل کر کے گویا اپنے کہنے کی تصدیق چاہی۔
"یہ ہے؟"
"ہاں۔ صرف تمہاری ممانی" شائستہ روتے روتے ہنس دیں۔ جمیل صاحب نے فوراً" شہوار کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ماں بیٹے کے پیار سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ محبت کے علاوہ کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔
"یار۔ صاحبزادے کی خدو خال ہے۔" جمیل صاحب نے تھوڑا آگے ہو کر شہوار کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ زور سے ہنس دیا۔ "آپ ادھر ادھر کی سوچنے کے بجائے یہ دیکھیے کہ بھائی کتنے وجیہہ ہو کر لوٹے ہیں پہچانے بھی نہیں جا رہے۔"
"ہاں یہ تو ہے۔" اس بار جمیل صاحب نے تائید میں گردن ہلائی۔

☼ ☼ ☼

اسد سے ملنے کے لیے آسیہ اور فاروق تو اسی دن چلے گئے۔ علینہ تب گئی جب اسد کے اعزاز میں دوست احباب کو پارٹی دی گئی۔ اسد محفل کی جان بنا ہوا تھا۔ خاندان کی لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی طرح اس سے چپکی ہوئی تھیں۔
"لگ رہے ہیں نا ہالی ووڈ کے ہیرو؟" وہ ایک طرف منہ بنائے بیٹھی تھی۔ جب شہوار نے قریب آ کر اپنا فقرہ جھاڑا۔
"مجھے تو نہیں ان کو ضرور لگ رہے ہیں جو ان کے گرد منڈلا رہی ہیں۔"
"تم ہمیشہ جلتی رہنا۔"
"میں کیوں جلوں گی؟ وہ بھی اس ہیرو کی وجہ سے جس سے میرا کوئی لینا دینا نہیں۔ ہاں اگر تمہارے گرد منڈلائیں تو پھر دیکھنا حشر کروں گی اور تمہیں تو میں تختہ کر دوں گی۔"
"اوہو۔" شہوار اکتا گیا۔ "میں بھائی کی پرسنالٹی کی بات کر رہا ہوں۔"
"ہوں۔" علینہ نے ذرا بھی دلچسپی نہ دکھائی۔ "ان کو دیکھ کر تو مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں جب میری دو پونیاں ہوتی تھیں اور ان کے گینڈے جیسے ہاتھ، جب تمہاری ہڈیاں ہوتی تھیں اور ان کے جنگلی جن والے ایکشن۔"
"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" شہوار جیسے آیا تھا ویسے چلا بھی گیا۔
"میرا کیا بھائی کا بچہ۔" وہ خود سے بڑبڑاتی رہی۔
پارٹی خیر و عافیت سے انجام پذیر ہوئی۔ رشتے دار دوست سب چلے گئے، ایک ماسوائے آسیہ، فاروق لوگوں کے۔ فنکشن کے نئے نئے آثار باقی تھے۔ تھکاوٹ کسی کے بھی چہرے کی مہمان نہیں بنی تھی۔ سب ابھی بھی تر و تازہ نظر آ رہے تھے۔ خوب صورت لباس اور بالکل ہلکا میک اپ کیے علینہ نے اسد کی توجہ اب کھینچی تھی، اس سے پہلے رنگ برنگی تتلیاں اسے چھوڑتیں تو وہ کسی اور طرف دیکھ پاتا۔
"پھپھو! یہ اتنی بڑی ہو گئی؟" علینہ اس کی ستائشی نظروں سے خائف ہو رہی تھی۔
"بھائی! دراصل آپ بہت سارے سال لندن کو دے آئے ہیں۔" شہوار نے جیسے اطلاع دینی چاہی۔
"پتا ہے یار۔ پتا ہے تو بھی بڑا ہو گیا۔" اسد کے کسی بھی انداز سے بچپن والے اسد کا شائبہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔
"پھپھو! یہ گونگی ہو گئی کیا؟ بچپن میں تو بالکل جنگلی بلی ہوتی تھی۔" وہ پھر بولا۔
"یہ اب بھی ویسی ہے۔" شائستہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ہاں اور تمہیں یاد ہے، مارتے تم شہوار کو تھے، روتی یہ تھی۔" جمیل صاحب کے لہجے میں بھانجی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔
"جی ہاں۔ اور اکثر شہوار کو مارنے کا بدلہ بھی یہ لیا کرتی تھی۔" اسد نے مزید معلومات پہنچائیں۔ جس پر علینہ نے بھنویں سکوڑیں۔ ایسا کوئی واقعہ اس کی یادداشت میں نہیں تھا۔ وہ دونوں تو ہمیشہ مار کھاتے

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت نظر کمرہ ذرا سے دیکھنے بیٹھی ہی تھی کہ آسیہ سبزی کی ٹوکری لے کر وہیں آ گئیں۔
"دوسرا چینل لگاؤ۔ کوئی پرانا گیت لگا رہا ہو گا۔" علینہ کو پہلے سے پتا تھا اس فرمائش تک ناچار چینل بدلے۔ مزے کی بات ساٹھ کی دہائی کا کوئی گیت لگا بھی ہوا تھا۔ اب سبزی اچھی کٹنی تھی۔ وہ صوفے پر لمبی ہو گئی۔
"امی۔ شائستہ مامی کا نام تو گنیز بک میں آنا چاہیے۔"
"کیوں؟" آسیہ پوری طرح سے ٹی وی میں گم تھیں بے خیالی سے پوچھا۔
"ایسی سوتیلی ماں پہلے کبھی نہ سنی تھی۔"
"کیا مطلب؟" آسیہ کے ابرو تن گئے۔ وہ پوری طرح علینہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ گیت والا بھول گیا۔
"آپ کو نہیں لگتا، شہوار کی حق تلفی کرتی ہیں؟" کسی ٹی وی اینکر کی طرح اس نے یہ سوال کیا۔ یہ خیال کیے بغیر کہ آسیہ سبزی کی ٹوکری بھول کر جلال میں آتی جا رہی ہیں۔
"سوتیلے بیٹے سے اتنا پیار اور سگے بیٹے کو ہمیشہ پھٹکار۔"
"علینہ!" آسیہ کی آواز گھن گرج سے مشابہ تھی۔ علینہ کو باقی الفاظ بھول گئے۔
"آج تو میں یہ سن رہی ہوں۔ آئندہ نہ سنوں۔" ان کی وارننگ [illegible]
"خاندان میں کسی کو بھی یہ بات یاد نہیں ہو گی کہ اسد شائستہ کا سگا بیٹا نہیں ہے اور تم گڑے مردے اکھیڑنے لگیں۔"
"امی میں تو۔"
"چپ کرو اور جاؤ اپنے کمرے میں۔" آسیہ کا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا۔ علینہ پاؤں پٹخ کر جانے لگی۔
"ہیں کیا کفر بول دیا میں نے۔ اتنا غصے ہو رہی ہیں۔ سچ ہی تو کہا ہے۔" دروازے سے نکلنے سے پہلے وہ جو ارشاد کر گئی تھی اسے سن کر آسیہ مزید تپ گئیں۔

☼ ☼ ☼

گھر میں جب بھی وہ اکیلی ہوتی، اطلاعی گھنٹی بجانے والوں کی آزمائش ضرور ہوتی۔ عموماً" آنے والا زچ ہو کر گھنٹی پر ہاتھ جما دیتا۔ تب وہ دروازہ کھولتی۔ آج بھی ایک بار، دو بار، تیسری بار۔ بہت اترا کر، بیزار ہو کر آنے والے کو کوس کر جب وہ دروازے تک گئی تو سامنے اسد کھڑا نظر آیا۔ گھبراہٹ کے مارے حواس ساتھ چھوڑ گئے۔
"السلام علیکم۔ کیا حال ہیں پیاری لڑکی؟" اتنی دیر انتظار کروانے پر کوئی ناراضی، کوئی غصہ نہیں۔ بلکہ ایک پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ مہذب طریقہ گفتگو۔ علینہ کی بوکھلاہٹ دوچند ہو گئی۔
"وہ۔" اس نے حلق تر کیا۔ "وہ۔" وہ کو لبا کیا۔ "اسد بھائی! امی تو گھر پہ نہیں ہیں۔"
"اوہ۔" اس کے چہرے پر مصنوعی مایوسی پھیل گئی۔ علینہ ہکلانے کے موڈ میں نظر آئی۔
"ابو بھی ابھی آفس سے نہیں آئے۔" جلدی جلدی خاص طور وہ [illegible] انداز۔
"یعنی مجھے چلتا کر رہی ہو؟"
"نن نہیں۔ بالکل نہیں۔" امید نہیں تھی اسد صاف کہہ بھی دے گا۔ "آپ آئیے پلیز۔" وہ کترا گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے اسد لاؤنج تک آیا اور وہیں صوفے پر بیٹھنے لگا۔
"چائے پئیں گے؟" اسد کی نظروں سے بچنے کا واحد حل یہی نظر آیا کہ تو اب میزبانی نبھائی جائے۔
"نہیں میں چائے نہیں پیتا۔" اسد جیسے اس کے اندر کی کیفیت جان کر محظوظ ہو رہا تھا۔
"مشروب تو بہت پیتا ہے۔" وہ بالکل غیر ارادتاً" بول گئی۔
"ہاں۔ مشروب واقعی بہت پیتا ہے۔" اسد نے ہنستے

ہوئے تائید کی۔ اس کے بعد جیسے باتیں ختم ہو گئیں۔ اسد ابھی بھی اس کے لیے ایک ہوا تھا۔ نہ ہوا تو شاید وہ اس سے بے تکلف ہو جاتی اور اسد کے لیے شاید زیادہ دلچسپ کام تھا علینہ کو دیکھے جانا۔ جو وہ مسکراتی نگاہوں سے بڑے اطمینان سے کر رہا تھا۔

"پھپھو کب آئیں گی؟" علینہ کے چہرے پر گھبراہٹ اور پھر ناگواری بڑھنے لگی تو اسد کو نارمل ہونا پڑا۔

"دیر سے آئیں گی۔" ایک بار پھر رٹا رٹایا انداز۔ اسد نے انہیں دہرانے کی ذرا کوشش نہیں کی۔

"تم مجھے نکال کر رہو گی۔" علینہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"بھئی بشریٰ آپا کا بچہ پیدا ہوگا تو آئیں گی نا۔" شرمندگی مٹانے کے لیے خفا خفا سے انداز میں جو وضاحت دی اسے سن کر اسد کو زبردستی خاصی محنت سے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹنا پڑا۔ جبکہ وہ دانتوں تلے زبان داب چکی تھی۔

"ہما نے بتایا تھا تم ایم بی اے کر رہی ہو؟" اس کی شرمندگی دور کرنے کی خاطر اسد یوں ہی پوچھنے لگا۔ اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"حیرت ہے۔ میں تو تمہیں میٹرک کی اسٹوڈنٹ سمجھا تھا۔" وہ چپ رہی۔ اسد کی پرشوق نگاہیں کچھ دیر تک اس کے سرخ پڑتے چہرے پر جمی رہیں۔ پھر وہ گہری سانس کھینچتا کھڑا ہو گیا۔

"پھپھو واقعی دیر لگا رہی ہیں۔ میں چلتا ہوں۔" علینہ کی سانس میں سانس آئی۔ جان خلاصی ہونے پر۔

"آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں اسد بھائی!" اب جب وہ جا رہا تھا تو اخلاق دکھانے میں کیا حرج تھا۔

"آپ نے کچھ دیا ہی نہیں۔" بالکل علینہ کے اسٹائل میں اس نے شوخی سے کہا۔ علینہ پھر سے شرمندہ ہو گئی۔

"اتنی فارمل نہ ہو کزن!" پہلی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے اس نے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے جو چاہیے ہوگا پھپھو سے لے لوں گا۔" پھر اس کے عین سامنے آکر بڑے ڈرامائی انداز سے کہا کہ علینہ پوری کی پوری سن سی ہو گئی۔

"گڈ بائے۔" وہ ہاتھ ہلاتا چلا بھی گیا تھا۔ علینہ دروازہ بند کرنے بھی نہ گئی۔

✿ ✿ ✿

آئینے کے سامنے کھڑی علینہ کی نظریں اپنی صراحی دار گردن میں موجود سونے کی بے حد نفیس زنجیر اور اس میں بڑے دل کی شکل کے نگینوں والے لاکٹ پر تھی۔ شہریار کی طرف سے لائے یہ گفٹ آج ہی موصول ہوا تھا۔ آج اس کی برتھ ڈے تھی مگر وہ کسی میٹنگ کی وجہ سے نہ آسکا تھا اور اب وہ اپنی دمکتی گردن پر نازاں اس لاکٹ پر ہاتھ پھیرتی تھک نہیں رہی تھی۔ اسی وقت اس کا موبائل فون اس مصروفیت میں حائل ہو گیا۔

مخصوص رنگ ٹون سے ظاہر تھا کہ کال شہریار کی ہے۔

"تم آئے کیوں نہیں؟" خوں خوار لہجے و انداز میں پوچھا گیا۔

"سالگرہ مبارک۔" دوسری طرف سے شہریار کی مخمور سی آواز ابھری۔ اس کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے۔ بعض اوقات ساری دنیا بھی آپ کے آگے پیچھے گھومے مگر وہ نہیں ہو جس کا دم دل بھرتا ہو تو دنیا بھی ہیچ لگنے لگتی ہے۔ بالکل آج کے دن کی طرح، سب اس کے آس پاس تھے۔ ایک سوائے اس کے، سب نے اس کو مبارک باد دی۔ تحائف مرضی و پسند کے دیے پھر بھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب تک چین لاکٹ گردن میں نہیں گیا اور اب شہریار کی کال نے تو جیسے بچی کچی ناراضی بھی ختم کر دی تھی۔

"تم آئے کیوں نہیں آج؟" اتنی جلدی شہریار کو غیر حاضری پر معاف نہیں کرنا تھی۔ تب ہی تو سوال دوہرایا۔

"گفٹ تو بھیج دیا نا۔" نرمی و محبت سے بات کرتا

اندر تک علینہ کھلنے لگی تھی۔

"خود دینے کیوں نہیں آئے؟" اس کی جرح ایسے کیسے ختم ہو سکتی تھی۔

"مصروف تھا یار۔ بہت زیادہ۔ معاف کر دو۔"

"کر دیا۔" وہ مسکرا دی تھی۔

"اچھا بتاؤ گفٹ کیسا لگا؟" شہریار نے بات بدل کر اشتیاق سے پوچھا۔ علینہ نے بے ساختہ آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

"بہت آؤٹ اسٹینڈنگ ہے۔ میری پسند کا نہیں ہے۔" لہجے میں واضح اتراہٹ اور فخر تھا کہ یہ نخرے تو محبت میں جائز ہوتے ہیں۔

"میری پسند کا ہے۔" شہریار نے زور دے کر جتلایا۔

"یہ دل اوپن بھی ہوتا ہے۔ اس میں اپنی اور میری تصویر لگانا۔"

"ہاں اور اسی سے جوتے بھی کھانا۔" شہریار کے ہی انداز میں اس نے فوراً جواب دیا۔

"اسد بھائی آئے تھے۔ تم نے ٹھیک طرح سے تو استقبال کیا ناں ان کا؟" عام سے انداز میں کہا۔ مگر وہ جو ابھی اور صرف اس کی باتوں سے محظوظ و مسرور ہو رہی تھی۔ ساری جان سے جل کر رہ گئی۔

"جس گھر میں جھنڈیاں لگنی تھیں اور نہ ہی سلامی دینے کے لیے توپیں رکھی تھیں۔" شہریار کو اس جلے کٹے جواب نے خوب لطف دیا۔ دیر تک اور خوب اونچا قہقہہ لگا کر علینہ کو مزید سلگایا۔

"بہت بدتمیز ہو تم بھائی ہیں وہ میرے۔" شہریار ابھی بھی ہنس رہا تھا۔

"اچھا بس امی آ رہی ہیں۔ میرے ہاتھوں میں کتاب کے بجائے موبائل دیکھ کر جوتے اٹھا لیں گی۔" گفتگو کے بیچ اسد کیا آیا سارا رومانس چوپٹ کر دیا۔ اور پھر آسیہ واقعی دروازہ بجا رہی تھیں۔ اس نے فوراً کال کاٹ دی۔

✿ ✿ ✿

کمرے کی فضا سوگوار تھی۔ شائستہ مغموم سی بیٹھی بیٹھی تھیں۔ چہرے پر گہری سنجیدگی اور سوچ کے رنگ بجائے جمیل صاحب یہاں سے وہاں ٹہل رہے تھے۔ شائستہ گاہے بگاہے چور نظروں سے ان کی طرف دیکھتیں، کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتیں اور پھر ہونٹ بھینچ لیتیں۔ ہمیشہ بُردبار بنی رہتیں۔ اور خوش مزاج رہنے والے جمیل صاحب کے ہر ہر انداز سے سنجیدگی ہی نہیں ناراضی بھی ظاہر تھی۔ شائستہ کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی انہیں اپنے نقطہ نظر سے قائل کرنے کی۔ یوں بھی تین دن سے وہ یہی تو کر رہی تھیں۔ وہ بھی پہلی بار انہی کسی بات کو لے کر ضدی ہوئے تھے۔ ان کی کسی بھی دلیل سے جذباتی نہیں ہو رہے تھے۔

صرف اس کمرے کی ہی نہیں۔ اسد کو چھوڑ کر سارے گھر کی فضا خاموش اور سوگوار تھی۔ شہریار کے کمرے سے اس کے گٹار کی دھنیں بجنا بند ہو گئی تھیں۔ وہ جیسے گٹار کی موجودگی کو بالکل بھول گیا تھا۔ صرف گٹار کیا اس کی تو مسکراہٹ بھی اس کے ہونٹوں تک کا راستہ بھول گئی تھی۔ وہ جس کے دم سے گھر پورا لگتا تھا۔ جب گھر آتا تو در و دیواریں بھی کھل اٹھتی ہیں۔ اب تب ہنستا بولتا جب اسد قریب ہوتا کہ اسے دکھانا مقصود ہوتا کہ وہ کتنا خوش ہے۔ بلاوجہ بات بے بات گونجتے قہقہے لگا کر اسد کو ہی نہیں خود کو بھی دھوکا دینے کی ناکام سعی کرتا۔ ایسے میں جمیل صاحب آنکھوں میں سے جیسے تیر نکال نکال کر شائستہ کو دیکھتے۔ جو خود شہریار کے اس مصنوعی پن سے مجروح ہو جاتی تھیں۔ اسد آس پاس نہ ہوتا تو شہریار ماں باپ سے ضرور اسد بھی بات نہ کرتا۔ شائستہ کے ضمیر و دل میں جیسے جرم کا احساس تھا سوا ہو گیا۔ جمیل صاحب بھی شہریار کو حوصلہ دینے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے کہ ردعمل کے طور پر وہ نہ جانے کتنے پرانے درد کھول کر بیٹھ جاتا۔ صرف ہفتہ بھر پہلے ہی رات کے کھانے کے بعد جب لاؤنج میں سبز چائے کا دور چل رہا تھا۔ شائستہ اور پھر شہریار اسد کی پسند کی لڑکی جاننے پر مصر ہو گئے۔

"کوئی بھی نہیں ہے یار اس نظر سے کوئی اچھی

نہیں گی۔"

"ماشاء اللہ قربان جائیے۔" شہوار نے جمیل صاحب اور شائستہ کی طرف دیکھ کر گویا انہی کی کی توصیف کی تائید چاہی۔ "لیکن اب آپ کو یوں چھوڑا بھی نہیں جاسکتا جبکہ سر کے بال بھی سفید ہونے لگے ہوں۔"

"نہیں نہیں یار!" اسد نے بے ساختہ بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"تمہاری کوئی پسند نہیں تو یہ چانس اپنی مما کے وینڈ اور کردو۔ وہ ڈھونڈ لیں گی تمہارے مزاج کی ہے۔"

"مما کو نہیں۔" شہوار نے جمیل صاحب کے مشورے کو فوری مسترد کر دیا۔ "اپنی علینہ بے چاری رشتہ کرانے والی سے ایک چھوڑ دس دس لڑکیاں دکھا دے آپ کو۔"

شہوار نے محسوس نہیں کیا اسد کے ہونٹوں کے ساتھ آنکھیں بھی مسکرانے لگی تھیں۔ "اس مقصد کے لیے ہر ٹائپ کی لڑکی دوست بنا رکھی ہے اس نے آپ کے ہاں لینے کی دیر ہے اور علینہ کی دوستوں کی پٹاری میں سے۔"

"دوستوں کی پٹاری میں سے کیوں؟" شہوار کو امید نہیں تھی اسد یوں بات کاٹ دے گا۔ وہ کچھ خجل سا ہو گیا تھا۔

"علینہ خود کیوں نہیں؟" پھر سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اسد نے گہری پر تجسس نظروں سے سب کے تاثرات جانچے۔

"کیا۔؟" کافی دیر بعد بالکل چونکی آس بھری مسکراہٹ کے ساتھ شہوار نے یوں کہا جیسے یقین ہو وہ سننے میں غلطی کر بیٹھا ہے اور اب پوچھنے پر اسد یقیناً معذرت کر کے کہے گا "میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"کیوں یار، علینہ کی فرینڈز میں سے کوئی کیوں، علینہ خود کیوں نہیں؟" مگر اسد نے جیسے اس کی سماعتیں دھواں دھواں کردیں۔ وہ خالی نظروں سے بس اسد کو تکے گیا۔ سمجھ بوجھ کے سارے فارمولے اس ایک پل میں ذہن سے نکل گئے۔

"کیا ہوا! علینہ اتنی بری ہے کیا؟ اس کا نام سنتے ہی آپ سب فریز کیوں ہو گئے؟"

"بہت بری۔" ایک دم جنگی۔ اندر کہیں بہت ناقابل برداشت تکلیف ہونے لگی تھی۔ اسی تکلیف کو چھپانے کی خاطر مسکرانے کی کوشش میں اس کا چہرہ کیسے راز محبت افشا کر گیا۔ اگر اسد چہرہ شناس ہوتا تو ضرور جان جاتا۔

"کیسے؟" اسد معنوی مایوس سا ہوا۔ اور وہ بیٹوں کے بیچ پنڈولم کی مانند جھولتیں شائستہ کی دعا محو کر گئی جس کے دو رنگ تھے۔ اسد کے لیے الگ۔ شہوار کے لیے الگ۔

"نہیں نہیں بالکل بھی نہیں۔" وہ بولیں تو شہوار نے انتہائی کرب سے انہیں دیکھا۔ جمیل صاحب غائب دماغی سے خیال اور دیکھ رہے تھے۔

"علینہ تو بہت پیاری بہت ہونہار بچی ہے۔ سب کی چہیتی۔" شہوار سے دانستہ نظریں چرا کر مدھم آواز میں شائستہ نے کہا۔

"تو آپ اس بہت پیاری بہت ہونہار اور سب کی چہیتی بچی کے لیے پھپھو سے بات کریں مما۔" اسد نے پورا لائحہ عمل ترتیب دے دیا۔ شہوار کی رنگت زرد ہوتی چلی گئی۔ جمیل یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

"اچھا ہے نا۔ آپ کو دوڑ دھوپ کرنے سے بچا لیا۔" اسد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ شائستہ جبراً مسکرا دیں۔ اور شہوار تو جیسے ذہنی طور پر بالکل ہی غیر حاضر ہو گیا۔

"لیکن بیٹے۔" گلا کھنکارنے کے بعد جمیل صاحب نے بے حد سنجیدگی سے کچھ کہنا چاہا تو شائستہ بری طرح سے ہراساں ہو گئیں اور شہوار کوئی کال سننے کے بہانے باہر نکل گیا۔

شائستہ اور جمیل صاحب بخوبی جانتے تھے وہ منظر سے غائب ہونا چاہتا تھا۔ سو وہ بھی بڑ کھا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس بات کو ہفتہ گزرنے کے بعد بھی سب کے

مزاج پر دانستہ تکلف کی چپ برقرار تھی۔

"میں جمیل نہیں۔" شائستہ کی بھرائی آواز پر جمیل نے رک کر انہیں دیکھا۔ شائستہ کی محبت کی ترجیحات اسد کے لیے اور تھیں شہوار کے لیے اور۔ اور اسی بات پر جمیل صاحب کو اعتراض تھا۔

"ہم ایک بیٹے کو خوش کرنے کی خاطر دوسرے کی خوشی نہیں چھین سکتیں۔" ان کی آواز بلند اور درشت تھی۔

"وہ جمیل۔"

"جانتے بوجھتے تم شہوار کو دکھ نہیں دے سکتیں شائستہ۔" جمیل لفظ چبا کر بولے۔ شائستہ رو پڑیں۔

"اسد نے اتنے عرصے بعد مجھ سے کچھ مانگا ہے۔"

"اسد نے ہمیشہ کی طرح صرف وہی مانگا ہے جو شہوار کا ہے۔" جمیل صاحب طنزیہ بولے۔

"میں اسے کیسے انکار کروں۔ وہ سمجھے گا۔" وہ روتے روتے بولیں۔ جمیل صاحب مزید اشتعال میں آگئے۔

"وہ کچھ نہیں سمجھے گا۔ وہ آٹھ نو سال کا بچہ نہیں رہا۔ ایک میچور مرد ہے۔ وہ سمجھ سکتا ہے تم نے اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کیا۔ محبت، شفقت، ممتا سب کچھ۔ اور آج تک کر رہی ہو۔" جمیل صاحب ان کے سامنے بیڈ پر آبیٹھے۔

"خدا کے واسطے۔" وہ شائستہ کا ہاتھ پکڑ کر منت سے کہنے لگے۔ "اسد کو اپنی ممتا اور محبت کے ہیولے دینا چھوڑ دو۔ ایسا کر کے تم شہوار کی حق تلفی کرتی ہو۔ اس پر ظلم کرتی ہو۔ کبھی تم نے سوچا اسد کے دل میں جگہ بنانے کی کوششوں میں تم شہوار کے دل سے نکلتی جا رہی ہو۔"

شائستہ تھک کر کھڑکی کے آگے جا کھڑی ہوئیں۔ آخری تاریخوں کا چاند اندھیرے کا پاسبان ہوا تھا۔

"ایسا کر کے تم مجھے بھی شرمندہ کرتی ہو شائستہ۔ میں نے کیا کب کہا تھا کہ تم اسد سے محبت کی انتہا کردو اور اپنے سگے بیٹے کی خوشیوں کی قاتل بن جاؤ۔ تم نے مجھے خوش کرنے کے لیے۔" جمیل صاحب سے بات پوری نہیں کی جا سکی۔

"رحم کرو شائستہ، شہوار پر کیونکہ اب معاملہ کھلونوں کا نہیں اس کی زندگی کا ہے، جو اسد چھین لے اور وہ اف بھی نہ کرسکے۔"

شائستہ نے آزردگی سے سر شیشے پر ٹکا دیا۔ دیر تک بے آواز روتی رہیں۔ جمیل صاحب نے چپ نہیں کرایا کہ اس بوچھاڑ کے بعد شاید شفاف راہ شائستہ کو نظر آجائے۔

"لیکن اب میں نے اگر اسد کو انکار کیا تو میری ساری محبت، خلوص، ممتا ختم ہو جائے گی۔" شائستہ کی لرزتی آواز پر جمیل صاحب نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"صرف اور صرف سوتیلی ماں رہ جاؤں گی۔"

☆ ☆ ☆

ابھی ابھی وہ جو سن آئی تھی اس کے بعد حواس کا قابو میں رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ درحقیقت اس کی پوری جان لرز کر رہ گئی تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شہوار کا نمبر ملاتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں جیسے سکت ہی ختم ہو گئی ہو۔ یوں کپکپا رہے تھے کہ موبائل فون بھی سنبھالنا دشوار لگ رہا تھا۔ شہوار کے نمبر پر بیل جا رہی تھی۔ وہ دم سادھے اس کے ہیلو کہنے کا انتظار کرتی رہی۔ مگر بیل جاتے جاتے خود تھک کر بند ہو گئی۔ شہوار نے فون نہیں اٹھایا۔

ایک بار، دو بار، تین بار۔ اور پھر شاید اسے خود بھی گنتی یاد نہ رہی۔ شہوار نہ جانے کن مصروفیات میں پھنسا تھا کہ کال اٹینڈ ہی نہیں کر رہا تھا۔

"شہوار! پلیز میری کال سنو۔ بات کرو مجھ سے ابھی اسی وقت۔ نہیں تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔" نمبر ملاتے ہوئے وہ ایک بار پھر بھرائی ہوئی آواز میں بڑبڑائی تھی مگر کال دو گھنٹیاں جانے کے بعد دوسری طرف سے دانستہ کاٹ دی گئی تو جیسے اس کی آنکھوں

کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

"شہوار..." اس کے لبوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

شہوار کی یہ حرکت سب سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے آسیہ بیگم کے کمرے کی طرف یہ بتانے کے لیے گئی کہ وہ ماموں کی طرف جا رہی ہے تو اندر سے اپنا نام سن کر لمحہ بھر کو رک سی گئی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" آسیہ کا لہجہ رعب لیے ہوئے تھا۔ علینہ نے کان باقاعدہ دروازے سے چپکا لیے۔

"کچھ نہیں... سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" فاروق صاحب کی آواز بھی اٹل تھی۔

"میں سوچ رہی ہوں اسد ضدی طبیعت کا تو ضرور ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس میں متانت آگئی ہے۔ مجھے لگتا ہے علینہ اور اس کا جوڑ برا نہیں۔" جملہ واضح تھے علینہ کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

"عجیب نا سمجھی ہے۔" فاروق خفا ہو گئے۔ "اولاد کی خوشی سے زیادہ تمہیں جوڑ ملانے کی پڑ رہی ہے۔" علینہ نے دروازے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ لیا تھا۔ "اور جوڑ تو شہوار کے ساتھ بھی خوب بنتا ہے۔"

جواب میں آسیہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئیں۔ علینہ کے دل میں سب الٹ پلٹ ہونے لگا۔ ایسی عجیب و غریب بات کانوں میں پڑ گئی کہ لگنے لگا جو کچھ بھی اندر ہے منہ سے باہر آ جائے گا۔ ٹانگیں الگ رعشہ زدہ ہو گئیں۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" آسیہ کی مدھم آواز میں الجھن سی کیفیت تھی۔

"ہم سے پہلے شائستہ اور جمیل کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔" فاروق صاحب کی آواز بلند تھی۔ "حیرت ہے انہوں نے کیا سوچ کر یہ بات کی؟"

جواب میں آسیہ پر پھر چپ کے بادل سایہ فگن ہو گئے۔ یہ سوچ کر کہ آسیہ کے دل میں کہیں نہ کہیں ضرور اسد کے لیے نرم گوشہ موجود ہے، علینہ کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔

"آپ..." آسیہ کی... جھجکتی ہوئی آواز آئی۔ "آپ سوچیں تو اسد بہترین لڑکا ہے۔"

"کوئی شک نہیں کہ اسد بہترین لڑکا ہے۔" فاروق صاحب نے فوراً کہا۔ "لیکن بہرحال وہ شہوار نہیں ہے۔"

"اور تمہیں یا مجھے علینہ کی خواہش یا خوشی کے آگے کچھ سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"ہاں جیسے وہ ہم سے بھی زیادہ سمجھدار ہے؟" آسیہ کی ناگواریت بھری بلند بڑبڑاہٹ باور کرا گئی کہ وہ اسد کو کن نظروں سے دیکھ رہی ہیں اور کیا مقام دینا چاہتی ہیں۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر کسی سسکاری کا گلا گھونٹتی علینہ اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ شہوار کو فوراً فون کیا صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ ماموں، ممانی نے اسد کے لیے بات کی... اور آسیہ کیا سوچے بیٹھی ہیں؟

وہ دونوں ہی کل تک بہت سکون سے اپنے رشتے کے خوشگوار انجام کے منتظر تھے۔ آج منظر دھندلا گیا ہے۔ مگر شہوار اول تو کال اٹینڈ ہی نہیں کر رہا تھا اور آخری تین کالز خود کاٹ دیا تھا۔ بہت جھنجھلا کر آخری بار ملایا تو شہری نے موبائل ہی آف کر دیا تھا۔ وہ ہونق سی رہ گئی۔

"شہری... کیوں کر رہے ہو ایسا... مت کرو۔" موبائل ایک طرف پھینک کر وہ زور زور سے رونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

کھانے کی ٹیبل پر اشتہا انگیز خوشبوئیں کھانے والوں کو مسحور کر رہی تھیں۔ مگر کھانے والے جیسے کھانے سے ہی نہیں ایک دوسرے سے بھی بے زار بیٹھے تھے۔ جامد خاموشی سب پر پہرہ دے رہی تھی۔ رغبت سے کھاتے اسد کا دل بھی اچاٹ

ہو گیا۔ بڑی گہری نظروں سے اس نے سب کا جائزہ لیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے، میرے اس رشتے سے کوئی بھی خوش نہیں ہے۔" شائستہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اسد گہری سنجیدگی سے متوجہ تھا، جمیل اور شہوار بھی اسے دیکھنے لگے۔

"جب سے میں نے بات کی ہے سب کو چپ لگ گئی ہے۔" انہیں اندازہ نہیں تھا وہ یوں صاف گوئی سے پوچھے گا۔ شائستہ تو زرد پڑی ہی تھیں، شہوار بھی بوکھلا گیا جبکہ جمیل صاحب معنی خیزی سے کھنکار کر پلیٹ پر جھک گئے۔

"نہیں... بالکل نہیں... ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟" مصنوعی مسکراہٹ شائستہ کو قدرے ہونق سا بنا گئی۔

"ہم سب بہت خوش ہیں۔" شائستہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔

"شہریار نہیں ہے۔" اسد نے براہ راست اسے دیکھ کر گویا وثوق سے کہا تو وہ خود پہ قابو پاتا بڑی بہادری سے مسکرا دیا۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں بھائی! ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔" اس نے اسد سے زیادہ خود کو یقین دلایا۔

"شیور؟" اس کے پوچھنے میں ابھی بھی شک تھا۔

"آف کورس۔" ایک بار پھر چہرا مسکرانا پڑا۔ اس مسکراہٹ کا ساتھ اسد نے بھی مسکرا کر دیا۔

"چلو شکر ہے... میری شادی کی شاپنگ بھی تم کرو گے۔" وہ انجانے میں اس کے زخم تازہ کر رہا تھا۔

"شیور... میں ہی کروں گا۔" حالانکہ بہت تکلیف ہو رہی تھی مگر وہ کمال کی بہادری دکھا رہا تھا۔

"ہینڈ آف ٹو سرپرائز... پھپھو لوگ سوچنے میں اتنا ٹائم کیوں لے رہے ہیں؟" گھر والوں سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے نیا مسئلہ اٹھایا۔ شہوار نے اپنی پلیٹ میں موجود چاول گننے شروع کر دیے۔

"تم پریشان مت ہو... فاروق بھائی انکار نہیں کریں گے۔ میرے بیٹے کو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔" اسد مبہم سا مسکرا دیا۔ شہوار کرسی گھسیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

شائستہ مسکراتے ہوئے علینہ سے گلے لگیں۔

"اتنے دنوں بعد آئی ہیں؟" اس سے الگ ہو کر شائستہ نے اپنا پہلا شکوہ کیا۔ "بیٹھو۔"

"جی بس..." وہ بیٹھ گئی۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

شائستہ نے اب غور کیا۔ ان چند دنوں میں اس کا سارا وزن کم ہو گیا تھا، چہرے پر الگ زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ شائستہ کو لگا وہ شہوار پر تو ظلم کر ہی رہی ہیں علینہ کو بھی دوہری اذیت دینے کا باعث بن رہی ہیں۔

"ہاں..." انگلیاں موڑتی وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اپنے کمرے سے باہر نکلتا شہوار لاؤنج میں علینہ کو شائستہ کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر واپس کمرے میں چلا گیا۔

بالآخر وہ تھکا ہوا سا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کا سامنا کرنے کی ہمت ممکن ہی نہیں تھی۔ علینہ جس اجڑے بکھرے حلیے میں بیٹھی تھی۔ کیا پتا وہ کمزور پڑنے لگتا۔

کچھ سوچ کر جیب سے موبائل نکالا اور کچن میں شام کی چائے بناتے شکور کو میسج بھیجا۔

"شکور! علینہ آئی ہوئی ہے، باہر اس کے پاس جاؤ، وہ پوچھے تو بتانا میں گھر پہ نہیں ہوں۔"

سارا دن لوٹ پوٹ شاپنگ میسج پڑھنے اور بھیجنے کا شوقین شکور میسج ٹون سے کبھی بھی غافل نہیں ہوتا تھا۔ اس نے فوراً شہوار کا میسج پڑھا اور قدرے حیران ہوا۔ اسے معلوم تھا شہوار اوپر بیڈروم میں ہے۔ کچن سے جھانک کر دیکھا شائستہ علینہ سے مصروف گفتگو تھیں۔ وہ چائے لے کر فوراً وہاں پہنچا۔

"لو چائے بھی آگئی۔"

"نہیں میں چائے نہیں پیوں گی ماں۔" اس کے انداز میں ہمیشہ والا اپناپن غائب تھا۔ شائستہ نے

شدت سے محسوس کیا۔

"کیوں علینہ سے ابھی سب کو۔"

"ہاں! شہوار ہے۔ مجھے اس سے بات کرنی تھی۔" شائستہ کی زبان فوراً اٹک گئی۔ وہ بیٹی اس سے پوچھ رہی تھی۔

"وہ تو ابھی باہر گئے ہیں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔" شائستہ نے حیرت سے فرفر جھوٹ بولتے شکور کو دیکھا۔ وہ بھی انہیں دیکھ کر نظروں سے کچھ سمجھاتا چلا رہا تھا اور شائستہ سمجھ بھی گئیں۔

"کب آئیں گے؟" علینہ کے چہرے پر چھائی سوالی شائستہ کا دل بھینچ رہی تھی۔

"رات ہو جائے گی کہہ رہے تھے۔" شکور کہہ کر واپس کچن میں چلا گیا۔

"اچھا۔" علینہ کی بچی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ وہ لبالب آنکھیں لیے کھڑی ہو گئی۔

"علینہ! بیٹھو تو بیٹا۔"

"نہیں بس۔" شائستہ کی بات کاٹ کر وہ بمشکل کہہ پائی۔ آنسو باہر نکلنے کو بے تاب تھے۔ وہ تیزی سے پلٹ گئی۔ اپنی کھڑکی سے جھانکتا شہوار نڈھال ہو کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

مگر علینہ کے پاس ایک اور اور شاید آخری راستہ موجود تھا۔

اس شام اس کی سیکریٹری نے اسے انٹرکام پہ علینہ کے آنے کی اطلاع دی تو جیسے اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔

"آپ بول دیں انہیں۔ کہہ دیں میں میٹنگ میں بزی ہوں۔" آخری الفاظ منہ میں ہی تھے جب آندھی طوفان بنی وہ اندر داخل ہوئی۔ ہانپتی ہوئی سیکریٹری بھی پیچھے تھی۔

"سر! یہ۔" سیکریٹری بے بسی سے کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے آپ جائیں۔" شہوار نے بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا تو وہ پلٹ گئی۔ علینہ آنکھوں میں غصہ لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"تم مجھ سے چھپ رہے ہو؟" وہ دانت پیس کر پوچھنے لگی۔

"بیٹھ کر میری بات سنو۔" شہوار اس کی جانب قدم بڑھا کر رسان سے بولا۔

"میں کال کروں تم سیل آف کر دیتے ہو۔ میں گھر آؤں تم جھوٹ بول دیتے ہو اور اب؟ اب تم میٹنگ میں بزی ہو؟" شہوار اس زود رو کمزور علینہ میں اپنی نٹ کھٹ سی علینہ کو کھوجتا تھا۔ وہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"علینہ!" ہاتھ پکڑ کر کچھ کہنا چاہا۔ علینہ نے ہاتھ جھٹک دیا۔ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ آنسو بے اجازت بہنے لگے۔

"شہوار۔ کیوں کر رہے ہو تم ایسا؟" پھر خود ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا کہ شہوار خود بھی کرچی کرچی ہو گیا۔ بس نہیں چلا علینہ کو ساتھ لگا کر کہہ دے۔ سب جھوٹ ہے، مذاق ہے، ہم تو آج بھی ساتھ ہیں۔ مگر زبان گونگی ہو گئی تھی۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھے گیا بس۔

"شہوار! ہم ایک دوسرے کے لیے ہیں ناں؟" اس کے پوچھنے میں یقین تھا۔ مگر شہوار چپ رہا۔

"پھر یہ اسد بھائی بیچ میں کہاں سے آ گئے؟" وہ روئے جا رہی تھی اور مقام حیرت کہ آج اس کے رونے کی وجہ وہ خود تھا۔ جو آج سے پہلے خود اس کے آنسو صاف کرتا تھا۔ شہوار کی چپ برقرار رہی تو علینہ کو طیش آ گیا۔

"مجھ سے کسی بھی قیمت پر دستبردار نہ ہونے کا دعوا کرتے تھے، جانتے ہو تم۔ اب اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے چھوڑنے پر کیسے راضی ہو گئے تم؟" روتے روتے وہ چلا اٹھی تھی۔ شہوار کے چہرے پر کرب پھیلتا چلا گیا۔

"اسد بھائی بچپن میں تمہارے کھلونے چھین لیا کرتے تھے لیکن وہ بے جان چیزیں تھیں۔ میں جیتی جاگتی انسان ہوں شہوار!" شہوار نے نظریں جھکا لیں۔

علینہ کا دل شدت سے رونا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"مجھے بے جان چیزوں کی طرح قربان مت کرو۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ شہوار نے بہت نرمی سے اس کے گال پر پھیلے آنسو صاف کیے اور رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

"علینہ۔" اس کی آواز علینہ کو دور سے آتی محسوس ہوئی۔ "اسد بھائی بہت اچھے ہیں۔" علینہ ایک دم سے رونا بھول گئی۔ وہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ وہ یہ کہے گا۔

"شہری!" اس نے بے یقینی سے پکارا۔ شہوار رخ پھیرے کھڑا تھا۔ علینہ کو لگا وہ رو رہا ہے۔ وہ کچھ دیر ٹھہر رہی۔ پھر خود اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ شہوار نے اسے یوں دیکھا جیسے آخری بار دیکھ رہا ہو۔

"تم نے پھر مجھے اسد بھائی کا بنا دیا۔" علینہ کی آواز بھرا گئی۔

"مگر اب تو ہم بچے نہیں ہیں۔ نہ ہم کوئی کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ ہماری زندگی ہے۔ پوری زندگی ایک ساتھ گزارنے کا سوال ہے۔ صرف دو گھڑیوں کے لیے مجھے اسد بھائی کا نہیں بننا۔" شہوار دانت پہ دانت جما کر چپ کھڑا رہا۔

"سن رہے ہو شہری۔ یہ میری پوری زندگی کا سوال ہے۔" علینہ اس کا بازو دبوچ کر چیخی تھی۔ وہ پھر بھی چپ رہا۔ اندر کی اذیت اندر چھپائے سپاٹ اور بے تاثر۔ علینہ آدھی بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بسمل کی طرح اپنا آپ چھوڑ کر گری یوں ہنسی جیسے اپنا مذاق اڑا رہی ہو۔

"ٹھیک ہے۔" پھر وہ بولی تو لہجہ عجیب ہو رہا تھا۔ "سمجھا ہے تو ٹھیک ہی سہی۔" وہ خود اذیتی کی حد تک پہنچ گئی۔

"اس نے ابھی مجھ سے نہیں پوچھا۔" یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ حواس میں نہ ہو۔

"لیکن اب میں ان سے خود جا کر کہہ دوں گی کہ مجھے اسد بھائی کا رشتہ منظور ہے۔" اس نے لفظ چبا ڈالے تھے۔

"دیکھتی ہوں کتنے بڑے سورما ہو تم۔ تمہارے گھر میں تمہارے سامنے تمہاری بھابھی بن کر رہوں گی۔ پھر [illegible]" وہ پلٹ کر جانے لگی۔

"رکو۔ میں چھوڑ دیتا ہوں۔" علینہ دروازے پہ رک کر پلٹی۔

"تم نے مجھے چھوڑ دیا ہے شہوار!" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا اور باہر نکل گئی۔ شہوار کرسی پر گر گیا۔

☼ ☼ ☼

اس سے اگلی رات کو جب وہ خود سے بے گانہ ٹوٹا بکھرا سا اپنے بیڈ روم میں بیٹھا تھا کہ شائستہ اندر داخل ہوئیں۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر غیر حاضر تھا کہ شائستہ نے جب تک اس کے کندھے پہ ہاتھ نہیں رکھا وہ ان کی آمد سے بے خبر رہا۔

"امی آپ۔" وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ شائستہ دنیا بھر کا پیار نظروں میں بسا کر اسے تکتی رہیں۔

"مصروف ہو؟" "نہیں۔" سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ شہوار کو دیکھتے ہی احساس جرم تازہ ہو گیا تھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔" شہوار نے سامنے رکھی فائل بند کر دی اور چپ چاپ شائستہ کی اگلی بات کا انتظار کرنے لگا۔ جنہیں ندامت کچھ بولنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بوکھلا کر کبھی شہوار کو دیکھتیں، کبھی اس کی ٹیبل پر رکھی چیزوں کی ترتیب بدلنے لگتیں۔

"کیسا ہے شہری!" یونہی مصروف نظر آنے کی کوشش میں وہ بولیں۔ "تمہاری پھپھو مان گئی ہیں؟"

شہوار خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھے گیا۔ کہتا بھی کیا۔ مبارک دینے کو دل آمادہ ہوا اور شکوہ کرنے کی تو عادت ہی نہیں تھی۔ بس تکلیف تھی کہ حد سے سوا ہو گئی تھی۔ تو علینہ نے وہی کیا جو وہ کہہ گئی تھی۔ اندازہ تھا پھر بھی دل رونے لگا۔ شائستہ نے بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا!" وہ رونے لگیں۔ شہوار کسی ہارے ہوئے انسان کی طرح بیٹھا رہا۔ جس سے

بچنے کی امید چھین لی گئی ہو۔
"نہیں مجھ رہی گی۔۔ علینہ خود انکار کردے گی لیکن۔۔" شائستہ کی اس بات پر اس کا دل چاہا زور زور سے ہنسے۔ شائستہ نے اس کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ وہ بہت بے چین ہو کر رو رہی تھیں۔

"پلیز چپ ہو جائیں ممّا!" وہ نرمی سے ان کا سر سہلاتا رہا۔ "سب کچھ بھول کر بھائی کی خوشی سیلیبریٹ کریں۔" شائستہ نے سر اٹھا کر متورم آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ خود ٹوٹ چکا تھا۔ انہیں سمیٹ رہا تھا۔

"میں بھی کوشش کروں گا۔" شائستہ کے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ پھر بولا تو آواز بھیگی ہوئی تھی۔ "سب کچھ بھولنے کی۔"

☼ ☼ ☼

زرد لباس میں وہ خود بھی سرسوں کا پھول بنی ہوئی تھی۔ ضرورت سے زیادہ چپ اور بالکل اداس۔ پہلی نظر میں تو اسد کو خدشہ ہوا کہیں وہ بیمار تو نہیں اور وہ پوچھنے بھی لگا تھا، لیکن اس کے آہستگی سے "چلیں" کہنے پر اس کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں بھی دونوں کے بیچ خاموشی حائل رہی۔ وہ کبھی کبھی شیشے کے پار دیکھتی رہی اور اسد الجھا الجھا سا کبھی اسے تو کبھی سامنے دیکھتا رہا۔

"تم اتنا کیوں نہیں بول رہی تھیں؟"
کچھ تو بولنا تھا۔ جب کہ وہ اسے لایا بھی اسی مقصد کے لیے تھا کہ وہ بولے گی اور وہ سنے گا۔
"کوئی بات نہیں ہے۔" بمشکل علینہ نے جواب دیا۔
"یار! میں اب اتنا بھی خوفناک نہیں ہوں۔" اسد نے فضا کی گمبھیرتا دور کرنے کی خاطر شوخی دکھانی چاہی۔
"ایسی بات نہیں ہے۔" علینہ کو بولنے سے چڑ ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔" اسد نے زیادہ دیر بحث مناسب نہیں سمجھی۔ یوں بھی علینہ کے چہرے پر بڑا واضح اختلاف لکھا تھا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا آخر کب تک۔
"تم کوئی ڈھنگ کا کلر پہن لیتیں۔" اسد کا اشارہ اس کے زرد رنگ کے سوٹ کی طرف تھا۔ علینہ استفہامیہ اسے دیکھنے لگی۔
"اس میں تمہارا چہرہ بھی نہیں نظر آ رہا۔ کپڑوں کا رنگ تم جیسا لگ رہا ہے۔" علینہ نے بے تکی بات کا کیا جواب دینا تھا، خاموش رہی۔
"ویسے تو تم اپنی مرضی سے بھی شاپنگ کر سکتی تھیں مگر میں چاہ رہا تھا ہم دونوں ایک ساتھ کریں۔" علینہ نے دانت پہ دانت جما لیے۔
بعض اوقات ان چاہے شخص کی سنگت اس کی باتیں کتنی ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ یہ اسے اب اندازہ ہوا تھا۔ اسد کو بھی اس کی بے زاری محسوس ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ بھی نہ بولا۔
"علینہ۔" کافی دیر بعد پکارا تو وہ چونک گئی۔
"پہلے کہاں چلیں۔ جیولری یا پھر ڈریس آرڈر کرنے؟" وہ بہت نرمی سے پوچھ رہا تھا لیکن علینہ کا دم گھٹنے لگا۔ بس نہیں چل رہا تھا چلتی گاڑی سے کود جائے۔

"اسد بھائی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر کبھی پلیز۔" وہ بہت عاجزی سے بولی۔ حیرت و پریشانی کا شکار اسد فوراً اس کی کلائی چیک کرنے لگا۔
"واقعی۔ تمہیں تو ٹمپریچر ہو رہا ہے۔" بہت نامحسوس انداز میں علینہ نے اپنی کلائی چھڑا لی۔
"ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔"
"نہیں پلیز نہیں۔" وہ بری طرح ہراساں ہوئی۔ "مجھے کہیں نہیں جانا۔"
"لیکن علینہ۔۔۔"
"اسد بھائی پلیز! مجھے کہیں نہیں جانا اور اگر آپ زبردستی لے گئے تو میں آئندہ کبھی نہیں آؤں گی۔" انداز دو ٹوک تھا۔ اسد ہونٹ بھینچتا ہوا گاڑی

موڑنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"کہیں جا رہی ہیں؟" اپنے کمرے سے پریشان صورت لیے لاؤنج میں عجلت داخل ہوتی شائستہ کو دیکھ کر جمیل صاحب نے پوچھا تو اسد اور شہیار دونوں متوجہ ہو گئے۔
"علینہ کا فون آیا ہے ابھی۔" شائستہ بے حد فکر مند نظر آ رہی تھیں۔ "وہ کہہ رہی تھیں علینہ کا ٹمپریچر بہت تیز ہو گیا ہے۔ وہ بالکل بے ہوش ہے۔"
اسد اور شہیار ایک ساتھ کھڑے ہوئے۔
"اسے ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ شہری! تم مجھے چھوڑ آؤ۔" عادتاً ان کے منہ سے شہیار کا نام نکلا تھا۔
"میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔" شہیار کے جواب دینے سے پہلے اسد آگے بڑھ گیا۔ علینہ کے ابھی اور سویرے کا ملال فکر میں ڈھل گیا تھا۔ وہ ہر بات بھلائے شائستہ سے پہلے باہر لپکا۔
"میں بھی چلتا ہوں۔" جمیل صاحب بھی ان دونوں کے پیچھے چلے گئے۔
شہیار وہیں بے جان بت کے جیسا کھڑا رہا۔

☼ ☼ ☼

اپنے کمرے میں بیٹھا وہ بے آواز آنسوؤں سے رو رہا تھا۔
علینہ کو اس حالت تک پہنچانے کا ذمہ دار وہ تھا۔ محبت کے دعوے دونوں طرف سے ہوئے تھے مگر ان پہ کھری علینہ اتری تھی۔ اس کے وعدے، اس کی قسمیں پوری ثابت ہوئی تھیں۔
"مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو علینہ!" باآواز بلند بڑبڑا رہا تھا۔
"ممّا۔ آپ کب تک اسد بھائی کو سوتیلی ماں ہونے کا جرمانہ میری خوشیوں کی صورت میں بھرتی رہیں گی۔۔۔ کب تک۔" وہ خود ترسی میں مبتلا ہو کر خود پہ روتا رہا۔ علینہ مکمل رہی تھی۔ اس سے گویا زندگی روٹھ گئی تھی۔

محض اس کی ضد میں آ کر علینہ نے اسد کا ساتھ منظور کیا تھا۔ اس کی بے اعتنائی کا بدلہ وہ خود کو بھینٹ چڑھا کر لے رہی تھی اور وہ اتنا بے بس اور مجبور کہ خاموش تماشائی بننے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔
"ایسا ہے تو کاش ابھی بھی آپ کا سوتیلا بیٹا ہوتا۔" اس کے صبر و برداشت کے تابوت میں یہ جملہ آخری کیل ثابت ہوا تھا۔ وہ ساری رات اس نے روتے ہوئے گزار دی۔

☼ ☼ ☼

صبح آئینے کے سامنے اپنی لال سرخ ہوئی آنکھوں کا جواز سوچ رہا تھا کہ دروازہ ہلکا سا بجا۔
"یس!" اسے ناچار کہنا پڑا ورنہ اس وقت کسی کا سامنا کرنے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ اسد مسکراتا ہوا داخل ہوا۔
"بزی ہو؟" اسے بغور دیکھتے ہوئے اسد نے استفسار کیا۔ وہ نظریں چرا کر رہ گیا۔
"ابھی تو بالکل نہیں۔" اسد اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ شہیار کو اپنا آپ چھپانا مشکل ہو گیا۔
"کوئی کام تھا آپ کو؟" اسد کی کھوجتی نظروں سے خائف سا ہو کر وہ خود پوچھنے لگا۔
"تم روئے ہو؟" اسد نے سنجیدگی سے سوال کیا تو اسے گھبراہٹ نے آ لیا۔
"نن۔ نہیں رووں گا کیوں؟" اس نے مصنوعی خوش گواریت کا سہارا لینا چاہا۔
"تو آنکھیں کیوں اتنی سرخ اور سوجی ہوئی ہیں؟"
"نیند نہیں آئی۔ سر درد کر رہا تھا۔"
"کیا بات ہے۔ جوں جوں منگنی کا دن قریب آ رہا ہے میرے قریب کے لوگ بیمار پڑ رہے ہیں۔ ادھر علینہ ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہی ادھر تم۔"
"بھائی! نیند نہیں آئی تو سر بھاری ہو گیا بس ورنہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
"یار یہ علینہ۔۔۔" شہیار کی وضاحت پر کان نہ دھرتے ہوئے اسد نے ابھی بھی مرغی کی ایک ٹانگ

پکڑ سے دور تھی۔ لیکن اس بار اس کا لہجہ شگفتہ تھا۔

"مجھے کیوں لگتا ہے علینہ اس رشتے سے خوش نہیں۔" ماتھا مسلتا وہ بھی تھکا تھکا سا لگا۔ شہریار نے بے اختیار ٹھنڈی سانس کھینچی۔ گویا مطمئن اسد بھی بس تھا۔

"آپ کا وہم ہے بھائی!" اسد دھیمی سی آواز میں شہریار نے کہا۔

"اچھا یہ دیکھو۔" شہریار نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ "میں نے علینہ کے لیے انگوٹھی لے لی ہے۔ دیکھو کیسی ہے۔" ایک بیش قیمت انگوٹھی اس نے شہریار کو دکھائی۔

"یہ تو بہت بڑی ہے۔" بے ساختہ شہریار کے منہ سے نکلا۔

"ہم میرا مطلب ہے علینہ تو بہت پتلی سی ہے تو۔" اس کی وضاحت پہ اسد تھوڑا سا مسکرا دیا۔

"اچھا ایسا کرو۔ تم مجھے یہ چھوٹی کروا دو۔"

"میں؟" شہریار بدکا۔

"یار! وقت کم ہے۔ مجھے سائز بھی نہیں معلوم۔ پھر وہ بیمار بھی پڑی ہوئی ہے۔" اسد نے بالکل عام سے انداز میں کہا۔

"اوکے میں کروا دوں گا۔"

"تھینکس۔" اسد کے چہرے پہ بڑی روشن سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بھی مسکرانے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں آنکھیں نم ہو گئیں۔

"شکریہ۔" اسد بے اختیار اس کے گلے لگ کر بولے جذب سے بولا اور پھر الگ ہو کر اس کے ماتھے کا بوسہ لیتا باہر چلا گیا۔ شہریار تحیر زدہ سا کھڑا رہا۔

☼ ☼ ☼

آج آسیہ اور فاروقی کے گھر بہار کا سا سماں تھا۔ چار اطراف رنگ ہی رنگ، خوشبوئیں اور قہقہے۔ گھر کی سجاوٹ کے علاوہ تقریب کے مہمان خصوصی یعنی علینہ اور اسد بھی نئے رنگ و ڈھنگ میں تھے۔

علینہ جدید طرز کے انار کلی فراک اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ نفیس سے میک اپ، جیولری میں پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ چہرے کی زردی پہ میک اپ کی تہہ آ جانے سے خاطر خواہ فائدہ ہوا تھا۔ شہریار اور اسد دونوں ایک ہی جیسے تھری پیس سوٹ میں تھے۔ شہریار کی بے چین نظریں علینہ پر پڑتیں تو ہٹنے سے انکاری ہو جاتیں۔ علینہ نے ایک بار بھی اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ آسیہ اور شائستہ کے درمیان بیٹھی وہ اپنے گود میں رکھے ہاتھوں کو تکے جا رہی تھی۔ چہرے پر چھائی سنجیدگی شہریار کا دل کاٹنے کا باعث بن رہی تھی۔

"دفعتاً" جمیل صاحب گلا کھنکار کر حاضرین محفل سے مخاطب ہوئے۔ "رات بہت ہو رہی ہے، رسم شروع کر دیں۔"

"اسد آؤ بیٹا!" شائستہ نے آواز دی۔

"جی مما!" اسد تابعداری سے قریب آ کھڑا ہوا۔

"انگوٹھی پہناؤ۔" وہ پیار سے کہنے لگیں۔ شہریار علینہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ابھی بھی ہاتھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ ارد گرد کیا ہو رہا ہے اس سب سے بے خبر۔ شہریار کو تو یوں گمان ہوا جیسے اس میں سانس ہی نہ ہو۔

"انگوٹھی؟" اس نے بھول پن سے یہاں وہاں دیکھا۔

"شہریار۔" یکدم اس نے پکارا۔ شہریار جھٹکا کھا کر چونکا۔

"انگوٹھی نکال یار!"

"او ہاں۔" اس نے جیبیں ٹٹولیں۔ "میرے پاس رہ گئی۔" انگوٹھی واقعی اس کی جیب سے نکلی۔

"یہ لیجیے۔" مخملی ڈبیا اس کی جانب بڑھائی۔ اسد نے لی نہیں۔ اچانک ہی اس کے گلے آ لگا۔

اسد شہریار کا ماتھا چوم کر الگ ہوا اور اپنی جیب میں سے دل کی شکل والا لاکٹ اور چین بر آمد کر کے شہریار کی مٹھی میں رکھ دیا۔

"سنبھالو اپنی امانت۔" شہریار نے آنکھیں پھاڑ کر پہلے لاکٹ چین کو دیکھا پھر علینہ کو۔ یہ وہی لاکٹ تھا

جو اس نے علینہ کو سالگرہ پہ دیا تھا۔ علینہ ابھی بھی متوجہ نہیں تھی۔ سب حیران کھڑے حق دق ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

"کیا سمجھتے ہو بہت بڑے ہو گئے ہو۔ مجھ سے بھی عقل، سمجھ والے ہو۔ یا پھر رشتے صرف تم ہی نبھا سکتے ہو؟" اسد اس کے کندھے پہ زوردار مکا رسید کر کے زور زور سے بول رہا تھا۔ آس پاس سارے بہت بے خبر کھڑے تھے۔ اب کے علینہ بھی سر اٹھا کر دونوں بھائیوں کو دیکھنے لگی۔

"مجھے بھائی نہیں سمجھتے ہو ناں!" اسد کی آواز بھرا گئی۔ جمیل صاحب اور شائستہ دونوں تڑپ اٹھے۔

"بھائی سمجھتے تو یہ حرکت نہ کرتے۔" اسد کا لہجہ دکھ سے لبریز تھا۔ شہریار کی بھی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

"تمہارے نزدیک میں ہمیشہ کی طرح آج بھی سوتیلا رہا۔"

"بھائی بالکل نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ خدا گواہ ہے۔" شہریار تڑپ کر اس کے گلے آ لگا۔ آسیہ اور شائستہ کی آنکھیں بہنے لگیں۔

"اچھا چلو اب یہ ستارہ انگوٹھی۔" اسے الگ کر کے اسد نے گیلی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے حکم دیا۔

"بھائی میں...؟" شہریار بدک گیا۔

"ہاں تم۔" اسد نے اسی کے انداز میں کہا۔

"یار تو تو ہیرو ہے۔" جمیل صاحب نے اسد کو بھینچ کر کہا۔

"آپ تو زیرو سمجھ رہے تھے۔ مجھے آپ سے بھی شکوہ ہے۔" اسد نے مصنوعی خفگی دکھائی تو وہ ہنس دیے۔

"معاف کر دے یار!" انہوں نے اس کا کندھا دبایا تو وہ مسکرا کر سر ہلانے لگا پھر شائستہ کو دیکھ کر نظروں میں کچھ کہا۔ اسد بھی مسکرانے لگا۔

شائستہ شہریار کو علینہ کے پاس لے گئیں۔ جس کا سکتہ ٹوٹ چکا تھا۔ کسی کا بھی لحاظ کیے بغیر وہ خوں خوار نظروں سے شہریار کو دیکھ رہی تھی۔ علینہ کے پہلو میں بیٹھ کر انگوٹھی پہنانے کے لیے علینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

تھوڑی دیر بعد مبارک سلامت کا شور گونج اٹھا۔ وہی ماحول تھا، وہی لوگ تھے ایک صرف غلط فہمی کا پردہ ہٹ جانے سے منظر بدل گیا تھا۔ شائستہ آسیہ کی مبارک باد وصول کر کے اسد کے قریب جا کھڑی ہوئیں۔ خوشی اور تشکر بھرے آنسوؤں کے ساتھ اسد کو دیکھے گئیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہی سنجیدہ ہو گیا۔

"اسد..."

"اصولاً تو مجھے صرف آپ سے ناراض ہونا چاہیے۔" شائستہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کچھ کہنا چاہا کہ اس کے یہ الفاظ انہیں چپ کرا گئے۔

"آپ نے مجھے ہمیشہ سوتیلا سمجھا مما! جبھی مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ آپ کی محبت پر حرف نہ آ جائے یہ سوچ کر آپ شہریار کے ساتھ لاتعلقی کرتی چلی گئیں۔ مگر اچھا تو میرے ساتھ بھی نہیں کیا۔ درحقیقت مجھ پر اعتبار نہیں تھا آپ کو۔" اسد کے لفظوں میں دکھ اور رنجیدگی تھی۔

"اسد! تم غلط سمجھ رہے ہو۔" شائستہ کی تڑپ شرمندگی میں ڈھلنے لگی۔

"ابا جتنی تو شہریار کی محبت قربان نہ کرتیں۔ شہریار پہ آپ کو مان تھا مجھ پہ نہیں؟" وہ شکوے پہ شکوہ کر رہا تھا۔ شائستہ اس کے ساتھ روتی رہیں۔

"مما میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ اس خوف سے نکل آئیں کہ میں آپ کو کبھی سوتیلا سمجھوں گا یا کوئی آپ کو طعنہ دے گا۔ پلیز مجھے شہریار نہ سہی شہریار جیسا سمجھ لیں۔"

اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"میں نے تمہیں ہمیشہ شہریار سے بڑھ کر سمجھا۔" انہوں نے اسد کے بھیگے گال اپنے ہاتھوں سے صاف کیے۔

"نہیں مما! اب نہیں۔ اب شہریار سے زیادہ نہیں شہریار کی طرح۔ بے شک اس سے کم سمجھیں مگر اپنا سمجھیں اور مجھ پر اعتماد کریں پلیز۔"

"ظلم کا اینڈ ہو گیا ہو تو کھانے کی کچھ کریں؟" اچانک جمیل صاحب کی شوخ آواز ابھری تو اسد اور

شائستہ مسکراتے چہرے لیے کھانے کی ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔
شہیار کی متلاشی نظریں علینہ کی تلاش میں چاروں اطراف گئیں۔ مگر وہ شاید وہاں سے اٹھ کر جا چکی تھی۔
کہاں؟ یہ وہ جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹیرس پہ ریلنگ تھامے وہ خشوع و خضوع سے روئے جا رہی تھی۔ جب شہیار کے کھنکارنے کی آواز گونجی۔ شہیار اس کی جانب آیا تھا۔ سرشار و شاداب۔
"شہیار! آگے مت بڑھنا۔" وہ پھنکاری مگر شہیار ان سنی کیے آگے بڑھتا آیا۔
"میں کہہ رہی ہوں آگے نہیں بڑھو گے۔" انگلی اٹھا کر اس نے وارن کیا تھا۔
"کیوں تم گولی مار دو گی؟" اتنے دنوں بعد اسے دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ شہیار کی شوخی بھی زندہ ہو گئی۔
"عزت پیاری ہے تو وہیں رک جاؤ۔" علینہ اتنی زور سے غرائی کہ گلے میں خراش پڑ گئی۔ تب تک شہیار قریب پہنچ گیا۔
"میری عزت، میری محبت، میرا سب کچھ تمہارا بلکہ میں پورا کا پورا تمہارا۔"
"مجھے یہ وہ کچھ نہیں چاہیے، سمجھے۔ تم میرے خالص جذبوں کے قابل نہیں۔" وہ اور زور سے رو رہی تھی۔ آواز تیز تو کیا سات گھروں تک جا سکتی تھی۔ اس خوف سے شہیار نے اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔
"بے شک گن گن کر بدلے لینا۔ میں واقعی تمہارا قصوروار ہوں مگر ابھی۔"
"معاف نہیں کروں گی تمہیں، ساری زندگی نہیں کروں گی۔" وہ چیخی۔
"سمجھانا نہ کرنا۔ مگر ابھی تو ان پیارے لمحوں کو محسوس کرو اور مجھے بھی کرنے دو۔" شہیار کا مصالحانہ تھا۔ علینہ چپ ہو گئی تھی۔ مگر سسکیاں جاری تھیں۔ شہیار نے اس پل کو غنیمت جان کر سمجھایا اور سب دل میں اتارا۔
"قسم سے بالکل اسٹرابیری لگ رہی ہو۔ ریڈ ریڈ سی۔"
"بکواس نہیں کرو۔" اس کے یوں کہنے پر بے اختیار سرخ پڑ گئی۔ شہیار نے جیب سے چین نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ وہ حیران سی ہو گئی۔
"اچھی حفاظت کرتی ہو میرے تحفے کی۔ بھائی کی کار میں گرا آئی تھیں۔ شکر ہے کہ اس میں تم نے اپنا لاکٹ اور میری تصویر نکال لی تھی۔ ورنہ ڈراپ سین کچھ اور ہوتا۔"
اس نے کس کر مٹھی بند کر لی۔ شہیار نے اس کی بند مٹھی پکڑ لی۔
"شہری! تم دوبارہ تو مجھے ایسے بیچ منجدھار میں چھوڑ دو گے نا؟"
اس کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ بے خوف ڈر۔ شہیار شرمندہ ہو گیا۔
"کبھی بھی نہیں۔" اس نے کان پکڑ لیے۔
"اور اگر ایسا کیا تو یاد رکھنا! اس وقت ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔ گولی مار دوں گی۔"
علینہ نے چھوٹی دو انگلیاں موڑ کر ہاتھ کو پستول کی شکل دے کے شہیار کی طرف اٹھایا۔ شہیار نے ہاتھ پکڑ کر اس کی انگوٹھی والی انگلی کھول کر ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ رہا ہونے لگا تھا۔ سنجیدہ چہرے پہ لو دیتی آنکھیں۔ اس نے ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا مگر اب کہاں بچ سکتی تھی۔

صبا اسلام

"اماں! میں نے آپ سے کہہ دیا ہے۔ مجھے اب اس گھر میں واپس نہیں جانا۔ چاہے جو مرضی ہو جائے۔ میں اب اس شخص کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" طیبہ نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں ایسا کون سا کوڑھ پڑ گیا ہے اس کی شکل میں اب؟" آپا سکینہ نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو نظر نہیں آرہا اور مجھے بتائیں کہ کسی کی صورت صرف کوڑھ کی مرہون منت ہے، اندر کا کوڑھ بھی ہوتا ہے جو باہر آجاتا ہے۔" طیبہ نے نفرت سے کہا۔

"دو سال کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا اگر دو سال تجھے کوئی تکلیف نہ ہوئی تو اب کیا مصیبت آگئی ہے کہ تو گھر چھوڑ چھاڑ کر آکر بیٹھ گئی ہے۔" اماں نے بے زاری سے کہا۔

"دو سال میں نے ہی سہا ہے سب کچھ اور وہ بھی بڑی خاموشی سے صرف اس آس پر کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ دکھ کے بعد سکھ بھی دے گا۔ مگر اماں! انجیر سنیں بھی کچھ دیتی ہیں؟ ان لوگوں کے پاس دینے کے لیے عزت ہے ہی نہیں۔ خالی لوگ ہیں وہ' نہ عزت نہ محبت۔ صحیح کہتے ہیں لوگ' جس کے پاس جو ہوتا ہے' وہی بانٹتا ہے اور ان لوگوں کے پاس صرف نفرت ہے اور وہ وہی دے سکتے ہیں۔ آپ نے صحیح کہا' دو سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ میں نے ان دو سالوں میں پرکھ لیا ہے ان لوگوں کو' وہ نہیں بدلنے والے۔" طیبہ نے زہرخند نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ اماں نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔

"ہم کریہ کنوں والی ہوتی تو گھر چھوڑ کر نہ بیٹھتی ارے تجھ سے ایک شوہر نہ سنبھالا گیا۔"

آپا سکینہ جو طیبہ کی بڑی بہن تھیں' نے ایک اور چھبویا۔

"آپ سے آپ کا شوہر کون سا سنبھالا گیا ہے' تو مار کھاتی ہیں۔" طیبہ نے بھی جوابی وار کر ہی دیا۔

"ہم تو سارا معاملہ نپٹانے آتے تھے۔ تم تو پہلے ہی سر پر سوار ہو گئیں۔ ارے اگر مار کھاتی ہوں تو کیا ہوا۔ اپنے گھر میں تو بیٹھی ہوں' کسی کو کیا پتا کہ میں مار کھاتی ہوں۔ تیری طرح تو نہیں کہ گھر چھوڑ کر تجھ جیسی بے وقوف عورت میں نے ساری زندگی نہیں دیکھی۔" آپا سکینہ سانس لینے کو رکیں۔

"اماں! میں بتاؤں آپ کو۔ یہی کی ساری ہے۔ اس نے ہی اپنا گھر اجاڑا ہے اور سن لیں اماں! کبھی تو نواز مجھے طعنے دے دے کر مار دے گا۔ اس نے اجاڑا ہی ہے' مجھے بھی بسنے نہ دے گی۔" سکینہ اب باقاعدہ زور زور سے رونے لگیں۔

اماں مسلسل سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ جیسے اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

طیبہ آج صبح ہی اپنے سسرال سے لڑ کے آگئی تھی اور اس نے آتے ہی بتا دیا تھا کہ اب وہ نہیں جائے گی۔ اگر اس کے شوہر نے طلاق نہ دی تو وہ خلع لے لے گی مگر واپس نہیں جائے



لحاظ سے ختم ہو گئے تھے۔ اماں کو پریشانی میں اور کچھ نہ سوجھا تو سکینہ آپا کو بلا لیا جو دو گلیاں چھوڑ کر رہتی تھیں۔ یہ ایک لوئر کلاس فیملی تھی اور اس خاندان کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی طیبہ تھی۔ جس نے میٹرک پاس کر رکھا تھا۔ آپا سکینہ نے تو چھٹی جماعت میں ہی پڑھائی سے توبہ کر لی تھی۔

طیبہ کو پڑھنے کا شوق تھا۔ مگر میٹرک کے بعد ابا نے اس کا بیاہ ایک بڑی فیملی میں کر دیا۔ یہ فیملی اسٹیٹس کے لحاظ سے نہیں بلکہ افراد خانہ کی تعداد کے لحاظ سے بڑی تھی۔ چار نندیں' پانچ دیور' ساس سسر' کوئی مذاق کی بات نہ تھی۔ بدمزاج اور دوستوں کے بہکاوے میں آجانے والا شوہر سونے پر سہاگہ تھا۔

"اس نے خود ہی گھر بسانے کی کوشش نہیں کی۔" آپا سکینہ نے آنسو پونچھ کر نہایت نفرت اور حقارت کے ساتھ کہا تو طیبہ بلبلا اٹھی۔

"میں نے گھر بسانے کی کوشش نہیں کی؟ میں نے؟" اس نے بے یقینی سے آپا کی طرف دیکھا۔

"ہاں تو نے' پڑھائی کا رعب جماتی ہو گی کہ وہ چار جماعتیں پاس اور تو دس جماعتیں پاس۔" آپا سکینہ نے ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تو طیبہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

"میں نے گھر بسانے کی کوشش نہیں کی' آپ صحیح کہتی ہیں۔" طیبہ نے غیر مرئی نقطے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں صحیح کہتی ہیں آپ۔ شادی کے دوسرے ہفتے میکے اور سسرال کا سارا زیور انہوں نے بیچ دیا۔ میری ناک میں ایک لونگ تک نہ رہنے دی۔ اماں! آپ کو تو یاد ہے ناکہ وہ سات نگوں والی لونگ میں نے کیسے حاصل کی۔ مجھے سونا پہننے کا شوق تھا۔ میں نے تین سال میں آٹھ سو ساٹھ کی کریاں سو روپے جمع کیے اور دو سو روپے آپ سے لے کر وہ لونگ خریدی تھی۔ دو دن لگائے تھے اس کے گرد سفید رنگ کے نگ اور درمیان میں سرخ نگ ایسے جڑا تھا جیسے ہرتی المقموں کے بیچ کوئی دلہن بیٹھی ہو۔ میں نے بڑا زور لگایا کہ اس کو نہ بیچو مگر کسی نے میری نہ سنی۔ میں چپ رہی کیونکہ اماں نے کہا کہ شوہر ہی سر کا تاج ہوتا ہے۔ میں نے گھر

بنانے کی کوشش کی ہوتی تو چپ کیوں رہتی؟"
ایک ماہ گزرا تھا شادی کو کہ یاسر نے بات بات پر مجھے گالیاں اور برا بھلا کہنا شروع کردیا اور آخری ہاتھ بھی اٹھانے لگا۔ میری غلطی بھی کیا یہ جو سب کچھ سہہ گئی۔" طیبہ نے آنکھیں جھپکیں تو آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ایک لمبی قطار کی صورت میں اس کے گالوں پر بکھر گئے۔

"اللہ نے اولاد کی خوشی دینا چاہی تو وہ بھی برداشت نہ ہوا۔ میری بڑی نند نے مجھے سیڑھیوں سے دھکا دے دیا۔ صرف اس لیے کہ وہ خود شادی کے چھ سال بعد بھی بے اولاد تھی۔ بمشکل میری جان بچی مگر سب سسرالیوں نے بدنصیب اور منحوس کہہ کہہ کر میرا جینا حرام کردیا۔ یاسر نے میری ہر ضرورت سے منہ موڑ لیا۔ گھر کے خرچ کے لیے مجھے بار بار ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ تنگ آگئی تو انہوں نے کہا کہ مجھے ہنر کس لیے دیا ہے گھر میں سلائی کا کام شروع کردے۔ گھر کا سارا بار مجھ پر آگیا۔ تھکے ہارے جسم کو دو گھڑی آرام کے نصیب نہ ہوتے اور میں گھر کا سارا کام نپٹا کر لوگوں کے کپڑے سلائی کرتی' تاکہ میرے پہننے کے لیے بھی کپڑے میسر آسکیں۔ سسرال والوں کو سلائی کے لیے آنے والی عورتیں بھی برداشت نہ ہوتیں۔ طعنے اور کوسنے میری جان نہ چھوڑتے۔

جب سلائی کا کام زیادہ ہونے لگا تو وہی ساس جو مجھے بدنصیب کہتی تھی اب مجھ سے پیسے مانگنے لگی۔ یاسر نے کاروبار چھوڑ دیا اور گھر بیٹھ گیا۔ وہ بھی مجھ سے پیسے مانگ مانگ کر اپنا گزارا کرنے لگا۔ اگر پیسے نہ دیتی تو مارتا۔ انہی دنوں یاسر کے ابا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ سارے محلے سے قرض لے کر پیسے اکٹھے کیے اور ابا کا علاج کروا کر گھر لائے۔ وہ پیسے میں نے کیسے لوٹائے' میں جانتی ہوں یا میرا خدا۔ اس پر بھی مار پیٹ' گالی گلوچ میں نے سہی۔ ایک نند بیاہی تھی چلو بھی کبھار آتی تھی مگر تین نندوں' پانچ دیوروں' ایک شوہر اور ساس سسر کو پالا ہے میں نے دو سال۔ ایک سے بڑھ کر ایک بڑھ حرام۔ دیور اگر کچھ کماتے تو خود ہی اڑا لیتے ہیں۔ بے اولادی اور بانجھ پن کے طعنے میں نے سنے ہیں۔ اپنے بدن پر مار کھا کر میں نے سہا ہے۔ اپنے خون کو لہو کے تیل کی طرح جوتا ہے میں نے۔ اس کے ساتھ دو سال گزارے ہیں' جس نے دو پل کے سکھ نہیں دیے۔ ان شریکوں کو اپنی کمائی میں شریک کیا ہے' جنھوں نے دکھ کو میرا ساتھی بنا دیا ہے۔"

طیبہ کے آنسوؤں کی رفتار اب مزید تیز ہو گئی تھی۔

"ہاں' بس ایک کام میں نے نہیں کیا۔ گھر بسانے کی کوشش نہیں کی میں نے۔ اپنی دس جماعتوں کے زعم میں رہی۔"

طیبہ نے طنز بھرے لہجے میں کہا اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

"مجھے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ میری تو اولاد بھی نہیں ہے۔ جس کے لیے سب سہوں۔ اماں' ابھی وہاں بھی خود کماتی تھی۔ یہاں بھی کما لوں گی' آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ بس اس چھت کا آسرا چاہیے۔"

طیبہ نے اماں کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے گھٹنے پکڑ کر لجاجت سے کہا مگر اماں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنی بیٹی کو دیکھا اور اس کے ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئیں۔

"تمہیں لوگوں کی باتیں نہیں سننی کہ لڑکی کہاں کھاتے ہیں۔ ہم نے تمہیں بیاہ دیا ہے۔ ہمارے گھر دو دن رہنے کے لیے آؤ مگر رہنے کے لیے اپنے گھر چلی جاؤ۔ اسی میں ہماری اور تمہاری عزت ہے۔ تمہیں گھر میں لیں تو سکینہ کو بھی لوگ طعنے دیں گے۔ کل کو وہ آجائے گی۔ اس کے تو چار بچے بھی ہیں۔ ہم کس کس کو سنبھالیں گے۔ اب گھر جاؤ۔ یہاں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمارے لیے نئے مسئلے کھڑے نہ کرو۔"

اماں نے بے رحمی سے کہا اور کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ نہ جانے دور آسمانوں میں کیا تھا' وہ تکے جارہی تھیں۔

"شوہر کے سکھ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔"
اس خوفناک خاموشی کو آپا سکینہ کی آواز نے توڑا۔

"مجھے نفرت ہوگئی ہے اس کی شکل سے۔ جب وہ مجھ پر ہاتھ اٹھاتا ہے تو میرے دل سے صرف ایک دعا نکلتی ہے کہ اس کے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔" طیبہ نے نفرت بھرے لہجے میں روتے ہوئے کہا۔

"توبہ استغفار! اللہ معاف کرے۔ تو تو اس کی سلامتی کی دعائیں مانگا کر۔" آپا سکینہ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

"کیوں مانگوں میں اس کی سلامتی کی دعائیں؟ مجھے اب اس کے ساتھ نہیں رہنا۔ مجھے خلع لینی ہے۔" طیبہ نے چیختے ہوئے کہا۔

"اچھا! خلع لینی ہے۔ کیا وجہ بیان کرے گی خلع لینے کی؟" آپا سکینہ نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

"وجہ؟ ابھی بھی آپ کو وجہ چاہیے۔ یہ جو وجوہات میں نے بیان کی ہیں' یہ کم ہیں کیا؟ ویسے بھی اسلام میں خلع لینے کے لیے یہی وجہ کافی ہے کہ عورت' مرد کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ بیوی کو اپنے شوہر کی شکل سے ہی نفرت ہے۔ یہی وجہ کافی ہے کہ مرد' عورت کو مارتا ہے۔" طیبہ نے کہا۔

"مگر اس کی شکل تو بڑی حسین ہے؟" آپا سکینہ نے طیبہ کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ "صورت' مجھے شکل پسند نہیں ہے۔ نفرت ہے مجھے۔ مرد' عورت کو مارتا ہے۔" آپا سکینہ' طیبہ کی نقل اتارتے ہوئے زور' زور سے ہنسنے لگیں۔

"گورے تو اس کے بغیر ہے کیا۔ عورت کا حسن مرد کے ساتھ ہے تو بچتی ہے کیا اس کے بغیر؟ شکل سے نفرت ہے' تو بڑی سیانی ہے۔" آپا سکینہ ایک بار پھر طیبہ کے الفاظ دہرا کر ہنسنے لگی۔ جیسے کوئی بہت ہی مزاحیہ لطیفہ سن لیا ہو۔

"بہت ہی کم عورتیں ہوں گی جنھوں نے کبھی اپنے شوہر سے مار نہ کھائی ہو۔ فرق بس اتنا ہے کہ کوئی تیری طرح کا بے وقوف سارے جہان کو بتادیتا ہے اور کوئی خاموش رہتا ہے۔ ارے جو مرد مارے نہ وہ کمزور ہوتا ہے' جھلی نہ ہو تو۔" آپا سکینہ ایک بار پھر ہنسنے لگی۔

"میں جارہی ہوں اماں! بچے اسکول سے آنے والے ہوں گے۔ نواز کو روٹی دیر سے ملے تو میری ہڈیوں کو ہی نمک لگادیتا ہے۔ میں ابھی' پتا نہیں کیا خاک بات ہوگئی ہے۔ ایویں ٹینشن نہ لیا کرو۔"

آپا سکینہ نے چادر لپیٹتے ہوئے کہا اور گھر کی دہلیز پار کرگئی۔ اماں خاموشی سے دروازہ بند کرنے لگی اور لنگر پر حق دق بیٹھی طیبہ کی نگاہیں ابھی تک چارپائی پر اسی جگہ ٹکی ہوئی تھیں جہاں سے آپا سکینہ اٹھ کر گئی تھیں۔

حضرت ثابت بن قیس کی بیوی نے ان سے خلع لی تھی اور اس خلع کی وجہ جو احادیث کی کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ ان کی بیوی کو ان کی شکل ناپسند تھی

طیبہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہتے چلے گئے۔ جاہلیت کے اس دور میں جب روشنی کا منبع اور مرکز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تب بھی عورت کے حقوق کا خیال رکھا گیا۔ اللہ نے اپنے کلام میں عورت کو خلع کا حق دیا مگر اکیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں جہاں عورتوں کے حقوق کے لیے بل پاس کیے جارہے ہیں۔ حقیقتاً" عورت آج بھی تہی داماں ہے۔ کیونکہ ایمان کی وہ کرنیں اب صرف مسجد میں کیے جانے والے سجدوں میں رہ گئی ہیں۔ آج بے شمار وجوہات کے باوجود وہ گھر کی چار دیواری میں مرنے کے لیے موجود ہے کیونکہ شوہر کے گھر میں گزاری جانے والی زندگی چاہے ذلت سے بھری ہو مگر پھر بھی باعزت کہلاتی ہے۔

طیبہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ شام کے وقت جب دھوپ ڈھل جائے گی تو وہ دارالامان چلی جائے گی۔

طیبہ نے آخری فیصلہ کرلیا' کیونکہ ظلم کو خاموشی سے سہنے والا بھی اتنا ہی ظالم ہے جتنا ظلم کرنے والا۔

☆



صائمہ اکرم چوہدری

ابن آدم

"وہ اپنے فلیٹ کے ٹی وی لاؤنج میں رکھے صوفہ کم بیڈ پر انتہائی بے ترتیب حلیے میں لیٹا ہوا تھا۔ اس نے گھٹنوں سے تھوڑا نیچے آتی سیاہ شارٹس پہن رکھی تھی۔ اس کی بنیان اور ٹی شرٹ سامنے کارپٹ پر لاپروائی سے پھینکی گئی تھیں۔ سامنے میز پر صبح کے ناشتے کے برتن پڑے تھے۔ وہ انتہائی انہماک سے ارفع عزیز کی پاکستان کے کم عمر محنت کش بچوں پر بنائی جانے والی ڈاکو منٹری فلم دیکھ رہا تھا کیونکہ اسے علم تھا کہ ارفع اس ڈاکو منٹری کے حوالے سے اس سے بہت جلد بات کرے گی اور اگر اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو روٹھنے اور منانے کا سیشن خاصا طویل چلے گا جو آج کل ویسے ہی آتش فشاں بنی ہوئی تھی۔

اس کے پس منظر میں ارفع کی خوب صورت آواز تھی۔ ڈاکو منٹری کا اسکرپٹ، لوکیشنز اور ریسرچ ورک تمام چیزیں ہی لاجواب تھیں۔ وہ اپنا کام انتہائی محنت، لگن اور ایمانداری سے کرنے کی عادی تھی۔ اس نے ڈاکو منٹری اسکرپٹ رائٹنگ کا باقاعدہ کورس آسٹریلیا کی کرفتھ یونیورسٹی سے کیا تھا اور اسی لیے وہ چھوٹی سے

مکمل ناول



چھوٹی باریکیوں کا بھی بے حد خیال رکھتی تھی۔

وہ اپنے کام کے بارے میں پاگل پن کی حد تک جنونی تھی۔ بس کا کیمرا مین اس سے صد درجہ تنگ تھا۔ وہ اسے زچ کر کے رکھ دیتی تھی۔ ابھی تک ارفع نے ڈاکومنٹری کے حوالے سے کیمرے کی تکنیکس کا بھی ایک کورس کر رکھا تھا۔ وہ اپنی سب سے بڑی نقاد خود تھی۔ اس لیے اکثر لوگ اس کے ساتھ کام کرنے سے کتراتے تھے۔ غضنفر نے بڑی دلچسپی سے اس کی ڈاکومنٹری فلم دیکھی اور پھر ٹی وی بند کر کے ریموٹ کنٹرول ایک دفعہ پھر نیلے کارپٹ پر پھینک دیا۔ اسی وقت اس کے فلیٹ کی گھنٹی بجی۔ اس نے کلائی سے گھڑی میں وقت دیکھا' دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

چپل پاؤں میں ڈال کر وہ بے زاری سے بال سمیٹتے ہوئے دروازہ کھولنے گیا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم ابھی پوستیوں کی طرح پڑے ہو گے۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر فوراً اندر داخل ہوئی۔

"تم بھی برے وقت کی طرح ہو جو کبھی بھی آسکتا ہے۔" اس نے سر کھجاتے ہوئے اسے بتایا۔

"بکومت... اور ہزار دفعہ کہا ہے کہ یہ گھر میں عمران ہاشمی بن کر مت پھرا کرو۔ جب دیکھو بنیان پہنے پھر رہے ہوتے ہو۔" ارفع نے کارپٹ سے شرٹ اٹھا کر اس کی طرف اچھالی۔ وہ سخت صدمے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بس' بس! زیادہ اوور ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں' مجھ سے تو تمہارا ایک پروگرام برداشت نہیں ہوتا اور تم نے گھر میں بھی ڈرامے بازی شروع کر دی ہے۔" وہ کارپٹ پر پھیلی چیزوں کو اٹھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ایک دنیا مرتی ہے میرے اس ٹاک شو پر' جس میں تم سو سو کیڑے نکالتی ہو۔" وہ اس کے سامنے آکر مصنوعی غصے سے بولا۔

"ظاہر ہے کہ مرے ہوئے لوگوں کو ہی یہ چیز پسند آسکتی ہے ورنہ زندہ اور عقل والوں کو ایک منٹ میں پتا چل جاتا ہے کہ یہ جو دانشور بن کر سیاستدانوں کو لڑا رہا ہے' یہ نری ڈرامے بازی کر رہا ہے۔ ویسے تم لوگوں کو قوم کے جذبات سے کھیلتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

وہ گیلا تولیہ باہر ٹیرس پر پھیلا کر معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے آج بھی اپنی بلیو مخصوص جینز کے ساتھ سفید کرتا پہن رکھا تھا۔ بالوں کو حسب معمول گول مول کر کے جوڑا سا بنایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی راج ہنس جیسی گردن خاصی نمایاں لگ رہی تھی۔

"اور جو تم ڈاکومنٹریز کے ذریعے دنیا میں مایوسی پھیلاتی ہو' اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ شرٹ کے بٹن کھٹل سے بند کرتا ہوا بولا۔ یہ کام کر کے وہ ایک دفعہ پھر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

"ہم لوگ گفتار کے غازی نہیں۔ دنیا کو حقیقت سے باخبر کرتے ہیں۔ ڈرامے بازیاں نہیں کرتے تحقیق کر کے کام کرتے ہیں۔" وہ اب سی ڈیز کے ڈھیر کو ان کے ٹھکانے پر ترتیب سے رکھتے ہوئے انتہائی اطمینان سے کہہ رہی تھی۔ یہ سارے کام وہ اکثر آتے جاتے یا پھر خصوصاً "اتوار" کو لازمی کرتی تھی۔

"ہم بھی سیاست دانوں کے بخیے ادھیڑنے کے لیے سخت محنت کرتے ہیں۔ ایسے ہی نہیں ایک گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔" غضنفر نے بمشکل جمائی کو روکا تھا۔

"آدھا ٹائم تم لوگوں کو آپس میں لڑانے میں اور آدھا "بریک" لینے میں گزار دیتے ہو۔ آخر میں نکلتا کچھ بھی نہیں۔" وہ ساری چیزیں ٹھکانے پر رکھ کر اب کمرے کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔ کمرے کا حلیہ اب کافی بہتر ہو گیا تھا۔

"وہ تمہاری روشن لال صاحب... آج بھی صفائی کے لیے تشریف نہیں لائیں گی کیا؟" ارفع نے کمرے سے کچن میں بھی جھانکا' جہاں ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔

"ان کی بہو صاحبہ نے ایک دفعہ پھر محکمہ بہبود آبادی کو ٹف دیا ہے۔ تیسرے آٹھویں بچے کی اماں بن گئی ہیں۔ اماں روشن جمال آرا آج کل بہو کی خدمتیں فرما رہی ہیں۔" اس نے شرارتی لہجے میں کہا۔

"ماشاء اللہ... اللہ ہی رحم کرے ان لوگوں کے حال پر... ایک کمرے کا گھر اور گیارہ بندے۔" وہ اپنے اسٹیپ کٹنگ بالوں کو جو کھل گئے تھے اب گول مول جوڑے کی شکل میں ایک دفعہ پھر باندھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی۔

"ویسے اماں ایک مشورہ دے رہی تھیں' تمہارے لیے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت مچل رہی تھی۔ ارفع نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہ کہہ رہی تھیں کہ ارفع بی بی سے کہنا کہ اب یہ فلمیں شلمیں بنانا چھوڑے اور آکر اپنا گھر سنبھالے۔ انہوں نے کوئی ساری زندگی کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا مجھ معصوم کا۔" اس کی اداکاری عروج پر تھی۔

"انہوں نے کون سا "مفت" میں ٹھیکا لے رکھا ہے۔ مہینے میں دس تو چھٹیاں کر لیتی ہیں۔ چار پانچ تم دے دیتے ہو' ان کا تو مفت کا وظیفہ لگا ہوا ہے۔" وہ اب کچن میں آگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سارے برتن اکٹھے کر کے دھوتی' وہ ٹی وی لاؤنج سے اونچی آواز میں بولا۔

"رہنے دو! روشن اماں آرہی ہیں۔ ان کا فون آیا تھا کہ ڈیڑھ بجے آئیں گی۔"

"تو یہ بکواس تم پہلے نہیں کر سکتے تھے' خوامخواہ سارا گھر ابھی صاف کروا لیا۔" وہ باہر نکل کر کمرے میں سخت برا انداز میں گویا ہوئی۔

"پہلے کہہ دیتا تو تمہارا یہ گھریلو سا روپ کیسے دیکھنے کو ملتا۔ قسم سے اس طرح کام کرتی بہت کیوٹ لگتی ہو۔" وہ شرارت سے ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ارفع کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"سخت لوفر ٹائپ ہو رہے ہو۔"

"جیسا بھی ہوں' اب تو تمہارے پلے پڑ گیا ہوں۔" اس نے پھر ایک لمبی جمائی لی۔

"دوبارہ یہ باسی جمائی لی تو جبڑا توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گی' جب سے آئی ہوں نحوست پھیلا رکھی ہے۔" وہ دوبارہ کچن میں جا کر چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر آئی تو وہ اب بالکل فریش بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ جس کو تم سو سو باتیں سناتی ہو' اس کی اسپانسرشپ اور ریٹنگ پر ساری ایک دنیا آہیں بھرتی ہے۔ یاد نہیں تمہاری بہن نے کتنی منتیں کی تھیں کہ میں اس کے فیشن شو میں حصہ لوں؟ وہ تو مجھے ایسی نمائشی چیزیں پسند نہیں تھیں ورنہ اب تک تو میں ماڈلنگ میں تہلکہ مچا چکا ہوتا۔" ارفع کو معلوم تھا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن یہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے آج تک اس نے زبان سے تسلیم نہیں کیا تھا۔

"تم شوبز کی دنیا میں تہلکہ مچانے سے پہلے ایک دفعہ واش روم میں جا کر اچھی طرح منہ دھو کر آؤ ورنہ جیسے منہ پھاڑ کر تم جمائیاں لے رہے ہو' حلق کا کوا تک نظر آرہا ہے۔ ایک دم جاہل لگ رہے ہو۔" اس کا لہجہ سنجیدہ جب کہ آنکھوں میں شوخی نمایاں تھی۔

"ایک بات تو بتاؤ ارفع عزیز!" وہ حد درجہ سنجیدگی سے ایک دم پھر اٹھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے انتہائی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ "جب تم آسٹریلیا ڈاکومنٹری اسکرپٹ رائٹنگ کا کورس کرنے گئی تھیں' اسی دوران تم نے "ملفوظات" میں بھی پی ایچ ڈی کرلی تھی کیا؟" ارفع نے اس کی بات پر اپنے ہونٹوں پر آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کا گلا بہت صفائی سے گھونٹا اور کچن میں جاتے ہوئے بولی۔

"جی جناب! میں نے "ملفوظات" میں پی ایچ ڈی اسی وقت کی تھی جب تم انگلینڈ سے "سستی اور کاہلی" کے ڈپلومے لے رہے تھے اور تم نے ان ڈپلوموں میں پوری یونیورسٹی میں ٹاپ بھی کیا تھا۔" وہ کون سا اس سے کم تھی۔

"کاش! تم میری تایا زاد کزن نہ ہوتیں' کاش! تم میری ہونے والی منکوحہ اور میری آخری محبت نہ ہوتیں۔" وہ اب دہائی دے رہا تھا۔ "ہائے ماں! ہائے باپ! کن ظالم رشتے داروں میں اپنے اکلوتے بیٹے کو چھوڑ گئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ دنیا کتنی ظالم ہے۔"

"یہ چائے کا کپ پکڑو اور ایکٹنگ بند کرو۔" وہ اپنا مگ تھام کر سامنے پڑے فلور کشن پر بے تکلفی سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک پلیٹ میں کیک رس رکھے ہوئے تھے جن کو وہ چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھی۔ خضر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی نانی خالصتاً "ایرانی حسن" کا ایک لاجواب نمونہ تھیں' وہی چیز وراثت میں اس کی ماما یعنی خضر کی تائی اور ان کی بیٹیوں کو وافر مقدار میں ملی تھی۔ بے تحاشا سرخ و سفید رنگت جیسے کسی نے دودھ میں ہلکا سا لال شربت گھول دیا ہو۔ بے داغ جلد' ستواں ناک' گلابی ہونٹ' بادامی رنگ کی کٹورا سی آنکھیں' لمبا قد اور انتہائی متناسب سراپا' وہ جس قدر خوب صورت تھی اس سے زیادہ اپنے حسن سے لاپروا۔

"تم نے رات نیوز میں دیکھا' شرمین عبید چنائے نے آسکر ایوارڈ کی تاریخ میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس کی ڈاکومنٹری فلم "سیونگ فیس" کیا کمال کی چیز ہے۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ آسکر کی چوراسی سالہ تاریخ میں پاکستان کا نام بھی درج ہوگیا۔ کمال کر دیا شرمین نے۔" وہ کھلے دل سے اسے سراہ رہی تھی۔

"اس میں کمال کی کیا بات ہے؟ "سیونگ فیس" لندن میں مقیم پاکستانی نژاد برطانوی ڈاکٹر جواد کے پاکستان واپس آنے اور ملک میں تیزاب کے حملوں کا شکار خواتین کے حوالے سے کام پر ایک دستاویزی فلم ہے۔ عام سی کہانی ہے۔ کیا خاص ہے اس میں؟" وہ چائے پیتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"خضر حیات! اس قدر اہم کام کو تم عام سی کہاں کہہ رہے ہو؟ اس کے کام کو بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا ہے۔ دنیائے فلم کا سب سے بڑا اعزاز "آسکر ایوارڈ" کیا معمولی بات ہے؟" وہ چائے میں کیک رس بھگونا بھول کر حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم ایک بات بتاؤ ارفع عزیز! کیا عرفان صدیقی نے اپنے کالم میں ٹھیک نہیں لکھا کہ "آسکر ہو یا کوئی اور عالمی اعزاز' صرف اس صورت میں کسی پاکستانی شخصیت' ادارے' تنظیم یا این جی او کا ہی مقدر کیوں بنتا ہے جس میں پاکستانی معاشرے کی گھناؤنی' متعفن اور نفرت انگیز تصویر پیش کی گئی ہو۔ ہمارے سینے پر ایک تمغہ سجا کر پاکستان کو بظاہر شاباش دی جاتی ہے لیکن درحقیقت پاکستان کا تیزاب زدہ مسخ چہرہ ساری دنیا کو دکھا کر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ پاکستان درندوں کی کمین گاہ ہے۔"

"تو کیا ایسا نہیں ہے؟ ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان میں ایسا ہو رہا ہے۔ یہ کوئی غلط بات تو نہیں۔" ارفع کی رنگت کی سرخی میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

"یہ صرف پاکستان میں ایسا نہیں ہو رہا' انڈیا' بنگلہ دیش' نیپال اور حتیٰ کہ یورپی ممالک میں بھی ایسے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں' پھر صرف پاکستان کو ہی ہر جگہ پر کیوں نمایاں کیا جاتا ہے؟" خضر کی آنکھوں سے بھی ناراضی جھلکی۔

"اس لیے کہ تھامس رائٹرز فاؤنڈیشن نے عورتوں کے حوالے سے ایک سروے میں پاکستان کو عورتوں کے لیے تیسرا بڑا خطرناک ملک قرار دیا ہے۔ پہلے نمبر پر افغانستان اور دوسرے پر ڈیموکریٹک ری پبلک آف کانگو ہے۔" بحث میں ہار ماننا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

"ہونہہ۔۔!" خضر نے ناک سے فرضی مکھی اڑائی۔ "کون سی احمقوں کی جنت میں رہتی ہیں آپ ارفع عزیز صاحبہ! یہ سروے کرنے والے کون لوگ ہیں۔ اور اپنا پیٹ ننگا کر کے کون دکھاتا ہے۔ مغرب میں عورتوں کو جیسے پھولوں کی طرح رکھا جاتا ہے نا! نئے دن ان کے اخبارات بھی ایسے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں۔ آپ پتا نہیں کون سی دنیا کی بات کرتی ہیں۔" وہ بھی پی ٹی وی کا ایک کامیاب ایکٹر تھا جس کے پروگرام کی ریٹنگ خاصی زیادہ تھی۔

"وہاں اگر ظلم ہوتا ہے تو انصاف بھی ہوتا ہے۔ ہماری طرح ساری زندگی عدالتوں کے دھکے کھاتے نہیں گزر جاتی۔" وہ پھٹ پڑی۔

"چلو! تم نے یہ تو مانا کہ وہاں بھی ظلم ہوتا ہے۔ ہمیشہ یاد رکھنا کہ ظلم تو ظلم ہی ہوتا ہے' چاہے وہ مرد پر ہو یا عورت پر' لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ظلم کو بھی ہمیشہ صنفی تعصب کے خانے میں فٹ کر کے دیکھتے ہیں۔" خضر نے بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا لیکن ان کی گفتگو ہمیشہ کی طرح اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جس کا اختتام ایک زوردار قسم کی لڑائی پر ہی ہوتا تھا۔

"تم سے تو بحث کرنا ہی فضول ہے' کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہو۔ اصل میں تمہیں تکلیف شرمین کے ایوارڈ لینے پر ہو رہی ہے کہ یہ آسکر اگر پاکستان کو ملا بھی تو ایک عورت کے ہاتھوں۔" وہ اس کے اس "شاہکار" انکشاف پر ہکا بکا رہ گیا۔

"استغفراللہ! کاش کہ جس موضوع پر کام کر کے پوری دنیا کے سامنے پاکستان کا منہ کالا کر کے اس عظیم خاتون کو ایوارڈ ملا ہے' یہ اعزاز شکر ہے کہ کسی پاکستانی مرد کے حصے میں نہیں آیا۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اندر اٹھتے گہرے اشتعال کو چھپا کر وہ بڑے تحمل سے بولا تھا ورنہ ارفع کی یہ عادت اسے خاصی ناپسند تھی کہ وہ خاصے غلط قسم کے اندازے لگاتی تھی۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ! میں تمہیں کیا واقعی اتنا تنگ نظر یا دقیانوس لگتا ہوں کہ میں صنفی تعصب کا بات بے بات مظاہرہ کروں؟" وہ تھوڑا سا جھک کر اس کا سوچتا ہوا انداز دیکھتے ہوئے بولا۔ "صنفی تعصب کا تو پتا نہیں' لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ میری ہر بات کی مخالفت تم اپنا پیدائشی' قانونی اور معاشرتی حق سمجھتے ہو۔" تپ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح ایک "اور" غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ اپنے گھر جانے کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے ڈنر کا کھانا کون بنا کر دے گا؟ ایمان سے سخت بھوک لگی ہے۔" اسے جاتے دیکھ کر وہ بلند آواز میں بولا۔ لہجے میں سارے جہان کی معصومیت سموئی ہوئی تھی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ پیچھے مڑ کر کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ شوخ نظروں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے ٹھیکا نہیں لے رکھا۔" اپنی بات کہہ کر اس نے ٹھاہ کر کے دروازہ بند کیا تھا۔ خضر اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

اس کے فلیٹ سے نکلنے کے ٹھیک دو منٹ بعد اس کے سیل فون کی بپ بجی۔ اس کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ یہ ارفع عزیز کا ہی میسج ہوگا اور وہی ہوا تھا۔

"کچن میں سرخ لنچ باکس میں کریلے گوشت کا سالن ہے' ٹھونس لینا۔" اس کا میسج پڑھ کر ایک بے ساختہ قہقہہ اس کے حلق سے نمودار ہوا تھا۔

ٹھیک دو منٹ بعد ارفع کو اس کا میسج ملا تھا۔

"گاڑی کی ابھی بینک کی قسطیں باقی ہیں' اس لیے آنکھیں کھول کر اور دماغ ٹھنڈا کر کے چلانا۔ تمہاری تو خیر ہے' گاڑی البتہ نئی ہے۔"

☆ ☆ ☆

"ہائے ڈارلنگ! تمہیں معلوم ہے کہ سائنس

"والوں کو ایٹم بم بنانے کا خیال کیسے آیا؟"
خضر حیات کا یہ ایس ایم ایس ارفع عزیز کو اس وقت موصول ہوا جب وہ اسلام آباد کی ایک کچی آبادی پر ڈاکومنٹری بنانے میں مگن تھی۔ وہ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے سر پر چھاتا تانے کھڑی تھی۔ اس نے اس ایس ایم ایس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ خضر کو جب تک اس کا جواب نہیں ملے گا' وہ ڈھٹائی کی تمام حدوں کو توڑتے ہوئے اسے ایک ہی پیغام ہر دو منٹ بعد بھیجتا رہے گا۔

وہی ہوا۔

ٹھیک دو منٹ بعد اس کے سیل فون کی میسج ٹون دوبارہ بجی تھی۔

ارفع نے جھنجلا کر اسکرین کو دیکھا۔

"ارے میری مصروف ترین لڑکا دوست! کیا تمہیں پتا ہے کہ سائنسدانوں کو ایٹم بم بنانے کا خیال کیسے آیا؟"

"نہیں ...!" اس نے مختصراً جواب لکھا۔ دوسری طرف سے جھٹ اطلاع آئی۔

"ان کو ایٹم بم بنانے کا خیال عورتوں کی زبان دیکھ کر آیا تھا ..." سخت مصروفیت کے عالم میں بھی اس لمحہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تن گئی۔

"اپنی فضول باتیں بند کرو اور اپنے پروگرام کا ہوم ورک ڈھنگ سے کرو۔ رات ایک تو تمہارے پروگرام کا موضوع انتہائی گھٹیا تھا' اوپر سے تم نے انتہائی واہیات ٹائی لگا رکھی تھی۔ زہر لگ رہے تھے' دل کر رہا تھا کہ گردن سے پکڑ کر ٹی وی سے باہر نکال لوں۔" اس نے پاس کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بڑی تیزی سے یہ میسج ٹائپ کیا تھا۔ اس کا اسسٹنٹ ایک دفعہ پھر وہاں موجود لوگوں کو ہدایات دینے میں مگن تھا۔ گرمی اور دھوپ کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"وہ خوب صورت ٹائی مجھے میری ایک بہت ہی کیوٹ سی "فین" نے دی تھی۔ اگر میں اس کو نہ لگا کر جاتا تو اس کا دل ٹوٹ جاتا۔" اس کا معصومانہ انداز ارفع کو زہر لگا۔

"ہم تم نے دوبارہ وہ ٹائی لگائی تو اس کا پھندا بنا کر تمہیں اس دنیا سے رخصت کر دوں گی ..." اس کے جوابی حملے پر خضر نے بے اختیار ہی اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر اس کو سہلایا تھا۔ شکر تھا کہ وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھی ورنہ اس سے کوئی بعید نہیں تھی۔

"شام کو ڈنر کروانے کے لیے شرافت سے "مونال ریسٹورنٹ" لے جانا' آٹھ بجے پروگرام کے لیے ریسرچ پہلے ہی کر لینا' کوئی بہانہ نہیں سنوں گی ..." اس کا دھونس بھرا میسج پڑھ کر خضر کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہزار دفعہ کہا ہے کہ مجھے مارگلہ کی خونی پہاڑیوں سے خوف آتا ہے' تمہیں زمین پر کوئی جگہ نہیں ملتی کھانا کھانے کو؟ اس پہاڑی کی گھمن گھیریوں پر چڑھ کر اپنا آدھا خون خشک کر کے کھانا کھانے کی کیا تک بنتی ہے بھلا ...؟" خضر نے بڑی سرعت سے جواب لکھا۔

"ہمیشہ ڈرپوک ہی رہنا۔ تمہیں کیا پتا کہ بلندیوں کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ انسان جب آسمان کو چھونے کی دھن میں اوپر سے اوپر جاتا ہے تو اس کے وجود میں کتنی سرشاری کی لہریں پھیلتی ہیں۔ اس کا اپنا ہی ایک لطف ہے ..." ارفع کا انداز اب کے ذرا فلسفیانہ تھا۔

"مائی ڈیئر! آسمانوں کی بلندیوں کا نشہ اپنی جگہ لیکن زمین کی قدر کرو۔ ہر پستی میں گرنے والا اسی کی گود میں آ کر گرتا ہے۔" خضر حیات سے بحث میں جیتنا کون سا آسان تھا۔

"تم اپنا لیکچر شام کو دینا' آٹھ بجے اور ہاں اس دفعہ مجھے "پیر سوہاوہ" تک جانا ہے ..." ارفع نے اسے خبردار کیا۔

"میرا خیال ہے محترمہ! ابھی اپنی وصیت بھی تعویذ کی صورت میں گلے میں لٹکا کر ساتھ آ جاتا ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میری موت ان ہی پہاڑوں پر آئے گی۔" خضر نے اسے جذباتی کیا۔

"بندے کی اگر شکل اچھی ہو تو اسے بات اس سے بھی زیادہ اچھی کرنی چاہیے۔ خیر! ارفع کو ہم میریٹ میں ہی ڈنر کر لیتے ہیں۔" وہ خلاف توقع جلدی ہار مان

گئی تھی۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں' تمہاری خاطر تو میں ہیلی کاپٹر پر ماؤنٹ ایورسٹ تک جا سکتا ہوں۔ بس ذرا شام میں لڑکیوں والے حلیے میں آنا' بہت عرصہ ہوا تمہیں انسانوں والے روپ میں دیکھے ہوئے۔" وہ اس کے جینز اور لونگ شرٹ والے حلیے سے سخت چڑتا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ شام میں سارہ کی وارڈ روب پر ڈاکا مارنا پڑے گا ..." وہ اس بات سے بھی متفق ہو گئی تھی۔ خضر اس کا میسج پڑھ کر حیران ہو گیا۔ وہ اپنے لباس "ٹام بوائش اسٹائل" پر کسی کا کوئی بھی مشورہ اتنی آسانی سے نہیں مانتی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" خضر نے مسکراہٹ کی علامتی شکل کے ساتھ اسے حیرت بھرا میسج بھیجا۔

"نہیں یار! سخت گرمی لگ رہی ہے' اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہی ہوں۔ تم ٹینشن نہ لو' شام تک میں اپنی اصلی حالت میں واپس آ جاؤں گی ..." وہ اس کی نبض شناس تھی۔ اس کا میسج پڑھ کر خضر کے منہ سے ایک بے ساختہ قہقہہ نمودار ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے میں نے اپنے بچے کی شکل دیکھی۔ کہاں گم تھے تم ...؟" صوفیہ بیگم نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے انتہائی محبت سے کہا۔ وہ ابھی ابھی "صوفیہ ولا" میں ارفع کو پک کرنے آیا تھا۔ اس وقت سب شام کی چائے پر لان میں اکٹھے تھے۔

"خیر تو ہے یہ آج ہیں تو ہیں "مکمل" ڈیش بن کر آئے اور پرفیوم کا بے دریغ استعمال کس خوشی میں کیا ہے؟ کہاں کسی کی سپاری کرنے جا رہے ہو؟" صوفیہ بیگم کے بالکل سامنے بوگن ویلیا کی بیل کے پاس لان چیئر پر نیم دراز سارہ نے توصیفی نظروں سے اپنے ہینڈسم کزن کو دیکھا۔ اس کا لہجہ شرارت میں ڈوبا ہوا تھا۔

"بھئی! تمہاری بہن کے ساتھ کہاں "کسی اور" پر

بم گرانے کا موقع ملتا ہے۔ حشر نہ کر دے میرا یہ اور بار گیا میں ایسی حرکتوں سے۔" اس نے بڑی بے تکلفی سے سارہ کا چائے کا کپ پکڑ کر منہ سے لگا لیا۔

"شرم کر لو اپنی حرکتوں سے تو تم مر کر بھی باز نہیں آ سکتے ..." وہ جل کر بولی۔ جب کہ صوفیہ بیگم اس کی شرارت پر بے ساختہ ہنس رہی تھیں۔

"آپ ہی نے اسے شہ دے دے کر سر پر چڑھا رکھا ہے۔" سارہ نے شکایتی نظروں سے صوفیہ بیگم کی طرف دیکھا' جو اس کے لیے بڑی محنت کے ساتھ چائے کا ایک اور کپ بنا رہی تھیں۔ وہ حقیقت میں ان کا لاڈلا تھا۔ جن دنوں اس کے ماں باپ اکٹھے پی ایچ ڈی کرنے انگلینڈ گئے تھے' اس وقت وہ صرف تین سال کا تھا اور اس نے اپنے بچپن کے پانچ انتہائی قیمتی سال صوفیہ بیگم کی گود میں ہی گزارے تھے۔ اس لیے وہ اپنی ممی کے ساتھ ساتھ صوفیہ بیگم کو ان کی بیٹیوں کی طرح ماما ہی کہتا تھا۔ صوفیہ بیگم اس کی تائی لگتی تھیں' ان کی صرف چار بیٹیاں ہی تھیں۔ اس لیے بھی وہ ان کا خاصا لاڈلا تھا۔

"میں نے سنا ہے اس سیزن میں تمہارے لان کے پرنٹس نے بڑے بڑے ڈیزائنرز کے چھکے چھڑا دیے ہیں؟ فیشن انڈسٹری میں بڑے چرچے ہیں جناب کے۔" اس نے ارفع کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے سارہ کو چھیڑا۔ وہ اس کی ہم عمر تھی اور دونوں میں بلا کی بے تکلفی تھی۔

"بس جی! اپنی تو بات ہی اور ہے۔" سارہ نے اپنے فرضی کالر اکڑائے۔

اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ صوفیہ بیگم کی چاروں ہی بیٹیوں نے اپنے اپنے میدان میں بے مثال کامیابی کے جھنڈے گاڑے تھے۔ حالانکہ جب صوفیہ بیگم کے شوہر کا اچانک ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوا تھا اس وقت ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ارفع صرف دس سال کی تھی۔ ان کی سب سے بڑی دو بیٹیاں جڑواں تھیں' جن میں عفیرہ ایک بہت اچھی ڈرماٹولوجسٹ ڈاکٹر تھیں۔ کچھ عرصہ سے اٹلی میں مقیم

تھیں۔ ان کے میاں بھی پلاسٹک سرجن تھے۔ ان کی جڑواں ماہو کی شادی ایک پروڈیوسر کے ساتھ ہوئی تھی اور ان کا اپنا بھی رجحان شوبز کی طرف تھا۔ آج کل دونوں میاں بیوی کے پروڈکشن ہاؤس کے زیر اہتمام بننے والے ڈرامے خاصے مشہور ہو رہے تھے۔ ان دونوں سے چھوٹی سارہ عزیز نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں باہر سے کافی کورسز کرنے کے بعد نہ صرف اپنی ٹیکسٹائل مل کو کامیابی کے ساتھ سنبھالا ہوا تھا بلکہ وہ فیشن انڈسٹری میں بہت تیزی سے ابھرتی ہوئی ڈیزائنر کے طور پر بھی مانی جا رہی تھی۔ اس کی بوتیکس اور فیشن شوز کا خوب چرچا تھا۔ اس سے چھوٹی ارفع کا رجحان بھی شوبز کی طرف تھا لیکن وہ اپنی تمام تر توانائیاں بس ڈاکومنٹری فلموں کی طرف مرکوز کیے ہوئے تھی۔ صوفیہ بیگم خود بھی ایک کامیاب بزنس وومن تھیں۔ وہ اپنی گارمنٹس فیکٹری کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ سارہ کا بھی خوب ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ رفاہی کاموں کے سلسلے میں بھی وہ خاصی متحرک تھیں اور خواتین کے حوالے سے ایک تنظیم بھی چلا رہی تھیں۔

"تم آج کل کچھ زیادہ بولڈ ہو کر کام نہیں کر رہے ہو؟ ایسے ایسے خطرناک قسم کے جملے بولتے ہو کہ ماما کا بی پی کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔" سارہ کو اچانک ہی یاد آیا تھا۔

"بیٹا! ذرا سنبھل کر اور محتاط انداز میں کام کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے خلاف روز بولتے ہو، وہ کوئی نقصان ہی نہ پہنچا دیں۔ میرا تو دل ہی دہلتا رہتا ہے۔" صوفیہ بیگم کے لہجے اور انداز میں اس کے لیے محبت اور شفقت کی فراوانی تھی۔

"ان میں سے بہت سے لوگ جو آن ایئر پروگرام میں ایک دوسرے کے جانی دشمن دکھائی دیتے ہیں، پروگرام کے اینڈ میں چائے پی کر خوب بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے گپ شپ لگا رہے ہوتے ہیں۔ بس الّو بناتے ہیں بس عوام کو۔" اس کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔

"مجھے معلوم ہے بیٹا! لیکن تم پھر بھی ذرا احتیاط کیا کرو۔" اسے ان کی محبت پر کبھی بھی شک نہیں رہا تھا اسی لیے مسکرا کر بولا۔

"منع کریں ماما! آپ ماہو آپی کی پروڈکشن ہاؤس کے رومانٹک سے اور ساس بہو کے جھگڑوں والے ڈرامے دیکھا کریں۔ یقین کریں ڈراموں میں اتنا رومانس دکھا رہی ہیں کہ میرے جیسے بندے کے کانوں سے دھواں نکلنے لگتا ہے تو باقی لوگوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ میں نے کل انہیں فون کر کے کہا تھا کہ کچھ خدا کا خوف کریں۔ کیوں ینگ جنریشن کا دماغ آپ لوگ خراب کر رہے ہیں۔ ایک تو سیل فون کے پیکجز نے آدھی نوجوان نسل کو تباہ کر دیا ہے، باقی ان ڈراموں کے ذریعے آپ لوگ کر رہے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھا کیا تم نے۔ میں خود ماہی سے کہتی رہتی ہوں کہ اچھی اصلاحی قسم کی کہانیوں پر صاف ستھرے ڈرامے بناؤ، لیکن وہ کہتی ہے کہ لوگ یہی دیکھنا چاہتے ہیں۔" "حد ہے بھئی۔"

صوفیہ بیگم کے انداز میں خفگی کا عنصر نمایاں تھا۔ چکن کے سرمئی کلر کے سوٹ میں ان کی سفید اور شفاف رنگت دمک رہی تھی۔

"کیا کیا جائے ماما! یہ دور ہی ایسا ہے، زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔" کباب کھاتے ہوئے سارہ نے تبصرہ کیا۔

"واہ بیٹا! یہ بھی خوب کہی آپ نے۔ زمانہ کون سا آسمانی مخلوق نے آ کر بسایا ہے، وہاں بھی آپ جیسی زمینی مخلوق ہے اور آپ بھیڑ بکریاں تھوڑی ہیں جن کو جو جہاں چاہے ہانک کر لے جائے۔ بیٹا! اپنی اخلاقی اقدار اور روایات کو خود زندہ رکھنا پڑتا ہے اور جو قوم ایسا نہیں کرتی وہ تاریخ کے اوراق پر عبرت کا نشان بن جاتی ہے۔" صوفیہ بیگم کے ہاتھوں سارہ کی دھلائی پر خضر نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"ماما! کس کو عبرت کا نشان بنا رہی ہیں آپ؟" وہ رسٹ واچ باندھتے ہوئے بڑی عجلت میں باہر نکلی تھی۔

ان تینوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی لمبی قمیص کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ اور کولہاپوری چپل میں وہ آج نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ آج خلاف عادت ہلکا ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ پنک لپ گلوس، بلش آن اور بڑی مہارت کے ساتھ آئی لائنر کا استعمال بھی کر رکھا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کا بھی بے دریغ استعمال کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے کمر تک آتے سلکی بالوں کو نیچے سے ہلکا سا رول کر رکھا تھا۔

"ماشاءاللہ بیٹا! اللہ نظر بد سے بچائے۔" انہوں نے خضر کے بالکل پاس کھڑی اپنی نازک سی بیٹی کو محبت بھرے انداز سے دیکھا۔ یہ ہر لحاظ سے ایک پرفیکٹ پیکج تھا۔

"مبارک ہو ماما! آج آپ کی اس بیٹی نے بھی آخر کار ہاتھ منہ دھو ہی لیا۔ کون سا منتر پڑھ کر پھونکا ہے خضر تم نے؟" سارہ کے ذومعنی انداز اور شرارتی نظروں سے وہ دونوں سٹپٹائے۔

"توبہ ہے سارہ! ایسے نہ میری بچی کے پیچھے پڑ جایا کرو۔" ماما نے اسے ٹوکا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"آپ کو یاد ہے ماما! اس نے آخری دفعہ شلوار قمیص ماہو آپی کی شادی پر پہنا تھا، آج سے کوئی تین سال پہلے۔"

"تمہیں کیا پرابلم ہے، میں پہنوں یا نہ پہنوں؟" وہ بری طرح چڑ گئی۔

"مجھے ویسے تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ہاں جب لوگوں کو پتا چلتا ہے کہ ڈیزائنر سارہ عزیز کی بہن یہ الٹی جلول حلیے والی لڑکی ہے تو وہ میرے کام کے حوالے سے بہت مشکوک ہوتے ہیں۔ ویسے ارفع! اچھی خاصی ہو، میرے نیکسٹ فیشن شو میں ماڈلنگ کیوں نہیں کرتیں؟" سارہ ایک دم جوش میں آئی۔ ارفع کو وہ اکثر و بیشتر اسی طرح سے راضی کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی لیکن ارفع کو اس کام میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے وہ صاف انکار کر دیتی تھی۔

"یاد کر لو بیٹا! میری بہت زبردست برائیڈل ڈریس کی کلیکشن سامنے آنے والی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم سب دلہنوں کو مات دے دو گی۔" سارہ نے اس کی منت کی۔

"جی نہیں، ارفع کسی کیٹ واک میں حصہ نہیں لے گی۔" خضر نے ایک دم ہی اس کی بات کاٹ کر عجلت میں کہا۔ وہ ایک لمحے میں سنجیدہ ہوا تھا۔ اس کے تیزی سے بدلتے تاثرات پر وہ تینوں ہی بری طرح سے چونکی تھیں۔ جس کلاس سے ان کا تعلق تھا، وہاں یہ بالکل ایک عام سی بات تھی۔ خود ماہو اور سارہ بھی اپنے فیشن شوز میں حصہ لے چکی تھیں۔

"اس میں کیا حرج ہے؟" سارہ کو اس کا یوں ٹوکنا بہت برا لگا تھا، لیکن وہ پھر بھی قدرے سنبھل کر بولی۔

"حرج کوئی نہیں ہے، لیکن مجھے پسند نہیں کہ ارفع ایسی کسی کیٹ واک کا حصہ بنے۔" سارہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات کی وجہ سے اس نے اپنا انداز قدرے ہلکا پھلکا رکھا۔

"کیوں؟ جب تم اپنے دوست حسن کی فارمل ایونز کے فیشن شو میں حصہ لے سکتے ہو تو ارفع اپنی سگی بہن کے لیے کام کیوں نہیں کر سکتی؟" سارہ نے بظاہر حیرت بھری ناگواری سے اپنے اس بہترین دوست کو دیکھا جس کی شخصیت کا یہ رنگ اس نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات ارفع کی خاموشی تھی۔

"اس کیٹ واک میں، میں نے مجبوراً حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد میں کسی ایسی ایکٹیویٹی کا حصہ نہیں بنا۔ اور جہاں تک ارفع کی بات ہے تو ساری دنیا جانتی ہے کہ میں اس کے معاملے میں کتنا حساس ہوں، لیکن پھر بھی اگر ارفع ایسا کرنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ ایک دم ہی جذباتی ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ناراضی کا عنصر صاف جھلک رہا تھا۔

"کیا فضول بحث کر رہی ہو سارہ! تمہیں ارفع کے مزاج کا علم نہیں ہے؟ وہ کیوں تمہارے کسی فیشن شو میں حصہ لے گی؟ خضر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہے ناں ارفع؟" صوفیہ بیگم کے لہجے کی معنی خیزی اور اس میں

موجود جواب کو ارفع نے بڑی تیزی سے سمجھا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے خضر! تمہیں پتا تو ہے' مجھے ان فضول فیشن شوز اور کیٹ واک میں کوئی دلچسپی نہیں' پھر کیوں بحث کر رہے ہو؟ چلو! اب نکلیں۔" اس کے لاپروا انداز پر صوفیہ بیگم کے چہرے پر بڑی تیزی سے سکون کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے زیادہ تیزی سے سارہ کا رنگ پھیکا پڑا تھا۔ خضر نے اضطراب سے کھڑے کھڑے پہلو بدلا۔ وہ اب بہت غور سے سارہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے دانستہ شرارت بھرے انداز میں بولا۔

"واہ سارہ! دیکھ لی تمہاری دوستی۔ خوامخواہ تم نے ویسے ہی ارفع کو اپنے فیشن شو میں حصہ لینے کی دعوت دی' میں مر گیا ہوں کیا۔۔۔"

"ابھی تو نہیں مرے' لیکن دوبارہ ایسے فضول ڈائیلاگ بولے تو میرے ہاتھوں تم ضرور شہید ہو جاؤ گے۔" سارہ نے اس کے کندھے پر زوردار مکا مارا۔

"ہائے ہائے! ارفع! ظالم لڑکی نے۔۔۔ اف میرے کندھے کی دو تین ہڈیاں تو ٹوٹ ہی گئی ہوں گی۔" وہ مصنوعی تکلیف کے احساس سے دوہرا ہو رہا تھا۔

"پورا ایکٹر ہے۔ آپ لیجئے وہ آپی کا فون۔ ان کے اگلے ڈرامے میں بکنگ کروا آتی ہوں۔" سارہ نے دھمکی دی۔

"ایکٹنگ تو اس کی اپنے پروگرام میں بھی عروج پر ہوتی ہے' جب مختلف سیاستدانوں کو شہہ دے کر آپس میں لڑا رہا ہوتا ہے۔ ہر وقت ڈرامے نہ کیا کرو بھئی!" ارفع نے اس کا بازو پکڑا اور زبردستی کھینچ کر پورچ کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا کر گول گول گھومتی ہوئی ایک معصوم سی بچی لگ رہی تھی۔ بارش اس کی کمزوری تھی اور اسلام آباد کی پہاڑیوں سے اسے عشق تھا۔ اس وقت وہ رات کی وجہ سے بارش کی بوندوں کو دیکھ تو نہیں سکتی تھی' لیکن انہیں محسوس کرتے ہوئے اس کے چہرے پر پھیلے خوب صورت رنگوں کو خضر حیات بہت آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔ وہ دونوں "مستان ریسٹورنٹ" کے نسبتاً پرسکون گوشے میں بیٹھے آسمان سے گرتی بوندوں کو تسلسل سے گرتا دیکھ رہے تھے کہ اچانک ارفع نے اٹھ کر بے اختیار بارش کو انجوائے کرنا شروع کر دیا تھا۔

"خضر! بارش کی بوندیں کتنی خوب صورت ہوتی ہیں نا۔۔۔" وہ کھلکھلائی۔

"ہاں! لیکن تم سے زیادہ خوب صورت دنیا کی کوئی چیز نہیں۔" اس نے بازو سے پکڑ کر اسے سامنے والی کرسی پر بٹھاتے ہوئے انتہائی جذب اور سچائی سے کہا۔ وہ چونک گئی۔ ایک دلکش سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔

"میں تمہیں دنیا کی سب سے خوب صورت چیز لگتی ہوں؟" وہ ایک ترنگ کے عالم میں سامنے بیٹھے حد درجہ دلکش شخص کو دیکھ رہی تھی' جس کے سامنے اسے اپنا آپ کبھی بھی اہم نہیں لگا تھا۔ اس کے فینز میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ خود اس کی روزانہ آنے والی ای میلز پڑھتی تھی اور خوب کھل کر ہنستی تھی۔ وہ دونوں بہت سالوں سے محبت کی مضبوط ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ اے لیولز کے بعد جب وہ پاکستان آیا تھا تب اس نے پہلی دفعہ اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ دونوں ایک ان کہے معاہدے کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔

"اس میں کوئی شک ہے کیا؟" خضر نے بے اختیار ہی اس کے ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھا تھا۔ ارفع جیسی پر اعتماد اور بولڈ لڑکی بھی ایک لمحے کو جھینپ گئی تھی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے معاملے میں حد درجہ جذباتی تھے۔ دونوں کی ان میں کئی دفعہ لڑائی ہوتی' لیکن اس کے باوجود ان کا ایک دوسرے کے بغیر گزارہ نہیں تھا۔ جن دنوں وہ آسٹریلیا اپنی اسٹڈی کے سلسلے میں گئی تھی' ان دنوں بھی وہ وہاں کے کئی چکر لگا آیا تھا۔ ان کی روز اسکائپ (skype) پر بات ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کو دیے گئے کارڈز' پھول اور گفٹس کی تعداد بھی ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ وہ دونوں اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ایک دوسرے سے بیان کرتے

ہوئے تھے۔

"لو بھئی! تمہاری جوڑی پھر یہاں پہنچ گئی۔۔۔ بابا! جان چھوڑو اس کی۔" نتاشا کی آواز پر وہ دونوں بری طرح اچھلے۔ وہ ان کے سامنے کھڑی کھلکھلا رہی تھی۔

"تم کہاں سے ہر جگہ ٹپک پڑتی ہو۔۔۔" ارفع نے اپنے بری طرح دھڑکتے ہوئے دل کو بمشکل سنبھالتے ہوئے اسے گھورا۔ نتاشا سارے زمانے کی شرارت اپنے چہرے پر سجائے کھڑی تھی۔ وہ ارفع کی بہترین دوست تھی۔ ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کرنے کے بعد وہ ایک انگلش اخبار سے وابستہ ہو گئی تھی۔

"یار! معید کینیڈے کے ساتھ آئی تھی' لیکن اسے اپنی کوئی پرانی گرل فرینڈ نظر آ گئی۔۔۔ جو تمہاری طرح خوب صورت بھی ہے۔ بس وہ وہیں اس کو بیٹھا ہوا ہے اور میں چونکہ سچ کی علمبردار ہوں۔ اتنا جھوٹ برداشت نہیں کر سکتی' اس لیے کھسکنے کے لیے یہاں آ گئی۔" اس نے بے تکلفی سے اپنے ماموں زاد کزن کے بارے میں بتایا جو اس کے ساتھ ہی اخبار کے لیے انویسٹی گیٹنگ (تفتیشی) رپورٹنگ کرتا تھا اور خضر کا بھی ایک اچھا دوست تھا۔

"اچھا! ارفع کی طرح خوب صورت ہے تو میں بھی معید کے ساتھ لائن مار کر آتا ہوں۔" خضر نے شوخی سے کہا۔

"خیر! ارفع جیسا تو کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"تم لوگ ایک دوسرے کو کمپنی دو۔ مجھے سامنے میز پر فلاں بھی دوستوں کے ساتھ نظر آ رہا ہے۔ میں ذرا ان سے مل کر آتا ہوں۔" خضر بھی اپنے دوستوں کو دیکھ کر بے تاب ہوا۔ دراصل وہ جا ہی رہا تھا کہ راستے میں لڑکیوں کے ایک گروپ نے اسے گھیر لیا۔ وہ شاید اسے پہچان چکی تھیں۔

"ارفع! تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" نتاشا نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا جہاں خضر راجا احمد ریا کھڑا ہنس رہا تھا۔

"ڈر کس بات کا؟" ارفع نے خضر سے نظریں ہٹا کر حیرت سے اپنی اس پر خلوص سی دوست کو دیکھا۔

"خضر کے حوالے سے۔۔۔ دیکھو! وہ میڈیا سے تعلق رکھتا ہے اور ڈیشنگ پرسنالٹی کا مالک ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ مختلف فنکشنز میں لڑکیاں اس کے گرد منڈلا رہی ہوتی ہیں۔۔۔"

"کم آن نتاشا! ڈونٹ بی سلی۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک تو مجھے خضر پر اپنی ذات سے بڑھ کر اعتماد ہے اور دوسری بات یہ کہ جو میں ہوں' وہ بس میں ہوں۔ خضر کو مجھ سے بڑھ کر کوئی اور مل سکتی ہے کیا؟" نتاشا نے چونک کر اس کے بے داغ حسن کو دیکھا۔ اس کی خوب صورتی کو اس کے پراعتماد انداز نے چار چاند لگا رکھے تھے۔ نتاشا نے متفق انداز سے اپنے کندھے جھٹکے۔

"تم ٹھیک کہتی ہو یار! حسن میں بڑی طاقت ہے۔ یہ تو کھل جا سم سم کی طرح ایک جادوئی اسم ہے۔" نتاشا کے لہجے میں حسرت کے ساتھ ساتھ تلخی بھی تھی۔ وہ عام سے خدوخال کی حامل ایک انتہائی عام سی لڑکی تھی۔ ویسے وہ بلا کی ذہین اور پراعتماد تھی' لیکن اپنی شخصیت کے حوالے سے وہ تھوڑا احساس کمتری کا شکار بھی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے نتاشا! خوب صورتی ہمیشہ کامیابی کی دلیل نہیں ہوتی۔ تم دیکھو! شوبز میں بھی کتنی خوب صورت مگر فراڈ لڑکیاں آتی ہیں تو وہ ایک دو دفعہ کے بعد پھر نظر نہیں آتیں۔" وہ کافی کا آرڈر دے کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"لیکن یار! تم مانو نا۔ خوب صورتی بذات خود ایک سفارش ہے' جس سے بہت سے کام ہو جاتے ہیں۔ ان لڑکیوں کو شوبز میں آنے کا موقع تو ملا نا! ورنہ تو کتنا ہی ٹیلنٹ صرف اس چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے رل رہا ہے۔ کون دے گا انہیں ایک چانس؟" وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔

"سارے لوگ ایسے نہیں ہوتے نتاشا!" ارفع نے تاسف بھرے انداز سے اس کے چہرے کو دیکھا جو تلخی

کے احساس کے ساتھ اور بھی بدنام سا لگ رہا تھا۔

"زیادہ تر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں مائی ڈیئر! اب تم اس معید کو دیکھ لو۔ سو بیسے ساری دنیا میں اپنی اور میری دوستی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ مجھ سے اپنے آفس کے ڈھیروں کام کروا لیتا ہے، لیکن جہاں کوئی اچھی صورت دکھتی ہے پھسل جاتا ہے۔ پھر اس کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ اب دیکھ لو انہیں پچھلے گھنٹے سے تمہارے ساتھ ہوں، سوائے ان کمیں منٹس میں بھی تمہیں سیکنڈز کے لیے بھی میرا خیال نہیں آیا ہو گا۔ تم لکھ لو، جب وہ لڑکی چلی جائے گی وہ تب سوچے گا کہ میں کہاں گئی۔" اس کے لہجے میں بس تلخی ہی تلخی تھی۔ ارفع اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"دیکھو! اسے احساس تک نہیں کہ ہم کھانا کھانے آئے ہیں۔ وہ اس وقت مزے سے اس ماڈل گرل کے ساتھ ڈنر اڑا رہا ہو گا۔"

"ایسے بدگمان نہیں ہوتے۔ وہ پاگل تھوڑی ہے جب تمہارے ساتھ کھانا کھانے آیا ہے تو تمہارے ساتھ ہی کھائے گا ناں۔ اس کو تو اس نے کلائی پا ہاتھ پر ٹرخا دیا ہو گا۔" ارفع نے اسے تسلی دی۔

"تم سے زیادہ جانتی ہوں میں اسے۔ پانچ سال پرانا تعلق ہے ہمارا۔" اس نے ٹشو سے آنکھیں صاف کیں۔

"ایسے ہی ہر وقت منفی باتیں نہ سوچا کرو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔؟" ارفع نے اسے محبت بھرے انداز سے ڈپٹا، اسی وقت خضر وہاں چلا آیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی تھیں نتاشا! وہ واقعی ایک گھٹیا چیز کو ٹٹول رہا ہے۔ بہت ہی کمینہ ہے یہ معید۔" خضر نے ارفع کے ہاتھ سے کلائی کا کنگ پکڑ کر اپنے منہ سے لگایا اور پھر گردن کو خم دے کر انتہائی عزت و احترام سے اسے واپس کر دیا۔

"اب یہ یقین کرو اس میں محبت کی چاشنی شامل کر دی ہے میں نے۔"

"وہ ابھی تک فارغ نہیں ہوا اس لڑکی سے؟" ارفع نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"او لو، او فارغ۔۔۔؟" خضر ہنسا۔ "وہ تو اس کے ساتھ مزے سے ڈنر اڑا رہا ہے۔ دنیا جہاں کی چیزیں اس بیلن تک ٹرائے کے سامنے سجا رکھی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ رات تک چھوڑنے جائے گا۔"

نتاشا نے جن نظروں سے ارفع کو دیکھا تھا وہ بری طرح خفت کا شکار ہوئی۔ جب کہ نتاشا کا چہرہ اس اطلاع کے ساتھ بالکل دھواں دھواں سا ہو گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور تیزی سے پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔

"اسے کیا ہوا؟" خضر نے اس کی آنکھوں میں ابھی ابھی آنسو دیکھے تھے۔ وہ سخت حیران ہوا۔

"اسے تو کچھ نہیں ہوا لیکن مجھے لگتا ہے کہ معید کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ نتاشا کو ڈنر پہ لے کر آیا تھا اور اب کھانا کسی اور کے ساتھ کھا رہا ہے۔"

"سو سیڈ یار!" خضر کو سخت افسوس ہوا۔ "یہ تو سخت زیادتی ہے۔" اسے حقیقتاً افسوس ہوا تھا۔

"یہ مرد حسن دیکھ کر پھسل کیوں جاتے ہیں؟" ارفع رنجیدہ ہوئی۔

"ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ محبت ان چیزوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ یقین کرو اگر مجھے نتاشا سے محبت ہوتی اور تم میرے سامنے آ جاتیں تو مجھے کبھی تم میں کشش محسوس نہ ہوتی۔" وہ صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مرد اتنا مضبوط نہیں ہوتا۔ وہ سب سے پہلے لڑکی کی خوب صورتی پر ہی پھسلتا ہے۔ محبت وحبت تو بہت بعد کی چیز ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی تو خضر نے تأسف سے اسے دیکھا۔

"چلو چھوڑو، ہمیں اس سے کیا، کچھ نہیں کیا۔ پھر تم اتنی خوب صورت شام کیوں برباد کر رہی ہو؟" وہ قدرے بے زاری سے بولا۔

"میں تمہاری شام برباد کر رہی ہوں۔۔۔؟ میں؟" وہ نہ جانے کیوں اتنی حساس ہو رہی تھی۔

"تم میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہو۔ تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ میرا کیا مطلب تھا۔ میں مانتا ہوں کہ نتاشا تمہاری دوست ہے اور جو اس کے ساتھ ہوا مجھے اس کا افسوس بھی ہے، لیکن اس میں سراسر نتاشا کا اپنا قصور ہے۔ وہ معید کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہے اور اس نے کوئی پہلی دفعہ اس کے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ وہ کیوں نہیں اسے چھوڑ دیتی؟" خضر نے آج صاف گوئی کی انتہا کر دی تھی۔ ارفع کو اس کی بات سے سخت صدمہ ہوا۔

"وہ کیسے اسے چھوڑ سکتی ہے؟ وہ اس سے محبت کرتی ہے خضر۔"

"محبت کرتی ہے تو پھر اس کی عادتوں سے بھی سمجھوتہ کرے۔" وہ قدرے اونچی آواز میں بولا۔

"محبت میں سمجھوتے نہیں ہوتے خضر! محبت اگر سمجھوتے کی راہ پر چل نکلے تو وہ محبت نہیں رہتی۔" وہ بولی نہیں، بھڑکی تھی۔

"یہ اچھی منطق ہے۔ اگر محبت میں سمجھوتے نہیں ہوتے تو کیا نفرت میں ہوتے ہیں؟ اگر کسی تعلق کو قائم رکھنا آپ کی مجبوری ہے تو سمجھوتے کی ڈور کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں جو آپ کو باندھ سکے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جب آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اسے اس کی خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کریں۔ آج کے دور میں کوئی فرشتہ نہیں ہوتا۔ ہم اگر کسی سے محبت کرتے ہیں تو ہمیں اس چیز کا رسٹ نہیں مل جاتا کہ ہم اس شخص کو ویسا بنا دیں جیسا کہ ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"محبت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسان اپنی عزت نفس کو اٹھا کر طاق پر رکھ دے۔" ارفع کو شدید غصہ آ رہا تھا۔

"مائی ڈیئر! اپنی عزت نفس کو کسی شخص کے لیے کچلنا ہی محبت ہے۔ جہاں "میں" آ جاتی ہے وہاں سے محبت رخصت ہو جاتی ہے۔" وہ تھوڑا سا دھیما ہوا۔

"میں تو ایسی محبت کو اٹھا کر گلی میں پھینک دوں جو میری عزت نفس کو کچل دے۔ میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ میں اس محبت کو ہی ختم کر دوں۔" اس کے لہجے میں اس قدر زہر تھا کہ خضر کچھ لمحوں تک بول ہی نہ سکا۔

"جو محبت ٹیوب لائٹ کے بٹن کی طرح ہو، جسے جب چاہو روشن کر لو، جب چاہو آف کر لو۔ وہ سب کچھ ہو سکتی ہے لیکن "محبت" نہیں۔" خضر نے بحث کا اختتام کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کی آج کی ملاقات بھی حسب معمول ایک لڑائی پر ہی اختتام پذیر ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہائے سویٹ ہارٹ!" پورے بیس دن بعد نتاشا اچانک ہی اس کے اسٹوڈیو میں آئی تھی۔ وہ ایڈیٹنگ روم میں اپنی ڈاکومنٹری کی ایڈیٹنگ میں بری طرح مگن تھی۔ پچھلے بیس دنوں میں اس نے کئی دفعہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا سیل فون مسلسل آف جا رہا تھا۔ آج بلیک جینز پر وہ درد کرتا پہنے وہ اچانک ہی آ گئی تھی۔ ارفع کو حقیقتاً اسے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ وہ خاصی تر و تازہ لگ رہی تھی۔

"تم زندہ ہو۔۔۔؟" ارفع ایڈیٹنگ کا کام ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بے تکلفی سے سامنے رکھے صوفے پر براجمان ہو گئی اور بڑی دلچسپی سے سامنے دیوار پر لگی ایل سی ڈی پر اس کی نئی ڈاکومنٹری کے مناظر دیکھنے لگی۔

"ہاں الحمدللہ صرف زندہ ہوں، بلکہ اچھی خاصی ہٹی کٹی ہوں۔۔۔" وہ قہقہہ لگا کر بولی لیکن ارفع نے لمحوں میں اس کے قہقہے کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا تھا۔

"کہاں روپوش ہو گئی تھیں تم؟ میں نے تمہاری تلاش میں کنوؤں تک میں بانس ڈلوا دیے تھے۔" ارفع کے فکرمند انداز پر وہ ایک دفعہ پھر ہنسی۔

"خدا کے واسطے نتاشا! کم از کم میرے سامنے ایسے مت ہنسا کرو۔" ارفع نے باقاعدہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وہ ایک دم ہی چپ ہو گئی تھی۔

"میں نے معید کا ماڈل کو بھی فون کیا تھا لیکن وہ بھی

تمہاری طرف سے لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔

"میں فاروق بھائی کے پاس دبئی چلی گئی تھی۔" اس نے اپنے سب سے بڑے بھائی کا بتایا جو کافی سالوں سے اپنے بیوی بچوں سمیت وہیں مقیم تھے۔

"اس اچانک دورے کی کوئی خاص وجہ؟" ارفع نے اس کے سپاٹ چہرے کو کھوجنے کی ناکام کوشش کی۔

"ایسے ہی۔ بھائی کا فون آیا تو میں نے سوچا کہ میں چکر ہی لگا آؤں۔" اس نے ارفع کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور پھر اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کروانے کے لیے ہشاش بشاش انداز میں بولی۔

"یہ تمہارا جیمز بانڈ کہاں افغانستان کی سرحدوں پر گھومتا پھر رہا ہے۔" اس نے خضر کا تذکرہ کیا جو پچھلے ایک ہفتے سے ایک اسائنمنٹ کے سلسلے میں کہیں چکر بنا ہوا تھا۔

"ویسے تم دبئی میں تھیں اور پاکستان کی سب خبریں تمہیں پتا ہیں۔" ارفع کے جل کر بولنے پر نتاشا نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔

"ہم جن سے محبت کرتے ہیں ان کے بارے میں سب خبریں رکھتے ہیں جناب!"

"بڑی مہربانی جناب کی۔" ارفع الیکٹرک کیٹل پر چائے کا پانی رکھنے لگی۔

"ویسے تم نے اچھا خاصا اسٹوڈیو بنا لیا ہے یار!" نتاشا نے توصیفی نظروں سے چاروں جانب دیکھا۔ وہ کافی عرصے بعد اس کے اسٹوڈیو میں آئی تھی جو اس نے اپنے گھر کی انیکسی میں بنا رکھا تھا۔

"یہ تمہارے یاجوج ماجوج نظر نہیں آ رہے؟" نتاشا نے اس کے دونوں اسسٹنٹس کے بارے میں پوچھا۔

"وہ دونوں کچھ میٹریل خریدنے کے لیے مارکیٹ تک گئے ہیں۔ تم بتاؤ کب آئیں پاکستان؟" ارفع خاصے مصروف انداز میں بولی۔ اس نے الیکٹرک کیٹل کا بٹن بند کر دیا تھا۔

"میں رات ہی پہنچی ہوں اسلام آباد۔"

"ہوں۔ یہ تمہیں آفس سے اتنی لمبی چھٹی کیسے مل گئی یار! تمہارا باس تو بہت خرانٹ سا نہیں ہے اس معاملے میں؟ مجھے معید بتا رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی بارات والے دن بھی آفس آیا بیٹھا تھا اور ایک گھنٹہ پہلے ہی چھٹی کر کے گیا تھا۔"

"یہ معید نے تمہارے ساتھ اتنی باتیں کرنا کب سے شروع کر دی ہیں۔" نتاشا نے ہلکے پھلکے انداز سے کہا تھا مگر وہ چونک گئی۔

"یار! جناح سپر میں ملا تھا مجھے کچھ دن پہلے۔" اس نے دانستہ اسے نہیں بتایا کہ وہ اس دن بھی کسی لڑکی کے ساتھ تھا۔ وہ اسے ہرٹ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"ہاں لو ایسا ہی ہے، لیکن معید نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں جاب سے ریزائن کر کے گئی ہوں؟" اس کے اس انکشاف پر ارفع کپ میں چینی ڈالنا بھول گئی۔ سخت حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تم نے جاب سے ریزائن کر دیا نتاشا اور مجھے بتایا تک نہیں؟" وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اس نیوز پیپر میں جاب کرنے کا کتنا جنون تھا۔

"بس یار! تھک گئی تھی۔ سوچا کچھ بریک ہی لے لیا جائے۔" اس نے ٹانگیں پھیلا کر سستی سے کہا۔

"تو بریک لینے کے لیے جاب چھوڑنا ضروری تھا کیا؟" ارفع نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔ اسے نتاشا کی ذہنی حالت کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"معید نے تمہیں نہیں روکا؟" وہ اب خشک دودھ کپوں میں ڈالتے ہوئے تعجب سے پوچھ رہی تھی۔

"وہ مجھے کیوں روکے گا؟" اس نے بے زاری سے الٹا سوال کیا تو ارفع کو یقین ہو گیا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔

"تمہاری معید کے ساتھ صلح نہیں ہوئی کیا ابھی تک۔۔۔؟"

"ہماری لڑائی کب تھی مائی ڈیئر۔۔۔؟" وہ اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے زبردستی مسکرائی۔ "تم چھوڑو ان سب باتوں کو، یہ بتاؤ! تم اور خضر کب شادی کر رہے ہو؟ تم سے بہت دنوں سے

شادی کا کھانا نہیں کھایا۔" ارفع کی تیوری چڑھ گئی۔

"تم مجھے وہ بات بتاؤ جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو؟"

"تم کون ارفع! میری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے اور تم مجھے کتنی عزیز ہو اس چیز کا تمہیں بخوبی اندازہ ہے۔ میں تم سے کیسے کچھ چھپا سکتی ہوں۔" نتاشا نے اپنے ہنسی اڑائی جیسے اس کی بات کو بھی اڑا رہی ہو۔

"اگر میں تمہیں عزیز ہوں تو تم میرے لیے کیا ہو؟ یا مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟ کیا مجھے یہ سب دہرانے کی ضرورت ہے نتاشا؟" ارفع کے لہجے میں کچھ تھا جو نتاشا نے بے اختیار نظر چرائی تھی۔

"تمہاری رگ رگ سے میں واقف ہوں۔ کیا چیز تمہیں خوش کرتی ہے اور کس بات سے تم ہرٹ ہوتی ہو مجھے سب ایسے اندازہ ہے کہ کبھی کبھی خضر بھی حیران ہو جاتا ہے۔"

"خضر مجھ سے جیلس نہیں ہوتا؟" وہ بہت عجیب سے لہجے میں بولی تھی۔

"وہ تم سے کیوں جیلس ہوگا! وہ بہت لونگ ہے اور ان تمام رشتوں اور چیزوں سے محبت کرتا ہے جو مجھے خوش کرتی ہیں۔" اس کے انداز میں اندھا اعتماد اور مان تھا۔

"وہ تم سے محبت کرتا ہے نا اس لیے۔ اصل میں بہت کم لوگوں کی محبت کا ظرف بہت بڑا ہوتا ہے۔ کچھ مجھ جیسے چھوٹے دل اور چھوٹے ظرف کے بھی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے محبوب کو چھونے والی ہوا سے بھی لڑنے لگتے ہیں۔" وہ خاصی رنجیدہ تھی۔ ارفع کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

"محبت کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن وہ میری بہت کیئر کرتا ہے جس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔" وہ بہت دلکشی سے مسکرائی۔

"اگر خضر تمہیں چھوڑ دے تو تم کیا کرو گی؟" اس کے انتہائی عجیب سوال پر بھی ارفع کے چہرے پر وہی ازلی سکون طاری تھا۔

"خضر مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔" نتاشا کو بے اختیار اس پر رشک آیا تھا۔

"ظاہر ہے! تم جیسی حسین لڑکی اسے دوبارہ مل سکتی ہے؟"

"میں اگر حسین و جمیل نہ بھی ہوتی۔ تب بھی خضر مجھ سے ایسے ہی محبت کرتا۔" ارفع کی بات پر نتاشا تھوڑا سا جھجکی۔

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔ حسن مرد کی پہلی ترجیح ہوتا ہے۔" اس کا دبا ہوا احساس کمتری ایک دفعہ پھر پوری قوت سے بیدار ہوا تھا۔ اس نے سامنے دیوار پر لگے بلند قامت شیشے میں اپنا اور ارفع کا عکس دیکھا۔ وہ اس وقت ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں ایک مہکتا ہوا گلاب لگ رہی تھی۔ اس کے بالمقابل نتاشا کی اپنی شخصیت بالکل ماند پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے، زرد چہرہ، چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں اور غیر متناسب ناک، کچھ بھی تو متاثر کن نہیں تھا۔ اس کا قد خاصا لمبا تھا لیکن جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ، وہ حد درجہ کمزور تھی۔ اپنے قد کے لحاظ سے اس کا وزن بھی خاصا کم تھا۔

"تم ساری فضول بحث کو چھوڑو، یہ بتاؤ! تم اب کیا کرو گی؟" ارفع نے انتہائی محبت سے اپنی سب سے عزیز دوست کا چہرہ دیکھا تھا۔ جو کم از کم اسے بہت پیارا تھا۔ اس کے فکر مند لہجے پر وہ مسکرائی۔

"یار! تمہاری دوست لاکھ عام سی ہو، لیکن اس نے صحافت کی دنیا میں بہت خاص کام کیا ہے۔ میرے ریزائن کی خبر جیسے ہی پھیلی، بہت سے اچھے اداروں سے آفر آئی، لیکن میں ابھی کچھ بریک لینا چاہتی ہوں۔ پچھلے کئی سالوں سے پاگلوں کی طرح کام کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ وہ میرا ویٹ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد کسی نہ کسی بہتر آپشن کو جوائن کر لوں گی۔" وہ خاصی مطمئن تھی۔

"ویری گریٹ۔" ارفع بھی خوش دلی سے مسکرائی۔

"اب تم بتاؤ! تم لوگ کب شادی کر رہے ہو؟"

"آج تمہاری سوئی ہماری شادی پر کیوں اٹک گئی ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"اچھے اور خوب صورت تعلق کو کوئی نہ کوئی نام دے دینا چاہیے۔ بے نام رشتوں کی خوب صورتی وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔" وہ آج کل کچھ زیادہ ہی فلسفہ بولنے لگی تھی۔

"خضر کی بھی یہی خواہش ہے، لیکن کچھ مسئلے مسائل ہیں۔ ایک تو وہ اپنا گھر بنوا رہا ہے، اوپر سے علیزہ آپی اور ان کے میاں دوبارہ اٹلی چلے گئے ہیں، پھر ماما سنجیدگی سے سارا کے لیے کسی بہتر پروپوزل کی تلاش میں ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ایک دفعہ ہی دونوں کو بھگتائیں۔ بس مزید کچھ پانچ چھ ماہ ہی لگیں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے اپنے بالوں کو کھول کر اب برش کر رہی تھی۔

"کیسا گھر بنوا رہا ہے خضر؟" نتاشا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"گھر تو حیات انکل نے اپنی زندگی میں ہی شروع کروا دیا تھا۔ وہ اور آنٹی اسی سلسلے میں پاکستان آئے تھے، جب کراچی سے آتے ہوئے مارگلہ کی پہاڑیوں سے ٹکرانے والے جہاز میں ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے گھر کی تعمیر روک دی گئی تھی کیونکہ خضر بہت زیادہ اپ سیٹ تھا، پھر وہ بھی انگلینڈ چھوڑ کر یہاں شفٹ ہو گیا۔ اب جب سے شادی کا پلان کیا ہے، تب سے گھر کی کنسٹرکشن دوبارہ اسٹارٹ کی ہے۔"

"خضر کا ننھیال کہاں ہوتا ہے...؟" نتاشا نے یونہی پوچھا تھا۔

"اس کی ایک خالہ اور ایک ماموں ہی ہیں۔ خالہ انگلینڈ میں اور ماموں آسٹریلیا میں ہوتے ہیں۔"

"وہی ماموں جن سے ملنے کے بہانے وہ تم سے ملنے آیا تھا..." نتاشا کے شرارتی انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنسی تو وہ پلک جھپکے بغیر اس کی سنہری آنکھوں میں چمکتے جگنوؤں کو دیکھنے لگی۔ اس نے اس لمحے اپنی دوست کے لیے ڈھیروں خوشیوں کی دعا دل ہی دل میں کی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ تم آج کل ماما کے ساتھ کن چکروں میں پڑے ہو؟" ارفع نے اس دن خضر کے فلیٹ پر بڑا کامیاب چھاپا مارا تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز خربوزہ کھانے میں مگن تھا اور اسے دیکھ کر بڑی خوش دلی سے مسکرایا تھا۔

ارفع نے غور سے اس کا تھکا تھکا سا چہرہ دیکھا۔ وہ خاصا کمزور سا لگ رہا تھا۔ چند دن کے دورے نے اس کی صاف شفاف رنگت کو کمہلا کر رکھ دیا تھا اور آنکھوں کے گرد ہلکے ہلکے سے حلقے بھی نمودار ہو گئے تھے۔ چہرے پر ہلکی ہلکی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔

"یہ آج تم مجھے اتنا گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو، نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟" اس کا دھیان مکمل طور پر خربوزے کی طرف تھا لیکن اس نے اس کی محویت کو ایک لمحے میں محسوس کر لیا تھا۔

"تم کیا دھوپ میں دوڑیں لگاتے رہے ہو جو اس قدر کالے پیلے اور کمزور لگ رہے ہو..." اس نے تولیہ اٹھا کر سامنے ٹیرس کی ریلنگ پر پھیلایا۔

"سچ کہو، واقعی کالا پیلا سا لگ رہا ہوں؟" اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اپنے گھریلو سے روپ میں اسے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ ارفع نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ اس حلیے میں بھی اتنا وجیہہ و خوبرو لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اسے دیکھ نہیں پائی۔

"جانے دو نا... آں۔" وہ بے اختیار ہی ہنسا تھا۔ اس کی چوری اس نے پکڑ لی تھی۔ خضر نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا کہ اس نے جینز پہننا کم کر دی تھی۔ اب بھی سرخ رنگ کے لان کے سوٹ میں تھی۔ اس کے ہمیشہ گول مول جوڑے میں بندھے رہنے والے بال بھی آج فرنچ ٹیل میں بندھے ہوئے تھے جو کمر تک آ رہی تھی۔ یہ ہیئر اسٹائل شاید نہیں "یقیناً" سارہ کا کارنامہ تھا۔ وہ ان معاملات میں بالکل کوری تھی۔

"جانے دو نا، کہاں بزی تھے؟ پرسوں بھی ماما بتا رہی تھیں کہ تم ان کے ساتھ تھے۔ کل بھی مجھے پتا چلا کہ تم گئے ہوئے ہو، جب میں اپنے اسٹوڈیو سے گھر میں آئی تب تک تم پھر ماما کے ساتھ جا چکے تھے۔" وہ کمرے میں پھیلے کشن اب ترتیب سے ایک جگہ رکھ

رہی تھی۔

"وہ تمہیں اعتراض میرے ماما کے ساتھ جانے پر ہے یا ان سے نہ ملنے پر؟" وہ خربوزے سے فارغ ہو کر اب اپنی شرٹ کی آستین فولڈ کرتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔

"فضول باتیں مت کرو خضر!" وہ بری طرح جھنجلائی اور اس کے پاس پڑی پلیٹ اٹھا کر کچن میں رکھ آئی۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔

"یار! اصل میں ماما کے بے سہارا خواتین کے لیے بنائے گئے ادارے میں آزاد کشمیر سے ایک لڑکی کو لایا گیا ہے، جس کے گاؤں والوں نے رشتہ نہ ملنے پر اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا اور پورے خاندان کو اس لڑکی کے کردار کی طرف سے بھی بدگمان کر دیا تھا۔ وہ پچھلے کئی دن سے سرکاری ہسپتال میں بے سہارا تھی۔ ماما کو کسی نے بتایا۔ وہ اسے نہ صرف اپنے ادارے میں لے آئیں، بلکہ اس کا کیس بھی لڑ رہی ہیں اور اس کا علاج بھی ہو رہا ہے۔"

"او سو سیڈ! اتنا ظلم ہے۔" اس کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

"ماما نے گھر میں ذکر ہی نہیں کیا..."

"ان کو میں نے منع کیا تھا۔"

"کیوں...؟"

"میں نے سوچا کہ تم ڈسٹرب ہو جاؤ گی۔ یاد نہیں ماما کے ویمن ہوم سے آنے کے بعد تم پورا ایک ہفتہ ٹھیک نہیں ہو سکی تھیں؟" وہ انتہائی محبت سے کہہ رہا تھا۔

"کیسی ہے وہ لڑکی اب؟" وہ واقعی ڈسٹرب ہو گئی تھی۔

"پتا نہیں، میں نے اسے نہیں دیکھا۔ ابھی ایک سرجری ہوئی ہے اور کچھ مزید آپریشن ہونے ہیں۔ ماما نے علیزہ آپی کو اس کے کیس کی رپورٹس اٹلی بھیجی تھیں، جہاں تیزاب یا آگ سے جھلس جانے والوں کے لیے ایک ادارہ "اسمائل اگین فاؤنڈیشن" کے نام سے کام کر رہا ہے، جس کی ایک ذیلی شاخ لاہور میں بھی ہے۔ یہ اطالوی ادارہ سامانہ ہسپتال کی مدد سے کام کرتا ہے۔ اس میں اطالوی پلاسٹک سرجنوں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی سرجن بھی کام کرتے ہیں۔" خضر نے تفصیل سے بتایا۔

"تو کیا یہ سرجن پاکستان والی برانچ میں بھی آتے ہیں؟" ارفع نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں، وہ علاج کرنے کی غرض سے باقاعدگی سے پاکستان بھی آتے ہیں اور جن مریضوں کا علاج یہاں ممکن نہ ہو، انہیں اٹلی لے جایا جاتا ہے، کیونکہ یہ علاج سالوں پر محیط ہوتا ہے، اس لیے انہیں اٹلی میں علاج کے ساتھ ساتھ کوئی ہنر بھی سکھایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔"

"اس علاج کے لیے رقم کون دیتا ہے خضر؟" وہ سخت حیران ہوئی۔

"یہ علاج ان عطیات سے ہوتا ہے جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائی دیتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ان کی رقم کس مذہب یا فرقے کے لوگوں کے علاج کے لیے خرچ ہو رہی ہے۔ وہ لاکھوں ڈالر کی تعداد میں عطیے دیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہاں مفت علاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اٹلی کے ایک ہسپتال میں پاکستان اور بنگلہ دیش میں تیزاب یا آگ سے جھلس جانے والی غریب اور مظلوم مسلمان خواتین کا علاج بھی ہوتا ہے۔" خضر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"او مائی گاڈ!" وہ سامنے پڑے فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

"ماما چاہ رہی ہیں کہ میں اس ٹاپک پر کوئی پروگرام کروں۔ بس اس سلسلے میں تھوڑا بزی تھا۔ کچھ ریسرچ ہو رہی تھی اور میں چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی کو اپنے پروگرام میں لے کر آؤں۔" وہ اسے سادہ سے انداز میں بتا رہا تھا، لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کی بات سن کر ایسے بھڑک جائے گی۔

"تمہیں شرم نہیں آئے گی خضر اس لڑکی کو میڈیا کے سامنے لاتے ہوئے؟ ذرا سوچو! اس پر کتنا بڑا ظلم ہوا ہے اور تم اسے دنیا کے سامنے تماشا بنانا چاہتے ہو؟ چار لوگ اس سے ہمدردی کریں گے تو آٹھ اس کے

کردار پر بھی انگلی اٹھائیں گے۔ ظاہر ہے! تم دوسری پارٹی کا بھی تو موقف سامنے لاؤ گے۔"

"کتنا دوہرا معیار ہے تمہارا ارفع! تمہیں یاد ہے کہ اسی کمرے میں تم اسی موضوع پر میرے ساتھ شرمین عبید کے لیے لڑی تھیں؟ جب اس کا کام اور اس کا آسکر ایوارڈ سب کچھ تمہیں کتنا متاثر کر رہا تھا؟ تب تمہیں لگ رہا تھا کہ میں محدود ذہنیت کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ اب جب کہ میں بھی اسی موضوع پر کام کرنا چاہ رہا ہوں تو تم کیوں اتنا بھڑک رہی ہو؟" اس نے ارفع کو لاجواب کیا تھا۔ اس کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بالکل چپ ہو گئی۔ ایک منٹ کے بعد وہ قدرے دھیمے انداز میں بولی۔

"میں شرمین کو آسکر ایوارڈ ملنے پر خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔"

"تو اس کو آسکر بھی تو اسی موضوع پر کام کرنے پر ملا تھا۔ کراچی والوں کے کسی تکلیف دہ پہلو پہ کام کیا ہے تم نے دیکھا! یہ تعصب پسند گورے کیسے اس کو ایوارڈ دیتے ہیں۔" وہ خطرناک حد تک تلخ ہوا تھا "اور جہاں تک بات موضوع کی ہے تو میں بھی اسی موضوع پر کام کرنا چاہتا ہوں، اسی کی مذمت کرنا چاہتا ہوں۔ اب میری دفعہ تمہیں خواتین کے جذبات کا خیال آ گیا؟ کیا شرمین کی ڈاکومنٹری میں خواتین نہیں تھیں؟ کیا ان کو ساری دنیا نے نہیں دیکھا ہو گا؟"

"ہاں! تم نے سوچا ہو گا کہ جب ساری دنیا اس بہتی گنگا سے ہاتھ دھو رہی ہے تو تم کیوں پیچھے رہو۔" بلی عقل پر قابو پانے کے چکر میں بہت غلط جملہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اس کی بات پر خضر کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا تھا۔ وہ کچھ لمحوں کو تو ششدر سا رہ گیا۔ اس نے بمشکل خود کو مشتعل ہونے سے روکا تھا۔

"بہت غلط بات کر رہی ہو تم ارفع عزیز۔" اس کے چہرے پر ایسا کچھ تھا کہ ارفع جیسی لڑکی کو بھی سانپ سونگھ گیا۔ وہ بہت غصے سے ٹی وی لاؤنج سے نکل کر اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ اس نے پوری قوت سے بیڈ روم کا دروازہ بند کیا تھا۔ اس کے اس انداز پر ارفع کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ اسے اتنے اشتعال میں دیکھا تھا۔ وہ تو انتہائی دھیمے مزاج کا بہت صبر و تحمل والا شخص تھا۔ اسے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے بہت مایوسی سے سامنے والے بند دروازے کو دیکھا۔ اسے پہلی دفعہ اپنے لہجے پر شدید غصہ آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن نتاشا کی سالگرہ تھی۔ وہ اس کے لیے پھولوں کا گلدستہ اور کیک خرید کر بہت تیزی سے راحت بیکرز کی سیڑھیاں اتر رہی تھی جب اس نے اپنے بالکل سامنے سعید کو اس میدے کی بوری جیسی رنگت کی حامل لڑکی کے ساتھ دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر بری طرح سٹپٹا گیا۔ اس نے بے یقین نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اس سے نظریں چرا رہا تھا کیونکہ وہ اس کی نتاشا کے ساتھ دھواں دھار محبت کی سب سے بڑی گواہ تھی۔

"یہ تم آج کل شتر بے مہار کی طرح کہاں گھومتے رہتے ہو جو ہمارے لیے ٹائم ہی نہیں؟ کل خضر بھی گلہ کر رہا تھا کہ اس نے افغانستان سے آنے کے بعد تمہیں کئی ٹیکسٹ کیے مگر تم نے کسی کا بھی جواب نہیں دیا۔" اس نے آج اسے آڑے ہاتھوں لینے کا فیصلہ اچانک ہی کیا تھا۔ سیاہ سوٹ میں اس کی رنگت اس وقت دمک رہی تھی۔ اپنے ساتھ اس لڑکی کی موجودگی میں ارفع کی اس سرعام "کلاس" سے اس کی رنگت ایک دم متغیر ہوئی تھی۔

"بس یار! کچھ بزی تھا۔ اس سے ملو، یہ میری دوست ماہم ہے۔ ابھی ابھی اس نے شوبز جوائن کیا ہے۔" وہ زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ اس لڑکی کا تعارف کروا رہا تھا جو ارفع کے حسین سراپے سے بری طرح خائف ہو کر اب پارکنگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہیلو!" ارفع نے کسی بھی مسکراہٹ سے بے نیاز ہو کر اسے ہیلو کیا تھا اور پھر اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر کے ایک دفعہ پھر سعید کی طرف متوجہ تھی۔ اس کا انداز سراسر جلانے والا تھا۔ ماہم کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی تھی تب ہی وہ انتہائی بے زاری سے اپنی رسٹ واچ پر بار بار ٹائم دیکھ رہی تھی۔

"ہاں یار! آؤں گا بہت جلد۔ تم سناؤ کیسی ہو؟ آج کل تمہارا کام بڑا اوپر جا رہا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے تمہاری اسلام آباد کی کچی آبادی پر بنی ڈاکومنٹری دیکھی تھی، کمال کر دیا تم نے۔" وہ عجلت بھرے انداز میں بولا۔

"حیرت ہے" آج کل "تمہارے پاس کچھ" اور "بھی دیکھنے کا ٹائم ہے، ورنہ مجھے تو لگتا تھا کہ تم آج کل زمین پر دستیاب ہی نہیں ہو۔" اس نے ٹھیک ٹھاک طنز کا ایک تیر کو چلایا۔

"اچھا ہاں، بہت جلد ملاقات ہو گی ابھی تازہ ترین مصروفیات سے وقت ملے تو کال کر لینا پھر کوئی مل بیٹھنے کا پروگرام بنائیں گے۔" اسے لگا تھا کہ اس کے الوداعی کلمات پر سعید نے بے ساختہ سکون کا سانس لیا تھا۔ تب ہی وہ فوراً "اختتامی کلمات" ادا کر کے اس بے زار سی لڑکی کے ساتھ راحت بیکرز میں گھس گیا تھا۔

وہ گاڑی اڑاتے ہوئے نتاشا کے نئے آفس میں پہنچی۔ اس وقت نتاشا کے آفس میں دو تین بجے اور ایک کیک پہلے سے ہی پڑا تھا۔ وہ کمپیوٹر پر خاصی مصروف دکھائی دے رہی تھی۔

"ہیپی برتھ ڈے سویٹ ہارٹ!" ارفع نے اس سے گلے ملتے ہوئے اس کے رخسار پر پیار کیا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"آج صبح سے تم دونوں کے پیچھے خوار ہوتی پھر رہی ہوں۔ پہلے صبح صبح اس نواب خضر حیات کو وش کیا، پھر اسے ناشتا بنا کر کھلوایا۔ وہ آج مکمل نخرے اٹھوانے کے چکروں میں تھا۔ اس کے بعد جناب کو آفس چھوڑا، پھر راحت گئی اور اب تمہاری طرف ہوں۔" وہ اسے جلدی جلدی ساری تفصیل بتا رہی تھی۔ خضر اور نتاشا کی برتھ ڈے ایک ہی دن ہوتی تھی جس کو کچھ عرصہ پہلے تک وہ چاروں اکٹھے خوب انجوائے کر کے مناتے تھے لیکن اب سعید کسی اور ہی چکر میں تھا۔

"یہ پھول اور کیک کیا سعید نے بھجوائے ہیں؟" اس نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ نتاشا کے چہرے کی رنگت پھیکی ہوئی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ملا تھا آج کمینہ، راحت بیکرز کی سیڑھیوں پر کسی میدے کی بوری کے ساتھ۔ ٹھیک ٹھاک طبیعت فریش کر کے آئی ہوں اس کی۔" وہ جگ سے پانی گلاس میں ڈالتے ہوئے خاصی تپ کر بولی۔

"میدے کی بوری کون؟" نتاشا نے سخت حیرت سے اس کا سرخ چہرہ دیکھا۔

"وہی پچھلے مہینے جس کو مس ماڈل گرل کا ایوارڈ ملا، جو بڑا ساگوں سی کریم کے اشتہار میں آئی ہے۔" ارفع کی بات پر نتاشا کھلکھلا کر ہنسی۔

"ذرا دیکھا کیا نام دیا ہے تم نے اسے۔"

"یہ میں نے نہیں دیا۔ خضر ایک دن غصے میں کہہ رہا تھا۔" وہ سنجیدگی سے اب پانی پی رہی تھی۔ "اچھا سا لنچ کرواؤ مجھے۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔ صبح سے دونوں نے مجھے خوار کر دیا ہے۔" گلاس میز پر رکھتے ہوئے وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولی۔

"ہاں! رات کا ڈنر مشترکہ پر ہم دونوں کو خضر دے رہا ہے۔" اس نے مزید ایک اور اطلاع دی۔

"لو خواہ مخواہ۔" وہ بدکی۔ "میں خواہ مخواہ اس اہم دن پر ایک سڑی ہڈی بن کر درمیان میں بیٹھ جاؤں۔"

"تو تم کون سا پہلی دفعہ بیٹھو گی؟ ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ تمہاری بھی کیا سعید کی طرح یادداشت کھو گئی ہے؟ یاد نہیں، ہم ہمیشہ سے ایسے ہی اکٹھے ڈنر کرتے آئے ہیں؟" ارفع جھنجلا کر اسے یاد کروا رہی تھی۔

"پہلے کی بات اور تھی ارفع۔۔۔ اس وقت ہم چاروں اکٹھے ہوتے تھے۔۔۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنی بات کی وضاحت کرے۔

"کیوں، اب ہم تینوں کے کیا سینگ نکل آئے ہیں یا سعید کوئی تیس مار خان تھا جو اس کے بغیر جاتے

ہوئے ہمیں کوئی اغوا کرلے گا؟ آج کے دن تو کم از کم تماشا! ہوائی تم کوئی بوگی نہ بنو۔" وہ کیک کے ڈبے سے فریش کریم انگلی سے چاٹتے ہوئے مل کر بولی۔

"تم یہ بتاؤ کہ تمہاری خضر کے ساتھ صلح کب ہوئی؟ آخری دفعہ تو تمہاری زبان نے خوب شر پھیلایا تھا۔" تماشا نے پلیٹیں نکالتے ہوئے مسکرا کر پوچھا' کیونکہ اس لڑائی کے بعد وہ سیدھی اسی کے پاس آئی تھی۔

"میں خوامخواہ ڈرتی رہی۔ شام میں ایک کیک اور سوری کا کارڈ لے کر اس کے فلیٹ میں گئی تو وہ کھڑا تربوز کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا "ارم! آج بہت میٹھا ہے۔ مل کر کھاتے ہیں۔ وہ مجھ سے اور میں اس سے کبھی خفا رہ ہی نہیں سکتے۔" اس کے لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔

"اللہ تم دونوں کو ہمیشہ ایسا ہی ہنستا بستا رکھے۔" وہ خلوص دل سے کہتے ہوئے کیک کاٹنے لگی۔ ارفع نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"ایک بات پوچھوں تماشا؟" وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا معید کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے؟" اس نے سو فیصد درست اندازہ لگایا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوئی پھر تھوڑا سا جھجکتے ہوئے بولی۔

"معید نے اس دفعہ کچھ زیادہ عجیب نہیں کیا؟ حسن پرست اور فلرٹی تو وہ پیدائشی تھا لیکن ہر دفعہ باہر کی خاک چھان کر تمہارے ہی قدموں میں بیٹھا تجدید محبت کر رہا ہوتا تھا۔ میں اس کے والہانہ پن اور شدتوں کی گواہ ہوں میں سمجھتی تھی کہ وہ باہر بس ایسے ہی منہ مارتا ہے' محبت تو وہ تم سے ہی کرتا ہے' لیکن ... اس دفعہ وہ تو ہم سے بھی نظریں نہیں ملا رہا..." ارفع کو دکھ ہوا تھا۔

"وہ کچھ دن تک اب تم لوگوں سے نظریں ملائے گا بھی نہیں۔ اس کے بعد ڈھیٹ بن کر آکر تم لوگوں کو بھی بتا دے گا کہ اس نے مام قریشی کے ساتھ کورٹ میرج کر لی ہے۔" تماشا نے ایک ہتھوڑا ہی تو ارفع کے سر پر مارا تھا۔ وہ سخت بے یقینی' تعجب اور صدمے کی کیفیت کے زیر اثر تماشا کا سپاٹ چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"تماشا...!" وہ بمشکل بولی۔ "کب؟ اور تمہیں کس نے بتایا؟"

"جس دن میں دبئی گئی تھی' اسی سے دو دن پہلے اس نے گھر والوں کی مرضی کے خلاف اس سے کورٹ میرج کی تھی۔ اس کے بعد ماموں ممانی نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ اب ایک فلیٹ میں رہ رہا ہے۔" وہ بہت ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"اور تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں ہے۔" اسے شدت رنج کا ہی تو لگا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو ایک ڈیڑھ ماہ سے اس قدر تکلیف دہ بات اکیلے ہی برداشت کرتی آئی تھی۔

"کیا بات بتاتی یار! اس نے تو مجھے خاندان بھر میں تماشا بنا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے دکھ اس کی شادی کا نہیں۔ ان الفاظ کا ہے جن سے اس نے میری شخصیت کے پرخچے اڑا دیے۔ وہ ماموں سے لڑ رہا تھا لیکن ماموں کے لیے ان کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس نے ماموں سے کہا "آپ اپنی عام سی شکل و صورت کی بھانجی کو زبردستی میرے سر منڈھنا چاہتے ہیں' اس کے لیے آپ کوئی اور احمق ڈھونڈیں۔ مجھ سے کسی قربانی کی امید نہ رکھیے گا۔" آنسو اس کی آنکھوں سے ایک قطار کی صورت میں بہہ رہے تھے۔ وہ اپنے نچلے لب کو بے دردی سے کچل رہی تھی۔ اسے اب اندازہ ہوا تھا کہ معید اس سے اور خضر سے کیوں چھپتا پھر رہا ہے۔

"او مائی گاڈ...!" ارفع نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گھومتا ہوا سر تھاما۔ "اور وہ جو ہمارے ساتھ ڈبل شادی کی پلاننگ کرتا تھا' وہ بیڈ روم کی کلر اسکیم' وہ گھر کا نقشہ۔ وہ ہنی مون کے لیے اسکاٹ لینڈ جانے کے پروگرام..."

"ڈرامے کرتا تھا۔ فلرٹ کر رہا تھا مجھ سے۔ اسے ہر وقت اپنی وجاہت کو سراہنے کے لیے کسی بے وقوف کی ضرورت تھی' جو اسے میری شکل میں مل گئی۔ اس کے بعد کا اس کا سارا کام میں کرتی تھی پہ باتیں کرتا پھرتا تھا..." وہ بے آواز رو رہی تھی۔

"خضر کو بہت پہلے سے اس کی فطرت کا پتا تھا۔ وہ مجھے اکثر ڈھکی چھپی باتوں میں سمجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی شادی کا اسے بہت پہلے پتا چل گیا تھا۔ وہ مجھے صدمے سے بچانا چاہتا تھا' لیکن جو ذلت آپ کی قسمت میں لکھی جا چکی ہو' اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ تم سوچ نہیں سکتیں' دبئی میں پندرہ دن میں نے کیسے گزارے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وقت رک گیا ہو' لیکن وقت کتنا ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو' ختم ہو جاتا ہے۔" گردن جھکائے دونوں ہاتھ گود میں رکھے وہ بول رہی تھی جب کہ ارفع سانس لینا بھول گئی تھی۔

"خضر کو اس کی شادی کا پتا تھا' اس نے مجھے بھی نہیں بتایا۔" ارفع کو ایک اور شاک لگا تھا۔

"وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے یار' وہ ہر اس چیز سے جو تمہیں دکھ دے' اس سے بچانا چاہتا ہے۔ وہ مجھے بھی بار بار کہہ رہا تھا ارفع بہت اپ سیٹ ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے بھی اسے منع کر دیا تھا۔" اس نے فوراً وضاحت کی۔

"بہت زیادتی کرتے ہو تم دونوں مجھ سے۔" اس کا لہجہ نم ہوا۔ "تمہیں اس وقت میری ضرورت تھی یار! دکھ بانٹنے سے ختم تو نہیں ہوتا' لیکن اس کی تکلیف کی شدت ضرور کم ہو جاتی ہے۔"

"کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جو بانٹنے سے بھی کم نہیں ہوتے۔ دل کسی طور بھی نہیں سنبھلتا۔ بس ان کے لیے واحد مرہم وقت ہوتا ہے' وہی اس کی شدت کو کم کرتا ہے' لیکن اپنی ذات کی بے وقعتی کا احساس کبھی بھی کم نہیں ہوتا۔ یہ دکھ بار بار سر اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔" وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ارفع کے دل کے اندر ایک گہرا سناٹا سا چھا گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ آج کے بعد ان تینوں کی گفتگو میں معید نامی شخص کا ذکر اب کبھی نہیں آئے گا۔ اس داستان میں پہلی دفعہ ایسا ہی ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں تیری چھاؤں میں پروان چڑھوں
اپنی آنکھوں پہ تیرے ہاتھ کا سایہ کر کے
تیرے ہمراہ
میں سورج کی تمازت دیکھوں
اس سے آگے نہیں سوچا دل نے
پھر بھی احوال یہ ہے کہ
اک بھروسا ہے کہ دل صبر کیسے رکھتا ہے
اک دھڑکا ہے کہ خوں سوچ کیسے رکھتا ہے...

خضر کا ایس ایم ایس پڑھ کر پہلی دفعہ اس کا دل ایک عجیب سی لے میں دھڑکا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ اپنے ایک نئے پراجیکٹ کے سلسلے میں خاصی مصروف تھی۔ ریسرچ اور اسکرپٹ نے اسے گھن چکر بنا رکھا تھا۔ دوسرے خضر کی مصروفیات بھی ان دنوں خاصی بڑھ گئی تھیں۔ وہ صوفیہ بیگم کے ساتھ تیزاب سے متاثرہ خواتین کے پروگرام میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کچھ صوفیہ بیگم نے بھی اسے اپنے کاموں میں لگا رکھا تھا۔ آتے جاتے اسے اس کشمیری لڑکی کی داستان سننے کو مل رہی تھی۔ صوفیہ بیگم اس کے معاملے میں حد درجہ پرجوش تھیں۔ وہ اس کے کزن کے خلاف کورٹ میں چلی گئی تھیں۔ ان ہی دنوں اسے ملیحہ آپی کے ہاں بچی کی پیدائش کی خبر ملی تو وہ فوراً کراچی چلی گئی۔ اس سے پہلے ان کا ایک بیٹا تھا۔ پندرہ دن وہاں قیام کے دوران بھی اس کا خضر سے رابطہ خاصا کم ہوا تھا۔ جب بھی فون پر بات ہوتی' پتا چلتا کہ وہ بہت مصروف ہے۔ جس دن اس کی واپسی کی فلائٹ تھی' اس دن اس کا کافی عرصے کے بعد میسج آیا تھا۔

"جان من! سنا ہے کہ آج شاہی سواری ہمارے شہر میں قدم رنجہ فرما رہی ہے۔ باقی تو سب کچھ ٹھیک ہے بس اپنے جہاز کو مارگلہ کی پہاڑیوں سے ذرا بچا کر رکھنا۔"

"بے فکر رہو! تم اتنے خوش قسمت نہیں ہو کہ میں اتنی جلدی تمہاری جان چھوڑ دوں۔" اس نے بھی جوابی حملہ کیا تھا۔

"پورے چوبیس سال سے تمہیں بھگت رہے ہیں۔ کیا تم اپنی سلور جوبلی پر ہمیں خوش ہونے کا موقع

نہیں ہوگی۔" وہ اس کی شرارت سمجھ کر ہنسی تھی۔
"کیا ہوا؟ کس کا میسج ہے؟" ملی آپی جو سامنے ہی بیٹھی اپنی بچی کے ناز نخرے اٹھانے میں مصروف تھیں' اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"آپی! خضر کا میسج ہے' ایسے ہی تنگ کر رہا ہے۔" اس نے صاف ٹالا تھا۔
"بھئی! اب تک تم دونوں میسج میسج کھیلتے رہو گے۔ میں نے تو ملا سے بھی کہا ہے کہ فوراً شادی کردیں' اچھا خاصا لڑکا ہے۔ اکیلا' خوب صورت اور پڑھا لکھا' صاحب جائیداد' آج کل کے حالات کا پتا تھوڑی چلتا ہے۔ لڑکیاں خود گلے کا ہار بننے کو تیار پھرتی ہیں۔" ملی آپی کی فکر مندی پر اسے ہنسی آگئی۔
"کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ آپ نے بھی نتاشا کی طرح باتیں کرنا شروع کردی ہیں۔"
"ہاں تو اس بیچاری کے ساتھ کون سا اچھا ہوا ہے۔ وہ بھی تو اس کے ماموں کا بیٹا تھا' کیا نام تھا بھلا اس کا۔" ملی آپی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر الجھن کا اظہار کیا۔
"عبدالمعید۔" اس نے آپی کی مشکل آسان کی۔
"ہاں ہاں لو وہی' جو اکثر نتاشا کے ساتھ ہمارے گھر بھی آتا تھا۔ سارے جہان میں اس بے چاری کا اشتہار لگا کر اب اس فضول سی لڑکی کے ساتھ شادی کرلی ہے جس کا پہلا ہی ڈراما پٹ گیا ہے۔" ملی آپی کو نتاشا کے حوالے سے اس پر سخت غصہ تھا۔ نتاشا کا بچپن سے ان کے گھر میں آنا جانا تھا' اس لیے پورے گھر کی اس کے ساتھ انسیت تھی۔
"آپی! آپ خضر کو معید کے ساتھ ملا رہی ہیں۔" اس کو بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔
"میری جان! یہ سارے مرد انیس بیس کے فرق سے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔" ملی آپی اپنی بیٹی کا پیمپر بدلتے ہوئے مصروف سے انداز میں بولیں۔
"خیر! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے' ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔" اس نے فوراً اختلاف کیا۔
"اللہ نہ کرے کہ کسی کے ساتھ بھی ایسا ہو۔ بس ملا کو علیزہ یا سارہ کی وجہ سے شادی لیٹ نہیں کرنی چاہیے۔ سارہ اب اتنی بھی تم سے بڑی نہیں ہے' دو سال کا فرق ہے۔ ویسے بھی تم سے چھوٹی اور علیزہ شادی کے لیے اٹلی سے ایک بچے کی لے کر آسکتی ہے۔" ماہو آپی نے بیٹھے بیٹھے مسئلہ چٹکی بجا کر حل کردیا۔
"میں کیا کہہ سکتی ہوں آپی! یہ خالصتاً ملا کا ڈیپارٹمنٹ ہے۔" اس نے لاپروائی سے کندھے جھٹکے۔ وہ ایک دفعہ پھر اپنے سیل فون پر آئے ہوئے میسج کی طرف متوجہ ہوگئی۔ آپی نے بھی اسے مصروف دیکھ کر مزید اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا' لیکن انہوں نے دل ہی دل میں ملا سے دوٹوک انداز میں بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے کراچی سے آئے ہوئے بھی ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا' لیکن خضر اس کے ہاتھ ہی نہیں آرہا تھا۔ بری طرح تلملا رہی تھی' جب اس دن نتاشا اس سے ملنے کے لیے آگئی۔
"تھینکس گاڈ! تم آگئیں' ورنہ اس خضر نے تو بہت تنگ کر رکھا ہے۔" اسے دیکھتے ہی اریج نے فوراً ہی خضر کی شکایت لگائی تھی۔
"ہاں! اس کا سارا وقت آج کل برنز ہسپتال' برن سینٹر میں گزر رہا ہے۔" نتاشا نے ہنستے ہوئے اطلاع دی۔
"برن سینٹر میں' وہ کیوں؟" وہ کچھ متعجب ہوئی۔
"وہ ہی تمہاری ملا والا کیس۔ اس لڑکی کو وہیں داخل کیا ہوا ہے' پچھلے دنوں ممی کافی بیمار رہی ہیں۔ ان کا انجائنا کا مسئلہ ہوا تھا' اس لیے میرا زیادہ وقت ادھر ہی گزر رہا تھا۔ وہیں میں نے خضر کو اکثر دیکھا تھا۔" وہ تفصیل سے بتا رہی تھی۔
"اوہ سو سیڈ' کیا ہوا آنٹی کو؟ تم نے مجھے بتایا نہیں۔" وہ پریشان ہوئی۔
"بس یار! پچھلے دنوں انہوں نے میری کافی ٹینشن لے لی تھی' اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلنا ہی تھا۔" وہ صاف گوئی سے بتا رہی تھی۔
"اب کیسی ہیں وہ؟" اریج نے فوراً پوچھا تو وہ بے ساختہ مسکرائی۔
"اب اللہ کا شکر ہے کہ کافی بہتر ہیں' لیکن شوگر کے مریض کی طبیعت خراب ہونے کا پتا تھوڑی چلتا ہے۔ خیر! تم سناؤ' ملی آپی کیسی تھیں اور ان کی گڑیا؟" نتاشا کی بات پر وہ اسے تفصیل سے بتانے لگی۔ پل بھر کو رکی ہی تھی کہ نتاشا نے فوراً سخت حیرت سے پوچھا۔
"تمہیں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہونے کو ہے اور خضر تم سے ملنے نہیں آیا؟"
"ہمم! بس دو تین دفعہ فون پر ہی بات ہوئی ہے۔" اریج نے اس سے بات کرتے ہوئے اپنے بیڈ روم کی کھڑکیوں کے پردے ہٹائے۔ بڑا غضب کا موسم تھا۔ کالے سیاہ بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔
"اف! ترس گئی تھی میں کراچی میں ایسے موسم کو۔" نتاشا بھی اٹھ کر اس کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ سامنے ہی لش گرین آسٹریلین گھاس والا لان ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے زمرد کی چادر پھیلا دی ہو۔ اریج کے بنگلے کا لان خاصا خوب صورت تھا۔ سارہ اور ملا دونوں کو ہی باغبانی کا جنون تھا' جس کا اندازہ ان کے لان کو دیکھ کر بخوبی ہو جاتا تھا۔
"لو آگیا تمہارا مجنوں۔" نتاشا نے خوش دلی سے کہا۔ وہ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے ادھر ہی آرہا تھا۔ بلیک ڈریس پینٹ کے ساتھ لائٹ پرپل شرٹ پہنے وہ خاصا تروتازہ لگ رہا تھا۔ شیو بھی لگتا تھا کہ آج ہی بنائی گئی ہے۔ اریج کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔ ٹھیک دو منٹ کے بعد وہ اوپر تھا۔
"خیال آگیا تمہیں میرا' موصوف آج کل ایسے خفیہ مشن میں مصروف تھے جو ایک سیکٹر سے دوسرے سیکٹر میں آتے ہوئے مصیبت پڑ رہی تھی۔" اریج اسے دیکھتے ہی شروع ہوگئی تھی۔ وہ خجالت سے کان کھجانے لگا' پھر کچھ کہے بغیر ان کے سامنے رکھی سفید کرسی پر بیٹھتے ہوئے قدرے احتیاط سے بولا۔
"تمہیں تو پتا ہی ہے کہ تین دن سے سی این جی کی ہڑتال چل رہی ہے' غریب بندہ ہوں' سوچا کہ ذرا ہڑتال ختم ہو جائے پھر چلتا ہوں۔" اس کی اداکاری عروج پر تھی۔
"کیوں ہسپتال میں تم کیا گاڑی کے بغیر پروں سے اڑ کر جاتے تھے؟" نتاشا نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔
"تعجب ہے! تم دونوں تو میرے خلاف اچھا خاصا محاذ بنا کر بیٹھی ہو۔ پتا ہوتا تو بلٹ پروف جیکٹ پہن آتا۔ افغانستان کے بعد کہیں پورا پہننے کا موقع ہی نہیں ملا۔"
"جس طرح کے خوفناک موضوعات پر تم آج کل پروگرام کر رہے ہو' لگتا ہے کہ اسے پہننے کا موقع آنے ہی والا ہے۔" اریج اس کا ٹاک شو اکثر دیکھا کرتی تھی۔
"کوئی پروا نہیں۔ موت کا ایک دن معین ہے' پھر بندہ کیوں ڈرتا پھرے۔" وہ ابھی بھی غیر سنجیدہ تھا۔
"تم آخر بزی کہاں تھے؟" اریج کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔
"اسی ملا کے تیزاب والے کیس میں بزی تھا' وہ جو پلوشہ نامی لڑکی کے ساتھ ظلم ہوا ہے' یقین کرو! اسے دیکھ کر دل دکھ کے احساس سے بھر جاتا ہے۔ اس قدر معصوم سی لڑکی ہے' جس کا واحد قصور اپنی خاندانی روایات کے برعکس گریجویشن کا ایگزام دینا تھا۔ اس کے والد سارے خاندان سے ٹکرا کر اپنی بیٹی کو پڑھا رہے تھے جس کا ان کے جیٹھ کے بچوں کو بہت رنج تھا۔ اوپر سے انہوں نے پلوشہ کے رشتے سے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور اس بیچاری کا سارا مستقبل ہی تباہ کردیا۔"
"ایسے تو بے شمار کیسز موجود ہیں۔ ہم کس کس کا رونا روئیں۔" نتاشا کچھ رنجیدہ ہوئی۔
"لیکن نتاشا! تم ذرا اس انیس سال کی لڑکی کو دیکھو' جس کے سامنے ایک پہاڑ سی زندگی پڑی ہے۔ اس کا قصور صرف تعلیم حاصل کرنا تھا۔ یار! یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟" وہ حد درجہ جذباتی ہوا۔

"خضر حیات! ہم کس کس کی جنگ لڑیں گے؟ ہر کسی کو اپنے حصے کی جنگ خود لڑنا پڑتی ہے اور تھکن خود ہی برداشت کرنا ہے۔" نتاشا کی تلخی کم نہیں آئی تھی۔

"ہم کسی ایک کو تو انصاف دلا سکتے ہیں نا۔۔۔" وہ بالکل بھی مایوس نہیں تھا۔ "تم ذرا گلوشہ درانی کی سسکیاں سنو۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد اپنا چہرہ دیکھ کر منہ سے نکلنے والی بے ساختہ چیخیں سنو تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میں کم از کم بے حسی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ میں اسے ضرور انصاف دلاؤں گا۔" اس کے چہرے سے جھلکتا عزم ان دونوں کو حیران کر گیا۔

"لیکن ذرا دھیان سے۔ اس کو انصاف دلانے کے چکروں میں کہیں اس کے ساتھ مزید بے انصافی نہ کر جانا۔" نتاشا استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ وہ بری طرح الجھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس کے اوپر یہ غیر انسانی سلوک کرنے والے درندے چین سے تھوڑی بیٹھیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تم انجانے میں اسے مزید مشکل میں ڈال دو۔" نتاشا نے وضاحت دی۔

"نہیں! اب ایسا نہیں ہوگا۔ ہم لوگ اسے باہر بھجوا رہے ہیں۔" اس کے انکشاف پر وہ دونوں چونکیں۔

"یہ ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟" نتاشا نے اسے غور سے دیکھا۔

"میں اور ماما۔۔۔" وہ سادگی سے بتا رہا تھا۔

"اللہ ہی خیر کرے۔۔۔" نتاشا کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "آنٹی اتنی سادہ خاتون تو نہیں ہیں جو ان چکروں میں پڑ رہی ہیں۔ دھیان رکھنا ارفع! آنٹی پاپا اور ان کے میاں کے بھیجے کا۔۔۔" اس کے انداز کی کڑواہٹ میں ہلکی سی شرارت بھی شامل ہو گئی تھی۔

"تم جب بھی سوچنا منفی ہی سوچنا۔ مانا کہ تمہارا ایلیٹ گروپ بیک گراؤنڈ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ تمہارا رویہ بھی منفی ہو جائے۔" خضر شاید برا مان گیا تھا تب ہی وہ کچھ سنجیدہ ہو کر چائے کی طرف متوجہ ہو گیا جو ابھی ابھی ملازمہ وہاں رکھ کر گئی تھی۔ نتاشا کے چہرے پر بڑی سرعت سے ایک تاریک سا سایہ لہرا

"کیا ہو گیا ہے خضر! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نتاشا جسٹ مذاق کر رہی ہے۔ تم اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہو؟" ارفع کی گلابی رنگت سرخی مائل ہو رہی تھی۔ خضر اور نتاشا دونوں نے ہی اپنی اپنی جگہ کو سنبھالا تھا۔

"جسٹ ریلیکس ارفع! مجھے معلوم ہے کہ خضر بھی یونہی کر رہا ہے۔ تم کیوں اتنی حساس ہو رہی ہو۔" نتاشا نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

"آئی ایم سوری اگر تم دونوں ہرٹ ہوئی ہو۔۔۔" خضر کا لہجہ جانے نہیں کیوں دونوں ہی کو کچھ سپاٹ سا لگا تھا۔ وہ چائے کا مگ اٹھا کر ٹیرس کی گرل کے پاس گیا۔ کالے بادلوں میں۔۔۔ ایک ارتعاش سا پیدا ہوا تھا جو اپنے دامن میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھر لائی تھی کہ اب اسے حاتم طائی کی طرح لٹا رہی تھی۔ ایک دم سے ہی سرمئی اندھیرا پھیلا اور ساتھ ہی بادلوں نے ہر طرف جل تھل کر دیا۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش کی بوندوں کو سمیٹے ٹیرس کے فرش کو بھی گیلا کر چکی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی کرسیاں کچھ اور پیچھے کر لی تھیں۔

"بارش کبھی کبھی اداسی کے ساتھ ساتھ عجیب وحشت بھی لیے آتی ہے۔ ہے نا؟" نتاشا کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ ارفع نے بے اختیار ہی اس سے نظر چرا لی تھی۔ جبکہ خضر لپک کر اس کی طرف گیا۔ اس کی پرپل شرٹ بھی بھیگ چکی تھی۔ وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"نتاشا بھولی! جس دن تم اپنے آپ کو یہ سمجھا لو گی کہ زندگی جیسی قیمتی چیز صرف ایک شخص کے پیچھے خراب نہیں کی جاتی 'اس دن' تمہیں موسم سے وحشت اور اداسی محسوس نہیں ہوگی۔" نتاشا نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا ایسے جیسے کچھ کہنے کے لفظ ڈھونڈ رہی ہو۔ باہر برستی بارش کے شور میں

بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"صرف ایک شخص ہی نہیں تھا میں نے اس سے ٹوٹ کر محبت کی تھی خضر!" اس کے لہجے میں اعتراف جرم کی سی کیفیت تھی۔

"کیا فائدہ ایسی محبت کا جو انسان کو توڑ کر رکھ دے۔ جذبات زندگی کے لیے ضروری ہیں لیکن پوری زندگی پر ان کو حاوی کر لینا اپنی ذات کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ تم کتنے دن تک اس یک طرفہ محبت کا سوگ مناتی رہو گی؟ آخر اس کو تو بھولنا ہے۔ مجھے یقین ہے، اسی ٹیرس پر اسی کرسی پر بیٹھ کر تم بھی کہو گی کہ یہ محبت تمہاری زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی تھی۔ اسی جگہ پر بیٹھ کر تم کسی اور کے گن گا رہی ہو گی کیونکہ جہاں سے شاخ ٹوٹتی ہے، وہیں سے دوسری نکلتی ہے۔ یہ قانون فطرت ہے۔" وہ بہت نرم لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

"مجھے کیسے کسی دوسرے شخص سے محبت ہو سکتی ہے؟" وہ سخت بے یقین تھی۔

"کیوں نہیں ہو سکتی؟ محبت ایک بار نہیں بار بار ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم ساری زندگی ایک ہی شخص کی یادوں کا ماتم کر کے دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ انسان بہت عجیب ہے۔ وہ جینے کے لیے سو جواز کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔" وہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کر رہا تھا۔ نتاشا نے جھنجلا کر اسے دیکھا اسے مطمئن کرنے کے لیے بمشکل مسکرا دیا تھا۔

"کیا تمہیں ارفع کے علاوہ کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟" اس نے ایک دم ہی بہت عجیب سوال کیا تھا۔

بادل زور سے گرجا تھا۔ ارفع اور نتاشا نے سخت حیرت سے انتہائی بے تکے انداز میں ہنستے ہوئے خضر کو دیکھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنسے جا رہا تھا۔ دونوں کو بہت عجیب احساس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

زندگی ایک مقام پر آ کر ٹھہر سی گئی تھی۔ ساون کی بارشوں نے عجیب دھوپ چھاؤں والا موسم کر رکھا تھا۔

وہ آج کل کچھ اکتائی سی پھر رہی تھی۔ نئے پراجیکٹ کو کرنے میں بھی مزا نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑے سے نتاشا ایک دفعہ پھر اچانک دبئی چلی گئی تھی لیکن اس دفعہ وہ بتا کر گئی تھی کہ آفس کے کام سے گئی ہے۔ ماما کی مصروفیات کا دائرہ بھی بڑھ گیا تھا اور سارہ بھی اپنی ایک اور ایگزیبیشن میں مصروف تھی۔ اس دن وہ بجھے اکتاہٹ بھرے انداز سے اپنے اسٹوڈیو سے نکلی اور سیدھی گھر پہنچی تو سارہ بک سک سے تیار گاڑی کی چابی تھماتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

"یہ تمہارے منہ پر کیوں بارہ بجے ہوئے ہیں؟" اس نے ایک دم ہی اس کی بے زاری کو محسوس کیا تھا۔

"کچھ نہیں یار! بور ہو رہی تھی۔ سوچ رہی ہوں کہ خضر کی طرف چکر لگا لوں۔ تم اگر باہر جا رہی ہو تو پلیز مجھے ڈراپ کر دو۔"

"وہ تو میں ڈراپ کر دوں گی لیکن یار! خضر کے کان میری طرف سے کھینچنا کہ کون سی آفت آ گئی تھی جو اس نے اچانک ہی اپنا ٹاک شو ختم کر دیا۔۔۔" سارہ کو ایک دم ہی یاد آیا تھا۔

"خضر نے ٹاک شو ختم کر دیا۔۔۔ کب؟" سارہ کی بات بے ساختہ کاٹتے ہوئے اس کی آواز بلند ہوئی۔ سارہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیوں، تمہیں نہیں بتایا اس نے؟"

"نہیں! مجھ سے تو کئی دن سے اس کی بات ہی نہیں ہو پائی۔ کچھ میں مصروف تھی اور کچھ وہ۔۔۔" ارفع نے مضطرب انداز میں بتایا۔ "لیکن تمہیں کس نے بتایا؟"

"مجھے تو پرسوں رات ماہ جو آپی نے کال کر کے بتایا تھا، بلکہ وہ سخت خفا ہو رہی تھیں کہ اتنی اچھی ریٹنگ تھی اس کے پروگرام کی اور اس نے بیچ میں ہی چھوڑ دیا۔ چینل والے اگلے ہی دن نیا بندہ لے آئے۔ سب کو پتا تھا کہ وہ ماہ جو آپی کا کزن ہے اس لیے میڈیا کے لوگوں کو ان سے ہی پوچھنا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ میں نے کہا ارفع کو پتا ہو گا۔" سارہ نے اس کے ساتھ چلتے چلتے وضاحت دی۔ وہ ایک دفعہ پھر الجھن بھرے

انداز میں ارفع کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری خضر کے ساتھ آج کل کوئی لڑائی وغیرہ تو نہیں چل رہی؟" وہ فوراً مشکوک ہوئی۔

"ہرگز نہیں۔" اس نے فوراً تردید کی۔

"اچھا! پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے تمہیں نہ بتائے؟" اس کی الجھن میں اب پریشانی کا اضافہ ہوا تھا۔ "خیر! اب جا رہی ہو تو پوچھ لینا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے بتانے کے لیے وقت نہ ملا ہو۔" سارہ اب ارفع سے زیادہ خود کو مطمئن کر رہی تھی۔

"مجھے بتانے کا وقت نہ ملا۔" ارفع اس بات پر سوچنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن ذہن اسی ایک بات کے علاوہ کچھ بھی سوچنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ سوچوں میں گم خضر کے فلیٹ تک آ گئی اور اسے پتا نہیں چلا۔ سارہ نے پہلے ہی اس سے معذرت کر لی تھی کیونکہ اس کی کوئی میٹنگ تھی جہاں اس کا وقت پر پہنچنا ضروری تھا۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ گھر ہی میں ہو گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ ارفع نے ایک ہی نظر میں محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ نہیں، اچھا خاصا تھکا تھکا سا ہے۔ شیو بھی لگتا تھا کہ کئی دن سے نہیں بنائی تھی۔

"یہ تم نے اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" ارفع نے نرم انداز میں پوچھا، حالانکہ اس کا مزاج پچھلے ایک گھنٹے سے خاصا جارحانہ تھا۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا تھا۔

"ہاں! میں ٹھیک ہوں۔ بس پچھلے کچھ دن سے کچھ طبیعت ڈاؤن اور ڈل سی تھی، جیسے کچھ بھی کرنے کو دل نہیں کر رہا۔" وہ ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

"کہاں مصروف تھے پچھلے دنوں؟" وہ سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کا چہرہ کھوج رہی تھی۔

"کہاں مصروف ہونا ہے یار! وہی روٹین کے کام اور دنیا کے بکھیڑے۔" وہ سستی سے جمائیاں لے رہا تھا۔ ارفع کو اپنا سارا ضبط فضا میں تحلیل ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"اب کون سی مصروفیت ہے؟ اپنا پروگرام تو تم چھوڑ چکے ہو، پھر بھی اتنے مصروف ہو کہ تمہیں کسی بات کی یہ اطلاع دینے کی بھی فرصت نہیں ہے؟" وہ ترش ہو کر بولی۔ خضر کا جمائی کے لیے اٹھا ہاتھ فضا میں ہی جامد ہو گیا۔ وہ لمحے بھر کو چونکا اور پھر تیزی سے اس نے خود پر قابو پایا تھا۔

"مجھے تمہیں بتانا تھا لیکن۔"

"فار گاڈ سیک خضر! اب یہ مت کہنا کہ تمہارے ہرٹ ہونے کے خیال سے نہیں بتایا تھا اور یہ کہ تم مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔" اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر باقاعدہ اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

"تم مجھے ایسے فضول قسم کے ڈرامے کر کے پریشانی سے مت بچایا کرو۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں اور نہ ہی کسی اور سیارے پر بستی ہوں جو مجھے تمہاری پریشانیوں کی اطلاع نہ پہنچے۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبنے لگی۔

خضر کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ لپک کر اٹھا اور اس کے بالکل سامنے کارپٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"میں تمہیں قتل کر دوں گا اگر تم نے ایک بھی آنسو اور بہایا۔" اس کے اس والہانہ انداز اور ہاتھوں کی گرمی سے اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ وہ پہلی دفعہ اس کے سامنے روئی تھی۔ وہ اسے دنیا کی مضبوط ترین لڑکی سمجھتا تھا۔ اس کا یہ خیال آج غلط ہو گیا تھا۔

"تم بہت عجیب ہو گئے ہو خضر! مجھے نہیں معلوم کیسے؟ لیکن مجھے اس کی وضاحت کرنا نہیں آ رہا۔" اس کے بچکانہ انداز پر خضر کے چہرے پر ایک معدوم سی مسکراہٹ ابھری۔

"کیوں؟ میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں کیا؟" وہ دانستہ غیر سنجیدہ ہوا۔

"کاش سینگ ہی نکل آتے۔ کچھ کنفیوژن تو نہ ہوتی۔" اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

"کیا کنفیوژن ہے؟ مجھے بتاؤ! میں کلیئر کرتا ہوں۔"

"تم مجھ سے باتیں چھپانے کیوں لگے ہو؟" ارفع کی بات پر اس نے بے ساختہ نظریں چرا لیں۔

"یار! ایسا کچھ نہیں ہے۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ بس میرا پروڈیوسر سے کچھ نظریاتی اختلاف ہو گیا تھا۔ بات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ میں اس کا آخری منٹ اس کے منہ پر مار آیا۔ پتا تو ہے کہ کتنا جلالی خون ہے میرا۔ غصہ سال میں ایک دو دفعہ ہی آتا ہے، لیکن جب آتا ہے سامنے والے کے کڑاکے نکال دیتا ہے۔"

"تو یہ بات تم مجھے بتا نہیں سکتے تھے؟" اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ رونے کے بعد اس کی آنکھوں میں ایک دلکشی سی اتر آئی تھی۔ خضر نے بمشکل اس سے نظریں ہٹائی تھیں۔

"تم نے میری ٹھیک ٹھاک کلاس جو لینی تھی۔ خیر! وہ تو اب بھی لے ہی رہی ہو۔ میری ایک اور جگہ بات چیت چل رہی ہے۔ امید ہے کہ وہ چار دن میں فائنل ہو جائے گی۔ پھر فخر سے بتاتا میں ان چینل والوں کے کیسے چھکے چھڑا آیا ہوں۔" وہ اٹھ کر کچن سے دو گلاس لے آیا۔ فریج سے کولڈ ڈرنک نکالی اور اسے اب گلاسوں میں انڈیل رہا تھا۔ ارفع نے بہت غور سے اسے دیکھا۔

"یہ تم نے میرے ساتھ مہمانوں والا سلوک کب سے کرنا شروع کر دیا ہے؟ پہلی دفعہ ایسا لگا ہے کہ میں تمہارے گھر آئی ہوں۔" وہ آج ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہی تھی۔

"تم نے بھی تو میرے سامنے [illegible] اور جذباتی خواتین والے ڈرامے شروع کر دیے ہیں۔ آج پہلی دفعہ ہی تو تم میرے سامنے روئی ہو۔" جواب میں وہ اسے چھیڑنے لگا۔

"تم نے بھی تو عجیب و غریب حرکتیں شروع کر دی تھیں، جنگل میں منگل والی۔" وہ کون سا کسی سے کم تھی۔ اچانک اس کی نظر میز پر رکھے خواتین کے تازہ شمارے کے ایک بنڈل پر پڑی۔ اسے سخت حیرت ہوئی۔

"یہ تم نے خواتین کے ڈائجسٹ اور ناول کب سے پڑھنے شروع کر دیے ہیں؟" اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ ہلکا سا چونکا۔

"یہ میرے ایک دوست نے منگوائے تھے یار! ورنہ مجھے ان چیزوں میں کہاں دلچسپی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ "یہ نتاشا کے آج کل کچھ زیادہ ہی دبئی کے چکر نہیں لگ رہے...؟" اس نے اچانک بات ہی بدل دی۔

"ہاں! کہہ رہی تھی کہ آفس کا کچھ کام ہے۔ وہ لوگ وہاں اپنا کوئی آفس بنا رہے ہیں۔" اس نے فوراً بتایا۔

"اچھا! مجھے بھی کچھ دنوں کے لیے انگلینڈ جانا ہے۔ پاپا کی پراپرٹی کا کچھ مسئلہ ہے۔ سوچا ہے کہ اس دفعہ جا کر حل ہی کر لوں۔"

"اچھا! کب جا رہے ہو...؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"شاید اگلے ہفتے..." وہ بیٹھے بیٹھے اچانک ہی کسی سوچ میں گم ہوا تھا۔

"میں بھی ساتھ چلوں؟"

"کیا...؟" خضر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیوں...؟" وہ ایک دم سے پریشان ہوا تھا۔

"یار! مذاق کر رہی ہوں..." وہ ہنسی تو خضر کے چہرے پر سکون کا بے ساختہ تاثر ابھرا تھا۔

"تھینکس گاڈ! ورنہ میں کس کس کو وضاحتیں دیتا پھرتا کہ یہ لڑکی کیوں میرا دم چھلا بنی ہوئی ہے۔" وہ اسے پھر تنگ کر رہا تھا۔ ارفع آج کافی دن کے بعد پرسکون ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

خضر انگلینڈ چلا گیا اور نتاشا دبئی سے واپس آ گئی۔ اس دفعہ اس میں بہت مثبت تبدیلی آئی تھی۔ وہ خلاف توقع بہت خوش تھی۔ ارفع اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن نتاشا کچھ مصروف تھی اور بہت جلد ہی اس کی

معصومیت کا راز کھل گیا تھا۔

وہ اس دن اس کے اسٹوڈیو میں ہنستی مسکراتی اور کھلکھلاتی ہوئی آئی تھی۔ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل بھی تبدیل کر لیا تھا جو اس پر بہت سج رہا تھا۔ آج اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی ملاحت اور کشش تھی۔ ارفع کچھ لمحوں کے لیے بے اختیار اسے دیکھے گئی۔

"یہ دیکھو آگیا ہے؟" وہ دور ہی سے ایک سنہری کارڈ لہراتے ہوئے آرہی تھی۔

"کون سی لاٹری نکل آئی ہے جو ایسے جھنڈے کی طرح لہراتی آرہی ہو۔" ارفع نے اس بے اختیار گلے لگاتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"یار! تمہیں کی بات ہے سارا خاندان یہی کہہ رہا ہے کہ نتاشا کی لاٹری نکل آئی ہے۔" وہ بے تحاشا خوش تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی جوت اور باچھیں کھل کر پڑنے والا اسپل آج اسے کچھ خاص بنا رہا تھا۔ نتاشا نے ہاتھ میں پکڑا سنہری کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

"تمہاری شادی کا کارڈ ہے کیا؟" ارفع نے سو فیصد درست اندازہ لگایا تھا۔ اسے ایک فطری سی مسرت کا احساس ہوا اس نے فوراً بے تابی سے کارڈ کھولا۔

"یہ منصور احمد کون ہے؟" ارفع نے انتہائی دلچسپی سے پوچھا۔ نتاشا آج کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔

"خضر بالکل ٹھیک کہتا تھا کہ جہاں سے شاخ ٹوٹتی ہے وہیں سے پھر پھوٹتی ہے جانِ من۔"

"تم ان شاخوں اور خوشبوؤں کو چھوڑو۔ مجھے بس اتنا بتاؤ کہ یہ منصور صاحب کہاں سے ٹپکے ہیں اور کیا حدود اربعہ ہے ان کا؟" ارفع کو شدید بے چینی ہو رہی تھی۔

"بھابھی کا فرسٹ کزن ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک میں جاب کرتا ہے۔ سی اے کیا ہوا ہے۔" وہ جھینپتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"مجھے اصل بات بتاؤ کہ تمہیں کہاں ملا؟ اب خدا کے واسطے یہ مت کہنا 'ارینج میرج' ہے۔" ارفع نے اسے دھمکی دی۔

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ ارینج میرج ہے۔ لاسٹ ٹائم جب سعد کا سوگ منانے دبئی گئی تھی تب بھی بھابھی کی طرف آیا ہوا تھا۔ ان دنوں میں اپنے غم میں ڈوبی ہوئی تھی اور یہ میرے اندر گرد گھومتا پھر رہا تھا۔ اس کے بعد یہ بہانے سے پاکستان بھی آیا تب ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے جھٹ پٹ پروپوز کر دیا۔ میں نے بھی سوچا 'پہلی دفعہ کوئی ہینڈسم بندہ میری منتیں کر رہا ہے۔ مان ہی جاتی ہوں اس سے پہلے کہ بھاگ جائے۔'" وہ اپنے پرانے انداز سے مزے لے لے کر بتا رہی تھی۔

"شرم تو نہ آئی میرے بغیر منگنی کرواتے ہوئے۔" ارفع نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

"لو جی! تم سب کو انوائٹ کرنے کے چکروں میں پڑتی تو اتنی دیر میں وہ رفو چکر ہو جاتا۔ نال پاپا نال! اس دفعہ پکے کام کروائے ہیں۔ منگنی کے بجائے نکاح کروا لیا ہے۔ رخصتی اب پندرہ دن بعد ہے۔" اس کے انکشاف پر ارفع کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ویری گڈ اور کارپٹ۔ تمہاری رخصتی ہے تو وہ بھی کر دو۔" ارفع خفا ہوگی۔

"وہ تمہاری یہ ہے جناب! کہ سعد صاحب کی بیگم نے خلع کے لیے مقدمہ کر رکھا ہے۔ دونوں کی ٹیمیں بھی نہیں چل سکی سو سعد بدھو لوٹ کے گھر آ چکے ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟" ارفع نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "وہ تمہارے نکاح پر آیا تھا کیا؟" اس کے منہ سے پھسلا۔

"جی جناب! بیوی کے تیا تھا کہ اس کے والد صاحب کی عام سی شکل و صورت کی حامل بھانجی کا نکاح کسی احمق سے ہو رہا ہے لیکن اسے اس احمق کو دیکھ کر اس کی کوالیفکیشن کا سن کر خاصا شاک لگا تھا۔ اسی لیے بمشکل ہی منٹ ہی بیٹھا تھا۔" وہ عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے بتا رہی تھی۔

"اب مجھے یقین آیا ہے کہ اگر آپ کی قسمت اچھی ہو تو زندگی خود بخود خوب صورت ہو جاتی ہے ورنہ میں نے پچھلے دنوں کچھ خوب صورت لوگوں کو بھی قسمت کے آگے رلتے دیکھا ہے۔"

"تھینکس گاڈ! تمہیں یہ بات سمجھ میں آگئی ورنہ میں اور خضر تو تمہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔" ارفع نے بھی اس کے خیالات میں مثبت تبدیلی پر شکر ادا کیا تھا۔

"یہ خضر کب انگلینڈ سے واپس آئے گا؟ اب تم لوگ بھی فوراً شادی کر لو ممکن تو اس کا تقریباً بن چکا ہے۔"

"ہاں! امّا بھی یہی کہہ رہی ہیں۔ سارہ کا پروپوزل بھی فائنل ہو گیا پچھلے ہفتے۔ اس کے سسرال والے بھی بہت اصرار کر رہے ہیں اس لیے ان شاء اللہ بہت جلد۔" ارفع نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تم لوگوں کی شادی اٹینڈ کر کے ہی جاؤں گی۔ بار بار آنا کون سا آسان کام ہے۔"

"تمہیں کس چیز کا مسئلہ ہے؟ سوئس بینکوں والے تو ویسے بھی امیر کبیر لوگ ہیں۔ ہمارے ملک کا آدھا پیسہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ تمہارے میاں کو بھی خوب تنخواہ دیتے ہوں گے۔ آرام سے آتی جاتی رہنا۔" ارفع نے اسے چھیڑا تو وہ ایک دفعہ پھر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے دمک رہے تھے۔ ارفع کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ واقعی خوش تھی یا خوش نظر آنے کی اداکاری کر رہی تھی۔ اگر یہ اداکاری تھی تو لاجواب تھی۔

✿ ✿ ✿

وہ بہار کی ایک قرمزی شام تھی۔ جب وہ نتاشا کو اس کی شادی کی شاپنگ کروا کر تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی تھی۔ نتاشا پتا نہیں کیوں اپنی شاپنگ کے سلسلے میں اتنی حساس ہو رہی تھی یا پھر ساری ہی لڑکیاں اپنی شادی کے سلسلے میں اتنی ہی حساس ہو جاتی ہیں۔ بہت مشکل سے آج اس کے شادی کے جوڑے کا کام نپٹایا تھا۔ ارفع کا بازاروں میں گھوم گھوم کر پورا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ ماہو آپی کراچی سے آئی ہوئی تھیں۔ وہ ان کو بھی وقت نہیں دے پا رہی تھی۔ ذہنی اور جسمانی تھکن کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوئی تو اس وقت خلافِ معمول صوفیہ بیگم، سارہ اور ماہو آپی کو لاؤنج میں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ ایک لمحے میں اس نے ناخوشگوار فضا کو محسوس کیا تھا۔ وہ سب کو سلام کر کے سامنے صوفے پر بیٹھی تو صوفیہ بیگم نے خاصے سنجیدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

"ارفع! تمہاری آخری دفعہ خضر سے کب بات ہوئی تھی؟" وہ اندازہ نہیں کر پائی کہ صوفیہ بیگم کے انداز میں اجنبیت زیادہ ہے یا روکھا پن۔

"میری اس سے فون پر بات تو ایک ہفتہ پہلے ہوئی تھی جبکہ اسکائپ پر پرسوں۔" وہ ان کے اس انداز پر الجھ گئی۔ "کیوں خیریت۔۔۔؟"

"اس وقت کہاں تھا وہ۔۔۔؟" وہ عجیب کسوٹی کھیل رہی تھیں۔

"لندن میں۔۔۔" وہ مزید حیران ہوئی۔

"اس نے تمہیں کیا بتایا کہ وہ پاکستان کب آئے گا؟" صوفیہ بیگم کا چہرہ سپاٹ اور انداز بھی حیران کن حد تک روکھا پن لیے ہوئے تھا۔ وہ کچھ تشویش کا شکار ہوئی۔

"اس نے یہی کہا تھا کہ وہ چیزوں کو وائنڈ اپ کر رہا ہے۔ کچھ ٹائم لگے گا۔ یہی کوئی ایک یا ڈیڑھ ماہ۔" اس نے حیرت سے جواب دیا، پھر جھنجلا کر پوچھا۔ "ماما! کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں ہوا۔ کیا اس نے تم سے کوئی ذکر کیا تھا کہ وہ اٹلی جائے گا؟" صوفیہ بیگم کا لہجہ گہری کھوج لیے ہوئے تھا۔ ارفع نے بڑی تیزی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیا اس نے تمہیں پرسوں انٹرنیٹ پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اس وقت اٹلی میں ہے؟"

"کیا مطلب؟ خضر اٹلی میں ہے؟" اس نے سخت حیرت، تعجب اور بے یقینی سے صوفیہ بیگم کا چہرہ دیکھا۔ کمرے میں ایک بوجھل سا سناٹا بہت تیزی سے پھیلا

تھا۔ صوفیہ بیگم کو اس کے سوال میں اپنا جواب مل گیا تھا۔

"وہ اٹلی کیا کرنے گیا ہے؟ مجھے تو اس نے ایسا کچھ نہیں بتایا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اچانک پروگرام بن گیا ہو۔ آپ کو کیا علیزہ آپی نے بتایا ہے؟" اس کا سلسلہ دھیان فوراً "اپنی وہاں مقیم بہن کی طرف گیا تھا۔ اگر خضر وہاں گیا تھا تو اس نے یقیناً قیام بھی وہیں کیا ہوگا۔

"مجھے علیزہ نے نہیں بتایا۔" صوفیہ بیگم نے سپاٹ انداز میں کہا۔ "وہ علیزہ کے گھر نہیں ٹھہرا۔ اس کو تو علیزہ نے اچانک مارکیٹ میں دیکھا تھا اسے وہاں پہنچے پورے پانچ دن ہو چکے تھے۔ وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔" صوفیہ بیگم نے ایک اور بم اس کے سر پر پھوڑا تھا۔ وہ ایک دم ساکت ہو گئی۔

"ماما! آپ اس سے دو ٹوک انداز میں بات کریں۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ چھ ماہ پہلے تو اس نے مجھے فون کر کر کے سر کھایا ہوا تھا کہ ماما سارہ سے پہلے ان کی شادی کیوں نہیں کر رہیں۔ اب جب کہ گھر بھی مکمل ہو چکا ہے تو وہ کیوں شادی کی ڈیٹ مزید آگے چھ ماہ تک بڑھانا چاہتا ہے۔" ماہی آپی کی بات پر ارفع کو شاک لگا تھا۔ اس نے بے یقینی سے ان کا تکتا ہوا چہرہ دیکھا۔

"مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مجھ سے تو وہ بات ہی نہیں کر رہا۔ اس نے علیزہ کو یہ پیغام دیا ہے کیونکہ میں نے علیزہ سے کہا تھا کہ اسے بتا دو کہ سارہ کے سسرال والے اگلے ماہ شادی کا کہہ رہے ہیں۔ اس نے آگے سے عجیب سی بات کر دی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ایسا کرے گا۔ میں نے علیزہ سے کہا ہے کہ اس سے دوبارہ بات کرے۔" صوفیہ بیگم کی بات پر ایک سرد سی لہر ارفع کے وجود میں دوڑ گئی۔

"لیکن وہ آخر اٹلی کرنے کیا گیا ہے؟ اور وہ بھی کسی کو بتائے بغیر۔ پھر وہاں پہنچ کر اس نے علیزہ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ یہ بات کم از کم مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔" ماہرو آپی کی صاف گوئی عروج پر تھی۔ "ایسی صورت میں جب وہ علیزہ کے سامنے بھی آ گیا باتیں شاپنگ کر رہا تھا۔ علی نے مجھے خود بتایا ہے کہ وہ جیسی ہی عجیب حرکتیں کر رہا تھا اور اس کے بقول علیزہ کے وہاں کے گھر ٹھہرنے پر راضی نہیں ہوا۔"

"کم آن آپی! کیوں ایک بات کے پیچھے پڑ جاتی ہیں؟ اور سے علی آپی بھی آپ کی طرح وہمی ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کا کوئی کام آ جائے گا تو پوچھ لیجئے گا۔" سارہ نے ارفع کے تاریک ہوتے چہرے کو دیکھ کر بے زاری سے کہا۔ ارفع خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے ناگ کی طرح سر اٹھا رہے تھے۔ خضر اسے کچھ عرصے سے قدم قدم پر چونکا رہا تھا۔

"میں پاکستان آ گیا ہوں اور تم سے ملنا چاہتا ہوں کیا تم میرے فلیٹ پر آ سکتی ہو؟" دو دن بعد ہی خضر کی کال پر وہ اڑتے ہوئے اس کے فلیٹ پہنچی تھی۔ وہ خاصا تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ اس کا بڑا سا سیاہ بریف کیس بھی ابھی لاؤنج میں پڑا تھا۔ وہ شاید ابھی ابھی پہنچا تھا۔ اس کے فلیٹ کی چیزوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ ایک مہینہ اور چھ دن بعد آیا تھا۔ اسے دیکھ کر آج پہلی دفعہ ارفع کو اپنی سانسیں بے ترتیب ہوتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ بہت غصے میں آئی تھی لیکن اسے دیکھ کر اس کا سارا غصہ اس کے اندر ہی کہیں منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ وہ بیزار قالین پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی بالکل اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ سیاہ سوٹ میں اس کی دلکشی ہمیشہ بڑھ جاتی تھی لیکن آج اس دلکشی میں اداسی، بے چینی اور اضطراب بھی جھلک رہا تھا۔

"پلیز! مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ میں اٹلی کیوں گیا تھا کیونکہ مجھے خود معلوم نہیں میں وہاں کیا کرنے گیا تھا۔ میں وہاں سے آ گیا ہوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے وجود کا ایک حصہ وہیں چھوڑ آیا ہوں۔" خضر کے لہجے میں کچھ تھا جو ارفع کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے سخت حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ غیر ارادی طور پر اس کے سامنے پڑے صوفے پر اضطراری انداز میں بیٹھ گئی۔

"مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے کروں؟" ارفع کو وہ بری طرح الجھا ہوا لگا تھا۔

"کیا مطلب ۔۔۔؟ کیسے کروں ۔۔۔؟ ویسے ہی کرو جیسے تم کرتے آئے ہو۔" ارفع نے اس کا متفکر اور پریشانی میں ڈوبا چہرہ غور سے دیکھا۔ اسے اپنے اندر بے چینی کی شدید لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"میں تمہیں ہرٹ کرنا نہیں چاہتا ارفع!" اس نے حلق میں اٹکے گولے کو بمشکل نگلتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

"میں اب تک بہت زیادہ ہرٹ ہو چکی ہوں خضر! تم وہ بات کرو جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔" ارفع نے وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ارفع! ہم انسان بہت سادہ اور بے وقوف ہوتے ہیں۔ ہم بہت آگے کی پلاننگ کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اوپر ایک ذات ہے جو سب سے بڑی پلان میکر ہے۔ وہ ذات "کن" کہتی ہے اور بہت کچھ عدم سے وجود میں آ جاتا ہے۔ آج سے تین ماہ پہلے میری زندگی بھی بہت ہموار تھی لیکن پھر اس میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔" ارفع نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی تھی۔

"بہت کچھ بدل چکا ہے۔۔۔ میں بہت دن سے سب سے بہت بچتا پھر رہا ہوں۔ یقین جانو ارفع! اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے میرا قصور ہو بھی اوپر والی ذات بہتر جانتی ہے۔" وہ کچھ چپ ہوا۔ خوف اور اضطراب ارفع کے وجود میں خون کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نے بے ربط باتیں کرتے خضر کو خوفزدہ انداز میں دیکھا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو خضر؟" ارفع نے خود کو کسی طلسم میں گرتا ہوا محسوس کیا تھا۔

"دیکھو ارفع! تم بہت خوب صورت، حسین اور زندگی سے بھرپور لڑکی ہو۔ تمہارا ساتھ کسی بھی شخص کی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہو سکتا ہے۔ تین ماہ پہلے تک میں بھی خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا۔۔۔" خضر کی بات پر ارفع نے لفظ "تھا" کو بہت غور سے سنا۔ اسے ایسے لگا جیسے کمرے کی دیواریں اس کے اوپر اچانک ہی سے آن گری ہوں۔

"مجھے تم سے بہت محبت تھی۔۔۔" خضر کی بات پر وہ سانس لینا بھول گئی۔

"مجھے آج بھی تم سے محبت ہے۔۔۔" ارفع کو ایسے لگا کسی نے جو سانسیں اسے مستعار دے دی ہوں۔

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری زندگی میں تمہاری موجودگی میں بھی کوئی آ سکتا ہے اور یہ کہ زندگی مجھے ایک عجیب و غریب دوراہے پر لے آئے گی۔" ارفع کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس کا لہجہ زیادہ عجیب سا تھا یا بات۔

"کون ہے وہ؟" ارفع نے بمشکل سانس لی۔ کمرے میں گھٹن کا احساس ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔

"وہ مجھے جب پہلی دفعہ ملی تو میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے جلے ہوئے چہرے پر دوسری نگاہ ڈال سکوں۔۔۔" خضر نے اپنے تھیلے کو ایک دم ہی الٹ دیا تھا۔

"اس کا آدھا چہرہ بری طرح جلا ہوا تھا اور باقی آدھے چہرے سے ساری دنیا اندازہ لگا سکتی ہے کہ وہ زندگی کی رعنائیوں اور دلکشی سے بھرپور ایک لڑکی تھی۔ اسے ایک ناکردہ گناہ کی سزا ملی۔ وہ انیس سال کی معصوم لڑکی جس کی سوچوں میں بھی کسی مرد کا گزر نہیں ہوا تھا اس کو ایک ناکردہ جرم کی سزا بھگتنا پڑی۔ اس کے کزن نے اس کا پھول جیسا چہرہ تیزاب سے جھلسا دیا تھا۔ ماما نے مجھے اس سے ملوایا تھا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر کانپ گیا۔ ماما اور میں نہ صرف اس کا علاج کروانا چاہتے تھے بلکہ اسے انصاف بھی دلانا چاہتے تھے۔" وہ اپنے ہاتھوں کو اضطراری انداز میں مسلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ارفع کو اپنے وجود میں نشتر سے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"میں جو اس کو ہمت دلاتا تھا اسے زندگی کی طرف واپس لانا چاہتا تھا اس لڑکی کی اس سے بڑی بدنصیبی

کیا ہو گی جو اپنے چہرے کو مسخ حالت میں دیکھ کر چیخیں مارتی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ زندگی نے ایک اور تماشا کیا۔ اس کو اپنے واحد مسیحا سے محبت ہو گئی۔"

ارفع نے خوفزدہ نظروں سے آنکھیں چراتے مظفر کو دیکھا۔

"تم مجھے اصل بات بتاؤ مظفر۔" اس کے حلق سے بمشکل نکلا تھا۔

"پتا نہیں مجھے کیا ہوا ہے ارفع! اللہ کی قسم مجھے نہیں پتا لیکن مجھے اس لڑکی کا جلا ہوا چہرہ برا نہیں لگتا۔" اس کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے ارفع۔

"وہ جب ہنستی ہے تو اس کے بائیں گال پر گڑھا پڑتا ہے۔ وہ جب خاموش ہوتی ہے تو اس کی آنکھیں ایک اداس جھیل کا منظر پیش کرنے لگتی ہیں۔ وہ جب خوش ہوتی ہے تو اس کے ہنسنے کی کھنکھناہٹ میں کتنی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ مجھے تمام چیزیں ازبر ہیں۔ میں نے اس سے بھاگنے کی بہت کوشش کی لیکن میں جہاں جاتا ہوں وہ ایک چٹان کی مانند میرے سامنے آ جاتی ہے۔ مجھے کوئی راہ فرار نہیں ملتی۔ اس کے چہرے کا صرف ایک حصہ جلا ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ وہ کوشش کرے تو زندگی کی طرف واپس آ سکتی ہے۔ میں نے انگلی پکڑ کر اس کو دوبارہ چلنا سکھایا ہے۔ میرا دل اور میرا ضمیر نہیں مانتا کہ میں اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنی زندگی میں مگن ہو جاؤں۔"

وہ آنکھیں بند کیے بڑے پرسکون انداز میں اسے وہ داستان ایسے سنا رہا تھا جیسے وہ کسی اور کی ہو۔ ارفع شدید صدمے اور بے یقینی سے بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی روح تک بھونچال کی زد میں تھی۔

"غلط کہتے ہیں لوگ کہ محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے۔ غلط کہتے ہیں یہ بھی کہ انسان کسی کے چہرے یا جسمانی حسن کو دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پھر اس سے محبت کرتا ہے۔ اصل میں جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے اس کی ہر چیز ہمیں خود بخود پیاری لگنے لگتی ہے۔ ہم اسے دنیا کی نظروں سے دیکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم وہ دیکھتے ہیں جو ہمارا دل ہمیں دکھانا چاہتا ہے۔" ارفع کو لگا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ کوئی اس کے سر پر ہتھوڑے مار رہا ہے۔ وہ ہراساں نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں بہت اذیت میں ہوں یار۔" مظفر نے بات کرتے کرتے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔

"میں اسے چھوڑ نہیں سکتا لیکن تمہارے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ میں نے اس موضوع پر اتنا سوچا ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ میں مزید ایک گھنٹہ بھی اس پر اور سوچوں گا تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے بے آواز رو رہا تھا۔ ارفع کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اس نے پوری کوشش کی کہ وہ اس سے لڑے، چیخے چلائے لیکن وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل مفلوج ہو گئی تھی۔

"وہ کہتی ہے کہ اس نے اللہ سے دعا مانگی ہے کہ وہ چاہے اس کا چہرہ ٹھیک نہ کرے لیکن مظفر حیات کو اس کا نصیب بنا دے۔" مظفر کے ہونٹ بری طرح کپکپا رہے تھے۔

"ماما نے اسے علاج کی غرض سے اٹلی بھیجا تھا، لیکن اس نے منع کر دیا۔ ماما ناراض ہو گئیں تو اسے میں نے اپنے ایک دوست کے کلینک میں شفٹ کروا دیا۔ ماما سمجھ رہی ہیں کہ اس کے والدین اسے آ کر لے گئے ہیں۔" وہ اسے ایک عجیب سی داستان سنا رہا تھا۔

"میں نے اسے بہت مشکل سے اٹلی جانے پر راضی کیا۔ کتنے محاذوں پر جنگیں لڑیں۔ کتنے ڈرامے کیے۔ اس کے خاندان والوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اسے دارالامان بھیج دیا جائے۔ وہ اسے قبول نہیں کر سکتے۔ میں نے بہت مشکلوں سے ایک دوست کے ذریعے اسے باہر بھجوایا۔ ماما کو اس بات کا علم نہیں۔ وہ سمجھ رہی ہیں کہ میں نے بھی اس کیس کو چھوڑ دیا ہے۔" اس نے ایک اور بم اس کے اعصاب پر پھوڑا تھا۔

"اس کے اٹلی جانے کے بعد مجھے لگا کہ میری زندگی نارمل ہو جائے گی۔ میں انگلینڈ میں تھا جب مجھے پتا

کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ مجھے نہیں معلوم میں کیسے انگلینڈ سے یہاں چلا گیا۔ کوئی طاقت تھی جو مجھے دھکیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کافی حد تک بہتر ہو گئی۔ مجھے اب سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں؟ میں اللہ کے سامنے بہت رویا ہوں' گڑگڑایا ہوں کہ مجھے درست فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ میں نے سات دن استخارہ کیا ہے۔ میری سمجھ نہیں آیا کہ اللہ اسے میرے لیے بہتر کیوں کہہ رہا ہے۔" اسفنج کو ایسے لگا تھا کہ کسی نے اسے اچانک زور سے دھکا دے دیا ہو' کوئی ٹرین اس کے اوپر سے اس کے پرخچے اڑاتی گزر گئی ہو۔ رخساروں سے پھسلتے آنسو اس کی ٹھوڑی سے زمین پر گر رہے تھے۔

وہ اٹھ کر بالکل اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اسی جگہ پر اس نے ارفع کو پہلی دفعہ روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی جگہ وہاں بری طرح ٹوٹے' بکھرے دیکھ رہی تھی۔ اسے کند چھری کے ساتھ ذبح کیا جا رہا تھا۔ درد اور اذیت کی شدت نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد آنسوؤں کی چادر اتنی گہری ہو گئی تھی کہ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"ارفع! اگر اللہ نے اسے میرے لیے بہتر خیال کیا ہے تو وہ تمہارے لیے محبت میرے دل سے نکال کیوں نہیں دیتا؟ میں دو کشتیوں کا مسافر بن کر زندگی کیسے گزار سکتا ہوں؟ مجھے سکون کیوں نہیں آتا؟ میرا دل ٹھہر کیوں نہیں جاتا؟ میرا ضمیر مجھے ملامت کیوں کر رہا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا؟" اسے بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔

"خضر! اگر میں تمہیں کہوں کہ تم اس لڑکی کو چھوڑ دو تو کیا تم اسے چھوڑ دو گے؟" وہ اس ساری گفتگو میں بس اتنا ہی بولی تھی۔ خضر کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ وہ بنا کسی توقف کے بولا۔

"ہاں! چھوڑ دوں گا لیکن اس کے بعد ساری زندگی اللہ اور ضمیر کی عدالت میں کبھی سر اٹھا کر نہیں کھڑا ہو سکوں گا۔"

"پھر تم مجھے چھوڑ دو۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں' کوئی شکایت نہیں۔ پوری ایمانداری کے ساتھ اس لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر لو۔ جب اللہ سے مشورہ کر لیا جائے تو پھر شکوک و شبہات میں نہیں پڑتے اللہ انسانوں کے لیے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔" اگرچہ اس کی سانس حلق میں اٹک رہی تھی لیکن وہ اب بڑے ہموار لہجے میں بول رہی تھی۔

"میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔" خضر کو اپنا دل کسی گہری کھائی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"پھر میں تمہیں چھوڑ دیتی ہوں۔ اگر میں تم سے تعلق رکھوں گی تو میں اپنے ضمیر اور اللہ کی عدالت میں کبھی سر اٹھا کر نہیں کھڑی ہو سکوں گی۔" وہ اس کی بات پر شدید بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی یکدم مدھم ہو گئی۔

"ارفع! میں تم دونوں کو آرام کے ساتھ رکھ سکتا ہوں' اگر تم اپنا دل بڑا کر لو۔" وہ التجائیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"ضروری خضر! تمہارے معاملے میں میری محبت کا ظرف بہت چھوٹا ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ اٹھی۔

"فار گاڈ سیک ارفع! تمہارے بغیر زندگی گزارنا میرے لیے زیادہ اذیت ناک ہو گا۔ پلیز! میری بات مان جاؤ۔" وہ اس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔

"خضر!" وہ اس کی جانب مڑی۔ "اگر تمہارے دل میں میرے لیے واقعی کوئی محبت ہے تو پلیز! مجھے یہ بات دوبارہ مت کہنا۔ میں تمہیں کھلے دل سے اس لڑکی کو اپنانے کی اجازت دیتی ہوں۔ لیکن مجھے اپنے ساتھ کسی آزمائش میں مت ڈالو۔" اس کی آواز' انداز اور الفاظ میں کچھ تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

"تم استخارہ کر چکے ہو اور جب اللہ سے مشورہ کر لیا جائے تو پھر بندوں سے مشورہ کر کے خود کو گناہ گار مت کرو۔ ضروری نہیں ہوتا کہ زندگی میں جو چیزیں ہمیں اچھی لگتی ہوں وہ سب ہی مل جائیں۔ میرا خیال اب دل سے نکال دو اور پوری ایمان داری سے وہ کام کرو

جس کا مشورہ تم اللہ سے کر چکے ہو۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ ایک دم سے کمرے سے نکل گئی تھی۔ قسمت نے ان دونوں کے ساتھ بہت عجیب کھیل کھیلا تھا۔ وہ اپنی گاڑی کی چابی وہیں بھول گئی تھی۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ وہ بمشکل اپنے پاؤں گھسیٹتے ہوئے چل رہی تھی۔ اس کا دل اس کا سارا وجود دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

وہ پیدل ہی پورا ایک سیکٹر کراس کر آئی تھی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی جب مرکز کے قریب نتاشا نے اسے دیکھا۔ اس کا آفس وہیں قریب ہی تھا۔ اس نے دیکھا' وہ فٹ پاتھ پر بیٹھی دونوں ہاتھ منہ پر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

وہ سخت حیرت' تعجب اور بے یقینی کے ساتھ اپنے سامنے بیڈ پر نیم بے ہوش پڑی ارفع کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا پورا جسم پچھلے دو دن سے بخار میں جھلس رہا تھا۔

"تم نے خضر حیات سے شادی سے انکار کیوں کیا ہے ارفع؟" وہ انتہائی زیرک نگاہوں سے اس کا بے تاثر چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ ہی اس دن اسے گھر لائی تھی۔ سارے راستے ارفع ہچکیوں سے روتے ہوئے آئی تھی لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ گھر آتے ہی وہ بے سدھ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ وہ شدید ذہنی دباؤ میں ہے' اس لیے اسے مزید ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ وہ ادویات کی وجہ سے غنودگی میں تھی' جب اس نے ایک دن ہاسپٹل میں بالکل اپنے پاس کھڑے خضر کو دیکھا۔ وہ مکمل ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ لیکن وہ اس کی آنکھوں میں جھلملاتی نمی کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ جتنی خاموشی سے آیا تھا' اس سے بھی زیادہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ اسے سارہ نے بتایا تھا کہ خضر انگلینڈ واپس چلا گیا ہے' تب اس نے سب کو یہی بتایا تھا کہ اس نے خضر سے شادی سے انکار کیا ہے۔ وہ ابھی بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لعنتوں' ملامتوں کا ایک سلسلہ خضر کے خلاف شروع ہو جائے۔ سارہ' ماہو آپی اور حتیٰ کہ

علیزہ آپی نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا تھا لیکن اس کی "نہ" "ہاں" میں نہیں بدلی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ خضر انگلینڈ میں شفٹ ہونا چاہتا تھا۔ اسی بات پر دونوں کا اختلاف ہوا اور بات بہت آگے تک بڑھ گئی۔

سب لوگ سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔ وہ سب بھی یہی سمجھے تھے کہ خضر غصے میں پاکستان چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ ایک رات اس نے ان سب کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ خضر کے علاوہ ہر بندے سے شادی کو تیار ہے لیکن اس سے کسی قیمت پر نہیں۔ اس کا لہجہ اس قدر دو ٹوک اور لچک سے عاری تھا کہ سب خاموش ہو گئے۔ جس دن بابا نے خضر کو انتہائی شرمندگی سے فون کر کے کہا تھا کہ وہ سخت شرمندہ ہیں کیونکہ ارفع اس سے شادی کے لیے کسی صورت راضی نہیں' اسی رات اس کا آخری میسج آیا تھا۔

"ارفع! پلیز میرے اوپر اتنے احسان مت کرو کہ میں ان کے نیچے ہی دب کر کسی دن مر جاؤں۔"

اس نے سارا الزام اپنے سر لے لیا تھا' کسی نے بھی خضر کو ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ لیکن اس دن جس حالت میں نتاشا اسے گھر لے کر آئی تھی اور اس نے جس طرح اسے روتے ہوئے دیکھا تھا' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ صرف اس ایک بات پر ارفع اتنا بڑا فیصلہ کر سکتی ہے اور خضر جیسا بندہ بھی اس کے فیصلے پر کوئی مزاحمت نہیں کرے۔ یہ بات اس کی عقل سمجھنے سے عاری تھی۔

"فار گاڈ سیک ارفع! مجھے بہلاؤ مت۔ میں نے تمہارے اور خضر کے ریلیشن شپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں اس بات کو مان نہیں سکتی کہ تم اتنی سی بات پر اتنا بڑا فیصلہ کر لو۔" اس نے بنا کسی تمہید کے ایک دفعہ پھر اس سے پوچھا تھا۔

"یہ اتنی سی بات نہیں تھی نتاشا!" ارفع کے حلق سے بہت دھیمی سی آواز نکلی تھی۔ وہ جبراً مسکراتے ہوئے بمشکل اٹھی تھی۔ نتاشا نے فوراً ٹیک کراس کے پیچھے تکیہ رکھا تھا۔

"یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی کہ جس کے لیے

اتنے سالوں کا اتنا خوب صورت ریلیشن ختم کر دیا جائے۔"

"کبھی کبھی جو چیز کسی اور کے لیے بہت معمولی ہوتی ہیں، کسی دوسرے کی ساری زندگی ہوتی ہیں ملی ڈیئر!" اس کی گلابی رنگت میں زردیاں سے گھل گئی تھیں۔

"پھر بھی ارفع! تم اپنے فیصلے پر دوبارہ سوچو۔ خضر کو بھی سوچنے کا کہو۔ مجھے تو ابھی بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے بھی اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ کیوں بنا لیا ہے اور تم بھی کیوں اڑی ہوئی ہو۔ آخر انگلینڈ شفٹ ہونے میں حرج ہی کیا ہے؟" وہ آنکھیں جھلاتے ہوئے شدید بیزاری سے کہہ رہی تھی۔ "تم تو ویسے بھی زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہتی ہو۔"

"لیکن مجھے اب نہیں رہنا۔" ارفع نے بے زاری سے کہا۔

"تو نہ رہنا لیکن دانشمندی سے بات کو ڈیل کرو۔ خضر نے کچ تک تمہاری کوئی بات ٹالی ہے جو اب ٹالے گا؟ مان جائے گا وہ۔ لیکن پیار سے سمجھاؤ۔" ناتاشا نے اسے سمجھانے کی ایک دفعہ پھر کوشش کی۔

"مجھے اس فیصلے پر نہ کچ سوچنا ہے اور نہ کچھ کرنا ہے۔" اس کے انداز میں چٹانوں سی مضبوطی محسوس کر کے وہ بری طرح جھلا گئی تھی۔

"تم کہو تو میں خضر سے بات کروں؟"

"ہرگز نہیں۔!" ارفع کے دوٹوک انداز پر وہ ٹھٹکی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" ناتاشا نے سخت برا مانا تھا۔ "تم دونوں ایسا کیوں کر رہے ہو یار! خضر کو فون کرتی ہوں تو وہ اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں بولتا۔ تمہاری ماما نے، سارہ نے اور علی آنٹی، ہم سب نے اس سے اگلوانے کی کوشش کی ہے لیکن اس نے بھی اپنے منہ کو تالا لگا رکھا ہے۔ جانے تمہیں کیا چیز لڑی ہے کہ تم دونوں کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی۔ سارے گھر کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔"

"ہم نے کیا کر دیا ہے ہم لوگوں نے جو تم سب لوگ روز سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہو۔؟ اور ایسا کیا انوکھا ہو گیا ہے؟ کیا تمہارا اور معید کا بریک اپ نہیں ہوا تھا؟" اس کے تلخ انداز میں کہنے پر ناتاشا کے چہرے پر بڑی سرعت سے ایک تاریک سایہ دوڑا تھا۔

"پلیز ارفع! تم خود کو میرے ساتھ مت ملاؤ۔ ہمارے کیس میں تو میں یک طرفہ طور پر اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ وہ تو میرے ساتھ صرف ٹائم گزار رہا تھا۔ ایسے معاملات کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن تمہارا کیس تو بہت مضبوط تھا۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ تم لوگ شادی کرنے والے ہو۔"

"خدا کے واسطے ناتاشا! ساری چیزوں کا حل شادی نہیں ہوتی۔ کہاں لکھا ہے کہ جس سے محبت ہو تو اس سے شادی ضرور کرو؟" اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔ ناتاشا کو اس کے ردعمل پر حیرانی ہوئی۔

"سوئٹ ہارٹ! ہم لوگ یورپ میں نہیں رہتے جہاں لوگ محبت کی وجہ سے شادی کے بغیر بھی ایک ساتھ ایک روم شیئر کرتے ہیں۔ ہمارا مذہب ان چیزوں کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمیں اپنے رشتوں کو نام دینا پڑتا ہے۔" ناتاشا اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کچھ نرم ہوئی۔

"تو میں کون سا اس کے ساتھ رہنے کا اعلان کر رہی ہوں جو مجھے کسی نام کی ضرورت پڑے؟ وہ واپس چلا گیا ہے تو بس جا کر کسی نہ کسی سے شادی کر ہی لے گا، بات ختم۔"

"تو تم کیا کرو گی؟" ناتاشا کے چبھتے لہجے پر اس نے بے ساختہ آنکھیں چرائیں اور پلکوں کو تیزی سے جھپک کر ان میں آنے والی نمی کو چھپایا۔

"میں نے فی الحال کچھ نہیں سوچا، لیکن میں بھی کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔" اس کے جواب پر وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

☆ ☆ ☆

دن گزرتے جا رہے تھے، لیکن ان میں بے رنگی اور بے کیفی کا عنصر نمایاں ہو گیا تھا۔ سارہ کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ اس دن صوفیہ بیگم کے چہرے کی رنجیدگی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ ان دونوں کو اکٹھے دلہن کریں گی لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سارہ کی شادی صوفیہ بیگم نے خوب دھوم دھام سے کی تھی۔ خضر اس کی شادی پر نہیں آیا تھا۔ لیکن اس نے سارہ کو شادی پر گاڑی کا تحفہ دیا تھا۔

ارفع نے خود کو بہت زیادہ مصروف کر لیا تھا۔ اسی دوران وہ ایک چھ ماہ کا ڈاکومنٹری فلمز سے متعلق ایک اور کورس کرنے امریکہ چلی گئی تھی۔ امریکہ قیام کے دوران ہی اسے پتا چلا کہ ناتاشا سوئٹزرلینڈ اپنے میاں کے ساتھ شفٹ ہو گئی ہے۔ واپس آ کر اس نے کئی پراجیکٹس اکٹھے شروع کر لیے تھے، سوائے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ سارہ کے ہاں بیٹے کی پیدائش اور خضر کی شادی کی اطلاع اسے اکٹھے ہی ملی تھیں۔

"دیکھو ذرا خضر کو۔ تم سے اگر ناراض تھی تو کم از کم ہمیں تو شادی پر بلا لیتا۔ پتا نہیں کس کے ساتھ شادی کی ہے اس نے۔ کچھ خیر خبر نہیں۔" سارہ اپنے بیٹے کے ساتھ ان دنوں میکے میں ہی تھی اور خضر کی شادی کی خبر نے ماما کے ساتھ اسے بھی کافی رنجیدہ کیا تھا۔ وہ جو کسی میگزین پر لگنے والی ڈاکومنٹری غور سے دیکھ رہی تھی اس کی بات پر چونک گئی لیکن وہ خود کو بے پروا ثابت کرنے کے لیے مسلسل ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

"ظاہر ہے! اسے شادی تو کرنی ہی تھی۔ آخر کوئی کسی کے لیے کب تک جوگ لے سکتا ہے۔" صوفیہ بیگم نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کو میز پر رکھتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ انہیں کچھ عرصے سے ارفع سے بہت گلے شکوے تھے۔ وہ اپنے لیے آنے والے ہر رشتے میں سے کوئی نہ کوئی نقص نکال کر مسترد کر دیتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صوفیہ بیگم کی شکایتوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ سارہ ان کے قریب ہی رہتی تھی اس لیے صوفیہ بیگم اکثر اس کے سامنے ہی اپنے دکھڑے روتی تھیں اور وہ بھی صوفیہ بیگم کی تمام شکایتوں کو بہت غور سے سنتی تھی۔

"ویسے ماما اس نے شادی کی کس سے ہے؟ آپ کو اس نے بتایا؟ مجھ سے تو دو منٹ کی بات ہوئی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ تصاویر میل کرنا، لیکن اس کے انداز سے لگ نہیں رہا تھا کہ وہ ایسا کرے گا۔" سارہ نے تجسس سے پوچھا لیکن بات کے اختتام تک اس کے لہجے میں مایوسی در آئی۔

"وہ کبھی بھی تصاویر میل نہیں کرے گا۔" ارفع نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

"وہ بھلا مجھے کیوں بتانے لگا اور پھر پوچھا تو میں نے خود بھی اس سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ کوئی بھی ہو، ہمیں کیا۔" صوفیہ بیگم حد درجہ آزردہ ہوئی تھیں۔

"ہاں! ہمیں تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اس نے بھی اعتراف کیا۔ "ماما مسز علوی نے جو ارفع کے لیے اپنے بھانجے کے پرپوزل کا ذکر کیا تھا اس کا کیا بنا؟" سارہ کی بات پر ارفع نے جھٹکے سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"مجھے مسز علوی کے کسی بھانجے سے شادی نہیں کرنی۔ جب میں ایک دفعہ کہہ چکی ہوں کہ اگلے دو سال تک میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تو آپ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی۔" وہ بھڑک کر کھڑی ہو گئی۔ صوفیہ بیگم اور سارہ دونوں ہی کی آنکھوں میں بے زاری کا سا اضطراب سٹ آیا تھا۔

"آخر کب تک نہیں کرو گی تم شادی؟ جب خضر سے شادی سے تم نے خود انکار کیا تھا تو اب کس چیز کا سوگ منا رہی ہو۔؟" سارہ کو بھی غصہ آ گیا۔

"خضر کوئی دنیا کا آخری مرد نہیں تھا اور تمہیں کس نے کہا ہے کہ میں اس کا سوگ منا رہی ہوں؟" وہ سوکھی لکڑی کی طرح چٹخی تھی۔

"تو پھر ہر آنے والے پرپوزل سے انکار کیوں کر رہی ہو؟" سارہ کی آواز جھنجلائی ہوئی تھی۔

"اس لیے کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ جب میرا ایسا کوئی ارادہ بنے گا تو میں تم لوگوں کو یہ بتا دوں

بجائے لوگوں کو دیکھنے کے شغل سے بچاؤں گی' اس لیے برائے مہربانی میرے حال پر رحم کریں اور یہ شادی والوں والے ڈرامے اور جذباتی بلیک میلنگ میرے ساتھ نہ کریں۔" ارفع کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ وہ تلخ لہجے میں کہہ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

"دیکھ لیں ماما! کتنا دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ ہمیں اس کی خضر والی بات مانی ہی نہیں چاہیے تھی۔" سارہ نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا جو پہلے ہی خاصے صدمے کا شکار دکھائی دے رہی تھیں۔

"سارہ! کہیں کوئی اور تو نہیں ہے... جس کے لیے...؟" صوفیہ بیگم کی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

"کم آن ماما! ایسی کوئی بات نہیں ہو گی اور فرض کریں۔ ایسا کچھ ہو بھی تو آپ شروع سے ہمارے ساتھ اتنی فرینڈلی رہی ہیں۔ اسے اچھی طرح پتا ہے کہ آپ کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہو گی' ملی آپی اور عفیرہ آپی دونوں کی شادیاں ان کے کلاس فیلوز کے ساتھ ان کی پسند سے ہوئی ہیں۔ صرف میرے معاملے میں آپ کو بھاگ دوڑ کرنی پڑی ہے۔ اس لیے میرا نہیں خیال کہ ارفع کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ ہے۔" سارہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا ہو جس کے بارے میں اسے لگتا ہو کہ مجھے پسند نہیں آئے گا۔ میرا مطلب ہے کہ اسٹیٹس یا کوالیفکیشن کے حساب سے...؟" صوفیہ بیگم کے اندیشے ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ سارہ ان کی بات پر ہنسی۔

"ماما! اس کے مزاج کا پتا تو ہے آپ کو۔ اپنے سے کسی بھی لحاظ سے کم کوئی شخص اسے پسند آ سکتا ہے بھلا۔ اور ایسی صورت میں جب وہ خضر جیسے بندے کو چھوڑ چکی ہو۔" اس کی بات میں اتنی قطعیت تھی کہ صوفیہ بیگم کو اپنے تمام اندیشے فضا میں تحلیل ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ انہوں نے یک دم ہی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ اس بات کی طرف تو واقعی ان کا دھیان نہیں گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ شاہ بلوط کے درخت کے مضبوط تنے سے ٹیک لگائے پچھلے دو گھنٹے سے وہیں ایک ہی پوزیشن میں کھڑی تھی۔ وہ جب کھڑے کھڑے وہاں تھک گئی تو اسی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ گھاس پر اگی گھاس کی پتیاں توڑ کر اسے مٹھی میں بالکل بے دھیانی سے مسل رہی تھی۔ اس وقت وہ اٹلی کے ایک ہسپتال کے بالکل سامنے بنے ایک خوب صورت پارک میں تھی۔ اس وقت وہ بیرونی دنیا سے یکسر لاتعلق تھی کہ اس کے اندر توڑ پھوڑ کا ایک جہان آباد تھا۔

ابھی ایک ہفتہ پہلے تک اس کا اٹلی آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ پاکستان میں خواتین پر ہونے والے جسمانی تشدد پر ایک ڈاکومنٹری بنا رہی تھی۔

بس اسی دوران ارفع نے اٹلی آنے کا ارادہ کر لیا۔ اسے اس کی رہائش کی تلاش میں زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے جب وہ ہسپتال پہنچی' اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہیں ایک ڈاکٹر نے بڑے خوشگوار انداز میں اس کی ہسٹری بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا شوہر بہت جنٹلمین ہے اور اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ کچھ ماہ پہلے ہی ان کی شادی ہوئی ہے اور وہ امید سے بھی ہے۔

ارفع نے جب اسے دیکھا تو وہ دائیں کروٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی وہ جلد انتہائی شفاف اور سرخ و سپید تھی۔ اس نے سوتے ہوئے کروٹ لی تھی۔ ارفع کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اس نے بے اختیار ہی اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹائی تھیں۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ ابھی اس کے کافی سارے آپریشن ہو چکے ہیں اور بہت سے باقی ہیں۔ اتنے آپریشنز کے بعد بھی اس کی طرف دیکھنا ایک دشوار کن مرحلہ تھا تو پہلے اس کی حالت کیا ہو گی' وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اس نے ایک نگاہ میں اس کے چہرے پر پھیلی

پرسکون مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔ وہ سوتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھی۔ ارفع کے لیے کمرے میں ٹھہرنا دشوار ہو گیا۔ وہ باہر آ گئی۔ موسم نے بھی اچانک ہی انگڑائی لی تھی۔ گہرے سیاہ بادل نہ جانے کہاں سے آ گئے تھے۔ انہوں نے آسمان پر اپنی چادر بچھا دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔

بارش اور آنسو دونوں ہی اپنی پوری شدت کے ساتھ برس رہے تھے۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ اسے بے پناہ تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ انتہائی اعصاب شکن لمحات تھے۔ وہ ارد گرد کے لوگوں کی حیرت سے بے نیاز بس انجانے راستوں پر چلتی جا رہی تھی۔ اس کا سیاہ لباس بری طرح بھیگ چکا تھا۔ وہ سنگلاخ فٹ پاتھ پر بنے سنگ مرمر کے بینچ پر بیٹھ گئی۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے بہت کم لوگ باہر نظر آ رہے تھے۔ وہ دونوں ٹانگیں بینچ پر اوپر رکھے نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی۔

بارش اور آنسو دونوں تھمے ہی تھے۔ وہ اب بالکل خاموش تھی' جب ارغوانی پھولوں کی روش سے چلتا ہوا ایک اطالوی جوڑا اس کے سامنے آ کر رکا تھا۔ وہ دونوں کسی کالج کے اسٹوڈنٹس لگ رہے تھے۔ سنہری ریشم جیسے بالوں والی لڑکی کے ہونٹ بالکل اسٹرابری کی طرح سرخ تھے۔ وہ اپنی گہری نیلی آنکھوں کو حیرت سے پھیلا کر اٹالین میں کچھ پوچھ رہی تھی۔ ارفع نے بے زاری سے سر کے اشارے کو نفی کے انداز میں ہلایا۔ وہ اب انگلش میں اس سے اس کی خیریت پوچھ رہی تھی۔

ارفع زبردستی مسکرائی۔ ان کے یوں دیکھنے پر ارفع کو تھوڑی سی الجھن ہوئی۔ سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا جس نے گہرے سبز رنگ کی پتلون پر سرخ شوخ سے رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے تھوڑا سا جھک کر سنہری بالوں والی لڑکی سے کچھ کہا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک چاکلیٹ نکال کر بڑے دوستانہ انداز میں ارفع کی طرف بڑھائی۔ اس لڑکی کے ہونٹوں پر ایک دلکش سی مسکراہٹ تھی۔ ارفع نے نہ چاہتے ہوئے بھی چاکلیٹ اس کے ہاتھ سے پکڑ لی۔ وہ لڑکا ایک دفعہ پھر شوخ کے انداز میں اسے کچھ کہہ رہا تھا۔

"یہ کہہ رہا ہے کہ تم اتنی خوب صورت ہو کہ تمہارے چہرے سے نظر ہٹانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔" لڑکی نے ہنس کر کہا۔

ارفع کو نہ جانے کیوں لگا تھا کہ منہ میں رکھا چاکلیٹ کا ٹکڑا حلق میں پھنس گیا ہو۔ وہ ایک دفعہ پھر اسی اضطرابی کیفیت کا شکار ہوئی تھی۔ اس نے خالی نظروں سے دونوں کو دیکھا جو لاابالی انداز میں فٹ پاتھ پر پڑے پتھر کو ٹھوکر لگاتے ہوئے آگے لے جا رہے تھے۔ بارش کب کی رک چکی تھی مگر آسمان پر بادل پھر برسنے کو تیار تھے۔ تیز ہوا درختوں کے پتوں سے شائیں شائیں کرتی گزر رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک اسی حالت میں بیٹھی رہی یہاں تک کہ اس کی گردن سے ٹیسیں اٹھنے لگیں اور ایک ہی جانب دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

"میرے چہرے سے نظر ہٹانا اگر مشکل کام ہے تو خضر نے یہ کام اتنی آسانی سے کیسے کر لیا؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑا باقی چاکلیٹ کا ٹکڑا سامنے درخت کے ساتھ لگے ڈسٹ بن میں اچھال دیا۔ سانحے کو گزرنے کے بعد بھی اس کا دل اس تلخ حقیقت کو ماننے سے انکاری تھا کہ خضر اس کی زندگی سے نکل چکا ہے۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ پر حدت قطرے مسلسل اس کے گالوں پر لڑھک رہے تھے۔ اس کے اندر خالی پن پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ اگلے دن پاکستان چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

لان میں لگے شاہ بلوط کے درختوں کے نیچے سفید لوہے کی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے ارفع اور ثنا کے مابین ایک محسوس کن بوجھل سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ ثنا صوفیہ بیگم کے اچانک انتقال پر بطور خاص اس سے ملنے اور افسوس کرنے آئی تھی۔ اس کے اٹلی سے واپس آنے کے تقریباً ڈیڑھ سال کے

بعد صوفیہ بیگم کا ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے بالکل اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ ارفع تقدیر کے اس وار پر بالکل ششدر رہ گئی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بظاہر اتنی مضبوط نظر آنے والی صوفیہ بیگم کا دل اتنا کمزور ہو سکتا ہے۔ سارہ جو اپنے میاں کے ساتھ آئرلینڈ شفٹ ہو گئی تھی۔ عفیرہ آپی جو دبئی میں تھیں وہ دونوں جب تک پہنچیں، صوفیہ بیگم کو منوں مٹی کے نیچے دفن کیا جا چکا تھا۔ اس کی تینوں بہنیں ماما کے چالیسویں تک وہیں رکی رہی تھیں۔ عفیرہ آپی نے اور سارہ نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ ماہو آپی البتہ کراچی سے اسلام آباد شفٹ ہونے کے ارادے سے گئی تھیں۔

نتاشا کے بیٹا ہوا تھا اس لیے وہ فوری طور پر تو نہیں آ سکی تھی، لیکن پاکستان پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کے پاس آئی تھی۔ نتاشا نے باتیں کرتے کرتے اچانک کہا۔ "ارفع! میں انگلینڈ گئی تھی۔ وہاں مجھے خضر ملا تھا۔" ارفع نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ نتاشا کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

"ارفع! تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟" وہ بہت غور سے ارفع کے چہرے پر پھیلی تاریکی کو دیکھ رہی تھی۔

ارفع کچھ نہیں بولی۔ وہ شاہ بلوط اور املتاس کی شاخوں سے لپٹی ہوئی شام کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے۔

"میں کبھی زندگی میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم دونوں کے درمیان اتنا کچھ ہو جائے گا اور تم لوگ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دو گے۔" نتاشا کے چہرے پر بجھی ہوئی راکھ جیسی مسکراہٹ تھی۔

"میرا ذہن آج بھی اس حقیقت کو ماننے سے انکاری ہے کہ تم جیسی خوب صورت، حسین اور مکمل لڑکی پر کوئی کسی اور کو ترجیح دے سکتا ہے۔ مجھے خضر نے بتایا کہ تم نے اسے خود یلوشہ سے شادی کرنے کی اجازت دی تھی۔ تم کتنی بے وقوف ہو ارفع۔۔۔" نتاشا کی بات پر ارفع کے گلے میں بے شمار آنسو اٹکے تھے۔ دل میں کوئی پھانس سی چبھ گئی تھی۔

"تم اس کا منہ توڑ دیتیں۔ اس کا گریبان پکڑتیں۔ تم کیوں اتنی آسانی سے اس سے دستبردار ہو گئیں۔۔۔ بے؟" اس کی آواز میں خفگی تھی۔

"تم کسی کو کچھ تو بتاتیں۔۔۔ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔" نتاشا کی آواز میں دکھ، صدمہ اور ناراضی کے سارے ہی رنگ تھے۔

"کیا بتاتی؟" وہ بولی تو اس کی آواز میں ایسی تلخی تھی کہ نتاشا اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم نے اس کی بیوی کو دیکھا ہے نتاشا؟" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

"ہاں دیکھا ہے اور اللہ معاف کرے اتنے اپ ٹو ڈیٹ ہونے کے باوجود بھی اس کی طرف دیکھنا کسی جنگی آزمائش سے کم نہیں تھا۔" نتاشا کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھی۔ ارفع نے اس کی بات پر گہری سانس بھری۔

"اسے وہ جھلسا ہوا چہرہ میرے چہرے سے زیادہ خوب صورت لگنے لگا تھا، پھر بتاؤ میں کیا کرتی؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ نتاشا کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"وہ اس کے اور میرے بیچ میں خدا کو لے آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے استخارہ کیا اور یلوشہ درانی کی طرف اشارہ ہوا۔ اب بتاؤ! میں کون ہوتی ہوں اللہ کے کاموں میں دخل دینے والی۔" وہ بمشکل بولتے ہوئے اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہاں! بس ایک وہی اللہ کا ولی رہ گیا ہے، جس کو اشارے ہوتے تھے۔" نتاشا کو بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔

"ایسے نہیں کہتے نتاشا! ہم کون ہوتے ہیں اللہ کے نام سے ہونے والے کاموں میں شک کرنے والے۔ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یلوشہ کے لیے محبت اللہ ہی نے اس کے دل میں ڈالی تھی ورنہ اسے اس کا جلا ہوا چہرہ حسین ترین نہ لگتا۔ تم خود سوچو! کوئی کسی پر ترس کھا کر یا ہمدردی کے نام پر بھی اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتا ہے۔" اس کی دلیل پر نتاشا چپ رہ گئی۔

"تم خود سوچو! تمہارا کہنا ہے کہ اس کی طرف دیکھنا کسی بڑی آزمائش سے کم نہیں تو پھر کوئی مومن بھی کسی جذبے کے لیے اپنے آپ کو کیوں امتحان میں ڈالے گا؟ یقین مانو مجھے بھی بہت تکلیف ہوئی تھی اس کے اس فیصلے سے، لیکن پھر اللہ نے میرے دل کو صبر دے دیا۔" ارفع کا انداز بہت سادہ تھا۔ تاشا نے رشک بھری نظروں سے اس کے مطمئن چہرے کو دیکھا۔

"تاشا! صبر کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے، لیکن اللہ اپنے بندوں پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ آج میں سوچتی ہوں کہ اس نے بہترین فیصلہ کیا۔ اس نے ایک جان بچالی۔ وہ لڑکی اگر یہاں ہوتی تو اب تک اپنے خاندان کے انتقام کی آگ میں جل چکی ہوتی۔" وہ بہت پرسکون تھی۔

"لیکن ارفع! تمہارا اور اس کا تعلق ....؟" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میرا اس کا تعلق قسمت میں اتنا ہی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے نا کہ میں نے اللہ کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔" ارفع کی بات پر تاشا نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

"ایسے فیصلے آسان تھوڑی ہوتے ہیں اور اللہ اپنے خاص بندوں کو ہی ایسی آزمائش میں ڈالتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو ارفع۔" تاشا نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ "خضر شروع ہی سے خاص بندہ تھا اور اس کی مشکل پسند طبیعت کو آسان چیزیں کہاں پسند آتی تھیں۔ ایسا کام وہی کر سکتا ہے، میرے جیسوں کے بس کی بات نہیں۔" تاشا کی صاف گوئی عروج پر تھی۔ وہ کچھ لمحے کے توقف کے بعد بولی۔

"وہ اپنی بیوی کا ذکر بہت محبت سے کر رہا تھا، لیکن مجھے اس وقت ایسا لگا جیسے وہ میرے سامنے ڈراما کر رہا ہے۔ اس کی بیٹی بہت خوب صورت ہے۔ جس نے اس کا نام فاطمہ رکھا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ ارفع کو یہ نام بہت پسند تھا۔" اس کی بات پر ارفع کو ایک دم چپ لگ گئی تھی۔

"تم اس کی زندگی میں نہیں ہو لیکن پھر بھی ہر جگہ ہو۔ وہ جتنی دیر تک میرے ساتھ رہا، تمہارا ذکر کرتا رہا۔ اس کی بیوی بھی تمہیں جانتی ہے اور تمہاری بہت احسان مند ہے۔ اس نے اسلام آباد والے گھر کو ادھورا ہی چھوڑ دیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے اس گھر میں تمہارے ساتھ رہنے کے خواب دیکھے تھے، وہ اس گھر میں کسی کو بھی نہیں لے جا سکتا۔" تاشا بہت آہستگی کے ساتھ اسے وہ باتیں بتا رہی تھی جو اسے مضطرب کر رہی تھیں۔

"تاشا! کیا ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟" ارفع نے ایک گہری سانس لے کر بے چینی سے پہلو بدلا۔ "میں اس موضوع کو اپنی زندگی سے ختم کر چکی ہوں، پھر ایسی باتوں، یادوں یا چیزوں کا کیا فائدہ جو آپ کو سوائے تکلیف اور اذیت کے کچھ نہ دیں۔ میں اپنی خواہشوں اور خوابوں کے سارے پرندے ذبح کر چکی ہوں۔"

"صرف ایک آخری سوال۔ تم لوگوں نے اسے ماما کے انتقال کی اطلاع کیوں نہیں دی؟" تاشا نے کھوجتی نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی انتہائی کمزور اور رنجیدہ سی دوست کو دیکھا۔ اتنے حادثات کے بعد بھی اس کی آب و تاب ویسے ہی قائم تھی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے کسی نے ایسا دانستہ نہیں کیا۔ اس کا سارہ کے ساتھ رابطہ تھا، جو سارہ کے آئرلینڈ جانے کے بعد شاید ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ماما کی ڈیتھ پر عفیفہ آپی نے کہا تھا کہ اس کو اطلاع کر دیں، لیکن سارہ نے ہی بتایا کہ اس کا وہ نمبر مسلسل بند ہے۔ شاید اس نے نمبر تبدیل کر لیا ہو۔ اس سے زیادہ ہم میں سے کسی نے بھی کوشش نہیں کی۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"چلو! ٹھیک، لیکن تم بتاؤ، تم نے زندگی کے لیے اب کیا سوچا ہے؟" تاشا نے بظاہر سرسری سے انداز میں خاصا اہم سوال کیا تھا۔

"مجھے کیا سوچنا ہے، پہلے کون سا میری سوچوں کے مطابق ہی ہوا ہے۔" ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی۔

"اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ انسان سوچنا ہی چھوڑ دے۔" تاشا نے برا سا منہ بنایا۔

"میرا دل نہیں کرتا کچھ بھی سوچنے کو، بس جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔" اس کے چہرے پر تھکن نمایاں ہو گئی۔

"جب سارے فیصلے تم نے خود کیے، پھر اپنے دل کو بھی سمجھاؤ، ایسے زندگی نہیں گزرتی۔" اس کے احتجاج بھرے انداز پر ارفع نے چونک کر اسے دیکھا جو شادی کے بعد نکھر گئی تھی۔

"تاشا! تمہیں معید یاد نہیں آتا؟" اس کے ایک دم پوچھنے پر تاشا کے چہرے پر پھیلنے والا تاریک سایہ ارفع سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

"نہیں ....." اس کا انداز دو ٹوک تھا۔ "جب بھی اس کے حوالے سے کچھ ذہن میں آیا تو بس اپنی ذات کی بے وقعتی کے حوالے سے کی جانے والی تذلیل کے لمحات ہی یاد آئے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی تھا وہ۔ مجھے اس سے محبت تھی، لیکن اس محبت کے بعد مجھے پتا چلا کہ محبت سے زیادہ عزت اہم ہوتی ہے۔ اس نے مجھ سے محبت نہیں کی.... نہ کرتا، لیکن میری عزت تو کرتا۔ سارے خاندان میں تماشا بنا کر رکھ دیا۔" وہ ایک دم ہی پھٹ پڑی تھی۔ "آج مجھے دیکھو ارفع! میں کہاں ہوں اور وہ کہاں؟ میرے رب نے مجھے کیا کچھ نہیں دیا۔ ایک محبت کرنے والا شریک حیات، دولت، اسٹیٹس، اولاد، بتاؤ! کس چیز کی کمی ہے میرے پاس.....؟ اور وہ کہاں ہے، نہ ڈھنگ کی جاب، نہ سکون، نہ کوئی اسٹیٹس، دوسری شادی کی تو پتا چلا کہ اولاد نہیں ہو سکتی۔ اب دوسری بیوی بھی چھوڑ کر چلی گئی۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس رہی تھی۔ ارفع نے گہری نظروں سے اسے جانچا۔

"پلیز تاشا! ایسے مت ہنسو۔ اللہ کو یہ سب پسند نہیں۔ یہ تمام چیزیں چھن بھی جاتی ہیں۔ ان کا بھروسا نہیں۔"

"ارفع! میں معید پر نہیں اس محبت پر ہنس رہی ہوں، جس کا راگ الاپ کر میں نے اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال اس شخص کے لیے غارت کر دیے تھے۔ خضر ٹھیک کہتا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب تم اپنی اس بے وقوفی پر ہنسا کرو گی۔ دیکھو! کتنی جلدی وقت آ گیا۔ میں نے اللہ پر چھوڑا تھا، اس نے میرے لیے بہترین کیا۔" وہ لاپروائی سے اپنی پلیٹ سے لے رہی تھی۔ ارفع نے رشک بھرے انداز سے اس کا پرسکون چہرہ دیکھا اور دل ہی دل میں اس کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا کی تھی۔

"تم اب مجھے انسانوں کی طرح بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے؟ اپنے اتنے قیمتی سال ایسے ضائع نہ کرو ارفع۔" ارفع کو اس کے خلوص پر ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

"میں نے بھی سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ میرے لیے بھی ویسا ہی بہترین کرے گا، جیسا اس نے تمہارے لیے کیا، اس لیے کہ وہ سب جہانوں کا رب ہے۔"

تاشا لاجواب ہو گئی۔ اس نے شدید حیرت سے اپنے سامنے بیٹھی ارفع کو انتہائی پرسکون انداز سے ہاتھ میں پکڑے کپ کی سطح کھرچتے ہوئے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماہو آپی اور ان کے بچوں کے آنے کی وجہ سے گھر کی رونق میں ایک دم ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ ارفع نے اپنا اسٹوڈیو اب خاصا جدید کر لیا تھا۔ اس نے کافی سارے پراجیکٹس پر کام شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی فارغ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ فراغت کے لمحات اس کے لیے بعض دفعہ بہت اذیت ناک بن جاتے تھے۔ اس کا بہترین حل اس نے مصروفیت میں ڈھونڈ لیا تھا۔

اس کی خواتین پر گھریلو تشدد کے حوالے سے بننے والی ڈاکومنٹری کو انٹرنیشنل لیول پر ایوارڈ ملا تھا اور اس کے کام کو خاصی پذیرائی مل رہی تھی۔ وہ دن بہ دن جتنی

مصروف ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی سنوں کی پریشانی میں بھی ویسے ہی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس دن بھی وہ بیگ کندھے پر ڈالے تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی جب کچن سے آتی ماہو آپی نے اسے دیکھا۔

"ارشع! آج پلیز جلدی گھر آجانا۔ میں نے شام کی چائے پر کچھ لوگوں کو انوائٹ کیا ہے؟" ماہو آپی نے سنجیدگی سے اس کے مصروف انداز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ رسٹ واچ کو باندھنے میں الجھی ہوئی تھی۔ ان کی بات پر چونکی۔

"خیریت ۔۔۔؟ کن لوگوں کو انوائٹ کیا ہے جو میری موجودگی ضروری ہے؟" اس نے اپنے لہجے کو سرسری بناکر پوچھا۔

"آنٹی صفیہ کے جاننے والے ہیں ان کی دوست کا بیٹا ہے۔ لڑکے نے سی اے کر رکھا ہے اور ملٹی نیشنل کمپنی میں اونچی پوسٹ پر ہے۔ بہت ہینڈسم اور سلجھا ہوا لڑکا ہے اور اکلوتا بھی ہے۔"

ارشع نے سر اٹھا کر الجھن بھرے انداز میں انہیں دیکھا وہ خاصی سنجیدہ تھیں۔

"تو آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔" اس نے بے زاری سے بیگ کی زپ بند کی تھی۔

"تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کیونکہ وہ تمہیں دیکھنے آ رہا ہے۔"

"کیوں میں کوئی عجوبہ ہوں یا کوئی تماشا ہوں جسے وہ دیکھنے آ رہا ہے؟" ارشع کے حلق تک کڑواہٹ گھلی تھی۔ ماہو آپی نے سخت ناراض نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھو ارشع! تم بچی نہیں ہو جو تمہیں ان چیزوں کی سمجھ نہیں ہے۔ بلا تمہارے لیے کتنی اپ سیٹ ہیں۔ اب تم ہم سب کو پریشان مت کرو۔ تمہارے سنوں کا پروڈکشن ہاؤس بہت متاثر ہو رہا ہے۔ وہ اسلام آباد مزید نہیں رک سکتے۔ انہیں کراچی واپس جانا ہے۔ تم ان چیزوں کو کیوں نہیں سمجھتیں۔"

"میں سب سمجھتی ہوں۔ اگر آپ لوگوں کو پرابلم ہے تو آپ لوگ جاسکتے ہیں۔ کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ تم ہو، ہم تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں!" وہ بھڑک اٹھیں۔

"میں اکیلی کب ہوں، سارے ملازمین ہیں۔ سب سے بڑی بات رحمت بوا ہیں اور میں تو ویسے بھی اپنے کام میں بزی ہوتی ہوں۔ مجھے کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" اس کے بے نیاز انداز پر ماہو آپی جب سلگیں۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے ارشع، تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہو یا نہ پڑتا ہو ہمیں بہت پڑتا ہے۔ ہم لوگوں کی بے ہودہ باتیں نہیں سن سکتے۔ آپی یہ ساری تقریر تم عفیرہ کے سامنے کرنا وہ تمہاری طبیعت سیٹ کرے گی۔" ان کا لہجہ درشت اور جھنجلایا ہوا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ عفیرہ کا وہ کافی لحاظ کرتی ہے جب کہ ان کے اور سارہ کے ساتھ اس کی بے تکلفی تھی اس لیے ہر بات میں بحث پر اتر آتی تھی۔

"میں خود عفیرہ آپی سے بات کرلوں گی۔ آپ لوگوں کو میرے حوالے سے لوگوں کی بے ہودہ باتوں پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں، جس کو کوئی تکلیف ہے وہ مجھے آکر کہے۔" ارشع کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

"لوگ ایسے اقوال زریں آپ کے سامنے نہیں، پیٹھ پیچھے آکر ارشاد فرماتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تین تین شادی شدہ بہنیں ہیں اور ایک جوان جہان چھوٹی بہن کو اکیلے چھوڑ رکھا ہے۔" ماہو آپی پھر سالجھ کے میں کوہا ہو گئیں۔

"جن لوگوں میں اتنی ہمت نہ ہو کہ آپ کے منہ پر آکر بات کرسکیں میں ایسے لوگوں کی پروا نہیں کرتی۔ جن لوگوں کو شام میں چائے پر بلوایا ہے ان سے میری طرف سے معذرت کرلیں۔ میرا ابھی ایسی تماشی بیٹھ کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

اپنی بات کر کے وہ رکی نہیں تھی۔ ماہو نے اپنے اندر اٹھتی اشتعال کی لہر کو بمشکل دبایا تھا۔ ارشع کا یہ دو ٹوک انداز انہیں سخت ناگوار گزرا تھا وہ غصے میں اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ آج عفیرہ سے بات کر کے انہیں ارشع کی ہٹ دھرمی کے بارے میں بتائیں گی۔ حالانکہ وہ اس موضوع پر اب خود ارشع سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں اس پر شدید غصہ تھا اور ابھی تو شام کو آنے والے مہمانوں کو کس طرح سے ٹالنا تھا؟ اس سوچ نے ان کی جھنجلاہٹ اور کوفت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ارشع کا آج کا سارا دن ہی بے کار گزرا تھا۔ آؤٹ ڈور ریکارڈنگ پر کیمرے میں ہونے والی فنی خرابی نے اس کا موڈ خاصا خراب کر دیا تھا۔ اس کا اسسٹنٹ بھی آج ذاتی طور پر غیر حاضر تھا۔ ٹیم کے دیگر لوگ بھی گرمی اور دھوپ کی وجہ سے خاصے بے زار تھے اور بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ شاید کہیں سے بادل جھومتے جھامتے آہی جائیں۔ وہ گرمیوں کی ایک خاموش سی دوپہر تھی فضا میں عجیب سی بے دلی اور اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ املتاس کے پیلے پھولوں سے لدے درختوں کے نیچے کھڑی اپنے اسسٹنٹ کو کیمرے سے نبرد آزما ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سورج کی مکمل روشنی میں املتاس کے درختوں کے کچھ شاٹس لینے تھے اس لیے بادل نخواستہ ہی سہی مگر اس گرمی کو برداشت کر رہی تھی۔ سیٹ بندی کا آخری گھنٹہ تھا اور اب بے ہوتے وہ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ یہاں پہنچے تھے۔

اس نے سامنے پہاڑوں پر پھیلی دھوپ اور اداسی کے رنگوں کو اپنے دل میں اترتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں ان سے ملنے آنے والے اس کو اس کی سنوں کو بھی ٹینشن کرتے ہیں۔ اس کا تعلق جس کلاس سے تھا، وہاں کسی کے پاس بھی ایک دوسرے کی ذاتیات کو ایکسپلور کرنے کا کہاں وقت ہوتا ہے لیکن یہ اس پر آج اور اک ہوا تھا کہ طبقہ کوئی بھی ہو لوگ دوسروں کی ذات پر بات کرنے کا وقت کہیں نہ کہیں سے نکال ہی لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کے زخموں کو کریدتا اور ان سے لطف اندوز ہونا تو ویسے بھی کچھ لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے چھوٹی ذہنیت کی کوئی کلاس نہیں ہوتی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ کیمرے کا فالٹ میں کوشش کے باوجود نہیں تلاش کرپایا۔ اسے کسی ایکسپرٹ کو دکھانا پڑے گا۔" اس کا اسسٹنٹ ساجد ہاتھ کی پشت سے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے اکتائے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ارشع نے چونک کر اس کی بے زار شکل دیکھی۔

"کیا ہوا ہے ساجد۔۔۔ طبیعت ٹھیک ہے؟" ارشع نے اسے غور سے دیکھا۔

"جی نہیں میڈم! عجیب سی طبیعت ہے۔ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں کر رہا۔" وہ متذبذب انداز میں اپنی انگلیاں چٹخا رہا تھا۔

"گھر میں سب خیریت ہے نا؟" اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔ وہ سب کو ایک فاصلے پر ہی رکھتی تھی۔

"جی! خیریت ہے۔ بس دل ہی ایک عجیب سی ضد پر اڑا ہوا ہے۔ اس کی اپنی ہی منطقیں ہیں۔ جو چیز اسے بھاتی ہے اس کے لیے خود سے ہزار دلیلیں گھڑ لیتا ہے اور جو نہ بھاتی ہو وہ ہیرے کی ہی کیوں نہ ہو دس ہزار برائیاں اس میں ڈھونڈ لیتا ہے۔" ساجد بہت عجیب سے انداز میں ہنسا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا نوجوان تھا اور پچھلے چند سال سے ارشع کے ساتھ تھا۔ ارشع بھی کچھ خود ترسی میں مبتلا ہوئی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو ساجد! ایسا ہی ہوتا ہے لیکن ہم جیسے لوگ جو اپنی باگیں دل کے ہاتھوں میں پکڑا دیتے ہیں وہ بہت خوار ہوتے ہیں۔ دل پر پاؤں رکھنا سیکھو۔" اس نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے سمیٹ کی۔ وہ اب جانے کے لیے تیار تھی۔

"یہ آپ نے سیکھ لیا ہے۔" ساجد کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔ ارشع نے اسے گھور کر دیکھا اس نے فوراً نظریں چرالیں۔

"سب سامان گاڑی میں رکھواؤ۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں نکلنا چاہیے۔" ارشع کا انداز قدرے سخت اور دو ٹوک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ساجد اس کے اور منظر کے

بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ شروع شروع میں اس نے پوچھنے کی بھی کوشش کی لیکن ارفع سے جھاڑ کھانے کے بعد دوبارہ اس کی ہمت نہیں ہوئی۔

اس کی گاڑی جب اپنے سیکٹر میں داخل ہوئی اس وقت شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے ماحول کو ایک اداس سا رنگ دے دیا تھا۔ اس کا گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ آ گئی تھی۔ ابھی اس کی گاڑی روش سے پورچ کی طرف رواں دواں تھی۔ اپنے گلاسز اتار کر اس نے ڈیش بورڈ میں رکھے اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اسی وقت ایک بال اڑتی ہوئی اس کے پیروں میں آ گری۔ لش گرین لان سے ایک ڈھائی سالہ انتہائی کیوٹ سی بچی بھاگتے ہوئے اس طرف آئی تھی۔ اس کے پیچھے ماہو آپی کا چار سالہ بیٹا سنی تھا۔ بچی خاصی صحت مند اور پیاری سی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کے اسکرٹ پر سفید ٹاپ پہن رکھا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید اور آنکھوں کا رنگ ہیزل گرین تھا۔ اس کے سیاہ سلکی اور گھنے بال ایک پونی میں قید تھے۔ اس کے بالوں میں گلابی اور سفید ہی رنگ کی خوب صورت پنیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کو پھیلائے دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہائے سویٹ ہارٹ" اس نے سنی کے ساتھ اس گڑیا کو بھی پیار کیا اور اشارے سے سنی سے پوچھا۔

"کیا گھر میں گیسٹ آئے ہوئے ہیں؟"

"یس تائی۔۔۔!" سنی نے بال اٹھاتے ہوئے انتہائی معصومیت بھرے انداز میں جواب دیا۔ اس کا موڈ ایک دم ہی خراب ہوا۔ لگتا تھا کہ ماہی آپی نے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود مہمانوں کو بلا لیا تھا۔ ارفع کا چہرہ واضح انداز میں بجھا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز سے اندر بڑھی۔ دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔ وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ پر جم گئی۔ اس کا دل پوری رفتار سے دھڑکا تھا۔ سامنے صوفے پر تھکے تھکے انداز میں نیم دراز مظفر کو دیکھ کر اس کے قدم ساکت ہو گئے تھے۔ اس کے بالکل پاس سنگل صوفے پر انتہائی خاموش سی ماہی آپی بیٹھی تھیں۔ ارفع چند لمحے بے یقینی اور بے بسی کی کیفیت میں کھڑی رہی پھر اس نے بہت سرعت سے خود کو سنبھالا تھا۔

"السلام علیکم! کیسی ہو ارفع۔۔۔؟" مظفر کی گمبھیر آواز آج پورے ساڑھے تین سال بعد اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیسے ہو؟" اس نے حلق میں اٹکتے گولے کو بمشکل نگلا تھا۔ بھاری قدموں کے ساتھ صوفے تک پہنچنا ایک دشوار کن مرحلہ تھا۔ وہ بالکل اس کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا تھا وہ خاصا کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی نمایاں تھے۔

"تم کب آئے پاکستان؟" وہ خود پر قابو پا کر اطمینان سے بولی۔

"میں صبح دس بجے آیا تھا۔ اب تو آئے ہوئے بھی آٹھ گھنٹے ہو گئے ہیں۔" وہ اب سنبھل کر بیٹھ گیا تھا اور بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ ارفع کو اس کی نظروں کا ارتکاز کرب میں مبتلا کر رہا تھا۔ ماہو آپی خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ دونوں ہی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کریں۔ ایک بوجھل سی خاموشی کا وقفہ درمیان میں آیا تھا۔ اس وقفے کو مظفر نے ہی ختم کیا تھا۔

"میری بیٹی فاطمہ سے ملی ہو تم؟"

"ہوں! ماشاء اللہ بہت کیوٹ ہے۔" ارفع نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہت زیادہ شرارتی ہے۔ پلوشہ کی ڈیتھ کے بعد اسے سنبھالنا میرے لیے بہت مشکل مرحلہ تھا۔" وہ اتنے سادہ انداز میں بتا رہا تھا کہ ارفع ششدر رہ گئی۔

"پلوشہ کی ڈیتھ۔۔۔ کب ہوئی اس کی ڈیتھ؟ تم نے بتایا ہی نہیں۔۔۔" وہ دم بخود اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"تم لوگوں نے ماما کے انتقال کا مجھے بتایا تھا۔۔۔؟" انتہائی آزردگی اور تاسف سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے ما

نے بتایا جب ان کی وفات کو چھ ماہ گزر چکے تھے۔ تم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مجھے کتنا شاک لگا تھا۔ میں کتنے ہی ماہ اس صدمے سے نکل ہی نہیں پایا کہ تم لوگوں نے مجھے اتنا غیر سمجھا۔ میں اسی دنیا میں تھا۔ میرا سیل نمبر تبدیل ہوا تھا۔ لیکن ای میل ایڈریس، پوسٹل ایڈریس سب کچھ تو وہی تھا۔" وہ آزردہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

ارفع اندازہ کر سکتی تھی کہ وہ اس وقت کتنی اذیت سے گزرا ہو گا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بے سبب صوفے کی ہتھیلی پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔

"جس ماما کی اچانک ڈیتھ نے اتنا بوکھلا دیا کہ کئی ماہ تک ہمیں خود بھی ہوش نہیں آیا تھا۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے؟" اس کے بعد سوچا کہ تمہیں بتا دوں پھر خیال آیا کہ تم اپنی بیمار بیوی کو دیار غیر میں چھوڑ کر کیسے آؤ گے؟" اس نے بمشکل صفائی دی تھی۔

"پلیز ارفع! کم از کم میرے ساتھ جھوٹ مت بولو۔ مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہے کہ تم اپنی زندگی کی کتاب سے میرے نام کے صفحات ہی پھاڑ چکی ہو۔ تم لوگوں نے دانستہ طور پر مجھے نہیں بتایا۔" وہ تھوڑا سا تلخ ہوا۔

"ہاں! پھر تم نے بھی دانستہ طور پر ہمیں نہیں بتایا کہ۔۔۔؟" ارفع نے فوراً اس کی بات قطع کی۔ "پہیلیاں بجھوانے تم نے کب سے شروع کر دیے مظفر؟" اس کی بات پر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں بے بسی صاف جھلک رہی تھی۔

"میری تو مجبوری تھی۔ ایک ڈر اور خوف تھا کہ پلوشہ کو ماما جانتی تھیں۔ عفیرہ آپی نے بھی دیکھ رکھا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ میری بیوی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی موت کے بعد کوئی اس کے بارے میں غلط کمنٹس دے۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"مظفر! کیا تمہیں ہم لوگ اتنے جاہل لگتے تھے کہ کسی مرے ہوئے بندے کے بارے میں غلط کمنٹس دیتے؟ یہ سب تمہارے خود ساختہ خوف تھے جب کہ تمہیں اس بات کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ سب جانتے ہیں کہ تم سے شادی سے انکار میں نے کیا تھا۔ اس کے بعد تم کسی سے بھی شادی کرتے ہمیں کو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔" طنز کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی اور سارے وجود پر چھا گئی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو ارفع! یہ سب میرے خود ساختہ خوف تھے۔ میں نے پلوشہ سے شادی تو کر لی تھی لیکن ساری زندگی اس خوف سے نہیں نکل پایا کہ ماما اور عفیرہ آپی کو پتا نہ چل جائے۔" وہ زبردستی مسکرایا تھا۔

"کیا ہوا تھا پلوشہ کو۔۔۔؟" لفظ اس کے حلق سے بمشکل برآمد ہوئے تھے۔

"نروس بریک ڈاؤن۔۔۔!" ایک تاریک سایہ اس کے چہرے پر لہرایا۔ "بہت حساس دل لڑکی تھی۔ جتنا عرصہ زندہ رہی اس کو یہی لگتا رہا کہ میں نے اس سے شادی کر کے شاید دنیا کا سب سے عظیم اور انوکھا کام کیا ہے۔ وہ مجھے بار بار کہتی تھی کہ میں دوسری شادی کر لوں کیونکہ اسے لگتا تھا کہ شاید میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ وہ لوگوں کے رویوں اور سوالات سے بہت عاجز تھی۔ جب فاطمہ پیدا ہوئی تو ہم نے [illegible] رکھ لی کیونکہ فاطمہ نے جیسے ہی ہوش سنبھالا وہ اس کے پاس آنے سے جھجکتی تھی۔ یہ بات اسے بہت تکلیف دیتی تھی۔ ایک رات جب سوئی تو اس سے اگلی صبح بیدار ہی نہیں ہوئی۔" اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ بمشکل ہی سن پائی تھی۔

"کتنا عرصہ ہو گیا اس کی ڈیتھ کو؟" ارفع نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"چھ ماہ ہونے کو ہیں۔ فاطمہ کی دوسری سالگرہ کے تین ماہ بعد۔"

"تو تم نے واقعی چھوٹی بچی کو اکیلے کیسے سنبھالا؟" وہ حیران ہوئی۔

"وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ اس کی آیا ساتھ تھی لیکن پھر وہ بھی واپس اپنے ملک چلی گئی۔ اب

پچھلے دو سال سے میں خود سنبھال رہا ہوں۔" اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

"سب دوستوں نے سمجھایا کہ پاکستان واپس چلے جاؤ۔ وہاں کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا کیونکہ وہ اب بڑی ہو رہی ہے اور اسے بعض دفعہ بہلانا بہت مشکل لگتا ہے۔ اس لیے یہاں آگیا ہوں اور ماہی آپی سے کہا ہے کہ رحمت بوا کو بھیج دیں۔ لیکن وہ کچھ تذبذب کا شکار ہیں۔" وہ تھوڑا سا پریشان تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ فاطمہ اور سنی ایک دوسرے کے پیچھے داخل ہوئے۔ فاطمہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا وہ "فنٹاسٹک" برطانوی لہجے میں انگلش میں اپنے پاپا کو ان چوزوں کے بارے میں بتا رہی تھی جو اس نے لان میں دیکھے تھے۔ وہ خاصی پر اشتیاق تھی۔ اس کا اندازہ ارفع کو اس کی گفتگو سے ہو گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں سنی مغفر کی وجہ سے کچھ جھجک رہا تھا۔

"مغفر! میں نے رحمت بوا سے بات کی ہے۔ وہ چلی جائیں گی لیکن ابھی فی الحال تم سکون سے یہیں رہو۔" ماہو آپی اپنی بیٹی کا فیڈر ہلاتے ہوئے اندر آئی تھیں۔

"تھینکس گاڈ! آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ آپ نے میری کتنی بڑی مشکل آسان کر دی۔" وہ کچھ پرسکون ہوا۔

"ویسے مغفر! لگتا ہے کہ تمہاری بیوی خاصی خوب صورت تھی۔ تمہاری بچی نے سوائے تمہاری کھڑی ناک کے علاوہ کوئی بھی نقش نہیں لیا۔" ماہو آپی بے تکلفی سے کہہ رہی تھیں۔

ان کی بات پر مغفر نے بے ساختہ نظریں چرائی تھیں۔ ارفع کو ایک شدید سی بے چینی نے گھیر لیا تھا۔ اس نے بہت غور سے اس معصوم سی گڑیا کی شکل کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے کھڑی مسکرا مسکرا کے دیکھ رہی تھی۔ ارفع نے اس کے پھولے پھولے گالوں کو آہستگی سے چھوا تھا۔ وہ تھوڑا سا شرما گئی تھی۔

"یہ بہت شرارتی ہے ماہی آپی! میرے سونے کے بعد خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی ہے اور لان میں گلہریوں کے پیچھے بھاگتی ہے۔ مٹی میں سارے کپڑے گندے کر لیتی ہے۔" وہ بہت محبت سے بتا رہا تھا۔

"سارے بچے ہی بہت شرارتی ہوتے ہیں۔ تم کون سا کم تھے۔ بھری دوپہر میں ارفع کو لے کر باہر نکل جاتے تھے۔ ایک دفعہ یاد نہیں، تم دونوں بچپن میں گم ہو گئے تھے اور پھر مختلف علاقوں میں لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرایا تھا؟" ماہو آپی نے ہنستے ہوئے یاد دلایا تھا۔

وہ ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہوا تھا۔ ارفع کے لیے بھی وہاں بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ دل کو ایک بے چینی سی لاحق تھی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی ایسے واپس بھی آ سکتا ہے۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ شاور لے کر جو لیٹی تو اسے فوراً ہی نیند آ گئی۔ ماہو آپی جو کھانے کے لیے اسے بلانے آئی تھیں اسے گہری نیند میں دیکھ کر چپ چاپ واپس چلی گئیں۔

اگلے تین دنوں کے لیے اسے پشاور جانا پڑ گیا تھا۔ وہ وہاں خاصی مصروف رہی۔ واپس آئی تو ماہو آپی ہی سے اسے پتا چلا کہ مغفر آج کل کوئی فیکٹری لگانے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ اس وجہ سے وہ بھی خاصا مصروف تھا۔ فاطمہ کی دیکھ بھال ابھی ماہو آپی اور رحمت بوا ہی کر رہی تھیں۔

"مغفر کی بیٹی ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔ گٹ مٹ کرتی ہے۔" کھانے کی میز پر ماہو آپی اسے بڑے خوش گوار انداز میں بتا رہی تھیں۔ "وہ سو گئی ہے۔"

"میں نے مغفر سے کہا کہ یہ بالکل تم پر گئی ہے، لگتا ہے کہ تمہاری طرح ایک بولڈ اینکر پرسن بنے گی۔" ماہو آپی ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے خاصی خوش تھیں۔ اس کا اندازہ ان کی باتوں اور لہجے سے بخوبی ہو رہا تھا۔

"وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ارفع نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ اور یہ کہ اسے کسی اچھے انسان سے شادی کر لینی چاہیے۔" [illegible]

طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ فضا میں معلق ہوا۔ ایک ناگواریت کا بڑا گہرا تاثر بڑے واضح انداز میں اس کے چہرے سے جھلکا تھا۔

"کیوں، اس کو میری شادی ہونے یا نہ ہونے سے کیا پرابلم ہے؟ یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ وہ کون ہوتا ہے ایسا کہنے والا؟" اس نے ہاتھ میں پکڑا چمچ پلیٹ میں پٹخا تھا۔ ماہو آپی نے سخت حیرت سے اس کا رد عمل دیکھا۔

"کیا ہو گیا ارفع! وہ ہمارا فرسٹ کزن ہے اور پھر تمہارا بیسٹ فرینڈ رہا ہے۔ اس میں اتنا زیادہ مشتعل ہونے کی کیا بات ہے؟"

"وہ میرا فرسٹ کزن ہے۔ لیکن شادی میرا بالکل ذاتی مسئلہ ہے۔ اس میں مجھے کسی کی بھی مداخلت پسند نہیں، خواہ وہ مغفر حیات ہی کیوں نہ ہو۔" وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈائننگ روم میں آتے مغفر نے بڑے تعجب اور حیرت سے اس کا یہ آخری جملہ سنا تھا۔ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ وہ اس کے پاس سے پلٹتے ہوئے ایک لمحے کو ٹھٹکی اور اگلے ہی لمحے وہ تیر کی طرح سے وہاں سے نکل گئی۔

"اسے کیا ہوا؟" وہ ہاتھ کے اشارے سے پوچھ رہا تھا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ اور کیا ہونا ہے۔" ماہو آپی جھنجھلا کر بولیں۔ ارفع کا یہ انداز انہیں خاصا مشتعل کر رہا تھا۔

"ٹیک اٹ ایزی۔" وہ ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ "آپ آرام اور سکون سے بات کریں۔ آپ کو پتا تو ہے کہ وہ کتنی جذباتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک جاتی ہے۔"

"یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ تم سے شادی سے انکار اس نے خود کیا۔ ہم سب نے سمجھایا۔ لیکن اس نے اپنی ہٹ دھرمی نہیں چھوڑی۔ خالہ اس کی وجہ سے اتنا اپ سیٹ رہیں۔ اب اس نے مجھے تنگ کر رکھا ہے۔" ماہو آپی اس سے حد درجہ بیزار تھیں۔ اس کا اندازہ ان کے لہجے سے مغفر کو بخوبی ہو رہا تھا۔ اسے حد درجہ شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ وہ ماہو آپی کو اصل حقیقت بتا دے لیکن پھر مصلحتاً چپ رہا۔

شام کو وہ کافی کا مگ اٹھائے لان میں آیا تو وہ سامنے سیڑھیوں پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ ارفع نے ایک لمحے کو چونک کر اسے دیکھا پھر سامنے لان میں لگے فوارے پر نظر جما دی۔

"ارفع! میں نے سوچا ہے کہ میں ماہی آپی، حفصہ آپی اور سارہ کو اصل بات بتا دوں۔ وہ جو ہر وقت تمہیں الزام دیتی رہتی ہیں یہ سلسلہ تو ختم ہو۔" وہ بات ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

"اس سے کیا ہو گا...؟" اس کا انداز مغفر کو بہت سپاٹ لگا۔

"اس سے کم از کم ان کو حقیقت تو پتا چلے گی نا! اور دوسرے میرے ضمیر کا بوجھ کم ہو جائے گا۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"پھر کیا ہو گا؟" وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔ "وہ اس کارنامے پر تمہیں کوئی ایوارڈ دیں گی یا تمہیں اتنی بڑی بات آسانی سے سہہ جانے پر کوئی میڈل دیں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ سب بچے جھاڑ کر تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ کسی کو یہ یاد نہیں رہے گا کہ تم نے کوئی نیکی کی تھی۔ سب کو میرا دھوکا یاد رہے گا۔ اس کے بعد ایک اور تماشا شروع ہو جائے گا۔ مجھ پر نہ سہی "اپنی" معصوم بچی پر رحم کھاؤ۔ یہاں کسی کا ظرف اتنا بڑا نہیں ہے۔" وہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ زمین پر رکھ کر اس کا دھواں دھواں چہرہ غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔

"یہ جو ماہی آپی تمہاری بچی پر ممتا لٹاتی پھر رہی ہیں نا، اس حقیقت کو جاننے کے بعد سب سے زیادہ اس کے اور اس کی مری ہوئی ماں کے خلاف زہر اگلیں گی۔ مغفر حیات! اب جذباتیت چھوڑ دو۔ زندگی اتنی آسان نہیں ہے اور نہ ہی... تمہیں جینے کی کوئی قسم ہے جس کے بعد سب اچھا ہو جاتا ہے۔" اس کے انداز میں

محسوس کی جانے والی ناراضی کی جھلک تھی۔

"ٹھیک ہے ابھی تم شادی کر لو۔ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہو؟" خضر نے اچانک کہا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں؟" اس نے کڑے انداز سے اسے گھورا۔

"تو پھر یہ کیا ہے؟ پراجیکٹس کے لیے، ڈاکومنٹریز کے لیے خود کو اتنا بزی کر رکھا ہے، جب شادی کرنی ہی ہے تو وقت پر کر لو۔ کم از کم ہم سب کی ٹینشن تو ختم ہو۔" وہ بھی تھوڑا سا اکھڑ کر بولا۔

"تو تم سب لوگوں کو کس نے کہا ہے کہ میری ٹینشن لو؟ تم سب کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟ مجھے جو کام کرنا ہے، میں کر لوں گی۔ مجھے تم سب لوگوں کے ڈکٹیشن کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے انتہائی غصے سے اپنا رخ قدرے موڑ کر چائے کا مگ اٹھا لیا۔

"ہم تمہیں ڈکٹیٹ نہیں کر رہے ارفع! ہم سب کو تم سے محبت ہے اور تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔" اس نے خود پر قابو پا کر تحمل سے کہا۔

"تم خود کیوں نہیں دوسری شادی کر لیتے؟ جب کہ تمہاری بیٹی کو تو ضرورت بھی ہے؟" تلخی اس کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔ وہ اس کی بات پر زبردستی مسکرایا۔

"میں ایک تجربے کے بعد جان چکا ہوں کہ میں ایک اچھا شوہر نہیں بن سکتا۔ میں اپنی تمام تر کوشش اور محبت کے باوجود جب پلوشہ کو خوش نہیں رکھ پایا تو کسی اور کو کیا رکھ پاؤں گا۔" اس کا چہرہ تناؤ کا شکار ہوا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ وہ تم سے خوش نہیں تھی؟" ارفع نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہر بات کہنے والی تھوڑی ہوتی ہے۔ اسے میری محبت مجبوری اور ترحم کے روپ میں لپٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے وہ اکثر خود کو غلط محسوس کرتی تھی۔ یہی وہ سوچیں تھیں جنہوں نے اس کی زندگی کی ڈور کو کاٹ دیا۔ میرے ساتھ خوش ہوتی تو کیا اسے نروس بریک ڈاؤن ہوتا؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے اپنا ہی مذاق اڑا رہا تھا۔ ارفع نے بے ساختہ اپنی نظریں اس سے چرائی تھیں۔

"پاپا! یہ میری بٹر فلائی مر گئی۔" فاطمہ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لیے بھاگتے ہوئے آئی۔ وہ اپنا ہاتھ کھول کر مری ہوئی تتلی باپ کو دکھا رہی تھی۔ اس کے پیچھے سنی بھی بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کا سانس بے ربط تھا۔

"انکل! میں نے اسے منع کیا تھا کہ اسے زور سے مت پکڑو، لیکن یہ کہتی تھی کہ میں اسے پیار کر رہی ہوں۔ اس نے زور سے پکڑا اور بٹر فلائی مر گئی۔" سنی نے جلدی جلدی وضاحت کی۔

"پاپا! پیار کرنے سے بھی کوئی مرتا ہے کیا؟" فاطمہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ارفع نے بے ساختہ ہی اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ ارفع کے ساتھ لگتے ہی وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"ہاں بیٹا! کچھ لوگ پیار کرنے سے بھی مر جاتے ہیں جیسے آپ کی ماما۔" خضر کے لہجے سے بے ساختہ ہی دکھ چھلکا تھا۔

"خضر! یہ کوئی بات ہے بھلا بچوں سے کرنے والی؟" ارفع نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

خضر نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ وہ دانستہ خاموش رہا تھا۔ ارفع نے بہت جلدی فاطمہ کو بہلا لیا۔ وہ کچھ ہی دیر بعد دوبارہ ایک اور تتلی کی تلاش میں سنی کے ساتھ نکل گئی۔

"خضر! تم شادی کر لو۔ اپنے لیے نہ سہی، اپنی بچی کے لیے۔" وہ خلوص دل کے ساتھ بہت نرمی سے کہہ رہی تھی۔

"تم کرو گی مجھ سے شادی...؟" وہ بہت بے رحم انداز کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ ارفع نے بے ساختہ ہی نظریں چرائی تھیں۔

وہ ان دونوں کی زندگی میں آنے والی ایک خوب صورت سی گلابی شام تھی۔ ایسی شام جس کے دامن

میں ہجر کی کوئی رات نہ تھی۔ آسمان پر بادل ایک دوسرے کے پیچھے اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے نم جھونکے بتا رہے تھے کہ نزدیک ہی کہیں بارش ہو رہی ہے۔ ویسے بھی ساون کی بے وقت کی بارشوں کا پتا بھی کہاں چلتا ہے۔ بہت عرصے کے بعد ساون ان دونوں کو اچھا لگا تھا۔ ہلکی ہلکی کن من سی شروع ہو گئی تھی۔ ان کی گاڑی ایئرپورٹ کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔

بلیو جینز پر سفید کرتا پہنے سیاہ گلاسز میں وہ آج پہلے سے کہیں زیادہ پرکشش اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ممتا کا نور اس کی دلکشی میں مزید اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ اس نے دائیں کندھے پر سفید رنگ کا ایک نازک سا بیگ لٹکا رکھا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اپنی چار سالہ کیوٹ سی بیٹی کا ہاتھ تھام رکھا تھا جس نے گلابی رنگ کا اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر ایئرپورٹ پر لوگوں کی چہل پہل دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ سیاہ پینٹ اور سرمئی رنگ کی شرٹ میں اس کا باپ تھا۔ جس نے اپنی گود میں اپنے چھ ماہ کے بیٹے کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ سے اپنا ٹرالی بیگ کھینچتا ہوا لا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی پرسکون مسکراہٹ تھی۔ وہ بہت عرصے بعد کھل کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے دیکھا اس کی بچی نے ماں سے ہاتھ چھڑا لیا تھا اور وہ سامنے ایک جوڑے کے ساتھ چلنے والی تین سالہ بچی کی طرف بھاگی تھی، جس کے ہاتھ میں ایک خوش رنگ سی گیند تھی۔

"فاطمہ! فاطمہ! واپس آؤ بیٹا۔" اس کی ماں اسے بلا رہی تھی۔ جب کہ وہ اس بچی کے ساتھ بڑے انداز سے ہاتھ ملا رہی تھی۔

"بہت شرارتی ہو گئی ہے یہ۔" وہ انتہائی محبت بھرے انداز سے اپنے شوہر سے بولی۔ ان دونوں کی لندن کے لیے فلائٹ تھی۔ وہ لوگ چھٹیاں گزارنے کے لیے تین ماہ کے لیے باہر جا رہے تھے۔

"میری بات سنو فاطمہ! چلو واپس..." اس نے اپنی بیٹی کو ڈانٹا جو کہ دوسری بچی سے زبردستی گیند لے چکی تھی۔ وہ دونوں اس جوڑے کے پاس پہنچ گئے جو کہ انتہائی خوش گوار انداز سے فاطمہ کی شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا، جبکہ ان کی بیٹی منہ بسور رہی تھی۔

"آئی ایم سوری...!" اس کی ماں نے مچلتی ہوئی فاطمہ کے ہاتھ سے گیند زبردستی لے کر اس بچی کو تھمائی۔

"اٹس اوکے!" اس بچی کی ماما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کی بیٹی ماشاء اللہ بہت کیوٹ ہے بالکل آپ کی طرح۔"

"تھینکس...!" وہ خوش دلی سے ہنسی۔

"آپ کی بیٹی کی شکل آپ سے بہت ملتی ہے۔" وہ خاتون مزید کہہ رہی تھیں۔ ان کی بات پر اس نے چونک کر اپنے شوہر کو دیکھا جو قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"آف کورس...!" وہ دونوں میاں بیوی اکٹھے بولے۔ ان کی بات پر وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس جوڑے نے خوش گوار حیرت سے اس کے شوہر کو دیکھا جو انتہائی محبت بھرے انداز سے کہہ رہا تھا۔

"ارفع! تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا...؟"

"مجھے یقین ہے خضر! کہ میری بیٹی کی شکل مجھ سے بہت ملتی ہے۔" اس نے فاطمہ کے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے بہت اطمینان سے کہا۔

اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر اس قدر روشنی تھی کہ خضر کے لیے اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا انتہائی دشوار لگ رہا تھا۔ وہ اس کی پہلی محبت تھی۔ اس کی قسمت میں لکھے ہجر کے سالوں کے بعد ملنے والا ایسا ستارہ، جو اس کی زندگی میں بالآخر روشنی لے آیا تھا۔ جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کو بارش کی بوچھاڑ سے بچایا تھا۔ وہ بارش کے قطروں کو محسوس کر کے قلقاریاں مار رہا تھا۔

خضر حیات نے جہاز میں اپنے ساتھ بیٹھی ارفع عزیز کو دیکھ کر اطمینان اور سکون سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اسے لگا تھا کہ وہ ایسا ابن آدم ہے جسے اپنی گمشدہ جنت واپس مل گئی تھی۔

سدرہ سحر عمران

بساطِ وادیٔ عشق

"کیا تم خوش رہ پاؤ گی؟"
عجب سوال تھا اس کی آنکھوں میں کرچیاں چبھنے لگیں لیکن وہ پھر بھی مسکرا دی۔

"جب کتابِ زیست سے محبت کا باب ہی مٹا ڈالا ہے تو خوشی غم کا سوال کیسا علی۔ جینا تو پڑتا ہے نا چاہے خوشی سے جیو یا اداسی سے۔ زندگی کے دن تو پورے کرنے پڑتے ہیں نا۔"

"لیکن ہم جدا ہونے کے لیے تو نہیں ملے تھے۔" بھیگی مضطرب پلکیں دل کی دنیا تاراج ہوتے پر ماتم کناں تھیں مگر اس کے سامنے کھڑی لڑکی کا حوصلہ کمال تھا۔

"ہجر و وصل قسمت سے ملتا ہے علی!" اس کے نرم پیروں میں کوئی کنکر چبھا تھا۔ "سی" کرکے وہ رکی اور پھر جھک کر اپنے گلابی پیر کی ایڑی دیکھنے لگی۔ معمولی سے کنکر نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لیا تھا شاید! اس کی ایڑی پہ چھوٹا سا نشان بن گیا تھا۔ اسے ہمیشہ ساحل کے کنارے ننگے پاؤں چلنے کی عادت تھی۔ سو جوتے وہیں چھوڑ آئی تھی جہاں سے وہ سنگ چلنے کا آغاز کرتے تھے۔ اس نے شروع سے ہی واپسی کے لیے ایک در کھلا رکھا تھا۔

علی ارسل کے پورے وجود میں اس قدر نشتر پیوست تھے کہ اسے یہ احساس ہی نہ رہا کہ وہ مہرین ابراہیم کی معمولی سی تکلیف پر بھی تڑپ جایا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی نمی اس کے دل کو بے چین سا کر دیتی تھی اور پھر وہ کتنے بہانوں سے کتنے جتن کرکے اس کے گلاب ہونٹوں پہ ہنسی کی شفق پھوٹتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ہنستی جاتی تھی اور وہ اپنی محبت پہ مسرور ہوتا رہتا مگر آج اس کے اپنے دکھ اتنے تھے کہ وہ مہرین ابراہیم کی یہ تکلیف فراموش کر گیا۔ وہ اب قدرے لڑکھڑاتے ہوئے چل رہی تھی۔ نہ علی ارسل نے اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا اور نہ اس نے سہارا مانگا تھا۔

"محبت کے سفر میں تپتے صحرا کو آبلہ پا طے کرنا ہوتا ہے علی! ہجر کا سورج سر پر تنا رہتا ہے اور ہمارے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ ہم کسی نخلِ گلستان کی امید پر چلتے رہتے ہیں برگِ آوارہ کی تلاش میں۔ لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہم دوراہے پر آکر رک جاتے ہیں۔ یہاں خبر ہوتی ہے کہ سراب کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے۔ جدا ہونے کے لیے بہت سا حوصلہ چاہیے ہوتا ہے علی! بچھڑ کر ہر کوئی نہیں جی لیتا۔ زندگی جینے اور اسے گزارنے میں بھی بہت فرق ہے۔ مگر فیصلہ تو کرنا پڑتا ہے۔ وصل یا فراق۔ محبت انسان کے اختیار میں نہیں تو مقدر کیسے ہو سکتی ہے؟"

وہ اب رک گئی تھی۔ علی ارسل بھی اس کے ساتھ ہی ٹھہر گیا۔

سرمئی سمندر کی لہروں میں عجب سی بے یقینی تھی، وہ کبھی ساکت ہو جاتی تھیں اور کبھی دھیرے دھیرے آگے پیچھے ہونے لگتیں۔

"تم اتنے خاموش کیوں ہو علی!"

"تمہارے اس فیصلے نے میرے لب سی دیے ہیں مہرا میرے ہونٹوں پہ قفل پڑ گیا ہے۔ گو کہ میرے دل میں ان گنت سوال ابھر رہے ہیں۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تم کو جدا ہونا تھا تو ملی کیوں تھیں مجھے۔ لیکن میں جانتا ہوں تمہارے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہوگا۔ تم مجھے لاجواب کر دو گی مگر سنو میں ایک بات جانتا ہوں کہ میں تم سے بچھڑ کر زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ میں رہ ہی نہیں سکتا تمہارے بن۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"میں نے کب کب تمہیں نہیں سوچا۔ زندگی کے چھ برسوں میں تم ہر پل سایہ بن کر میرے ساتھ رہی ہو۔ کوئی خیال تمہارے بغیر نہیں۔ کوئی سوچ تمہارے بن ادھوری ہے۔ یہ رسم و رواج تمہاری محبت سے بڑھ کر ہیں کیا! میں نے سو زمانوں سے الگ ہو کر تم سے محبت کی تھی اور تم مجھے اس لیے چھوڑ رہی ہو کہ تمہاری برادری میں باہر رشتہ نہیں کرتے۔ کیا پہلے تمہیں یہ معلوم نہ تھا؟"

"علی! میں نے تمہیں آغاز میں ہی یہ سب بتایا تھا۔" وہ اس کی بات پر حیران سی ہو کر بولی تھی۔



"مگر تم نے کہا تھا کہ ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔"

"محبت کوشش سے نہیں ہوتی لیکن اس کا حصول کوشش سے مشروط ہے۔"

"تب میں بہت خوش گمان تھی علی ارسل! ہمارا خلوص ہمیں ایک کر دے گا لیکن پچھلے ڈیڑھ سال سے میں نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا تمہیں پا لینے کے لیے مگر سوائے الزامات اور پابندیوں کے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ میں اب الزام سہتے سہتے تھک چکی ہوں۔ تم مرد ہو، خود مختار ہو۔ اپنی منوانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو لیکن میں نہ خود مختار ہوں نہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر کچھ کر سکتی ہوں۔ مجھے عزت کے ساتھ محبت چاہیے۔ میں محبت کو داغ نہیں بنانا چاہتی۔"

"تم نے ٹھیک نہیں کیا میرے ساتھ مہو!" وہ رو دینے کو تھا۔

"میرے ساتھ کب کسی نے ٹھیک کیا ہے علی!" اس کا ضبط پہلی بار چھلکا تھا اس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

"اپنی محروم حسرتوں کا گوشوارہ کروں یا رائیگاں مسافتوں پہ دکھ کا افسانہ تحریر کروں۔ بے وفائی میری فطرت نہ تھی لیکن مجبور انا کی بے نقدری نے وفا کو زنجیر کر دیا ہے۔ ایک طرف تم ہو میری محبت کا غرور۔ ایک طرف میرا نسب۔ میرے باپ کی انا۔ فیصلہ کس کے حق میں گیا ہے۔ قسمت کا لکھا ٹھہرا مگر۔ علی ارسل ابراہیم بٹ! تم محبت اور یہ قسمت ضرور ہے لیکن بے وفا نہیں ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا اور ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔"

وہ اشکوں کا سیل رواں ہتھیلی میں چھپا کر واپسی کے لیے پلٹ گئی اور علی ارسل ساحل کے کنارے پر تنہا کھڑا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

چار بجے اس کی اسلام آباد کی فلائٹ تھی۔

"چاچو! وعدے کے مطابق آپ نے 12 دسمبر کی صبح تک واپس آنا ہے ہر صورت۔ ورنہ میں آپ سے سخت خفا ہو جاؤں گی۔ آپ کو اسپیشل ورکنگ نہ ہوتی تو میں کبھی بھی اپنی شادی سے چار دن پہلے اسلام آباد نہیں جانے دیتی۔" بھتیجی اس کا لیپ ٹاپ اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"لوٹ کے ان شاء اللہ۔" ٹیکسی گیٹ پر آ چکی تھی۔ اس کے ملازم نے سامان اٹھا کر ٹیکسی میں رکھا اور وہ وہیں رک کر اسے "اپنا خیال رکھنے" کی تاکید کرنے لگا۔

"میں اپنا بہت سارا خیال رکھوں گی چاچو! مگر آپ کو بھی اپنا خیال رکھنا ہے۔ میرا خیال رکھنے کے لیے تو یہاں بہت سے لوگ ہیں مگر آپ تو ہر سفر میں تنہا ہوتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں آپ اپنی محبت کو بھی نہیں بھول سکے۔"

وہ اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہی تھی اور علی ارسل کی آنکھیں بائیس سال بعد بھی نم ہو گئی تھیں۔

"محبت کو کون بھولتا ہے پگلی!" وہ فریم لیس گلاسز اتار کر آنکھیں مسلنے لگا تھا۔

"وہ تو بھول گئیں نا آپ کو جنہوں نے آپ سے محبت کی۔"

"ہاں ہو سکتا ہے گردش ایام نے اس کی زندگی اتنی مصروف کر دی ہو کہ اسے مجھے یاد کرنے کے لیے فرصت بھی نہ ملتی ہو لیکن محبت پھر محبت ہے مہرین بیٹا!"

"پھر مہرین۔۔۔ آپ مجھے مہو کیوں نہیں کہتے سب کی طرح۔"

"تمہیں یہ نام تو میں نے اس لیے دیا تھا مہرین! کہ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز نام یہی تھا اور بھابی نے کہا تھا کہ وہی نام رکھوں جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پسند ہو۔ کتنی عجیب فرمائش تھی پھر میں نے تمہارا یہی نام رکھ دیا لیکن "مہو" کہنے کا حق تو بس اسی نے مجھے دیا تھا وہ میں کسی اور کو کیسے۔"

"چاچو! آپ کہاں کھو گئے؟" وہ اب اس کا شانہ ہلا رہی تھی اور ٹیکسی ڈرائیور ہارن دینے لگا تھا۔

"لوٹ کے بیٹا! مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے مہرین

کے سر پر ہاتھ رکھا۔
"ہوسکے تو جاتے ہی ایئرپورٹ سے اتر کے ہی کال کیجیے گا۔ میں منتظر رہوں گی۔"
"ہاں ان شاء اللہ۔" وہ اسے رخصت کرکے گیٹ تک آکر پلٹ گئی تھی۔ رات کے اس وقت سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور وہ اس کے لیے جاگ رہی تھی کہ اسے گھر میں سب سے زیادہ محبت علی ارسل سے ہی تھی۔

☼ ☼ ☼

دسمبر کا اوائل تھا۔ موسم میں خشکی زیادہ اور سردی کم تھی۔ یہ راتیں اسے بہت بے چین اور مضطرب کردیتی تھیں کیونکہ انہی دنوں تو وہ دونوں جدا ہوئے تھے لیکن بائیس برس بعد بھی اسے مہرین ابراہیم اور دسمبر کی آخری زرد شام بہت شدت سے یاد آتی تھی۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہ تھا اسی لیے شور و غل بھی کم تھا۔ وہ اپنے اندر کی وحشت سے گھبرا کر لیپ ٹاپ آن کرنے لگا تھا لیکن وقت کم ہی رہ گیا تھا۔ اس لیے شیشے سے باہر دیکھنے لگا جہاں رات کی تاریکی اپنے جوبن پر تھی مگر سڑک کے کنارے لگے بجلی کے پولز کی زرد روشنیاں اطراف میں پھیل کر ماحول کو بہت دلکش بنا رہی تھیں۔
"مجھے وہ راتیں بہت اچھی لگتی ہیں' جب آخری راتوں کا چاند اپنی نم ہوا آنکھوں سے زمین والوں کو دیکھتا ہے اور ایسے میں میرا دل چاہتا ہے۔" "کیا چاہتا ہے علی!" وہ اشتیاق سے کہتی اور علی ارسل اس کے چاند چہرے کو تکتا رہ جاتا۔
"کیا چاہتا ہے؟"
"یہ کہ میں اور تم سنسان سڑک پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دور تک چلتے رہیں اور تب تک چلتے رہیں' جب تک ہماری ٹانگیں جواب نہ دے جائیں۔"
وہ آخر میں ہنستی تھی۔ اس کی جھرنوں سی ہنسی ابھی بھی اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ لیکن ڈرائیور نے ٹیکسی روکی تو وہ چونک کر کراچی شہر کے خوب صورت ایئرپورٹ کی عمارت دیکھنے لگا۔ پھر خفیف سا ہو کر رہ گیا۔ ڈرائیور نے اس کا سامان اس کے پاس رکھ دیا تو وہ والٹ نکال کر کرایہ دینے لگا۔
ڈپارچر لاؤنج میں کافی رونق تھی۔ فلائٹ میں کم ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔
"ماما! آپ کبھی میری بات بھی مان لیا کریں۔ پہلے سے پوچھ لیا تھا میں نے۔ وہ خفا نہیں ہوں گے۔" اس کے سامنے سے سترہ سالہ خوب صورت نوجوان گزرا تھا۔ اس کے لہجے کی جھنجلاہٹ اسے بہت بھلی محسوس ہوئی۔
"آپ نے سیاسی جماعتوں کی طرح ہر اہم موقع پر کوئی نہ کوئی بیان فوراً جاری کرنا ہوتا ہے۔"
اسے ہنسی آگئی اور پھر یکدم ہی وہ چونک کر اس لڑکے کو اور اس کے آگے چلتی خاتون کو دیکھنے لگا۔
"فراز! زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ محض تمہاری ضد پہ میں کراچی آگئی ہوں۔"
اس نے پلٹ کر اپنے بیٹے کو گھورا تھا۔ علی ارسل کے مسکراتے لب یکدم سکڑ گئے۔ گہرے براؤن کلر کے پرنٹڈ شلوار قمیص پر لیے مخصوص انداز میں دوپٹا اوڑھے وہ مہرین ابراہیم تھی۔ علی ارسل کے لیے وقت تھم سا گیا تھا۔ اس کی نظریں اپنے بیٹے پر تھیں اور علی ارسل کی اس پہ۔ بائیس سالوں میں اس کی زندگی میں کچھ نہیں بدلا تھا لیکن مہرین ابراہیم بہت بدل چکی تھی۔ اس کی گلابی رنگت میں زردیاں گھل گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں تھے۔ علی ارسل نے اسے اتنا سوچا نہ ہوتا تو شاید پہچان ہی نہ پاتا۔
"مہرو!" اس کے لب ہلے تھے۔
"ماما! اب آ ہی گئی ہیں۔ تو نزہت کی طرف جانے میں کیا حرج ہے؟"
"جسٹ اسٹاپ اٹ۔ خاموشی سے اپنی پھپھو کی طرف چلو۔ نزہت سے خود جاکر مل آنا۔ میں نہیں جاؤں گی وہاں۔"
وہ سخت لہجے میں کہہ کر آگے بڑھنے لگی تھی۔ "دانستہ" اس کی نگاہ بائیں طرف اٹھی اور اٹھی۔"

تھی۔ اس کی نگاہوں میں حیرت تھی، پیاس اور تشنگی تھی۔ وہ دونوں بائیس سال بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بائیس سالوں میں مہرین صرف دو بار کراچی آئی تھی اپنے ماں باپ کے انتقال پر ورنہ تو اس کا ناتا مکمل طور پر اس شہر سے ٹوٹ چکا تھا۔ جس کی ہواؤں اور فضاؤں میں علی ارسل بس رہا تھا۔ وہ اس سے بے خبر نہ تھی کیسے جانتی تھی کہ بائیس برس بعد بھی علی ارسل محبت کی شاہراہ پر تنہا کھڑا ہے۔ اس نے کسی سے بچھڑتے اپنی دنیا بسا لی تھی۔
"مہرو! اگر زندگی میں کبھی کسی موڑ پر تم مجھے ملوگی تو ہمیشہ کی طرح اپنا منتظر پاؤ گی۔"
اس نے بہت دفعہ یہ کہا تھا اور آج مہرین کو لگا تھا کہ وہ اپنی وفا میں سچا تھا۔ بے وفا تو مہرین ابراہیم بھی نہ تھی لیکن اس کے حصے میں جرم لکھا جاچکا تھا۔ وہ آج بھی محروم تمنا کا کاسہ لیے اس کی راہ میں آکھڑا ہوا تھا اور وہ آج بھی مجبور و بے بس تھی۔
"ماما! آپ ان لوگوں سے ملنے کیوں نہیں جاتیں۔ میں اور نزہت تو یونیورسٹی فیلو ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں جان کر معلوم ہوا تھا کہ ہمارا کتنا قریبی رشتہ ہے اور آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ اب میں اس کے گھر نہیں گیا تو وہ مجھ سے سخت خفا ہو جائے گی۔ ماما! آپ کیوں دوسروں کے دل کی پروا نہیں کرتیں۔"
وہ لب بہت آہستگی سے شکوہ کناں تھا۔ مہرین ابراہیم کی پلکیں بھیگنے لگیں۔
"میرے دل کی پروا کس نے کی تھی فراز؟"
"چلیں ماما! آپ رک کیوں گئیں؟" بیگ شولڈر پر ڈالے اس نے ٹرالی آگے بڑھاتے ماں کو پکارا۔
مہرین ابراہیم نے چونک کر اسے دیکھا اور علی ارسل کے قریب سے کسی اجنبی کی طرح گزر گئی۔ اس کی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ ڈپارچر لاؤنج میں بھگدڑ سی مچ گئی۔
"مہرو!" علی ارسل نے بے اختیار اسے آواز دی لیکن وہ دوست سے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو چکی تھی۔
بائیس برس بعد اس کی خوابیدہ محبت نے سسکاری بھری۔ سوئے ہوئے جذبوں میں ارتعاش پیدا ہوا تھا لیکن چند لمحوں کا فسوں تھا یہ۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہو مگر یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس سے بچھڑ کر جی نہ سکے گا اور جی تو رہا تھا۔ مہرین ابراہیم اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی جس کے خواب وہ تا عمر دیکھتا رہا تھا۔ لیکن اس خواب کو تعبیر ملی نہ اس کے جذبوں کو قرار۔ وہ پھر سے بکھرنے لگا تھا اس کا وجود جیسے گردش ایام کی بے مہر اور سرد ہواؤں نے برف کردیا تھا۔ اس پہ بجلی سی ضرب لگی تھی لیکن یہ بے سود تھا۔ اس نے تو خسارے کا سودا تب ہی کرلیا تھا جب چھبیس برس کی عمر میں محبت اس سے جدا ہوئی تھی۔ کراہتے ہوئے دل پہ اس کی یادوں کے پھاہے رکھتے ہوئے وہ اپنے سامان کی طرف بڑھ گیا۔ ذہن کے ایک گوشے میں چند اوتے پڑتے الفاظ بھٹک رہے تھے۔

گئے دنوں کی عزیز باتیں
نگار صبحیں گلاب راتیں
یہ سلسلہ بھی عجیب شے ہے
ہزار جیتیں ہزار ماتیں
جدائیوں کی ہوائیں لمحوں کی
خشک مٹی اڑا رہی ہیں
گئی رتوں کا ملال کب تک
چلو کہ شامیں تو ٹوٹتی ہیں
چلو کہ قبروں پہ خون رونے
اپنی آنکھیں ہی پھوٹتی ہیں!

عائشہ تحسین احمد

مرا الجھن سے کوشن

موبائل فون ہاتھ میں پکڑے وہ کافی بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا اور ہر گزرتے پل کے ساتھ اس کے سر پہ چمکتے تیز سورج کا اثر دماغ پر ہو رہا تھا اس کی بے چینی غصے اور جھنجلاہٹ میں بدلنے لگی تھی۔ سہ پہر ڈھلنے کو تھی مگر سورج ڈھلتے ڈھلتے بھی دل کی بھڑاس نکال کر جانا چاہتا تھا اور اس کی بدقسمتی کہ چھت پر کوئی کمرا، کسی ایک طرف کوئی چھپر بھی نہیں تھا، جس کے نیچے کھڑے ہو کر وہ انتظار کی یہ کوفت بھری گھڑیاں گزار سکتا۔

"اللہ تمہیں پوچھے روی! تم نے تو آج میرا تیل نکال دیا۔" وہ دل ہی دل میں اسے کوستے ہوئے تپا جا رہا تھا۔

"ہائے ہادی۔۔ کیا کر رہے ہو اتنی دیر سے یہاں کھڑے ہوئے؟" پاس والی چھت سے نازیہ نے پکارا تھا۔ وہ تین بار مسکرا کر دیکھنے کے بعد جب اسے ہادی کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملا تو وہ اسے مخاطب

مکمل ناول





کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔
"کیا ہے۔ کیوں سر پر سوار ہو؟" وہ غرایا۔ "تم جو صبح دوپہر شام یہاں اپنی ملاقاتیں بھگتاتی ہو میں نے کبھی تم سے پوچھا ہے؟"
"اچھا تو کسی سے ملنے آئے ہو۔" اس نے معنی خیزی سے سر ہلایا۔ "ویسے کس سے ملنے آئے ہو۔"
وہ یہ کہہ کر اماں صاحب کی چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ ہادی اسے مزید کوئی سخت جواب دیتا اس کا سیل گنگنا اٹھا۔ خوشی سے اچھلتے ہوئے اس نے اسکرین پر نگاہ ڈالی اور اگلے ہی پل ساری خوشی کافور ہو گئی مگر کال ریسیو کرنا بھی ضروری تھا کیونکہ اسے پتا تھا جب تک وہ بات نہیں کرے گا زین اسی طرح بیل پر بیل دیتا رہے گا بلکہ ہو سکتا ہے وہ خود ہی تن دھمکتا۔
"ہیلو!" اکتاہٹ بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔
"ابے! کہاں مر گیا ہے تو۔ تجھے اندازہ بھی ہے پچھلے ایک گھنٹے میں تجھے کتنے ایس ایم ایس کر چکا ہوں۔ پورے ایک ہفتے کا کوڈ ختم کر دیا ہے میں نے۔"
زین اس کی آواز سنتے ہی اپنے مخصوص مبالغہ آمیز انداز میں شروع ہو گیا تھا۔
"ایسی بڑ ہانکنے سے پہلے تو ایک بار آئینے میں اپنا تھوبڑا دیکھ لیتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ تیرے موبائل میں ایک دن کے دس ایس ایم ایس پیکج کا بیلنس تو ہوتا نہیں ہے اور بات کر رہا ہے تو ایک ہفتے کی۔ چل فون بند کر دے اب کسی کا فون آنا ہے۔" اس نے اس سے جان چھڑانی چاہی مگر دوسری طرف زین کے کان کھڑے ہو گئے۔
"کیا مطلب... کس کا فون آنے والا ہے؟"
"وہ میں تجھے نہیں بتا سکتا۔ اٹ از سیکرٹ۔" بات کرتے ہوئے اس نے دائیں طرف دیکھا تازیہ جا چکی تھی۔
"پھر تو میں ہرگز فون بند نہیں کرنے والا۔ کرتا رہ انتظار۔" زین نے دھمکی دی۔
"خبیث انسان! رومی کا فون آنے والا ہے۔" اس نے دانت پیسے۔
"او آئیں خواہ مخواہ ہی اتنا ایکسائٹڈ ہو گیا تھا۔ تجھے تو بس اسی کے فون آ سکتے ہیں۔ میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں اور تیرے لیدر کے نئے جوتے میرے پاس۔"
"کیا؟" وہ زین کے اس انکشاف پر...
"اتنا اور ایکسائٹڈ مت ہو میرے یار! تو اب یہی کہے گا ناں کہ دوستوں میں کوئی تیرے امیر نہیں ہوتا۔ میں نے اس لیے تو فون کیا ہے تجھے جب بھی اس کی ضرورت پڑے بلا جھجک آ کے لے جانا۔ دوستوں میں کیا تکلف۔ اچھا فون بند کرتا ہوں، رومی کا فون آنے والا ہو گا گڈ بائے۔" زین نے جلدی جلدی کہہ کر فون بند کر دیا۔ پتا تھا کس کے ڈھیر میں جلتی ہوئی تیلی ڈال دی ہے۔
"اماں... اماں۔" وہ چلاتے ہوئے نیچے گیا۔
"کیا ہے۔ کیوں پاگلوں کی طرح چلا رہے ہو؟"
اماں کچن میں تھیں وہیں سے چیخ کر بولیں۔
"زین میرے جوتے لینے آیا تھا؟" وہ وہیں آ کر پوچھنے لگا انداز کافی غصے والا تھا۔
"ہاں۔ آیا تو تھا۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "کچھ کہہ رہا تھا کہیں جانا ہے۔ کیا کہہ رہا تھا صفی!" انہوں نے پکوڑوں سے لطف اندوز ہوتے صفی کو دیکھا۔
"زین بھائی کہہ رہے تھے انہیں انٹرویو دینے جانا ہے تو ہادی کے سب سے اچھے اور نئے والے جوتے چاہئیں۔ جو ابھی تک نہ تو اس نے پہنے ہوں اور نہ لے پڑے ہوں۔" کچھ کے چٹخارے لیتے ہوئے صفی نے کہا مگر جب اسے اپنی طرف گھورتے ہوئے پایا تو سٹپٹا کر بولا۔
"یہ میں نہیں زین بھائی کہہ رہے تھے۔"
"تو کیوں گدھا ہوا جا رہا ہے۔ لے آئے گا واپس کھا نہیں جائے گا۔" اماں کو غصہ آ گیا تھا۔ وہ بیچ و
سب کیا کرایا گیا۔ ساتھ ہی دل میں زین کا حشر کرنے کی ٹھان لی۔
"یہ پکوڑے کہاں سے آئے؟" پلٹتے ہوئے اس کی نظر پلیٹ میں بچ رہے وہ تین پکوڑوں پر پڑی تو ٹھٹک گیا۔
"نیچے سے آئے تھے۔" صفی نے جلدی سے ایک پکوڑا منہ میں رکھا اور دوسرا ہاتھ میں لے لیا۔
"پھر تو پالک کے ہی ہوں گے یا آلو کے۔" وہ کچھ بے دلی سے بولا۔
"ہاں... تم تو جیسے لاٹ صاحب کی اولاد ہو ناں۔ صبح و شام خوان بھیجتے ہیں تمہارے ہاں۔ وہ بے چارے خلوص سے مجبور ہو کے کچھ بھیجیں اس پر بھی تمہارے نخرے۔ فکر مت کرو میں بھی شام کو تمہارے بنا رہی ہوں۔ جیب میں پیسے ہوں تو کر لو اپنے لیے بریانی پلاؤ کا انتظام۔"
اماں کو پڑوسیوں کے بھیجے ہوئے پکوڑوں پر اس کی تنقید ذرا پسند نہیں آئی۔ صفی ہنسنے لگا۔
"واقعی بھائی! آپ اپنے لیے لائیں تو ایک پلیٹ بریانی میرے لیے بھی لے آئیے گا۔ پکوڑے تو مجھے بھی ذرا اچھے نہیں لگتے۔"
"تو کہاں جا رہا ہے؟" اماں نے پکارا۔
"اسٹور کھولنے جا رہا ہوں اور کہاں جاؤں گا۔" باہر نکلتے ہوئے اس نے کچھ بیزاری سے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے اپنا موبائل گھر پہ چھوڑ جا۔"
"ہیں... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔
"زرینہ کے ہاں پوتا ہوا ہے۔ مبارک باد کا فون کرنا ہے۔"
"ہاں تو گھر کے فون سے کر لیں ناں۔ مجھے کیوں کہہ رہی ہیں۔" ہادی واقعی پریشان ہو گیا۔ وہ موبائل گھر چھوڑ جاتا اور اماں رومی کی کال ریسیو کر لیتیں تب کیا ہوتا۔
"ارے! اس کے موبائل میں دوسری دوسری سم ہے۔ گھر کے فون سے کروں تو ایک منٹ تین روپے کا پڑتا ہے۔" اماں کو اور کچھ یاد نہ ہو بے شک کمپنیوں کے کال ریٹ ضرور ازبر رہتے تھے۔
"اچھا! ابھی میرے موبائل میں بیلنس نہیں ہے۔ ڈلواؤں گا تو شام میں بات کر لیجیے گا۔" اسے بروقت بہانہ سوجھا تھا۔ اماں نے گھور کر اسے دیکھا پھر جیسے اس کی شکل پر ترس کھا کر بولیں۔ "اس کے پیسے میں تجھے دے دوں گی پر تو ڈلوا ضرور لینا۔"
"جی اماں! آپ فکر ہی نہ کریں۔" وہ انہیں تسلی دیتا ہوا جلدی سے باہر نکل گیا۔ اماں کا موڈ بدلتے زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔
"ہادی بھیا!" داخلی دروازے کی طرف بڑھنے سے پہلے ہی سونا کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ اپنے دروازے میں کھڑی تھی۔
"اسٹور جا رہے ہیں؟" اسے اپنی جانب تکتا پا کر سونا نے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"کوئی کام تھا؟"
"امی کی دوائی ختم ہو گئی ہے ویسے تو میں جانے کا سوچ رہی تھی مگر اب جا رہے ہیں تو کسی بچے کے ہاتھ یہ دوائیں بھجوا دیجیے گا پلیز۔"

"آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے؟" اسے اچانک ہی خیال آیا۔ پرسوں رات ان کی طبیعت اچانک سخت بگڑ گئی تھی تب ہادی ہی انہیں ہسپتال لے کے گیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ اب تو بہت بہتر ہیں۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل آیا۔

ہادی اپنا میڈیکل اسٹور سنبھال رہا تھا۔ میڈیکل میں جانے کی اپنی شدید خواہش کو اسے تب دبانا پڑا تھا" جب حامد بھائی اپنی مشہور زمانہ زن مریدی کے باعث پھوپھو اماں کو بے سہارا چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ حالانکہ ثمرین بھابھی اماں کی سگی بھانجی تھیں اور اماں کے پاس انہیں بیاہ کر لانے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ عورت ہیں "کل کلاں کو کوئی تریا چلتر آ کر ان کے سب سے بڑے اور کماؤ پوت کو لے اڑی۔ تب وہ کیا کریں گی۔ اس وقت انہیں قطعی نہیں پتا تھا کہ بظاہر بہت بھولی اور سیدھی سادی ثمرین کس طرح ان کے بیٹے پر سونگ دلنے والی ہے اور ان کی نظروں کے سامنے ان کے بیٹے کو اپنا بے دام غلام بنانے والی ہے۔

ثمرین نے ایک سال سے بھی کم عرصہ ان کے ساتھ گزارا تھا اور اس قلیل سی مدت میں ان ساس بہو کے درمیان کتنے معرکے ہوئے تھے، یہ خود انہیں بھی یاد نہیں تھا۔ اس کے بعد تو اماں کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ ادھر کوئی ثمرین کا نام لیتا اور ادھر وہ بھول بھر کے بددعائیں دینا شروع ہو جاتیں۔

حامد کے الگ ہو جانے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اخراجات کا آن پڑا تھا۔ تب ہی اماں نے بینک سے جو جمع جتھا پائی تھا اس سے اوپر دو کمرے بنوا لیے اور خود اوپر شفٹ ہونے کے بعد نیچے کا حصہ کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ پھر ہادی نے بھی مستقل آمدنی کے لیے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے تھے۔ اس کے ڈاکٹر بننے کا خواب تو چکنا چور ہو ہی چکا تھا سو وہ اس میڈیکل اسٹور کو غنیمت جان کر جی جان سے اسے سنبھالنے میں لگ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس وقت ایک گاہک کو فارغ کر رہا تھا جب اس کا فون بجنے لگا تھا۔ دیکھا تو روبی کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے ریسیور کان سے لگایا۔

"ہاں بھئی سارانی صاحبہ! یاد آ گئی میری۔ سو وقت مل گیا مجھے فون کرنے کا۔" اس کے لہجے میں خود بخود ناراضی در آئی تھی اور دوسری طرف اس کی ہنسی کے جلترنگ بج اٹھے۔

"سوری ہادی! عین وقت پر آپی آ گئی تھیں۔ اب میں ان کے سامنے تو تمہیں فون نہیں کر سکتی تھی نا۔"

"کیوں؟ تم تو کہتی ہو انہیں سب پتا ہے اور تمہاری آپی کو اور کوئی کام نہیں ہے۔ جب دیکھو یہیں آئی رہتی ہیں۔ اس سے تو اچھا ہے مستقل وہیں شفٹ ہو جائیں، میرے بھائی کا خرچہ بھی بچ جائے گا اور انہیں دیگر القابات کے ساتھ ساتھ گھر داماد کا لقب بھی مل جائے گا۔"

"شٹ اپ ہادی!" وہ بری طرح چٹخ گئی۔ "تم بھی اپنے بھائی کی یہ ساری کھول کن مجھ پر مت اتارا کرو۔ ان کے سامنے تو بڑے معصوم بنے رہتے ہو۔ میرے سامنے ہی تمہیں یاد آتی ہیں ان کی یہ کوالٹیز۔"

"ہاں تو ان کے سامنے کیسے کہہ سکتا ہوں۔ کن کی سال سے شادی جو کرنی ہے۔" وہ ہنسا تھا۔

روبی چپ سی ہو گئی پھر کچھ دیر بعد کہا۔ "اس کے لیے بھائی کو نہیں اپنی اماں کو مناؤ جب سے آپی الگ ہوئی ہیں تب سے وہ ایک بار بھی یہاں نہیں آئیں اور خاندان بھر میں کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں آپی کے خلاف، کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ جادوگرنی، احسان فراموش، پتا نہیں کیا کیا نام دے رکھے ہیں انہیں۔ خالہ کو یہ خیال بھی نہیں ہے کہ وہ ان کی بہن ہیں۔ جہاں بیٹھتی ہیں وہاں لگی کہتی ہیں کہ فرحت نے ہی ثمرین کو سکھا پڑھا کے بھیجا ہے اور امی نے بیوہ بہن کو اس عمر میں خوار کیا ہے۔ اب بتاؤ! آپی اور آپی کی ساس کی لڑائی میں امی کو کیوں گھسیٹ رہی ہیں۔ ویسے بھی جتنے مہینے آپی ان کے ساتھ رہیں "خالہ" نے انہیں کوئی سکھ نہیں

دیا ایسے میں جدا الگ نہ ہوتیں تو اور کیا کرتیں۔"

وہ اسے سنا رہی تھی اور وہ چپ چاپ سن رہا تھا۔ ہادی کے لیے یہ وہ حقیقت تھی جیسے ناچتے ناچتے کسی مور کی نظر اپنے بدصورت پیروں پر پڑ جائے۔

"تم نے یہ سب سنانے کے لیے فون کیا ہے مجھے؟" کچھ دیر بعد وہ قدرے چڑ کر بولا۔ زبان درازی میں روبی نے ثمرین کا ریکارڈ تو توڑ ڈالا تھا۔ "یہ بتاؤ مل کب رہی ہو؟"

"ابھی نہیں۔ بتایا تھا ناں تمہیں میرے ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔" وہ کچھ بے نیازی سے بولی۔

"تو اس کا ہمارے ملنے سے کیا تعلق ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"اف بھئی! تیاری کرنی ہے مجھے۔" روبی جھلا گئی اور ہادی ہنس پڑا۔

"چھوڑو یار! تم نے کبھی ایگزامز کی تیاری تو کی نہیں ہے۔ ٹیسٹ کی تیاری کیا کرو گی۔"

وہ مذاق اڑانے لگا اور روبی نے دل ہی دل میں سو بار کو کوسا جس نے ہادی کے سامنے اس کی نالائقی کا پردہ چاک کیا تھا۔ ایک سال پہلے جب عین ان کے رزلٹ آؤٹ ہونے کے دن وہ ان کے گھر آیا تھا۔

"ہاں لیکن امی نے مجھے وارن کیا ہے کہ اگر اس سال بھی میری کوئی سپلی آئی تو وہ مجھے کالج سے ہی اٹھوا لیں گی۔" اس نے شرمندگی سے بتایا۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولی۔

"سنو ابھی آج آپی کے ساتھ ان کے گھر جانے والی تھی۔ یہاں اس چھوٹے گھر میں تو مجھے کچھ یاد نہیں ہونے والا۔ تم ایسا کرو وہیں آ جاؤ۔"

"ہاں۔" ہادی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ عرصہ پہلے جب خالہ موسمی بخار کے باعث بستر پر پڑی تھیں تب وہ محض روبی کی خاطر ان کی طبیعت پوچھنے چلا گیا تھا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی ہی تھی کہ اسی وقت حماد بھائی بھی وہاں موجود تھے اور ظاہر ہے کہ اماں تک یہ خبر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور اس کے بعد جو ان کی طبیعت خراب ہوئی تو ہادی ہاتھ پیر جوڑ کر انہیں یقین دلانے لگا تھا کہ آئندہ وہ کبھی بھول کے بھی خالہ کے گھر کا رخ نہیں کرے گا مگر اب تو بات حامد بھائی کے گھر کی تھی جہاں وہ اس سے پہلے بھی اماں کی لاعلمی میں دو تین بار جا چکا تھا اس لیے کچھ دیر کے بعد بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے مگر بھابھی۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ کچھ کہیں گی تو نہیں۔"

حالانکہ ثمرین بھابھی کی تیوریوں پر پڑے بل ہی اسے ڈرانے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ وہ اکثر حیران ہو کے سوچتا بھی کہ حامد بھائی ان پر کیسے فدا ہو گئے۔

"جی نہیں! وہ کچھ نہیں کہیں گی اور میں تمہیں ایک بات بتاؤں وہ تمہیں بہت پسند کرتی ہیں۔"

یہ روبی نے نیا انکشاف کیا تھا۔ اسے جھٹکا لگا۔

"اچھا! لگتا تو نہیں۔"

"خیر! تم یہ سب چھوڑو بس تم بس آ جانا اور سنو! میری برتھ ڈے بھی آنے والی ہے اس مہینے کی سولہ کو تو ایسا کرو گفٹ مجھے ایڈوانس میں دے دو۔ گفٹ کچھ ایسا ہونا چاہیے جسے میں اپنے کالج کے فنکشن میں پہن سکوں۔ سمجھ گئے؟ اچھا اب میں فون رکھتی ہوں امی کب سے آوازیں دے رہی ہیں۔ او کے بائے۔"

اس نے جلدی جلدی جملے ادا کر کے فون بند کر دیا تھا۔ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی اپنے مطلب کی بات کہنے کے بعد وہ ہادی کی کوئی بات سننے کی زحمت نہیں کرتی تھی۔ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے وہ پلٹا اور زین پر نظر پڑتے ہی چونک گیا۔

"تو کب آیا؟"

"جب تو اپنی ہیر سے بات کر رہا تھا۔" زین مسکراتے ہوئے اسٹور کی اکلوتی کرسی پر براجمان ہوا۔

"تیرا اکلوتا دوست جگری یار اور سچا محسن ہونے کے ناتے مجھے تیرے مستقبل کی بڑی فکر ہونے لگی ہے یار! میری دوستی، میری وفاداری مجھ سے تقاضا کر رہی ہے کہ میں تجھے اس روبی بم کے چنگل سے بچاؤں۔"

وہ چہرے پر خاصے دردمند اور غور و فکر کے تاثرات

سمجھائے کہہ رہا تھا۔ ہادی کے پاس اس وقت صرف سوال ہی تھا جو وہ زین کی اس بکواس پر اس کے سر پر مار سکتا تھا۔ اس نے بے حد مشکل سے خود پر ضبط کیا۔

"اور میرا جوش یار! تو اُلٹا مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میں تیر اگلا دیا دوں۔ کچھ شرم کر لے کہیں سے تھوڑی سی غیرت ادھار لے لے' اپنی ہونے والی بھابھی کے بارے میں ایسی گل افشانی کرنے سے پہلے تو نے اپنی زبان کیوں نہ کاٹ لی۔" ہادی کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔ زین نے بے ساختہ ایک قہقہہ لگایا۔

"تو وہ قیامت تمہاری ہونے والی ہی رہے گی۔"

"تف ہے تو میرا کیسا دوست ہے یار! بجائے میری مدد کرنے کے بجائے مجھے یہ بتانے کے کہ میں مروی کے لیے لائق کو کیسے منتوں۔ تو مجھے بد دعائیں دے رہا ہے؟" تاسف سے کہتے ہوئے وہ روہانسا ہونے لگا مگر زین پر مطلق اثر نہ ہوا۔

"یہ بد دعا نہیں ہے میرے جگر! یہ تو دعا ہے جو میرے معصوم دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے مگر دیکھ دے، تو کہاں سمجھے گا۔ اس کے عشق میں تو جس طرح اپنا تن من اور آج کل تو دھن بھی بے دردی سے لٹا رہا ہے، اس سے ثابت ہو چکا ہے کہ تیرا ذہن اب کسی جوگا نہیں رہا۔ نہ تو تجھے اپنی بیوہ ماں کی دعا امیدیں نظر آتی ہیں مجبور تجھ سے جو تو نے جھنجی ہے اور نہ ہی اپنے چھوٹے بھائی کا مستقبل۔"

"تو کہنا کیا چاہ رہا ہے؟" وہ ہونٹ چبانے لگا۔ "تجھے لگتا ہے میں بھی حلد عقل کی طرح انہیں چھوڑ جاؤں گا؟"

"یقیناً ایسا نہیں ہو گا اگر تو مروی کا خیال دل سے نکال دے تو۔" زین بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"یعنی سارے مسئلے کی جڑ مروی ہے؟" ہادی نے ایک گہری سانس لی۔

"اول تو اس کی بہن کو جھیلنے کے بعد تجھے اس سے بھلائی کی توقع رکھنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ پھر بھی اگر تیرا پاگل دل اس پر آ ہی گیا اور تیرے جس بھرے دماغ نے یہ جان لیا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں تو اب جب کم از کم اب تو اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کے کچھ سمجھ لے تیوار ہو جا۔ ہر وہ تجھ سے کچھ نہ کچھ اینٹھنے کے لیے کوئی نئی فرمائش کر لی ہے اور تو اسے پورا کرنے کی فکر میں ہلکان ہو رہا ہے۔ وہ بھی اچھی طرح جانتی ہے یہ بات کہ تو اپنے گھر کا واحد کماؤ پوت ہے تو بھی یہ بات جانتا ہے کہ تمہاری بھولی بھالی سیدھی سادی اماں بھی آکر اسٹور کا حساب کتاب چیک نہیں کر سکتیں۔ تجھ سے جواب دہی نہیں کر سکتیں۔ خرچ تیرے ہاتھ میں ہے اور تو اپنی کمائی کے واحد ذریعے سے حاصل ہونے والے حلال کمائی کو بے دردی سے اس پر لٹا رہا ہے۔ میں تو شکر کرتا ہوں کہ یہ میڈیکل اسٹور ہے جنرل اسٹور نہیں۔ ورنہ ان کے گھر کا مہینے بھر کا راشن بھی یہیں سے جاتا' وہ بھی کبھی نہ چکنے والے ادھار پر۔" اسے کچھ سنجیدہ موڈ میں محسوس کر کے زین نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

"تجھے لگتا ہے وہ مجھے الو بنا رہی ہے؟" ہادی نے اسے دیکھا۔

"بالکل نہیں۔" زین نے جھٹ نفی میں سر ہلایا۔

"وہ تو تو پہلے سے ہی ہے۔ اب تو تجھ میں گدھے والی خصوصیات پیدا ہونے لگی ہیں جو بوجھ ڈھوتا ہے۔ وہ وقت گھاس چرتا ہے۔ موڈ میں ہو تو مستیاں کرتا ہے اور سوچنے سمجھنے کا کام اپنے مالک پر چھوڑ دیتا ہے۔"

"جتنی بکواس کرنی ہے کر لے۔ کسی دن میں نے بھی تجھے زہر کا انجکشن لگا کے اس دنیا سے فارغ نہ کر دیا تو میرا نام بھی ہادی عبدالصمد نہیں۔" ہادی نے خاصے پر عزم انداز میں چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ زین چونک گیا۔

"اچھا تو تیرے پاس زہریلے انجکشن کا اسٹاک بھی ہے۔ مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا' یہ جو آئے دن عجیب و غریب کمپنیوں کے عجیب و غریب بندے بیٹھے رہتے ہیں تیرے پاس ان کا کچھ تو نتیجہ نکلے گا۔ سدھر جا اس سے پہلے کہ جیل کی ہوا کھانی پڑے۔"

ہادی جواب میں اسے دیکھ رہا تھا کوئی کسیلا جواب

دیکھنے لگا تھا کہ کاؤنٹر پر ایک گاہک کی آمد ہوئی۔
"ہادی بھائی! یہ بیلنس کارڈ کروادیں اس نمبر پر۔" وہ محلے کا ہی لڑکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہادی کو سونا کی تاکید یاد آئی۔
"ہاں کرتا ہوں۔ تم پہلے میرا ایک کام کردو۔" اس نے دوائیوں کا شاپر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ دوائیاں جاکر ہمارے کرائے دار کے ہاں دے آؤ۔"
"سونا باجی کے گھر؟" اس نے تصدیق چاہی۔
"ہاں وہی سیدھے دے آنا۔ ادھر ادھر گھومنے کی ضرورت نہیں اور واپس یہاں آنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا بیلنس لوڈ ہو جائے گا۔"
"یہ سونا کون ہے؟" اس کے پلٹتے ہی زین نے پوچھا۔
"تو نہیں جانتا؟" ہادی نے تعجب کا اظہار کیا۔
"چاندی کا شوہر؟" زین نے کچھ سوچ کر اپنے تئیں صحیح جواب دیا۔
"یہ چاندی کون ہے؟" اس نے کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے گھورا تو زین بری طرح چڑ گیا۔
"بتا نا! کون ہے یہ سونا؟"
"ہمارے نئے کرائے دار، بلکہ نئے تو نہیں رہے۔ اب تو انہیں چار پانچ مہینے ہو رہے ہیں۔" ہادی نے فریزر سے بوتل نکال کر اس کی طرف اچھالی جسے اس نے فوراً ہی مہارت سے کیچ کر لیا۔
"تھینک گاڈ! تجھ جیسے زہریلے انسان سے تو میں واقعی کسی زہریلے انجکشن کی توقع کر رہا تھا۔" اس نے ٹھنڈی بوتل سے بڑا سا گھونٹ لیا۔
"ویسے کمال ہے یار! انہیں یہاں شفٹ ہوئے پانچ مہینے ہو رہے ہیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ جب ہی میں کہوں آج کل تمہاری وہ میرا جیسی صورت اور وینا جیسی ڈریسنگ والی کرائے دار ریدا اے میں کھڑی نظر کیوں نہیں آتی۔"
"تجھے تو بڑا افسوس ہو رہا ہو گا۔" ہادی نے ہنس کر اس پر چوٹ کی۔
"ہاں میں تو جیسے اسی کے لیے تیری گلی کے چکر کاٹا کرتا تھا۔" زین کو غصہ آگیا۔
"تب کیوں جل رہی ہے اس کی وجہ سے تو بہت سے لوگوں نے اپنا روٹ چینج کر کے اس گلی سے گزرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کیا پتا تیری دل پھینک فطرت نے بھی تجھے مجبور کر دیا ہو۔" ہادی اب دل جلانے والی مسکراہٹ سے کہتے ہوئے بدلہ چکانے لگا تھا۔
"ویسے پہلے پہل اس نے کافی شرافت کا مظاہرہ کیا تھا مگر جیسے جیسے اس نے پر پرزے نکالے۔ اماں کو دیکھ دیکھ کر اختلاج قلب ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ اس کی وجہ سے میری اکلوتی پیاری اماں کو کوئی بڑا جھٹکا لگتا میں نے اسے گھر خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔ حالانکہ کرایہ دینے میں اس نے کبھی اڑی نہیں کی تھی۔ بلکہ مقررہ تاریخ سے پہلے ہی وہ خود آکر کرائے کے ساتھ ساتھ اکثر بریانی اور قورمے کے ڈونگے بھی دے جاتی تھی۔" اب کے ہادی نے سنجیدگی سے بتایا۔
"تو تم لوگوں نے مکان دیتے ہوئے کسی قسم کی کوئی چھان بین نہیں کی تھی؟"
"کیسی چھان بین کرتے یار! ہم تو سمجھ رہے تھے کہ چلو صرف میاں بیوی ہیں۔ زیادہ جھنجھٹ نہیں ہے یہ تو اس کے شوہر کے دبئی سدھارنے کے بعد ہی ہمیں اس کے لچھنوں کا اندازہ ہوا۔ اللہ معاف کرے!" ہادی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔
"اماں کو تو میری وجہ سے بھی ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں میں اس کے چکر میں نہ پڑ جاؤں کیونکہ وہ تین بار مجھے اپنے گھر بھی بلا چکی تھی۔ کبھی پانی کا مسئلہ ہوتا تو کبھی بجلی کی لائن میں گڑبڑ ہو رہی ہوتی۔" ہادی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی تھی۔
"اور یہ لوگ؟" زین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"نہیں یار! یہ لوگ تو بہت شریف اور خاندانی ہیں۔ بیوہ خاتون ہیں اور ان کی دو بیٹیاں۔ خود بھی ریٹائرڈ ٹیچر ہیں اور بڑی بیٹی بھی کہیں ٹیچنگ کرتی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ اماں ان سے بہت خوش

ہیں۔"
"ویسے اگر تو اپنی پرانی کرائے دار کو ہمارے ہاں بھیج دیتا تو زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔ ہماری بلڈنگ کے فرسٹ فلور کا فلیٹ کب سے خالی پڑا ہے۔" زین نے اٹھتے ہوئے کہا تو ہادی اسے گھورنے لگا۔
"لگتا ہے اس نے تجھے اچھا خاصا متاثر کر ڈالا ہے۔"
"اس صورت میں تو بالکل نہیں جیسے تو سوچ رہا ہے۔ میں تو اس کی بریانی اور قورمے سے مستفید ہونے کی سوچ رہا تھا۔" زین نے اصل وجہ بتائی۔
"بھابھی کے پکائے بدمزہ کھانے کھا کھا کر میرا تو اس دنیا سے دل ہی اچاٹ ہو گیا ہے قسم سے۔"
"تو تو شادی کیوں نہیں کر لیتا؟" ہادی نے مخلصانہ مشورہ دیا۔
"پہلے نوکری تو کر لوں، ورنہ بھائیوں کی کمائی سے بیوی پالنے کا الزام بھی لگ جائے گا مجھ پر۔" وہ ہنس کر بولا۔
"نوکری سے یاد آیا۔ تیرے انٹرویو کا کیا بنا؟"
"کس انٹرویو کا؟" وہ چونکا۔
"وہی جس کے لیے تو نے میری جوتیاں گھسائی تھیں۔" ہادی کو یاد کر کے نئے سرے سے غصہ چڑھنے لگا سو دانت پیس کر رہ گیا اور زین نے ایک قہقہہ لگایا تھا۔
"وہی جو اس سے پہلے کے تمام انٹرویوز کا ہوتا آیا ہے۔"
"تیرا کچھ نہیں بن سکتا۔" وہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔
"اور تیرا بہت کچھ بن سکتا ہے بس اس ریدی نام کی بلا سے پیچھا چھڑالے۔" وہ جاتے جاتے بھی اسے تپانے سے باز نہیں آیا۔ ہادی تلملا کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"سونا! امی کو دوائی دے دی تھی؟"
تعبیر اس وقت منہ ہاتھ دھونے کے بعد کاپیوں کا ڈھیر لے کر بیڈ پر بیٹھی تھی۔ شدید تھکن کی وجہ سے اس کے سر میں درد ہو رہا تھا اور آنکھیں بھی جلنے لگی تھیں مگر کاپیاں چیک کرنا بھی ضروری تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد تو اسے اتنا ٹائم نہیں مل سکا تھا۔ اسی لیے آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر وہ دوبارہ کام کرنے بیٹھ گئی تھی۔
"تم سے پوچھ رہی ہوں! بہری ہو گئی ہو کیا۔" اپنی کمر کے پیچھے کشن رکھتے ہوئے اسے سونا کی خاموشی پر تاؤ آیا جو بڑی بے نیازی سے ڈائجسٹ میں منہ دیے بیٹھی تھی۔
"ہاں دے دی تھی دوائی مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد امی کا بی پی پھر سے ہائی ہو گیا۔ پھپھو کا فون آیا تھا۔" سونا کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔
"اچھا! تم کہاں تھیں تب؟" اسے حیرانی ہوئی۔
"نہانے گئی ہوئی تھی۔ تمہارے نہانے کا دورانیہ بھی دو گھنٹوں سے گھٹتا ہے۔" سونا نے اس پر بھی طنز کر ڈالا۔ سو لب بھینچے اسے گھورنے لگی۔
"میں تو امی سے ان کی بات بھی نہیں کروانا چاہ رہی تھی۔ مگر تم جیسے ہی واش روم سدھاریں، ان کا فون آگیا۔ بس پھر مجبوراً امی کو ہی فون تھمانا پڑا۔"
"کہہ کیا رہی تھیں؟" وہ کاپی بند کر کے پھر سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
"ولید بھائی کی شادی طے ہو گئی ہے۔ یہی اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا لیکن مجھے پتا ہے انہوں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا ہو گا اور بھی بہت کچھ کہا ہو گا امی سے اور پتا ہے امی مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں۔ امی کہہ رہی تھیں کہ میں تمہیں یہ بات نہ بتاؤں ولید بھائی کی شادی والی۔"
سونا نے بات ختم کر کے اسے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی۔
"ایک تو یہ امی بھی نا۔ کیا سمجھتی ہیں میں مری جا رہی ہوں ولید کے پیچھے۔ اس کی شادی کی خبر سنوں گی تو خودکشی کر لوں گی۔"
"اور کیا پتا ایسا ہو بھی۔" سونا نے مسکراہٹ دبا کر

عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔
"کیا مطلب؟" تعبیر الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔
"خود کشی سے... یاد ہے جب تمہاری منگنی ٹوٹی تھی۔ تب تم نے کیسا ری ایکشن دیا تھا۔" اسے یاد دلاتے ہوئے سونا نے جب اس کے چہرے پر چھائی زردی کو دیکھا تو خائف سی ہو گئی۔
"ایسی بکواس کرنے سے پہلے کچھ سوچ لیا کرو سونا! وہ ری ایکشن میں نے منگنی ٹوٹنے پر نہیں دیا تھا۔" تعبیر کے لہجے میں تلخی تھی۔
"بلکہ جس بات کو بنیاد بنا کر منگنی توڑی گئی تھی اس پر دیا تھا۔ ولید کوئی اس دنیا کا آخری مرد نہیں تھا کہ جس سے رشتہ ٹوٹنے پر میں زندگی بھر کنواری رہنے کے غم میں اپنی زندگی حرام کر لوں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے اور افسوس بھی کہ جب تم لوگ ہی مجھے اتنا غلط سمجھ رہے ہو تو میں کسی اور سے کیا شکایت کروں گی۔"
"آئی ایم سوری تعبیر! میں تو بس یونہی مذاق کر رہی تھی۔" سونا کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے یہ بات چھیڑی ہی کیوں۔
"کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں راہ چلتے کسی بھی شخص کا ہاتھ پکڑ لوں، محض اپنی تسلی کے لیے، انہیں یہ بتانے کے لیے کہ مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ میں نے کسی کے لیے جوگ نہیں لے رکھا اور یہ کہ میں کسی دن میں بیاہ کر بھی گزر دوں گی۔" اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ بے نیاز رہنے کی اس کی تمام تر کوششیں اب بے سود ہونے لگی تھیں۔
"پاگل ہو گئی ہو تعبیر!" سونا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "دو بیٹیوں کی ماں ہیں اور ہمارے لیے ان کی فکر بالکل جائز ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے وہ جان بوجھ کر فکر مند ہوتی ہیں؟ انہیں اس طرح پریشان اور مایوس رہنا اچھا لگتا ہے؟ ہمارے ان گھٹیا ترین رشتے داروں کی باتیں سن کر انہیں لطف آتا ہے؟ تمہیں یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ تمہارے منگنی ٹوٹنے سے تمہیں بھلے ہی کوئی فرق نہ پڑا ہو مگر امی کی ساری پریشانیاں اسی وجہ سے ہیں۔"
"کیسے ختم ہو گی امی کی یہ پریشانی؟" چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد تعبیر نے سنگ کر پوچھا تھا۔
"میں نہیں جانتی۔" اس نے نگاہیں چرا لیں۔ "مگر شاید تمہاری شادی سے۔"
"بات تو گھوم کر وہی آ گئی ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر سر ہلایا۔ "میں شادی کر لوں چاہے کسی سے بھی کر لوں۔"
"اگر تمہاری منگنی نہ ٹوٹی ہوتی تو بات الگ تھی۔ اب کوئی پلٹ کر نہیں آتا جب اسے یہ بات پتا چلتی ہے۔"
"تو گویا یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے؟" اسے نجانے سونا کے انداز میں کیا بات محسوس ہوئی کہ اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔
"تمہیں برا لگے گا مگر سچ تو یہ ہے کہ اس میں کچھ غلطی تمہاری بھی ہے۔"
سونا یہ کہہ کر اٹھ گئی تھی مگر وہ ساکت رہ گئی۔ سونا نے ٹھیک کہا تھا اسے یہ سن کر بہت برا لگا۔ کیونکہ اسے نہیں پتا تھا کہ سونا بھی اسے قصوروار سمجھتی ہے پھر تو اس کا بھی یہی خیال ہو گا اس نے سر تھام لیا تھا۔
"کہاں ہے اس سارے معاملے میں میری غلطی؟ صرف اتنی کہ میں نوکری نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ میں خود غرض نہیں بننا چاہتی تھی مگر اس کا مجھے کیا فائدہ ہوا... یہی کہ پھر بھی مجھے ہی قصوروار گردانا جا رہا ہے۔ مجھے ہی الزام دیا جا رہا ہے۔ میں ہی مجرم ہوں۔"
وہ سوچ رہی تھی۔ اپنی غلطی تلاش کر رہی تھی اور آنسو خود بخود اس کے رخساروں پر پھسلتے جا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

تعبیر بہت حساس تھی۔ باپ کی وفات کے بعد ماں نے کن مشکلات سے گزر کر ان کی پرورش کی تھی۔ کس طرح نامساعد حالات کا مقابلہ کیا تھا اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا۔ دوست احباب، رشتہ دار تو ایک طرف ان میں سے کسی نے آ کر احوال تک دریافت کرنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ کہیں

ہمدردی جتائیں اور ان سے مدد ہی نہ مانگ لی جائے۔ صرف ایک تایا جی تھے جو ہمیشہ ان سے باخبر رہا کرتے تھے اور ان کی وجہ سے وہ ددھیالی خاندان والوں سے بھی جڑے ہوئے تھے۔
ان ہی دنوں جب تعبیر کا ماسٹرز مکمل ہونے والا تھا، تایا جی آ کر اسے ولید کے نام کی انگوٹھی پہنا گئے۔ کتنے دن وہ بے یقین سی رہی۔ تایا جی تو خیر شروع سے ہی ان کی محبتوں سے بندھے ہوئے تھے مگر تائی جی کیسے مان گئیں اور ولید... وہ سوچ سوچ کر الجھتی رہتی۔ اگر ایک دن ولید نے اسے یونیورسٹی سے پک کرتے ہوئے اس سے اپنی پسندیدگی کا اظہار نہ کیا ہوتا۔
اس کا اضطراب تو ختم ہو گیا تھا مگر اس کی پریشانی نہیں۔ تائی جی کے ماتھے کے بل تو وہ اسی دن دیکھ چکی تھی اور اب تو وہ جب بھی آتیں تیور اکھڑے ہوئے ہی ہوتے اور تعبیر کو یہ ہرگز منظور نہیں تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی شروعات کسی کی بھی قربانی یا ناراضی سے کرے۔ پھر یہ پریشانی بھی پس پشت چلی گئی جب اس کا رزلٹ آیا۔
امی گورنمنٹ ٹیچر تھیں۔ ان کی ریٹائرمنٹ میں چند ہی سال تھے۔ جاب کا تو اس نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ اپنی قابلیت پر اسے اتنا بھروسا تو تھا کہ اسے کہیں بھی بہت اچھی جاب مل سکتی ہے مگر یہاں بھی اس کی حقیقت پسند سوچ اور منکسرالمزاج طبیعت کہ کسی کو کوئی اعتراض، کوئی بات کرنے کا موقع نہ ملے، اس نے بھی ٹیچنگ کرنے کو ترجیح دی اور ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی مگر تب... اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ولید نے یہ سنتے ہی ایک ہنگامہ اٹھا دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تعبیر نوکری کرے۔ بے شک وہ ٹیچنگ ہی کیوں نہ ہو۔ امی کو پتا چلا تو انہوں نے بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ولید کو نہیں پسند تو یہ جاب چھوڑ دینی چاہیے مگر تعبیر کا فیصلہ اٹل تھا۔
ان کی ماں نے ان کے لیے جو کچھ کیا تھا۔ اس کا صلہ کیا وہ انہیں اس طرح دیتی کہ اب جب انہیں ضرورت پڑنے والی تھی تو وہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر صرف اپنا گھر بسانے کے بارے میں سوچتی۔
تعبیر نے ولید پر اپنا موقف واضح کر دیا تھا۔ نتیجتاً ان دونوں کے بیچ ایک گہری خلیج حائل ہو گئی تھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی تایا جی آئے تو شادی کی بات چھیڑ دی۔ تعبیر کو کوئی مسئلہ نہ ہوتا اگر وہ ولید کی فطرت جان چکی تھی۔ وہ ہر معاملے میں اپنی من مانی کرنے والا ایک ہٹ دھرم قسم کا انسان تھا اور شادی کی یہ جلدی بھی یقیناً اسی کے کہنے پر مچائی جا رہی تھی حالانکہ کچھ دن پہلے تائی نے خود کہا تھا کہ ولید کو ایک اسپیشل کورس کے سلسلے میں جاپان جانا ہے اور شادی اس کی واپسی پر ہی ہو گی۔
تعبیر ضدی نہیں تھی مگر اس وقت اسے بھی جیسے ضد سی ہو گئی تھی اور اس نے شرم و لحاظ بالائے طاق رکھ کر خود ہی تائی سے کہہ دیا کہ اس کا ابھی شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ ولید واپس آ جائے پھر دیکھا جائے گا۔ ولید تو اس سے پہلے ہی ناراض تھا، رہی سہی کسر اس کے انکار نے پوری کر دی۔ وہ چلا گیا اور جاتے ہوئے اس سے مل کر بھی نہیں گیا۔
اس کے جانے کے بعد کچھ ہی دن آرام سے گزرے تھے کہ تایا جی کی "تا" "فاتا" موت نے سب کچھ درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ بابا کی وفات کے بعد ایک وہی تو تھے جن کے ہونے سے انہیں ڈھارس تھی، جو اسے بالکل اپنے بابا جیسے لگا کرتے تھے۔ تعبیر کو اس صدمے سے سنبھلنے میں بہت وقت لگا تھا۔ ولید سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا اور نہ ہی تائی، تایا جی کے وفات کے بعد ان کے گھر آئی تھیں۔ امی پریشان تھیں تو الجھن اسے بھی ہو رہی تھی۔ مگر اس کی الجھن کچھ ہی روز میں ثابت ہو گئی۔
تائی جی تو نہیں آئیں مگر کچھ دنوں بعد پھپھو ضرور آ گئی تھیں ان کا پیغام لے کر۔
تائی جی نے اپنی جانب سے یہ رشتہ توڑ دیا تھا اور وجہ اس کی نوکری بھی نہیں بلکہ اس کا کریکٹر بتا تھا۔ وہ گہرے صدمے میں تھی اس لیے نہیں کہ اس کی

سکنی نہیں تھی بلکہ اس لیے کہ آج تک حد سے زیادہ محتاط رہ کر بھی، پھونک پھونک کر ہر قدم اٹھانے کے بعد بھی اس کے کردار پر انگلی اٹھائی گئی تھی۔ وہ اتنا تو جانتی تھی کہ تائی جی اسے پسند نہیں کرتیں مگر وہ رشتہ توڑنے کے لیے اس پر اتنا گھٹیا الزام لگائیں گی۔ اس کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

تائی جی کے جانے کی دیر تھی، امی نے جیسے ہر لحاظ ختم کر دیا تھا۔ نجانے ولید سے کیا کہا گیا تھا مگر انہیں یہی جتلایا گیا تھا کہ یہ سب ولید کی خواہش پر ہوا ہے۔ اس وقت تعبیر کو یقین نہیں تھا کہ ولید ایسا چاہ سکتا ہے مگر جلد ہی اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی۔ جب واپس آنے کے بعد ولید نے ایک بار بھی آ کر ان سے سارا معاملہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ تعبیر کو ولید سے محبت نہیں تھی مگر اپنی عزت نفس پر اس شدید چوٹ نے اسے بہت لہولہان کیا تھا۔

اب وہ مطمئن تھی مگر امی کو اس طرح اپنے لیے پریشان ہوتے دیکھتی تو اس کا سارا اطمینان اضطراب میں بدل جاتا تھا۔ مگر مسئلہ سارا یہی تھا کہ امی کی یہ پریشانی دور کرنے کے لیے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! میری بلیک شرٹ کہاں رکھ دی آپ نے؟" کمرے کھنگالنے کی تلاش بسیار اور الماری کو الٹ پلٹ کر کے ناکام ہونے کے بعد اب وہ امی کو آوازیں دینے لگا تھا۔

"خدا کے لیے امی! مجھے دیر ہو رہی ہے، پلیز! اگر میری شرٹ ڈھونڈ کر استری کر دیں۔" الماری کا پٹ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے وہ کچھ اور بھی بلند آواز میں چلایا مگر کچھ فاصلے پر فون پر مصروف امی نجانے کس رشتے دار خالہ کی غیبتیں سن رہی تھیں کہ بیٹے کی آواز نے انہیں کسی مکھی کی بھنبھناہٹ سے بھی کم متوجہ کیا۔ [illegible]

"صبر کیجئے بھائی! ایک گھنٹے کا لیکچر ختم ہو گا تو آپ کو آپ کی شرٹ مل جائے گی۔" موبائل فون پر گیم کھیلتے صفی نے اس کی بے چارگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے صبر کی تلقین کی۔ وہ اسے خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔

"پھر کیا کروں، کوئی دوسری شرٹ پہن لوں؟" وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔

"لیکن نہیں۔ مجھ پر بلیک کلر زیادہ جچتا ہے۔ روبی نے بھی یہی کہا تھا۔"

آئینے کے سامنے آ کر اپنا گورا چٹا چہرہ دیکھنے لگا۔ نئی نئی کی گئی شیو کی نیلاہٹ نے چہرے کو کچھ اور بھی وجیہہ بنا دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جاندار سی مسکراہٹ آ گئی۔ پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ صفی کے پاس آیا۔

"چل اٹھ صفی! جا کے دیکھ امی نے میری شرٹ کہاں رکھ دی ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" صفی بدک کر دور ہٹا۔ "بھائی ہوں آپ کا کوئی غلام تھوڑی ہوں کہ ایک منٹ میں چراغ کے جن کی طرح کہیں سے آپ کی شرٹ ڈھونڈ لاؤں۔ کوئی اور شرٹ پہن لیجئے نا۔"

"مجھے یہی شرٹ پہننی ہے جسے امی نے کسی خزانے کا نقشہ سمجھ کر کسی تجوری میں لاک کر دیا ہے۔" وہ امی کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ انہوں نے ایک گھوری اس پر ضرور ڈالی مگر فون بند نہیں کیا۔

"ایسا کریں وہ لائٹ گرین چیک والی شرٹ پہن لیں۔ آپ پر بہت اچھی لگتی ہے، ایکدم ہیرو لگتے ہیں آپ اس میں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔"

صفی سنجیدہ سی شکل بنائے قسم کھانے کو تیار بیٹھا تھا۔ بس کسی طرح اس کی جان چھوٹتی۔ وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا اور پھر جب وہ اپنے کمرے کی طرف آیا تھا کہ امی کی بات نے اس کے قدم روک دیے۔

"فرحت کس مزاج کی عورت ہے یہ تو ایک دنیا جانتی ہے۔ جتنی بیٹیوں کو بیاہا ہے ان سب کی سسرال والوں کو نجانے کیسی کیسی پٹیاں پڑھا کر جادو منتر پھونک کر اپنے

میاں باپ سے الگ کروا لائی ہے۔ جیسی فسادن عورت ویسی اور میری مت ماری گئی تھی نجانے کیسا پردہ پڑ گیا تھا عقل پر کہ جا کر اس کمینی میسی کو بیاہ لائی۔ اس ایک سال میں اس نے جو میرے ساتھ کیا ہے وہ تو تئیس سالوں میں بھی میری ساس نے بھی میرے ساتھ نہیں کیا۔"

امی کافی جوش میں خالہ اور بھابھی کے بخیے ادھیڑنے میں مگن تھیں۔ وہ بے اختیار جھرجھری لیتا کمرے کی طرف بڑھ آیا۔

"اگر امی کو پتا چل جائے کہ میں روبی سے ملنے جا رہا ہوں تو پتا نہیں وہ میرا کیا حشر کریں۔"

"دیکھیں امی! یہ کیا ہے؟" تھوڑی دیر بعد وہ پھر امی کے سامنے کھڑا تھا۔ مگر صد شکر کہ اب وہ فون بند کر چکی تھیں اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

"کیا ہے۔" اس کے پکارنے پر ایک بیزار سی نظر اس پر ڈالی اور دوبارہ [illegible] کے بیج چننے لگیں۔

"اس کف کا بٹن کہاں گیا؟" اپنا بازو ان کے سامنے کرتے ہوئے اس کا لہجہ تند ہوا تھا مگر امی کی ایک گھوری پر دھیما بھی ہو گیا۔ "اب میں کیا کروں۔"

"تو خود لگا لے نا بابو جی! اب کیا ایک بٹن کے لیے بھی تو مجھے پریشان کرے گا۔ یہ کام تو لڑکے خود بھی کر لیتے ہیں۔"

انہیں غصہ آ گیا۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور انہوں نے ابھی تک ہانڈی بھی نہیں چڑھائی تھی۔ ایک گھنٹہ تو پہلے ہی فون پر برباد ہو چکا تھا۔

"یہ کام وہ لڑکے کرتے ہوں گے جو پارٹ ٹائم میں کاج اور بٹن لگانے کا کام کرتے ہوں۔ میں سوئی تو لگا سکتا ہوں مگر چلا سکتے نہیں۔" وہ بھی تپ گیا۔ جتنا وہ جلدی نکلنا چاہ رہا تھا، اتنی ہی دیر ہوتی جا رہی تھی۔

"غضب خدا کا! بوڑھی ماں کا کوئی خیال نہیں۔ ایک تو پہلے ہی مجھ اکیلی جان کو سو جھمیلے ہیں اور اوپر سے تو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے منہ بسورتا آ جاتا ہے۔ تیری شادی کر دوں تو جان چھوٹے میری۔" جھٹکا کر ہاتھ دھوتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگی تھیں۔

"ایک تو یہ فریدہ بھی ہمیشہ بے وقت ہی فون کرتی ہے۔" وہ بٹن اور سوئی دھاگا لے کر اس کے سامنے آ بیٹھیں۔ "وہ بھی گھنٹہ گھنٹہ بھر کے لیے۔ اب بھلا بندہ پوچھے ایسی کون سی بات ہے جو پانچ منٹ میں نہیں ہو سکتی۔ خود تو تین تین بہوؤں کے ہوتے ہوئے ویلی بیٹھی رہتی ہے دوسرے بھی اسے اپنی طرح ہی لگتے ہیں نکمے بھر کے فارغ۔"

"امی پلیز! اب تو بتا دیں آپ نے میری بلیک شرٹ کہاں رکھی ہے۔" بے چینی سے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتے ہوئے اسے اچانک یاد آیا تو پوچھ بیٹھا۔

"وہ۔ اس کی تو میں نے صافیاں بنا لیں۔" امی نے خاصی بے نیازی سے جواب دیا تھا اور بلاول ان کے جواب پر اس بری طرح اچھلا کہ سوئی کف کے بجائے اس کی کلائی میں اتر گئی۔ "ستیاناس" منہ سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی۔

"ہائیں۔"

"بس بیٹھا رہ آرام سے۔ زیادہ ہچکیں نہ مار۔" امی کو لگا وہ غصے کا اظہار کر رہا ہے، سو جھڑکنا ضروری سمجھا۔

"لیکن۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟" صدمے کے مارے اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ گئی۔ وہ شرٹ اس نے کچھ دن پہلے ہی تو خریدی تھی اور تھی بھی کافی مہنگی۔

"میں نے تجھے کتنی بار کہا ہے کالا رنگ نہ پہنا کر تجھے نظر لگ جاتی ہے۔ مگر تو سنتا ہے کسی کی؟ بچپن میں جب تجھے کالے رنگ کا جوڑا پہناتی تھی تو دوسرے ہی دن تجھے بخار چڑھ جاتا تھا اور اس دن بھی تو نے یہی منحوس رنگ پہنا تھا جب تیرا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ میں نے سوچا اب تو تو باز نہیں آئے گا۔ اچھا ہے اس کے ٹکڑے کر دوں۔"

"امی! آپ نے ایک فضول سے وہم کے لیے میری شرٹ کا ستیاناس مار دیا۔" اس کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

"السلام علیکم خالہ!" ایک نرم نسوانی آواز نے اس

کے سوگ میں خلل ڈالا تھا۔ سب بے اختیار ہی چونک کر دروازے کی سمت دیکھنے لگے۔

"تعبیر! آج تو بڑے دنوں بعد چکر لگایا تو نے۔ ارے اندر آنا، دروازے میں کیوں کھڑی ہے۔"

اماں اسے دیکھ کر اتنی پرجوش ہو گئیں کہ اس کی آستین میں دھاگا سوئی سمیت ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس نے خود ہی دھاگا ایک جھٹکے سے توڑ کر تعبیر کی طرف دیکھا جو اب جھجکتے ہوئے اندر آ رہی تھی۔

سیاہ چادر اوڑھے سنہری رنگت اور خوابیدہ سنہری آنکھوں والی تعبیر کی شخصیت میں عجیب سا سحر تھا۔ اماں اس سے اس کی امی کی طبیعت پوچھنے لگی تھیں۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا، پھر باہر نکل آیا تھا۔

وہ ان کے گھر بہت کم آتی تھی۔ ایک تو وہ جاب کرتی تھی اس لیے بھی اور کچھ وہ رہتی بھی کافی الگ تھلگ تھی۔ آج اگر وہ خود سے آئی تھی تو یقیناً کسی وجہ سے ہی آئی تھی۔ وہ کچھ دیر تو سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر روحی کو خیالوں میں لے آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیسی ہو؟" وہ اس کے سامنے بیٹھی تو ہادی نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ خود تو سیاہ رنگ میں ہی ملبوس پایا تھا مگر روحی اس وقت سیاہ اور سرخ رنگ کے سوٹ میں کافی چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"ٹھیک ہی ہوں فی الحال۔" بے نیازی سے چیونگم چباتے ہوئے وہ اپنے نیل پالش کو جانچنا چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"فی الحال... مطلب؟" اس نے روحی کے الفاظ پر غور کیا تو چونک گیا۔

"امی میرے لیے رشتے دیکھ رہی ہیں دھڑا دھڑ۔" اس نے کچھ بیزاری سے اطلاع فراہم کی۔ خیال تھا یہ خبر ہادی کے دل و دماغ کو خاصا جھنجھوڑے گی۔

"دھڑا دھڑ؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "ہاں! ولوے یہ رشتے دیکھ رہی ہیں ہا سوئی چھل!" اس کا تجاہل اطمینان اس بات پر تھا ہادی کو شدید غصہ آیا۔

"ہادی! میں تم سے کیا کہہ رہی ہوں اور تم... سنو! اگر امی نے میرا رشتہ کہیں اور طے کر دیا نا تو پھر مجھ سے شکایت مت کرنا۔"

"ہاں تو میں بھی تو منع کر رہا ہوں نا اماں سے بات کرنے کی۔" وہ کچھ لاچارگی سے بولا۔

"تم میں تو اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ اپنی اماں کے سامنے میرا نام تک لے سکو۔ تم انہیں میرے لیے کنونس کیسے کرو گے۔ امی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ پھپھو مر جائیں گی مگر کبھی تمہیں اپنی بہو نہیں بنائیں گی۔"

"تم نے خالہ کو بتا دیا۔" ہادی تو یہ سن کر اچھل ہی پڑا۔

"بتاتی نہ تو اور کیا کرتی۔ وہ تو میری منگنی طے کیے بیٹھی تھیں۔ اب بھی انہوں نے مجھے ایک مہینے کا ٹائم دیا ہے۔ اگر اس ایک مہینے میں تم اپنی اماں کو لے کر ہمارے گھر نہیں آئے تو وہ میری شادی کہیں اور طے کر دیں گی اور میں کچھ نہیں بول سکوں گی، سمجھے تم؟"

وہ غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ ہادی بے چینی سے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

"دیکھو! میں مانتا ہوں۔ اماں اتنی آسانی سے نہیں مانیں گی مگر تمہیں بھی تو کچھ کوشش کرنی چاہیے نا میری مدد کرنے کی۔ میرا مطلب ہے تم ان کی بھانجی ہو تو تمہیں انہیں اس بات کا احساس دلانا چاہیے۔ بھابھی کے الگ ہونے کے بعد تم نے جھانکا بھی نہیں کبھی ہمارے گھر۔ اماں ناراض ضرور ہیں مگر ان کی یہ ناراضی بھابھی کے لیے ہے۔ اگر تم ان کا دل جیتنے کی کوشش نہیں کرو گی۔ انہیں یہ یقین دلاؤ گی نہیں تو کہ ان کی اور بھابھی کی اس لڑائی سے تمہارا کوئی لینا دینا نہیں ہے تو وہ تمہیں اپنی بہو بنانے پر کیسے رضامند ہوں گی۔"

"سوری ہادی! جس کا دل مجھے جیتنا تھا، میں جیت چکی۔" اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ تیزی سے بولی۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ میں نیک پروین بن کے

تمہاری اماں کے آگے پیچھے پھر کے ان کے خوشامد میں کر کے ان کا دل جیتیں گی تو تم غلطی پر ہو۔ مجھ سے یہ ڈھونگ نہیں ہو گا۔ تم خود انہیں منا سکتے ہو تو منا لو مگر مجھ سے کوئی توقع مت رکھنا۔"

رومی نے نہایت قطعیت سے اس پر واضح کیا۔ ہادی کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

"تو پھر تم مجھ سے یہ توقع کیسے رکھ سکتی ہو کہ میں اماں کو تمہارے لیے مناؤں گا۔" ہادی نے جتنے سرد انداز میں کہا تھا، رنگ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"میں جلد بازی نہیں ہوں رومی! اس لیے تم اس بھول میں مت رہنا کہ میں اماں کی مرضی کے خلاف کچھ کروں گا۔ تم ان کی خفگی دور کرنے کے لیے ان کے پاس نہیں جا سکتیں اور وہ تمہیں اپنی بہو بنانے کے لیے تمہارا رشتہ مانگنے چلی آئیں۔ کن خیالوں میں ہو تم۔" وہ استہزائیہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ رومی غصے سے کھولتی بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو ٹھیک ہے نہ آئیں وہ میرا رشتہ مانگنے۔ میں بھی کوئی مر نہیں رہی ہوں تم سے شادی کے لیے۔"

"رومی! یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔" اسی وقت کمرے میں چائے کے لوازمات کے ساتھ داخل ہوتی بھابھی نے اسے ٹوکا تھا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے ہادی! وہ ہماری خالہ ہیں۔ ہماری بزرگ ہیں۔ اگر تم ان کے پاس چلی جاؤ گی تو شان نہیں گھٹ جائے گی تمہاری۔"

ان کے لہجے میں ڈانٹ کا عنصر نمایاں تھا۔ ہادی کو اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا اور پھر اپنی آنکھوں پر۔ وہ یقیناً بھابھی ہی تھیں، جو اماں کو اپنی بزرگ قرار دیتے ہوئے اپنی بہن کو سرزنش کر رہی تھیں۔

"میری تو خیر وہ صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ نجانے کیا کیا بدگمانیاں پالے بیٹھی ہیں میرے لیے اور اس میں قصور ان کا بھی نہیں ہے یہ جو ہر وقت آگ لگانے والے رشتے دار وہ اپنے گرد اکٹھا کیے رہتی ہیں وہی زہر بھرتے رہتے ہیں ان کے دل میں میرے خلاف مگر تمہارا معاملہ الگ ہے۔ تم چلی جاؤ گی تو کم از کم ان کی یہ غلط فہمی تو دور ہو جائے گی کہ میں نے تم لوگوں کو ان سے تعلق توڑنے پر مجبور کیا ہے۔ میں نے تو جلد سے بھی کہہ دیا ہے صاف صاف کہ وہ اپنے سارے گلے شکوے بھول کر پہلی فرصت میں اماں سے مل آئیں۔ ورنہ وہ پھر مجھے ہی کوستی رہیں گی کہ میں نے ہی جادو ٹونا کروا کر جلد کا دل ان سے پھیرا ہے۔"

مسلسل بول رہی تھیں۔ ان کی اس تقریر پر رومی کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے الجھن سی ابھری تھی۔ شاید وہ بھی بہن کی اس کایا پلٹ پر حیران تھی۔ ہادی کے لیے تو آج یہ ایک حیرتوں بھرا دن تھا۔ سب سے پہلے تو بھابھی نے جس پرجوش انداز میں اس کا استقبال کیا تھا، وہ بھی اس کے لیے کچھ کم حیران کن نہیں تھا۔ اس سے پہلے وہ جتنی بار بھی آیا تھا، ان کی بیزاری اور چڑچڑاہٹ ہی دیکھنے کو ملی تھی، جو اب ان کے مزاج کا لازمی حصہ بنتی جا رہی تھی اور اس وقت بھی گو کہ اماں کے لیے ان کے لہجے میں کچھ زیادہ خوشگواریت نہیں تھی، مگر پھر بھی پہلے کی نسبت یہ ایک کافی بڑی تبدیلی تھی کہ انہوں نے براہ راست اماں کو کچھ کہنے کے بجائے اپنی صفائی پیش کی تھی۔

"آپ کا مطلب ہے میں چلی جاؤں اور جو انہوں نے آپ کی تمام تر بھڑاس مجھ پر نکال دی تو؟" رومی نے پیالہ اور کپ رکھتے ہوئے ہچکچا کر سوال کیا تھا۔

"ایسا نہیں ہو گا یقین کرو۔" ہادی پرجوش ہو کر بول اٹھا۔ بھابھی کی تقریر نے کچھ اثر تو کر ہی دیا تھا۔

"اماں غصے کی تیز ضرور ہیں مگر دل کی بہت کھری ہیں۔ وہ کوئی بات زیادہ دیر دل میں نہیں رکھتیں۔ تمہیں دیکھ کر وہ اتنی خوش ہوں گی کہ انہیں اپنی ناراضی یاد ہی نہیں رہے گی۔"

"ٹھیک ہے دیکھتی ہوں۔" اس نے بادل نخواستہ سر ہلایا۔

"دیکھتی ہوں کا کیا مطلب ہوتا ہے رومی! ایسا کرو تم آج ہی ہادی کے ساتھ چلی جاؤ۔" بھابھی نے کہا تو ہادی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"ارے نہیں۔۔۔ میرے ساتھ نہیں!" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بھابھی تو اسے منوانے کا پلان بنائے بیٹھی تھیں۔

"تم اس طرح میرے ساتھ جاؤ گی تو پتا نہیں وہ کیا سوچیں۔" اس نے یہ نہیں کہا کہ پتا نہیں وہ کیا کر بیٹھیں۔ حالانکہ اسے یہی کہنا چاہیے تھا۔

"اتنا ڈرتے ہو ان سے۔" بھابھی نے طنزاً کہا تھا۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"ہاں۔۔۔ میں ان سے اتنا ہی ڈرتا ہوں اور میں انہیں اپنی طرف سے کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کا لہجہ بہت کچھ جتانے والا تھا۔ بھابھی کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"ارے ہادی! تم چائے تو لو۔ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔"

رومی نے موضوع بدلنے کے لیے اس کا دھیان بٹایا تھا۔ وہ بھی اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ بھابھی نے آج چائے کے ساتھ کافی اہتمام کیا تھا اور اس کی وجہ سمجھنے کے باوجود وہ اس وقت یہ الجھن ذہن سے جھٹک کر ان لوازمات سے انصاف کرنے لگا۔ بھابھی اگر آج خاطریں کرنے کے موڈ میں تھیں تو وہ بھی یہ موقع چھوڑنے والا نہیں تھا۔

٭ ٭ ٭

"تعبیر تم اور گئی تھیں؟" وہ پہر کے کھانے کے بعد جب وہ چائے بنا کر امی کے سامنے بیٹھی تو انہوں نے پوچھ لیا۔ وہ کچھ چونکی پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"جی امی! میں نے سوچا آج جب آفس سے چھٹی لیا ہے تو میں خود ہی انہیں جا کر کرایہ دے آؤں۔ اچھا ہے کرائے ہی ہیں ہر مہینے میں کچھ بچت ہو جائے گی، بجٹ بن گیا۔۔۔ کہاں کے ہیں وہ۔۔۔ وہ اپنے منہ سے کہیں گی تو۔" چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"کیسی تھیں ہادی کی امی۔۔۔"

"ٹھیک تھیں اور آپ کی طبیعت پوچھ رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ وہ تو روز آئیں آپ سے ملنے۔ مگر ان کے بیٹے انہیں اتنا مصروف رکھتے ہیں کہ انہیں کہیں آنے جانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔"

انہیں بتاتے ہوئے اس کی نظر اچانک ہی سائیڈ ٹیبل پر پڑے اس میرون اور گولڈن کلر کے کارڈ پر پڑی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا۔

"بہت ہی سادہ اور بھلی عورت ہے۔" امی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی مگر تعبیر انہیں دیکھنے کے بجائے کارڈ کے اندر لکھے مندرجات پڑھ رہی تھی۔

"یہ کل نعیمہ بھابھی دے گئی تھیں اور آنے کے لیے۔۔۔ اصرار بھی کیا ہے۔"

امی نے اس کے ہاتھ میں کارڈ دیکھا تو اس کے چہرے پر تاسف کی ہلکی سی پرچھائیں کوئی زیاں کا تاثر کھوجنا چاہا مگر اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔

"تو تعبیر! ہمارے تعلق کا خیال آ ہی گیا انہیں۔" کارڈ واپس اپنی جگہ پر رکھتے اس کا لہجہ بالکل نارمل تھا۔

"آپ کو جانا ہو تو بتا دیجئے گا، میں آپ کے کپڑے نکال دوں گی۔" کارڈ میں تاریخ اسی ہفتے کی درج تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے مجھے جانا چاہیے؟" پتا نہیں انہوں نے اس سے مشورہ طلب کیا تھا یا پھر اس کی رائے۔

"کیا فرق پڑتا ہے میں چاہوں نہ چاہوں آپ اس خاندان سے تعلق نہیں توڑنا چاہتیں اور نہ توڑ سکتی ہیں تو آپ ہی ڈیسائڈ کیجئے کہ آپ کو جانا چاہیے یا نہیں۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ رشتہ دار کیسے بھی کیوں نہ ہوں، ان سے کٹ کر نہیں رہا جا سکتا۔" امی نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"اگر تم دونوں کے مستقبل کی فکر نہ ہوتی تو میں۔۔۔"

"ہمارے مستقبل کی فکر۔۔۔" تعبیر ان کی بات کاٹے بغیر نہ رہ سکی۔

"آپ ان خود غرض لوگوں سے جڑے رہنا چاہتی ہیں کیونکہ آپ کو ہمارے مستقبل کی فکر ہے؟ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی آپ ان سے امید رکھ رہی ہیں امی؟"

وہ تلخی سے کہہ رہی تھی۔

"تمہاری پھپھو معیز کے لیے اشاروں کنایوں میں سونا کا کہہ چکی ہیں۔" نظریں چراتے ہوئے ان کا لہجہ پست تھا۔ یہ مجبوری بھی انسان کو کتنا بے بس کر دیتی ہے اس کا احساس انہیں آج ہوا تھا۔

"اشاروں میں کیا ہے۔ اگر رشتہ تو نہیں مانگا۔ بلکہ جنہوں نے رشتہ مانگا تھا انہوں نے کون سا بوجھ چکا کر دیا آپ کا۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا وہی سونا کے ساتھ ہو کیا چاہتی ہیں آپ؟"

وہ اتنی تلخ نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن وہ جو اس نے ابھی تک بھی مکمل کر لیں سے اس موضوع پر بات کی تھی مگر آج ان کے خیالات جان کر اسے جو دھچکا لگا تھا۔ وہ ضبط نہیں کر پائی۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ امی ایسی تھیں تو نہیں تھیں پھر اب وہ کیوں اتنی کمزوری کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

"خدا نہ کرے تعبیر! کیسی باتیں کر رہی ہو۔" وہ دہل گئیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ خدا کے لیے امی! انسانوں سے آس لگانا چھوڑ دیں۔" ملتجیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے اس کا لہجہ دھیما ہوا۔

"اللہ پر بھروسا رکھیں۔ آپ تو ہر حال میں اللہ پر توکل کرنے والوں میں سے تھیں۔ پھر اب یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ کیوں اپنے ہی پڑھائے ہوئے سبق بھول رہی ہیں کہ نصیب اللہ جوڑتا ہے انسان نہیں۔"

ان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ ان کا چہرہ دھندلا ہوتا نظر آیا۔

"سوری امی! مگر ایک بات میں آپ پر واضح کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔ اسی لیے آپ میری فکر چھوڑ دیں اور سونا ابھی چھوٹی ہے۔ اس کی عمر اتنی زیادہ بھی نہیں ہوئی کہ آپ کو اتنا پریشان ہونے کی ضرورت ہو۔" وہ چہرے سے کہتے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا... کیا باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ۔" سونا ابھی ابھی برتن دھو کر نکلی تھی۔ وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ناسمجھی کے عالم میں دونوں کے چہرے دیکھنے لگی۔

"ولید کی شادی میں کس نے جانا ہے؟ وہی ڈسکس کر رہے تھے۔" تعبیر نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"کیا... آپ لوگ شادی میں جانے کا سوچ رہے ہیں؟" سونا کی بلند آواز میں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی۔

"کیوں... آپ کے ذہن میں یہ خیال آیا بھی کیسے؟"

"زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے سونا! کوئی نہیں جا رہا ہے یہاں سے۔" کنپٹیاں دباتے ہوئے امی نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔

"تو پھر یہ تعبیر کیوں کہہ رہی ہے کہ..." وہ کہتے کہتے رک کر اسے گھورنے لگی۔

"لگتا ہے تمہارا وہاں جانے کا بڑا دل ہو رہا ہے۔" تعبیر اس کی بات نظرانداز کر کے امی سے مخاطب ہوئی۔

"پلیز امی... میں نے آپ سے یہ نہیں کہا کہ آپ مت جایئے۔ میں تو بس آپ سے اتنا چاہتی ہوں کہ آپ بلاوجہ خود کو بہلاوے مت دیں۔ ان سے ایسی کوئی امید مت رکھیں جس سے آپ کا ہی دل دکھے۔ آپ پھپھو کی بات کر رہی ہیں۔ جب سے ہم یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ انہوں نے تو یہاں قدم بھی نہیں رکھا... نجانے کب اور کس موڈ میں انہوں نے آپ سے کچھ کہہ دیا اور آپ ہیں کہ اسے دل سے لگا بیٹھی ہیں۔ ان سے ملیں گی تو انہیں یاد بھی نہیں ہو گا کہ انہوں نے ایسی کوئی بات کی بھی تھی... میں پھر کہہ رہی ہوں۔ آپ نے جانا ہو تو مجھے بتا دیجیے گا۔ مجھے آپ کے وہاں جانے سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

وہ اپنی بات ختم کر کے مزید ان کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئی تھی۔ پیچھے سونا جو اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش میں ہونق سی بنی کھڑی تھی اب امی کے پاس آ کر ان کے کان کھانے لگی تھی۔

٭ ٭ ٭

"ہاں زین! بھابھیاں کیسی ہیں تیری۔"

وہ اس کے سامنے بیٹھی تھیں۔ زین کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔ اسے بابری کے ساتھ بینک جانا تھا۔ بابری کو بل جمع کروانے تھے اور اسے اپنا ایک چیک کیش کروانا تھا اور اس مشقت کے بعد لنچ کا وعدہ بابری کی طرف سے تھا۔ اس وقت وہ بابری کی امی کے دیے ہوئے گاجر کے حلوے سے انصاف کر رہا تھا کہ ان کے اس سوال پر منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

"اف خالہ! کیا پوچھ لیا آپ نے۔" اس نے کچھ اس انداز میں کہا کہ وہ فوراً گھبرا اٹھیں۔

"ہائے اللہ خیر کرے کیا پھر کسی کی طبیعت خراب ہو گئی... ابھی پچھلے ہی دنوں تو بھابھی کا آپریشن ہوا تھا وہ کیا کہتے ہیں بلاسسہ سیزرو۔" سلو موشن خالہ نا سمجھی کے عالم میں اس لفظ میں ہی الجھ گئی تھیں۔ ادھر زین بے تحاشا جھینپ گیا۔

"نہیں خالہ! سب ٹھیک ہی ہیں۔" اس نے جلدی سے انہیں اس الجھن سے نکالا۔ "میرے کہنے کا مطلب تھا کہ انہیں اتنی جلدی کچھ نہیں ہو سکتا۔ چچا جان کی اولادوں میں سے ہیں سب کی سب۔" چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس کے لہجے میں تلخی گھلی تھی۔

"چل تو یہ بتا تو نوکری کیوں نہیں کر لیتا۔" انہوں نے ایک نیا موضوع چھیڑا۔ زین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"تیری ان کمینی کم ظرف بھابھیوں کا منہ بھی بند ہو جائے گا اور میں بابری کے ساتھ ساتھ تیرے لیے بھی لڑکی دیکھ لوں گی۔"

بابری ہی تو ہمیشہ "ان" سے ذکر کرتا رہتا تھا۔ اس لیے انہیں اندازہ تھا زین کی مشکلات کا۔

"میری فراغت تو صرف ایک بہانہ ہے۔ نوکری مل جائے گی تو وہ کسی نئی بات کو ایشو بنا لیں گی اور کفن پھاڑ کر رولیں گی... مجھے ان کی عادتوں کا پتا ہے خالہ! آپ ٹینشن نہ لیں اور میں بھی ان کے سامنے کوئی بیبا بچہ نہیں بیٹھا رہتا۔ ایک کے بدلے دس سناتا ہوں۔ اب تو وہ میری زبان درازی خاندان بھر میں مشہور کر چکی ہیں لیکن میں کوئی لڑکی تو ہوں نہیں کہ رشتہ نہ آنے کی فکر ہو سو کوئی پروا بھی نہیں۔"

وہ اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں کہتا انہیں مطمئن کر رہا تھا کہ کہیں وہ اسے بالکل ہی بھابھیوں کے رحم و کرم پر رہنے والا کوئی مظلوم و یتیم بچہ ہی نہ سمجھ لیں۔

وہ چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور اپنے امیر باپ کا سب سے لاڈلا بیٹا تھا مگر تب تک جب تک وہ زندہ تھے۔ ماں اس کے بچپن میں ہی گزر گئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دیگر بھائیوں کی نسبت اپنے والد سے زیادہ قریب تھا۔ اب تو خیر حالات ہی اور تھے مگر بھابھیوں نے کبھی ان کی زندگی میں بھی زین کا لحاظ نہیں رکھا تھا اور اب تو ایک مضبوط وجہ بھی تھی ان کے پاس اس سے خار کھانے کی کہ شہر کی معروف ترین مارکیٹ میں ان کی چار چلتی ہوئی دکانوں میں سے بھی وہ حصے دار تھا اور اسی علاقے میں وہ رہائشی بلڈنگ سے آنے والے کرایوں میں بھی۔

زین کے والد حصے بخرے کر کے نہیں مرے تھے۔ ورنہ اس کے دوسرے بھائی کب کے اس بڑے سے گھر کو بیچ کر اپنے الگ الگ گھروں اور بنگلوں میں شفٹ ہو چکے ہوتے۔ اب اس جائیداد کے حصے ہوتے تو ایک بڑا حصہ زین کے قبضے میں چلا جاتا جس کا نہ کوئی کام تھا نہ کوئی دھندہ۔ ہر مہینے اسے اتنی معقول رقم مل جاتی کہ وہ اپنی شاہ خرچیاں پوری کر لیتا۔ جبکہ دوسرے بھائی دکانداری کرتے ہوئے خوار ہو رہے تھے۔ اسے چونکہ اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی سارا دن سودے بازی کرنے والے گاہکوں کے ساتھ مغز ماری کرنے کا شوق تھا سو پہلے اطمینان سے اپنی پڑھائی مکمل کی اور اب اپنے مطلب اور اپنے معیار کی نوکری کی تلاش میں وقت گزار رہا تھا۔ اسی لیے بھابھیوں کو تو غصہ آتا ہی تھا کہ محنت ان کے شوہر کرتے اور ہر مہینے

ایک موٹی رقم اس شہزادے کی جیب میں چلی جاتی۔ سو وہ اس کے منہ پر ہی اسے مفت خورا، طفیلا وغیرہ جانے کیا کیا کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتی رہتیں۔

"چل بچو! اٹھ اب نکلنے کی کر۔" فریش اور نکھرے نکھرے ہادی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ زین نے پہلے تو سر سے لے کر پیر تک اس کا جائزہ لیا پھر معنی خیز انداز میں سر ہلایا تھا۔

"یاد رہے تو بینک جا رہا ہے، روحی سے ملنے نہیں۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے۔" ہادی نے فوراً اسے ٹوکا، کیونکہ ان کو دیکھا جو چائے کے برتن سمیٹ رہی تھیں۔ ہادی کی قسمت اچھی تھی کہ یہ بات ان کی سماعتوں تک رسائی حاصل نہیں کر پائی۔ زین ہنسنے لگا۔

"یار! تو تو اس لڑکی کی طرح گھبرا رہا ہے جو ماں سے چھپ کر ڈیٹ پر جا رہی ہو۔"

"چل ہٹ، بکواس باہر نکل پھر میں تجھے بتاتا ہوں۔" ہادی نے بمشکل اپنا غصہ دبایا۔ زین نظر انداز کر کے خالہ سے کہنے لگا۔

"خالہ! میری تو نوکری کا مسئلہ ہے۔ مگر ہادی کے لیے تو آپ لڑکی دیکھ ہی لیجیے۔ برسرروزگار ہے میرا یار، اچھا خاصا ہٹا کٹا مسٹنڈا ہے۔ کہیں ہاتھ سے ہی نہ نکل جائے۔"

اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے آخری جملہ وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ ہادی کا چہرہ سرخ پڑنے لگا غصے اور ضبط کے باعث۔

"ہادی کے لیے تو میں لڑکی دیکھ چکی ہوں۔ بس اب تو جلدی سے نوکری تلاش کر لے تو پھر تم دونوں کی منگنی ایک ساتھ ہی کرواؤں گی۔" امی نے مسکراتے ہوئے پرعزم لہجے میں کہا۔ ہادی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور زین کی آنکھوں میں اندھی سی چمک آگئی۔

"تو پھر وعدہ رہا خالہ! میرے لیے بھی لڑکی آپ ہی دیکھیں گی ویسے بھی اپنی امی جان کی پسند پر مجھے کچھ زیادہ بھروسا نہیں۔" وہاں سے وہ اٹھنے لگا تھا۔

"ارے پاگل۔۔۔ میرے لیے تم کوئی ہادی سے کم تھوڑا ہی ہو۔ میں تو جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں، تمہیں کے بجائے چاروں بیٹوں کے لیے دعا کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر خالہ!" زین کے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"یار! یہ خالہ کیا کہہ رہی تھیں۔" سیڑھیاں اترتے ہوئے ہادی نے ہراساں لہجے میں کہا تھا۔

"یہی کہ تیرے سہرے کے پھول کھلنے والے ہیں اور کسی بیچاری سی لڑکی کی قسمت پھوٹنے والی ہے۔ لیکن میں خدا سے یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ جو کوئی بھی ہو، بس روحی نہ ہو۔" زین نے یہ بات کرتے ہوئے اس کی طرف نہیں دیکھا ورنہ جان جاتا کہ ہادی اسے گھور رہا ہے۔

"تو۔۔۔ تو دوستی کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔"

"اور مجھے اس پر فخر ہے۔ آج کل تو داغوں کو اچھا ثابت کرنے کے لیے لاکھوں روپے کی ایڈورٹائزمنٹ کی جا رہی ہے۔" زین نے بے فکری سے بات اڑائی۔

"مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ تجھے روحی سے اتنا شدید بیر کیوں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تو نے اس پر لائن ماری ہو اور اس نے تجھے لفٹ نہ کروائی ہو۔" ہادی نے پرسوچ انداز میں کہتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ زین ہنس پڑا۔

"تیرے دوست کی وجاہت پر آج تک بہت سی لڑکیاں قربان ہوئی ہیں۔ مگر جسے میں دل دوں گا۔۔ وہ صرف ایک ہی ہو گی اور میں اسے اپنا کر دم لوں گا۔ چاہے وہ مجھے لفٹ کروائے یا نہ کروائے۔ سمجھے؟"

زین نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا سونا کی آواز گونجی تھی۔

"ہادی بھیا!" وہ شاید دروازے کے پاس ہی ٹہل رہی تھی۔ جب ہی تو جوتوں کی آواز سن کر فوراً ہی دروازہ کھول کر جھانکا تھا مگر ہادی کے ساتھ کھڑے زین کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ زین کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ زین کی آنکھوں میں بے اختیاری تھی اور

سونا کی آنکھوں میں حیرت۔

"ہاں سونا! کچھ کام تھا؟" ہادی پوچھنے لگا۔

"سونا۔" زین چونکا۔ "اس کا نام تو چاندی ہونا چاہیے تھا یا پھر۔۔۔ چاندنی۔" اجلے روپ اور چاندی کی رنگت والی اس لڑکی کو دیکھ کر وہ سوچے بنا نہ رہ سکا۔

"کیا صفی گھر پر ہے؟ اصل میں کچھ منگوانا ہے تو۔" وہ جھجکتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔

"نہیں وہ تو گھر پر نہیں ہے لیکن تم فکر مت کرو وہ جہاں کہیں بھی ہے میں اسے فون کر کے آنے کے لیے کہہ دوں گا۔" ہادی نے اسے تسلی دی۔

"شکریہ۔" وہ مسکرائی، پھر ایک آخری نظر دونوں پر ڈالی۔ الجھی ہوئی شیو اور ماتھے پر بکھرے بالوں سے وہ اسے کافی لاپروا نوجوان لگا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اسی پر جمی تھیں۔

"بدتمیز۔" دل ہی دل میں اسے لقب دیتی وہ کافی زور سے دروازہ بند کر چکی تھی اور زین کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے روحی کے لیے اچھا سا گفٹ لینا ہے۔" بینک سے نکلتے ہی ہادی نے اسے اپنا اگلا پروگرام بتایا۔ یہ سنتے ہی زین یوں اچھلا کہ پارکنگ ایریا سے نکلنے والی بائیک سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"او بھائی! آنکھیں کیا گھر پر ہی چھوڑ آئے ہو۔" بائیک سوار نے اسے کافی خونخوار نگاہوں سے گھورا تھا۔ زین خون کے گھونٹ پی کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"کیا بولے ابھی تم۔۔۔؟"

"مجھے طارق روڈ لے چلو۔" ہادی اس کے ساتھ اس کی بائیک پر آیا تھا اس لیے یہ نئی فرمائش بلکہ آزمائش اسے کافی ناگوار لگی تھی۔

"جہنم نہ لے چلوں؟" اس نے دانت پیسے۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس سے پہلے میں روحی کے لیے گفٹ ضرور لوں گا۔ بھئی اس کے پاس میری کوئی آخری نشانی بھی تو ہونی چاہیے۔" ہادی نے مسکراتے ہوئے اس کا مزید جی جلایا۔

"قسم سے کسی عورت کو اپنی سوکن سے بھی نہیں ہو گی۔ جتنی مجھے اس روحی سے ہے۔ خدا کی قسم۔"

زین واقعی بیزار ہو گیا تھا۔ پھر ہادی نے محض ایک گفٹ کی خاطر پورے دو گھنٹے اسے اپنے ساتھ خوار کروایا تھا اور آخر میں زین کے ہاتھ پیر جوڑنے پر اس نے ایک جیولر شاپ سے روحی کے لیے بے حد خوبصورت چاندی کے کنگن خرید لیے تھے۔

"جب تجھے آخر کار یہیں آنا تھا تو اتنی دیر بوتیکس اور کاسمیٹکس شاپ میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت تھی۔" زین نے تھک کر سوال کیا تھا۔

"اصل میں، میں نے سوچا میں اس کے لیے کچھ ایسا گفٹ لوں۔ جسے وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھے اور جو کبھی پرانا نہ ہو۔ سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہہ رہا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ زین کچھ خاموش سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو؟" اس نے یہ سوال کیوں کیا تھا وہ خود بھی نہ سمجھ سکا۔ ہادی چونک گیا۔

"تو تمہیں کیا لگتا ہے میں فلرٹ کر رہا ہوں؟"

"نہیں۔۔۔ ٹھیک ہے۔" خلاف توقع اس نے بحث کرنے کے بجائے بات ختم کر دی۔ ہادی الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تعبیر! میں اوپر جا رہی ہوں۔" وہ کچن میں اسے یہ بتانے آئی تھی۔ وہ شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی بور ہو رہی تھی۔" اس نے کچھ اس طرح منہ بنا کر کہا کہ تعبیر کو ہنسی آگئی۔

"تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے اوپر تمہاری کوئی بہت

ہی کیوں سیکی بیٹھی ہو تم سے گپ شپ لڑانے کے لیے ہے۔"

"ہاں تو ہے۔ سکینہ آنٹی اچھی مزے کی باتیں کرتی ہیں اور پھر صفی بھی تو ہو گا۔ میں جا رہی ہوں۔" وہ عجلت میں کہہ کے باہر نکل گئی۔

عجلت میں اوپر آ کر اسے احساس ہوا کہ وہ کافی غلط وقت پر آ گئی تھی۔ لاؤنج میں سامنے والے صوفے پر آنٹی سے جڑ کر بیٹھی ان کے شانے پر سر رکھے یہ خوب صورت سی لڑکی گلوگیر لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی اور خود ان کے آنسو بھی ایک تواتر سے بہتے چلے جا رہے تھے۔ اس نے ذرا سا نگاہوں کا زاویہ بدلا تو صفی بھی نظر آ گیا جو چہرے پر دنیا جہاں کی بیزاری سجائے شاید اس جذباتی سین کے ختم ہونے کے انتظار میں تھا۔ اس پر نظر پڑی تو فوراً اسے مسکرا کر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ جھجکتے ہوئے اندر چلی آئی۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" ان دونوں کی توجہ اس کی جانب قطعی نہیں تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں صفی سے پوچھا۔

"چڑیل... میری کزن۔" اس نے ایک سرد آہ بھر کر بتایا تھا اور سونا مشکوک نگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔

"جھوٹ بول رہے ہو، تمہاری کزن ہے تو پہلے کیوں نہیں آئی۔"

"یہ سوال میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ ان خالہ بھانجی کا ملاپ پورا ہونے دیں پھر ضرور ان سے پوچھوں گا۔" صفی نے اب بھی صحیح جواب نہیں دیا۔ وہ جب کسی کو کچھ کہنے کے بجائے سامنے دیکھنے لگی۔

"آپ کی ناراضی تو امی اور ابو سے تھی ناں خالہ! پھر ہمارا کیا قصور تھا کہ آپ نے ہمیں بھی دل سے نکال دیا۔ آپ کو کبھی امی اس بھانجی کی یاد نہیں آئی۔ آپ جانتی ہیں کتنا پیار کرتی تھیں امی آپ سے۔ میرا کتنا دل کرتا تھا آپ سے ملنے کے لیے لیکن ہر بار میں یہاں آتے آتے رہ جاتی تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں ابو پر کیا غصہ آپ مجھ پر نہ نکال دیں۔"

وہ ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی اور ان کا دل اتنے عرصے بعد اپنی اس پیاری سی بھانجی کو دیکھ کر پگھل کر بہنے کو تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر اسے سینے سے لگا لیا۔

"افوہ اماں! اب بس بھی کریں اور کچھ نہیں تو روحی آپی کو چائے کا ہی پوچھ لیں اور یہ دیکھیں، سونا آپی بھی آئی بیٹھی ہیں۔"

صفی بالآخر بول ہی پڑا اور انہوں نے جیسے پہلی بار چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"ارے سونا... تم کب آئیں؟"

"بس کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔" سونا نے مسکرا کر بتایا۔

"روحی آپی! یہ ہماری سونا آپی ہیں اور یہیں رہتی ہیں۔" صفی نے اس لڑکی سے اس کا تعارف کرایا تھا جواب عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم لوگ بیٹھ کر باتیں کرو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" اماں یہ کہہ کر اٹھنے لگیں۔

"میں آپ کی مدد کروں آنٹی؟" سونا نے جلدی سے پوچھا تھا۔

"نہیں، نہیں تم روحی سے باتیں کرو۔ یہ میری بھانجی ہے بہت دنوں بعد آئی ہے مجھ سے ملنے کے لیے۔" انہوں نے کہا پھر روحی سے مخاطب ہو گئیں۔

"اور تو بھی سن لے روحی! میں تجھے رات کا کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ تو گھر فون کر کے بتا دے۔"

"لیکن خالہ! دیر ہو جائے گی تو میں گھر کیسے جاؤں گی۔" روحی نے گھبرا کر استفسار کیا تھا۔

"تو کیا ہوا! ہادی چھوڑ آئے گا۔ بس میں نے کہہ دیا۔ تو اب کہیں نہیں جا رہی۔ بیٹھی رہو آرام سے۔" وہ اپنا حکم سنا کر کچن کی جانب بڑھ گئیں۔ روحی نے بمشکل چہرے پر در آنے والی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

"کیا کرتی ہیں آپ؟" وہ سونا کی جانب متوجہ ہوئی جو خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

"کچھ خاص نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"پڑھتی نہیں ہیں آپ؟" روحی کو اس کے جواب پر حیرت ہوئی۔

"میں گریجویشن کر چکی ہوں اور اب گھر پر ہی ہوتی ہوں۔" اب کے سونا نے تفصیلاً بتایا۔

"اوہ!" اس نے بے اختیار سر ہلایا۔ وہ دیکھنے میں اتنی کم سن لگ رہی تھی کہ روحی کو لگا وہ ابھی میٹرک یا انٹر کی اسٹوڈنٹ ہوگی مگر اس کے گریجویشن کر چکنے کی خبر نے اس کے بے چین اعصاب کو تسلی آمیز تھپکی دی تھی۔

"جب یہ اتنی بھی بچی نہیں ہے جتنی شکل سے نظر آتی ہے مجھ سے یقیناً بڑی ہوگی۔" اس نے یہ نہیں سوچا کہ ہر کوئی اس کی طرح ایک ہی کلاس میں دو دو سال نہیں لگاتا۔

"آپ کیا کرتی ہیں؟" سونا کو اس میں کافی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تھی بھی کافی خوب صورت سی۔

"میں ابھی گریجویشن کر رہی ہوں۔" اس نے قدرے بے نیازی سے بتایا۔

"پچھلے تین سال سے۔" صفی نے لقمہ دیا تھا۔ سونا نے حیرت سے روحی کو دیکھا، جو غصے سے صفی کو گھورنے لگی تھی۔

"تم ابھی تک ویسے ہی بدلحاظ ہو صفی!"

"نہیں، اب اس سے زیادہ ہوں۔" وہ شرارت سے بولا تھا۔

"بتانے کی ضرورت نہیں ہے، پتا چل رہا ہے۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔

ہادی، زین کے ہمراہ آیا تھا۔ روحی، سونا کو اپنے مشاغل کے بارے میں بتا رہی تھی اور سونا ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سنتے ہوئے چائے کے برتن سمیٹنے میں لگی تھی۔

"زہے نصیب... آج یہ ہمارے گھر کے بھاگ کیسے جاگ گئے۔" وہ اسے دیکھ کر کھل گیا تھا۔ اماں اس وقت کچن میں تھیں سو اس نے اپنی خوشی ظاہر کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

زین خاموشی سے سونا کو دیکھ رہا تھا جو برتن لے کر کچن کی سمت بڑھ گئی تھی۔ روحی کی بے ساختہ آمد اس کے لیے حیران کن نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا یہ بھی پارٹی کے کسی پلان کا ہی حصہ ہو گا۔

"میں تو کافی دیر سے آئی بیٹھی ہوں اور اب خالہ نے روک لیا ہے۔ کہہ رہی ہیں رات کا کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیں گی اور... تم ہی مجھے گھر چھوڑ کر آؤ گے۔"

وہ فاتحانہ لہجے میں بتا رہی تھی۔ اس کی بات کی سنی ان سنی پر ہادی مسکرا کر رہ گیا تھا۔ اسی پل زین کا سیل بجا تو وہ فون سننے کے لیے سائیڈ پہ گیا مگر سونا کو جاتے دیکھ کر جلدی سے فون بند کر کے اس کی جانب چلا آیا۔ شیفون کے سفید سوٹ میں سنہری بال شانوں پر بکھرائے وہ چاندنی کا دوسرا روپ لگ رہی تھی۔

"ہیلو مس چاندنی! آپ..." گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے زین نے کہا۔ سونا نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیق چاہ رہی تھی۔

زین کو اپنا سب کچھ ہاتھ سے نکلتا محسوس ہوا۔

"آپ کو اپنے ارد گرد کوئی دوسرا چاند نظر آ رہا ہے؟"

اس کے خوب صورت چہرے پر یک دم ہی ناگواری پھیلی تھی۔ وہ سرعت سے سمٹ کر وہ تند لہجے میں بولی تھی۔

"میرا نام چاندنی نہیں ہے اور آپ بہت بدتمیز ہیں۔"

"کیا ان دونوں باتوں کا آپس میں کوئی تعلق ہے؟"

وہ غصے میں اب اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ زین کے لیے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹانا مشکل ہو گیا تھا۔ سونا کو غصہ آنے لگا۔ یہ دوسری بار تھا کہ وہ اس کی نظروں سے نروس ہونے لگی تھی۔

"ہٹیے سامنے سے، مجھے جانا ہے۔"

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔ میں آپ کو چاندنی کہہ کر پکاروں گا تو آپ برا تو نہیں مانیں گی؟"

وہ جنونی اس کے سامنے جما کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر تو

ہونٹ کاٹتی رہی۔ پھر بنا کوئی جواب دیے اس کی سائیڈ سے ہو کر کافی تیزی سے دروازہ پار کر گئی۔ زین کے منہ سے بے اختیار ایک گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ آئیے آکر چائے پی لیجیے اور یہ سوتا آپی کہاں گئیں۔" صفی جو اسے بلانے گیا تھا حیرت سے دریافت کرنے لگا۔

"چلی گئیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"کمال ہے وہ بنا چائے پیے تو نہیں جاتیں۔" صفی حیرت سے بڑبڑایا تھا اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کبھی بتایا نہیں ہادی! کہ تمہاری ایک اتنی خوب صورت پڑوسن بھی ہے۔"

روی فون پر اس سے بہت چبھتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

ویسے تو وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر جانے سے پہلے اماں نے اسے علیحدگی میں بلا کر خاص طور پر اس بات کی تاکید کی تھی کہ اس نے فرحت کے گھر قدم بھی نہیں رکھنا اور روی کو چھوڑ کر باہر سے ہی واپس آجانا ہے۔ اس نے اماں کی اس تاکید پر من و عن عمل کیا تھا۔ روی کے شدید ترین اصرار کے باوجود کیونکہ ہادی کو کچھ عرصہ پہلے کی اماں کی ناراضی اچھی طرح یاد تھی۔ وہ دوبارہ انہیں خفا کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

"اگر میں تمہارے سامنے اپنی خوب صورت پڑوسن کی خوب صورتی کا ذکر کرتا تو تم میری جان نہ لے لیتیں۔" ہادی نے ہنس کر کہا تھا۔ "ویسے ڈونٹ وری۔ وہ میرے لیے بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح ہے۔"

"یہ تو ہر لڑکا کہتا ہے۔" اسے تسلی نہیں ہوئی۔ جب سے اس نے سوتا کو دیکھا تھا۔ عجیب سی جلن ہونے لگی تھی۔

اور کتنی بے تکلفی تھی اس لڑکی کے انداز میں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسی کا گھر ہو۔ اس سے زیادہ تو میں

اپنے آپ کو غیر محسوس کر رہی تھی وہاں۔"

"اوہو روی! تم چھوڑو بھی یہ ٹاپک۔" وہ بیزار ہوا تھا۔ مگر روی جب ایک بات کا پیچھا کرنے لگتی تو پھر چھوڑتی نہیں تھی۔

"ہاں تم تو یہی کہو گے، چھوڑو۔ لیکن مجھ سے پوچھو کیا کیا وہم ستانے لگے ہیں مجھے۔ بے شک تم اتنا مگر تم ہو ذات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا کب ایک سے دل اٹھا کر دوسری پر آجائے۔ وہ بھی تب جب کوئی صبح و شام نظروں کے سامنے ہی رہتی ہو۔"

"اچھا۔ تو تم مجھ سے کیا سننا چاہتی ہو؟" وہ چڑ گیا ہوا۔

"فی الحال تو کچھ نہیں۔" اس نے فوراً ہی لہجہ بدلا۔

"یہ تم نے خالہ سے بات کی؟"

"ہادی!" اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، اماں دروازے میں آکھڑی ہوئی تھیں۔

وہ چونکا۔ "جی اماں۔"

"بات کرنی ہے تجھ سے کیا کر رہا ہے۔" اماں اندر داخل ہو گئی تھیں۔ اس نے ایک نظر سیل کو دیکھا پھر سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب۔

"کچھ نہیں۔ آپ کہیں کیا کہنا ہے؟"

"تو بیٹھ جا پہلے ایسی نہیں ہوگی بات۔" بظاہر بیٹھے ہوئے ان کے لہجے سے بڑی چھلکی تھی اس کے جان چھڑانے والے انداز پر۔ بے اختیار اسے کال کٹ کرنی پڑی اور ان کے پیروں کے قریب بیٹھ کر اس نے دوبارہ پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"میں نے تیرے لیے لڑکی دیکھی ہے۔" وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"نہیں۔" وہ دل ہی دل میں چیخا۔ "روی سے ملنے کے بعد بھی اماں اس لڑکی کو نہیں بھولیں۔ تو پھر کون ہے جو میرے سارے ارمان جلانے پر تلی ہوئی ہے۔"

"ویسے تو مجھے یقین ہے تجھے بھی وہ لڑکی ضرور پسند آئے گی۔ لیکن پھر بھی میں نے سوچا اس کی رائے

بات کرنے سے پہلے ایک بار میں تجھ سے پوچھ لوں۔"

"کون ہے وہ۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اسے پوچھنا پڑا۔

"تعبیر!" اماں کا جواب تھا یا کوئی بم جو اس کے اعصاب پر پھٹا تھا۔ اگر وہ بیٹھا نہ ہوتا تو یقیناً" اسے کسی چیز کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آجاتی۔

"مگر... تعبیر۔" وہ بمشکل کر بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ مانتی ہوں میں کہ تیرے مقابلے میں وہ لڑکی ہیرا ہے۔ مگر وہی ہے جو تجھے اور اس گھر کو سنوار سکتی ہے۔"

"لیکن... لیکن اماں! وہ لوگ اتنے انجان اور..." اسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں سوجھ رہے تھے۔

"تو انجان کیوں؟" انہیں غصہ آگیا۔

"پچھلے سات مہینوں سے ساتھ ہیں اور پرکھنے کے لیے تو ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔ بوڑھی ضرور ہوں، کم عقل بھی ہوں، دھوکے بھی بہت کھائے ہیں مگر اتنی پاگل بھی نہیں ہوں کہ برے بھلے کی پہچان ہی نہ کر سکوں اور ان کی تو صورتیں ہی بتاتی ہیں کہ ان کا تعلق کسی اچھے اور باعزت خاندان سے ہے۔ کیسی بھلی اور معصوم صورت والی بچیاں ہیں۔ تو نے بھی انہیں کوئی ایسی ویسی حرکت کرتے دیکھا ہے؟"

وہ پوچھ رہی تھیں اور ہادی اچھا خاصا شرمندہ ہو گیا۔

"نہیں اماں! میرے کہنے کا مطلب تھا کہ پتا نہیں وہ غیروں میں رشتہ کرتے بھی ہوں یا نہیں۔ کیا پتا اس کا پہلے ہی رشتہ طے ہو چکا ہو۔ کیا پتا وہ منگنی شدہ ہو۔"

"تجھے ان پریشانیوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں معلوم کر چکی ہوں۔ اس کا کہیں رشتہ طے نہیں ہوا اور بھی مجھے یہ بتا دے کہ تجھے کوئی اعتراض تو نہیں؟" انہوں نے بات سمیٹتے ہوئے اس کے الجھے ہوئے ہزار رستے پر ٹکٹکی لگا لی۔

"نہیں اماں!" وہ ایک دم جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ نے ایسا کیوں سوچ لیا۔ کہاں میں اور کہاں وہ۔

میں کسی طرح اس کے قابل نہیں ہوں۔"

اس کا ذہن کسی سادہ سلیٹ کی مانند ہو رہا تھا۔ اسے کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا گلو خلاصی کے لیے۔ بھلا تعبیر جیسی لڑکی پر وہ کیا اعتراض کرے گا۔ اگر بیچ میں روی نہ پڑی ہوتی تو یقیناً" وہ خود کو خوش قسمت سمجھتا۔ تعبیر اسے ہمیشہ بہت خاص لڑکی لگی تھی اوروں سے بالکل الگ اور اپنی سوچ سے بہت اوپر۔

"دیکھ ہادی! اب میں تیری کوئی بات نہیں سنوں گی۔ تو رہنے دے اپنے یہ بہانے۔ عادل کی بار مجھ سے غلطی ہوئی جو انجانوں پر اعتبار کر لیا۔ پر اب ایسا نہیں ہوگا۔ خاندان کی کوئی لڑکی میں اس گھر میں نہیں لانے والی اور نہ ہی اب میری عمر رہی ہے ان رشتے کرانے والیوں کے ساتھ جا کر گھر گھر کی خاک چھاننے کی۔ یہ میرے دیکھے بھالے لوگ ہیں اور تعبیر جیسی لڑکی میں ہاتھ سے نہیں جانے دوں گی۔ یہ بات تو یاد رکھ لے اور اچھی طرح سوچ لے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

اماں اگرچہ اس کے اور روی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں مگر انہوں نے بات کچھ اس انداز میں کی کہ وہ مجبور سا بن گیا۔ وہ تو اتنی محتاط ہو گئی تھیں کہ خاندان کی کسی بھی لڑکی کو سوچنا نہیں چاہتی تھیں اور جو ہادی خاص روی کا نام لے لیتا تو پھر تو گویا ایک بھونچال ہی آجاتا۔

وہ اپنا فیصلہ سنا کر نکل گئی تھیں اور ہادی سر تھامے اس ناگہانی مصیبت سے نمٹنے کی تدبیر سوچنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی لوگ سب کچھ بیچ باچ کر اپنا اپنا حصہ لینے کی صلاح کر رہے ہیں۔"

وہ اس وقت ایک گاہک کو فارغ کر کے بیٹھا ہی تھا کہ جب زین نے آتے ہی یہ خبر سنائی۔

"اچھا یہ تو تیرے لیے خوشی کی خبر ہے۔" ہادی فوراً ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"خاک خوشی کی خبر!" زین جو اس دوران ایک کاؤنٹر پر بیٹھ چکا تھا، برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

"ہر ماہ جو ایک معقول رقم ملا کرتی تھی' اب اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

"تو اچھا ہے نا' رقم ملنا بند ہو گی تو تم سیریس ہو کے نوکری کے بارے میں سوچو گے۔ ویسے اپنے حصے کا کرو گے کیا' کوئی بزنس وغیرہ؟"

"نہیں یار!" بیزاری سے کہتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بزنس تو نری ٹینشن ہوتی ہے۔ میرے لیے تو بندھی بندھی نوکری ہی ٹھیک ہے۔ ویسے بھی اپنے حصے میں میں ان سے اپنا گھر مانگ چکا ہوں۔"

"گھر کون سا؟" ہادی نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی جس میں اس وقت وہ پورا چاچا کا گھر آباد ہے۔" زین نے انکشاف کیا۔

"پاگل ہو تم زین! اتنے بڑے گھر کا کیا کرو گے۔" وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"سیٹل ہوں گا۔" وہ ہنسا۔

"ظاہر ہے رہوں گا اور کیا کروں گا۔ وہ گھر ابو نے اپنی محنت کی کمائی سے بنایا تھا اور میری اس گھر سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ میں اسے چھوڑ کر کہیں اور جاؤں' اسی لیے میں نے ان سے کہہ دیا کہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے سوائے اس گھر کے۔ نوکری مجھے آج نہیں تو کل مل ہی جائے گی مگر گھر بنانا بہت مشکل ہوتا ہے ہادی! اسی لیے میں نے سوچا ہے میں اس گھر کو نئے سرے سے بنا کر سجا کر اپنی چاندنی کے ساتھ اس میں اپنی چھوٹی سی دنیا بساؤں گا۔"

تصور کے پردے پر ایک دلکش عکس لہرایا تھا اور آنکھوں میں جگنو جل اٹھے تھے۔

"یہ... یہ چاندنی کون ہے؟" ہادی جو مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا' بے صبری سے پوچھنے لگا۔

"میرے خوابوں کی ملکہ... میرے خیالوں کی ملکہ۔" وہ دھیرے سے گنگنایا تھا۔ ہادی کا منہ بن گیا۔

"چلو' جب خوابوں کی ملکہ حقیقت بن کر آئے گی تب پوچھوں گا۔" اس نے دل ہی دل میں ارادہ باندھا جبکہ زین آنکھیں موند کر گنگنانے لگا تھا' ہونٹوں پر دھیمی سی مسکان بھی تھی۔

"لگتا ہے تو نے کل رات بھی فلم دیکھی تھی' ابھی تک نظروں میں کچھ گھومتی ہوئی ہیں۔" زین بے اختیار ہنس پڑا۔

"یقین کر' تجھے کسی مووی پر ضائع کرنے سے بہتر ہے میں اتنی دیر تیری شکل دیکھ لوں۔"

"تو تو تمہیں بتانے لگا۔" ہادی کے تیور کڑے ہو گئے۔

"تو جانتا ہے۔" اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کون؟" اس نے بے صبری سے پوچھا۔

"تیری پڑوسن۔"

"کیا...؟" ہادی ششدر رہ گیا۔ "تو تعبیر کی بات کر رہا ہے؟"

"تعبیر... یہ کون ہے؟" وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ "اس دن تو تو اسے سونا کہہ رہا تھا۔"

"اوہو... سونا!" یہ نام سنتے ہی ہادی نے سختی سے سر ہلاتے ہوئے نام کو کافی کھینچ دیا۔ پھر قدرے توقف سے کھنکھارتے ہوئے بولا۔ "زین! دیکھ ویسے اچھی لڑکی ہے۔"

"جانتا ہوں۔ تیری طرح نہیں ہوں میں۔ اپنی پسند پر بھروسا ہے۔" وہ اسے چڑانے کی خاطر بولا۔

"کیا مطلب ہے تیرا' مجھے بھی اپنی پسند پر پورا بھروسا ہے۔" ہادی نے کچھ غصے کچھ جوش سے کہا۔

"اسی لیے اپنی اماں کے سامنے اس کا نام لینے کے خیال سے ہی چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔" چھیڑتے ہوئے مذاق اڑا رہا تھا اس کی آنکھوں میں بے بسی اتر آئی۔

"ویسے اس دن روبی تیرے ہی کہنے پر آئی تھی نا؟" وہ پوچھنے لگا۔

"ہاں!" اس نے سر ہلایا۔ "میرا خیال تھا اس سے ملنے کے بعد اماں کے خیالات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آ ہی جائے گی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات... اماں اب بھی ان کے لیے ایسے ہی خیالات رکھتی ہیں جیسے ہٹلر کے یہودیوں کے لیے تھے۔"

"شرم کر... اپنی اماں کو ہٹلر کہہ رہا ہے۔" زین نے گھرک کر شرم دلانی چاہی۔ وہ کچھ جھینپا پھر کہنے لگا۔

"اور پتا ہے انہوں نے میرے لیے لڑکی کون سی ڈھونڈی ہے۔ تعبیر... سونا کی بہن۔"

"پھر تو فوراً مان جا... جیسی سونا ہے ویسی ہی اس کی بہن بھی ہو گی۔" زین نے بے ساختہ ہی مشورہ دیا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا یار! کیا کروں۔" زین نے یہ باتیں چھیڑ کر اس کی بے چینی پھر سے بڑھا دی تھی۔ وہ ٹہلنے لگا۔

"ایک ہی حل ہے۔" زین نے اچانک کہا تو وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔

"اپنی بھابھی سے اس بنگالی عامل کا پتا لے لے جس سے انہوں نے حامد بھائی کو مٹھی میں کرنے کے لیے تعویذ لیا تھا۔ تیرا مسئلہ یوں حل ہو جائے گا۔" اس نے چٹکی بجائی۔ ہادی چند لمحے تو اسے خشمگیں نظروں سے گھورتا رہا پھر تاسف سے سر ہلانے لگا۔

"تجھ جیسا بے شرم انسان اس روئے زمین پر کوئی نہ ہو گا۔ اب مجھے یقین ہو چلا ہے۔ تو مجھے اپنی اماں پر تعویذ گنڈے کروانے کا کہہ رہا ہے۔"

"یہ تیری اپنی نیت کا فتور ہے یار! میں تو تجھے تیرے ہونے والے سسرالیوں پر تعویذ کروانے کا کہہ رہا ہوں تاکہ تیری وہ ہم نام خالہ اپنی تمام اکڑ اور طنطنہ گھر پر ہی چھوڑ کر تیری اماں سے معافی مانگنے آئے اور جمیل تیری بھابھی کے اور روبی کو رشتہ خوروں کی جھولی میں ڈال جائے۔" زین نے کافی سنجیدگی سے کہا تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا واقعی... ایسی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ مطلب ایسا بھی کوئی تعویذ ہو سکتا ہے کیا؟"

اس کے قریب آ کر وہ آس بھرے لہجے میں پوچھنے لگا تھا مگر جب زین نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تب اسے اپنے بے وقوف بننے کا احساس ہوا۔

"یار! تجھے تو روبی نے واقعی پاگل کر دیا ہے۔" وہ شرارت سے اسے دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"آج تو میں تیری جان لے کر رہوں گا۔" وہ جارحانہ تیور لیے اس کی جانب بڑھا۔

"ٹھیک ہے مگر اس سے پہلے کسی بنگالی بابا کا ایڈریس ضرور حاصل کر لے۔ جیل جانے سے بچت ہو جائے گی ان کے کسی چلے کی بدولت۔" زین کے ہاتھ تو موقع لگا تھا۔

وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتا اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جانتا تھا اب نجانے کتنے عرصے تک زین اس بات پر اس کا ریکارڈ لگاتا رہے گا۔

☼ ☼ ☼

تعبیر کو آج کافی دیر ہو گئی تھی۔ چونکہ بچوں کے امتحانات ہو رہے تھے اسی لیے اس پر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا اور آج تو وہ اتنی تھک گئی تھی کہ اس نے گھر پہنچتے ہی سونے کا سوچا تھا۔ مگر اس کا یہ ارادہ دھرا کا دھرا ہی رہ گیا جب اس نے امی کو کچن میں کھڑے دیکھا۔

"امی! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں اور سونا کہاں ہے؟"

انہیں روٹیاں بناتے دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور سونا کی لاپروائی پر غصہ بھی آیا۔ ابھی امی کی طبیعت پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ کام کرنے کھڑی ہو گئی تھیں۔

"سونا اوپر گئی ہے۔" انہوں نے آخری روٹی توے سے اتار کر ہاٹ پاٹ میں رکھی۔

"تم یہاں کیوں کھڑی ہو گئی ہو' جاؤ! جا کر کپڑے تو بدل لو' تب تک سونا بھی آ جائے گی۔" انہوں نے اسے کچن کے دروازے میں کھڑے دیکھا تو ڈپٹ کر بولیں۔

"سونا کو اوپر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی اور جانا ہی تھا تو کم از کم اپنا کام تو کر کے جاتی۔" اس سے اپنا غصہ نہیں چھپ رہا تھا۔

"اسے میں نے ہی بھیجا ہے' میں نے سوچا تھا تم

فریش ہو کر آؤ گی تب جاؤں گی مگر تم تو تفتیش کرنے ہی کھڑی ہو گئی ہو۔" ان کے لہجے میں بھرپور ناراضی تھی۔

"ہادی کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ صبح باتھ روم میں سلپ ہو گئی تھیں۔ کلائی چوٹ میں آئی ہے۔ سب دیکھنے گئی تھی انہیں۔ ڈاکٹر نے تقریباً ایک ہفتہ مکمل بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ ایسے میں کیا کریں گی بچاری۔ اکیلی عورت ہیں اور پھر عمر بھی کافی ہو گئی ہے۔ ان کی تو کوئی بیٹی بھی نہیں ہے جو ان کی خدمت کر سکے۔ اب ہم پڑوسی ہیں۔ ہم کام نہیں آئیں گے تو اور کون آئے گا۔ اس لیے میں نے آتے ہی سونا کو لوٹ بھیج دیا۔ اب تم کھانا کھا لو تو تم بھی ہو آنا۔"

امی نے تفصیل بتائی تو اس کا دل تاسف سے بھر گیا۔ تھوڑی دیر میں سونا آ گئی۔

"ان کی طبیعت اب کیسی ہے؟" تعبیر نے تفکر سے پوچھا۔

"چوٹوں کی شدت سے انہیں بخار چڑھ گیا ہے۔ ابھی جب میں آ رہی تھی تب ہی ہادی بھیا علاقے کے ڈاکٹر کو لینے گئے تھے۔ اب تو شاید آ گئے ہوں۔ میں تو آنا بھی نہیں چاہ رہی تھی مگر آنٹی نے زبردستی بھیج دیا کہ صبح سے یہاں ہو، تھک گئی ہو گی۔" کہتے ہوئے وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔

تعبیر اٹھ کر آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"ویسے تو مجھے بہت تھکن ہو رہی ہے۔ نیند بھی بہت آ رہی ہے مگر میرا خیال ہے میں ابھی ادھر ہو چلی جاؤں۔" اپنی سرخ ہوتی آنکھوں اور پژمردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے سرسری سے لہجے میں کہا تو سونا کچھ عجیب سی نگاہ سے اسے دیکھنے لگی۔

"بالکل ٹھیک ہے تمہارا خیال۔ آنٹی کی طبیعت بہت خراب ہے اور... آج جو میں نے محسوس کیا تعبیر! تو مجھے یوں لگا جیسے انہیں گھر کی دیکھ بھال کے لیے کسی ملازمہ کی نہیں بلکہ ان کا جی اچھا کرنے کے لیے، ان کا خیال رکھنے کے لیے ایک بیٹی کی سی اپنائیت اور فکر مندی کی ضرورت ہے۔"

لاابالی سی سونا کے منہ سے ایسی منطقی بات تعبیر کو حیران کر گئی۔ اسے نہیں پتا تھا وہ اندر سے اتنی حساس ہو سکتی ہے۔

"ان کے بیٹے تو ہیں ان کے لیے پریشان بھی بہت ہیں مگر بہت بڑا فرق ہوتا ہے بیٹے اور بیٹی میں اور آنٹی کو شاید آج یہ فرق کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا جبھی تو وہ بات بات پر اتنی دل گرفتہ ہو رہی تھیں۔ میں نے ان کے گھر کا سارا کام تو دیکھ لیا تھا مگر ایک بہت بڑی خرابی ہے مجھ میں ہے کہ میں کبھی اپنے جذبات کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتی۔ میں نے ان سے یہ نہیں کہا کہ آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تعبیر! میں نے ان سے یہ تک نہیں پوچھا کہ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔"

سونا تاسف بھی تھی اور نادم بھی۔ تعبیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"تم بھی نا سونا! پاگل ہو بالکل۔ تم ان کی دیکھ بھال کے لیے ان کے گھر میں تھیں۔ اس سے بڑی ان کے لیے کیا بات ہو سکتی ہے۔"

"ہاں لیکن کبھی کبھی زبانی کلامی اظہار بہت ضروری ہوتا ہے۔" وہ اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"تو پھر ابھی تم جا رہی ہو نا...؟"

"ہاں۔" تعبیر نے اثبات میں سر ہلایا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ادھر تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو! میں کچھ مدد کروں؟" کچن میں جھانکتے ہوئے اس نے کھٹ پٹ کرتے صفی کو مخاطب کیا۔

وہ یہاں آئی تو خالہ کے کمرے میں عیادت کے لیے تین چار رشتے دار خواتین آئی بیٹھی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر وہاں بیٹھی۔ خالہ کی طبیعت پوچھی۔ ایک دو باتیں کیں اور پھر کچن میں چلی آئی۔ جہاں موجود صفی اسے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔

تعبیر ان کے گھر بہت کم آئی تھی اور تب بھی وہ صرف ڈرائنگ روم تک محدود رہی تھی۔ سونا کی طرح

بے تکلفی سے اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھا تھا۔

"کیا کر رہے تھے؟" اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنائیت سے پوچھا۔

"چائے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔" صفی نے کچھ شرمندگی سے بتایا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"دراصل اماں نے کبھی ہم سے چائے بنوائی ہی نہیں۔ حالانکہ جس گھر میں لڑکیاں نہ ہوں وہاں بہت سارے کام لڑکے ہی کرتے ہیں۔ مگر اماں نے کبھی ہمیں یہ عادت ہی نہیں ڈالی۔ وہ ہر کام خود کرتی تھیں اور اب جب وہ بیمار ہیں تو پتا چل رہا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے چولہے پر رکھی پتیلی کی طرف اشارہ کیا۔ جس میں اس نے سب کچھ ایک ساتھ ہی ڈال دیا تھا۔

"اچھا میں بنا دوں۔"

دوستی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ایک پتیلی اٹھا لی۔ صفی سینے پر ہاتھ باندھے سلیب سے ٹیک لگا کر اسے دیکھنے لگا۔

"ویسے تو اس وقت ہمارے ہاں چائے کبھی نہیں بنتی۔ مگر آج بہت کچھ معمول سے ہٹ کے ہو رہا ہے۔"

"اچھا... مثلاً کیا کیا؟" صفی کی بنائی گئی عجیب و غریب چائے کو چولہے سے اتارتے ہوئے تعبیر نے اسے دیکھا۔

"سب سے پہلے تو اماں پر آئی یہ اچانک مصیبت۔" صفی نے بتانا شروع کیا۔

"ویسے آج مجھے ایک بات پتا چلی کہ آنٹی جی کافی سوشل ہیں۔ سونا بتا رہی تھی سارا دن انہیں دیکھنے کے لیے محلے دار اور رشتے دار خواتین کا تانتا بندھا رہا اور ابھی بھی ان کے پاس چار خواتین آئی بیٹھی ہیں۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہے ان کا دل بہلا رہے گا۔ بیماری میں انسان کچھ زیادہ ہی فرسٹریٹڈ ہو جاتا ہے۔"

"ان کا دل بہلے نہ بہلے۔ ہماری حالت ضرور بگڑی ہوئی رہے گی۔" کیبنٹ سے نمکو کا پیکٹ نکالتے ہوئے صفی نے محسوس کروایا۔ تعبیر ٹھٹک گئی۔

"ویسے کیوں کیا بول رہے ہو صفی!"

"حقیقت بیان کر رہا ہوں۔" اس نے کوئی اثر لیے بغیر کہا۔ "صبح سے نجانے کتنے لوگ آ گئے ہیں اور سب کے لیے سونا آپی نے نجانے کتنی بار چائے بنائی ہے۔ کتنی بار کولڈ ڈرنکس سرو کیں۔ کتنے برتن جمع ہوئے ہیں اور کتنی بار دھلے ہیں اف میرے خدا...!"

"کوئی بات نہیں صفی! جس گھر میں کوئی بیمار پڑتا ہے تو عیادت کے لیے تو لوگ آتے ہی ہیں اور ان کی خاطر تواضع بھی کرنی پڑتی ہے۔" وہ نرم لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ مگر ان لوگوں کو کم از کم اتنا احساس تو ہونا چاہیے کہ ہمارے گھر میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ہمیں اپنا کام کرنے میں اتنی دشواری ہو رہی ہے تو ان کی خاطر تواضع کون کرے گا۔ آپ کو پتا ہے صبح پھپھو اور ممانی ایک ساتھ آئی تھیں۔ پھپھو کی چار بیٹیاں ہیں اور ممانی کی تین مگر دونوں اکیلی آئی تھیں اور بہانے شاید پہلے سے سوچ کے آئی تھیں۔ پھپھو کے مطابق فضا کے کالج ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ عظمیٰ کو شام میں اپنے آنے والے سسرالیوں کی خاطر مدارات کی تیاری کرنی تھی۔ شاہینہ کے پاؤں میں اچانک موچ آ گئی تھی۔"

تلخی سے کہتے ہوئے اس نے سر جھٹکا تھا۔ تعبیر نے کچھ حیرت سے اس سترہ سالہ جذباتی لڑکے کو دیکھا۔

"ابھی وہ لوگ بیٹھے ہی تھے کہ چھوٹے چچا آ گئے اپنی فیملی سمیت اور ان سب کے لیے کھانے کا انتظام بچاری سونا آپی کو اکیلے کرنا پڑا۔ آپ ہی بتائیے ان کے کھانے کے لیے رکنے کی کوئی تک بنتی تھی۔ جبکہ وہ جانتے بھی ہیں کہ اماں بستر پر پڑی ہیں اور ہم میں سے تو کسی کو انڈا ابالنا بھی نہیں آتا۔ خود تو ان میں سے کسی نے اتنی مدد بھی نہیں کی کہ اٹھ کر سلاد ہی بنا لیتیں۔ مجھے یقین ہے جتنا کام آج سونا آپی کو یہاں کرنا پڑا ہے۔ اتنا تو انہوں نے کبھی اپنے گھر میں بھی نہیں کیا ہو گا۔"

وہ پر جوش انداز میں بولتا جا رہا تھا اور پیچھے دروازے میں کھڑے ہادی کے اضطراب میں کئی گنا اضافہ ہو گیا

تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا مگر اس نے صفی کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ وہ سلسلہ میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ بے خیالی میں ضمیر کو دیکھنے لگا۔ جو بیوٹن کلر کے لباس میں دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے چولہے کے سامنے اس طرح کھڑی تھی کہ ہادی کو نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ وہ خود ہی اس کے متوجہ ہونے سے پہلے وہاں سے نکل کر چھت پر چلا گیا اور پاکٹ سے سیل نکال کر روی کو کال ملائی۔

"تمہیں یاد ہے کہ تمہیں میسج میں نے تمہیں کچھ بتایا تھا۔" اس کے کال ریسیو کرتے ہی روی کے بولنے کا موقع دیے بغیر تند لہجے میں گویا ہوا تھا۔ روی حیران ہو گئی۔

"کیا ہادی۔۔۔ کون سی بات کر رہے ہو؟"

"ہوں! تو تم واقعی بھول گئی ہو مجھے پہلے سے پتا تھا تمہیں یاد رہ بھی کیسے سکتا ہے۔ تمہیں تو صرف اپنے مطلب کی باتیں یاد رہتی ہیں نا۔"

"مجھے لگتا ہے ہادی! تم کسی سے جھگڑا کر کے آ رہے ہو۔ ایسا کرو جا کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیو اس کے بعد اگر مجھ سے بات کرنا۔"

وہ بھی روی تھی۔ کیسے اس کا درشت لہجہ برداشت کرتی۔ اس لیے کھٹ سے فون بند کر دیا تھا۔ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ سیل کو دیکھتے ہوئے اس نے بمشکل اسے دیوار پر دے مارنے کی خواہش کو دبایا تھا۔ وہ اس کا مہنگا سا ٹچ فون تھا' روی نہیں کہ اس پر اپنا غصہ اتار لیتا۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ نے کیا کیا خالہ! میں تو سوچ رہا تھا آپ نے میرے لیے لڑکی ڈھونڈ لی ہو گی اور تب ہی میں نے تو ساری تیاریاں بھی کر لی تھیں۔ بس کارڈز چھپوانے کی کسر تھی اور آپ ہیں کہ ساں بستر پکڑ کر بیٹھ گئی ہیں۔"

یہ زین کا مخصوص انداز تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔ نئی نئی جاب کی مصروفیت میں وہ کئی دن سے ہادی سے نہیں مل سکا تھا۔ آج جب اس سے ملا تو اس کی نوالی خالہ کی بیماری کا سن کر فوراً ہی انہیں دیکھنے چلا آیا تھا۔ بستر پہ نیم دراز خالہ چند دنوں میں ہی کافی کمزور ہو گئی تھیں۔ اس کی باتوں پر ہولے سے مسکرا دیں۔

"تو لڑکی دیکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ یہ کام تو میں بستر پہ بیٹھے بیٹھے بھی کر سکتی ہوں۔ بلکہ کر رہی ہوں پچھلے چار دنوں سے۔" صفی جو پاس ہی کرسی پر بیٹھا سیب کاٹ رہا تھا' چپ نہ رہ سکا۔

"اچھا کون سی لڑکیاں؟" زین نے چونک کر دلچسپی سے پوچھا۔

"رہنے دے۔ وہ تیرے مطلب کی نہیں ہیں۔" ہادی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولا تھا۔

"تو بتا زین! اگر تجھے کوئی لڑکی پسند ہے تو میں بنا دیر کیے اس کا ہاتھ مانگنے چلی جاؤں گی۔" اماں نے کہا تو ہادی حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

"کیا کہہ رہی ہیں اماں!"

"کیوں فارسی بولی ہے میں نے جو تجھے سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ بد مزہ ہو گئیں۔

"نہیں! لیکن فرق ضرور کیا ہے۔ مجھ پر تو اپنی مرضی ٹھونس دی اور زین سے اس کی پسند پوچھ رہی ہیں۔ یہ ناانصافی کیوں؟" اس کے انداز میں بھرپور احتجاج تھا۔

"کیوں بھائی! آپ نے کیا لو میرج کا پلان بنایا تھا۔" ہادی کی بات پر صفی نے بے ساختہ پوچھا تو وہ سٹپٹا گیا۔

"نہیں! میرا وہ مطلب نہیں تھا لیکن۔"

زین ہنسنے لگا۔ "بات یہ ہے دوست کہ خالہ کو تیری پسند پہ اعتبار نہیں ہے۔ کیوں خالہ! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔" زین نے شرارت سے کہتے ہوئے ان سے بھی تائید چاہی۔

"اور نہیں تو کیا۔ ایسے بندے کی پسند کا بھروسا بھی کیا کیا جا سکتا ہے جو سبزیوں تک میں تازہ اور باسی کا فرق نہیں کر سکتا۔"

"سبزی اور لڑکی میں بڑا فرق ہوتا ہے اماں!" ہادی نے چبا کر الفاظ ادا کیے۔ "اور جو آپ کو پسند آئی تھی اس کا نتیجہ بھی دیکھ چکے ہیں ہم۔"

"اور اب اسی طرح کا ایک نتیجہ بھگتنے کے لیے تو بی اماں کو طعنے دے رہا ہے۔ شرم آنی چاہیے تجھے۔" اس کی بات پر زین ناگواری کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکا۔

"جانے دے زین! یہ مجھے بس اس لڑکی کا نام بتا دے جس کی وجہ سے آج یہ میرے منہ کو آ رہا ہے۔" اماں بے وقوف نہیں تھیں کہ اس کے بگڑے تیوروں سے کچھ اخذ نہ کر پاتیں۔

"کوئی نہیں ہے۔" اس نے نگاہیں چرائیں۔

"بتا دے اگر کوئی ہے تو۔" زین نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سختی تیزی سے کہا تو وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے التجا کرنے لگا۔

"السلام علیکم۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی خوش انداز میں سلام کرتی سوہا کی نظر جب زین پر پڑی تو وہ نروس سی ہو گئی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا اور آنکھوں میں شوق کے کئی رنگ جھلملا اٹھے۔

"اندر آ جائیے نا۔ اسٹیچو کیوں بن گئی ہیں۔" صفی ہولے سے دروازے میں ٹھٹکی دیکھ کر بول اٹھا۔

"گھبرائیے مت۔ یہ اپنے زین بھائی ہیں اور کسی جنگل سے بالکل نہیں آئے۔"

"صفی!" انہوں نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا تھا۔ جبکہ سوہا گہری سانس لیتے ہوئے اندر چلی آئی۔

"پھر تو واقعی گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارے بھائی ہیں تو میرے بھی بھائی ہی ہوئے نا۔" ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اماں کے پاس جا بیٹھی تھی۔ اس کی بات پر جہاں زین کے چہرے کا رنگ بدلا تھا' وہیں ہادی نے بمشکل اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا۔

"کیسی طبیعت ہے خالہ آپ کی۔" وہ ان کے پاس بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

وہ مستقل اسے دیکھ رہا تھا۔ زرد رنگ گو کہ زین کو کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا مگر اس وقت سوہا کو زرد رنگ پہنے دیکھ کر اسے اس رنگ سے بھی عشق سا ہوتا محسوس ہوا۔

"صفی! یاد بھی ہے یا بھول گیا کہ تو چائے چڑھا کے گیا ہے۔ وہ تو اُبل اُبل کے سوکھ گئی ہو گی۔" اماں نے یاد دلایا۔

"وہی دیکھنے کے لیے جا رہا تھا کہ آپ نے سیب کاٹنے کے لیے بٹھا لیا۔ اب کیا میں دو گھڑی بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ آپ تو ایک دن میں ہی مجھے اس طرح ٹریٹ کرنا چاہ رہی ہیں جیسے کوئی لڑکی سالوں کی تربیت کے بعد ہوتی ہے۔"

روٹھے لہجے میں کہتے ہوئے صفی اچھا خاصا جلا گیا تھا۔

"تم رہنے دو صفی! میں دیکھ لیتی ہوں۔" سوہا جو پہلے ہی زین کی موجودگی کے باعث جانے کے لیے کوئی بہانہ سوچ رہی تھی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی' پھر خالہ کے کسی اعتراض یا انکار سے پہلے ہی وہاں سے نکل کر کچن میں چلی گئی۔

"جا کر کہہ دے اپنے دل کا حال۔ موقع اچھا ہے۔" ہادی نے اس کی طرف جھک کر دھیرے سے کہا تو وہ چونک گیا۔

"تھینکس یار!" وہ پُرجوش انداز میں اس کا ہاتھ دبا کر اٹھ گیا۔

"کیا آپ جانتی ہیں میں کون ہوں؟" سینے پہ ہاتھ باندھے وہ اس کے دلکش سراپے کو نگاہوں میں قید کرتے ہوئے اس سے مخاطب تھا۔

"پاگل۔" اس کا دل بے ساختہ بول اٹھا۔ مگر دل کی آواز کو نظر انداز کر کے اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"ہادی بھیا کے دوست۔"

زین کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ "پھر تو آپ بہت کم جانتی ہیں میرے بارے میں۔"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔ مجھے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ اضطرابی کیفیت میں ایک کے بعد ایک ماچس کی تیلی جلا رہی تھی۔

"لیکن مجھے تو ہے۔" وہ اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "اور جب میں کسی کے لیے اپنے دل میں کچھ اسٹرونگ فیلنگز محسوس کرتا ہوں تو پھر یہ بات میں اس سے شیئر کیے بنا نہیں رہ پاتا۔ سمجھیں؟" وہ

نفرت ہو یا محبت۔" زین نے اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکا' جہاں لمحہ بھر میں حیرانیاں سی پھیل گئی تھیں۔

"آپ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں۔ آپ کو مجھ سے نفرت ہے؟" وہ اس کی بات سمجھ کر بھی تجاہل سے کام لے رہی تھی۔ زین ہنس پڑا۔

"ہاں! اتنی نفرت کہ میں ساری زندگی بطور سزا آپ کو خود پر مسلط کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے اتنی اچانک یہ بات کہی کہ سونا ششدر رہ گئی۔ اور خود کو سنبھالنے میں اسے کئی پل لگ گئے۔

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے مجھے یہ چائے اندر لے کے جانی چاہیے۔" راہ فرار اختیار کرنا چاہ رہی تھی مگر زین یہ موقع گنوانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"ضرور لے کے جائیے لیکن اس سے پہلے اپنا جواب دیتی جائیے مس چاندنی!" زین نے کافی زور دیا اس نام پر جو وہ خود ہی اسے دے چکا تھا۔

"کیسا جواب بھئی! آپ نے مجھ سے کون سا سوال پوچھا ہے۔" سونا اس بات پر دھیان دیے بغیر کہ زین نے اسے کیا کہہ کر پکارا' کچھ جھلا کر بولی تھی۔

"اف... میں آپ سے کہہ رہا ہوں' مجھے بھائی مت کہیے۔"

"مجھے کوئی شوق بھی نہیں ہے آپ کو بھائی کہنے کا۔" اس کی گھبراہٹ اب جھنجلاہٹ میں بدلنے لگی تھی۔

"پھر کیا کہنے کا شوق ہے۔" زین نے فوراً اس کی بات پکڑتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔

"ارے خوامخواہ ہی۔ آپ تو فری ہوتے چلے جا رہے ہیں۔" سونا کو اس کے انداز پر حیرت ہو رہی تھی۔

"خوامخواہ کیوں... جب میرا دل اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے آپ کے نام کی مالا جپتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کا دل مجھے یاد نہ کرے۔" اس کا انداز اتنا پُریقین تھا کہ اس کا دل نادان ڈول ہو گیا۔ وہ چند لمحے تو کچھ بول نہ سکی۔

"مجھے لگتا ہے آپ پاگل ہو چکے ہیں۔ اپنا علاج کروائیے۔" چائے کی ٹرے اٹھا کر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اپنی بات کہہ کر باہر نکل گئی۔

✿ ✿ ✿

"ہدیٰ! تم بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ یہ بہترین موقع ہے کہ میں اماں کو تمہارے لیے کنونس کر سکتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر ہدیٰ کو فون کر کے اس کی منت کر رہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے۔ فائدہ اٹھاؤ اس موقع سے' مجھے کیا کہتے ہو۔" وہ ہمیشہ کی طرح اکھڑی ہوئی تھی۔ ہادی نے ایک گہری سانس لی۔

"دیکھو ہدیٰ! اماں کو بستر پر پڑے آج پانچواں دن ہے۔ وہ خود سے کوئی کام نہیں کر سکتیں۔ اور پتا ہے تمہیں یاد بھی کر رہی تھیں۔ اس دن آئی تھیں تو آج بھی آجاؤ۔ زیادہ نہیں بس دو تین دن کے لیے۔ شاید تمہیں اپنی بہو بنانے پر غور کر لیں۔"

"اف! یہ خالہ جی کی طبیعت ٹھیک کیوں نہیں ہو جاتی۔" وہ جیسے عاجز آ گئی۔ "تمہیں پتا ہے ہادی! میں نے ان کے لیے کتنی دعا کی ہیں۔" وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس نے ہادی کی اماں کے لیے دعائیں ضرور کی تھیں مگر اس لیے نہیں کہ اسے ان کی کوئی فکر تھی بلکہ اس لیے کہ ہادی ان کی تیمارداری کے لیے اسے بلانے کی ضد چھوڑ دے۔

"اچھا کی ہوں گی۔ مگر انہیں تمہاری دعاؤں کا پتا تب ہی چلے گا جب تم خود آکے انہیں بتاؤ گی۔ ابھی تو تعبیر اور سونا آکے ہر کام دیکھ رہی ہیں اور سچ کہوں تو میں ان کے سامنے بہت شرمندگی محسوس کرنے لگا ہوں۔"

"شرمندگی کیوں! پڑوسی ہیں کیا اتنی سی مدد بھی نہیں کر سکتے۔" وہ تپ گئی تھی۔

"اور تم تو ان کی سگی بھانجی ہو۔ جب تم ان کی دیکھ بھال کے لیے یہاں نہیں آسکتیں تو ان سے یہ توقع

کیسے رکھ سکتی ہو۔"

"تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے اس دنیا میں ان کی واحد بھانجی میں ہی ہوں۔"

"نہیں اور بھی ہیں مگر مجھے تو صرف تم سے مطلب ہے ناں۔" اس کا لہجہ بھاری ہوا تھا۔ وہ چپ سی رہ گئی۔

"دیکھو ہادی... مجھے خالہ کی فکر ہے بلکہ تم سے زیادہ ہے مگر میرے ایگزامز ہونے والے ہیں۔ میرے سر پر ان کی بھی ٹینشن ہے۔ پھر میں امی سے کیا کہوں گی۔ اگر خالہ خفا ہیں تو کم از کم امی ابھی نہیں ہیں۔ میں آنا بھی چاہوں تو وہ کہاں آنے دیں گی۔ پچھلے دنوں جب امی بیمار پڑی تھیں تب خالہ جی بھی انہیں دیکھنے نہیں آئی تھیں۔"

"تو تم نہیں آؤ گی۔" اس کی باتوں سے ہادی نے یہی نتیجہ اخذ کیا۔

"کوشش کروں گی۔ مجھے لگتا ہے آپی بلا رہی ہیں مجھے۔ میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔ ٹھیک ہے۔"

اس نے ہادی کی مزید کوئی بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے فون کو دیکھا پھر تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"شاید زین ٹھیک کہتا ہے۔ میں واقعی اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں اور شاید اپنے جذبات بھی۔" بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے اس نے یاسیت سے سوچا تھا۔ ابھی پل صفی نے اندر جھانکا۔

"بھائی! آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔"

وہ چونک گیا۔ "کیا کہہ رہی ہیں۔"

"پتا نہیں... مجھے تو نہیں بتایا۔" صفی نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔

"جلدی آئیے گا۔ میں باہر جا رہا ہوں اسی لیے واپس نہیں آؤں گا۔ ایسا نہ ہو اماں انتظار کرتی رہیں اور آپ بھول ہی جائیں۔" وہ تاکید کرتا نکلا تو اس نے بھی موبائل کمرے میں ہی چھوڑ کر اماں کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ تکیے کے سہارے نیم دراز تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولیں۔

"کہاں تھا تو۔ صبح سے ایک بار بھی یہاں جھانک کے نہیں گیا۔ ابھی بھی صفی سے کہہ کر تجھے بلانا پڑا ہے۔" وہ ناراضی سے دریافت کر رہی تھیں۔ ہادی نادم سا ہو گیا۔

"سوری اماں... اسٹور میں ہی رہا آج سارا دن۔ آپ بتائیے دوائی لی آپ نے۔" سائیڈ ٹیبل پر پڑی دوائیاں چیک کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ہاں! لے لی تھی۔ تجھے میں نے اس لیے نہیں بلایا۔" وہ بیزار سی ہو گئیں۔ "تو یہ بتا تو نے کیا سوچا؟"

"کس بارے میں؟" ہادی نے حیران ہو کر انہیں دیکھا تو ان کے چہرے پر چھائی بیزاری کو دیکھ کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"میرا مطلب ہے۔ مجھے کیا سوچنا تھا جو آپ یوں پوچھ رہی ہیں۔"

"شاباش ہے ہادی! یہ قدر ہے تیرے دل میں ماں کی کہ تجھے اب میری کوئی باتیں بھی یاد نہیں اور میں پاگل اس انتظار میں بیٹھی ہوں کہ تو مجھے اپنا جواب دے تو میں تعبیر کی ماں سے بات کروں۔" انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ اور وہ ان کی بات سنتے ہی مضطرب سا انگلیاں چٹخنے لگا۔

"مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت اور دے دیجیے۔" اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا۔ "میں اگلے ہفتے آپ کو حتمی جواب دے دوں گا' پکا۔"

"تو پچھلے دس دن سے تو کیا جھک مار رہا تھا۔" انہیں غصہ آ گیا۔

"میں نے تجھ سے کہا بھی تھا ہادی! میں اب مزید دیر نہیں کرنے کی۔ یہ تو اگر میں بستر پہ نہ پڑی ہوتی تو تیری ہاں یا نہ سنے بغیر کب کا رشتہ ڈال آتی۔ مجھ سے تو وہ زین اچھا ہے۔ سگا نہیں ہے مگر ماں کہہ دیا ہے تو سگے بیٹوں سے بڑھ کے نبھا رہا ہے۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی اور اس نے سچ مچ سارا اختیار مجھے سونپ دیا اور جانتا ہے جب میں نے سونا کے بارے میں اس کی

رائے پوچھی تو اس نے فوراً کہہ دیا کہ آپ جہاں چاہیں رشتہ طے کر دیں، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے اور ایک تو یہ کہ ماں کے کہے کی کوئی عزت ہی نہیں۔"
وہ کہے جا رہی تھیں اور ہادی ان کے انکشافات پر منہ کھولے ہونقوں کی طرح بیٹھا تھا۔
"یہ... یہ... زین نے کہا تھا آپ سے؟" وہ خاموش ہوئیں تو اس نے پوچھنے کا خیال کیا۔
"ہاں تو اور کس نے کہا۔" وہ خفگی سے بولیں تو ہادی ان کے بھولپن پر جھلا اٹھا۔
"آپ نہیں جانتیں اماں! وہ کتنا گھنا ہے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیسے انہیں زین کی فرمانبرداری کی اصلیت سے واقف کرے۔
"تو تو جیسے بڑا بھولا ہے نا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا ہادی! تو کس پہ چلا گیا ہے۔ کہاں بیچ آیا ہے شرم اپنی۔" اماں آج بڑے غضب ناک موڈ میں تھیں۔
"اوہو اماں!" وہ جھنجلا کر بولا۔ "آپ جتنا مرضی مجھے برا بھلا کہہ لیں لیکن میں اس طرح جلد بازی میں بنا سوچے سمجھے اپنی زندگی کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے زین کا رشتہ آپ کر سکتی ہیں مگر میرا نہیں۔ میں ابھی تیار نہیں ہوں۔"
وہ خاصی بدتمیزی کا مظاہرہ کر کے باہر آ گیا۔ اماں کے تاثرات پر اس نے جان بوجھ کر نگاہ نہیں ڈالی کہ کہیں وہ کمزور پڑ کر ان کے سامنے ہار ہی نہ مان لے۔ ابھی تو اسے اپنی محبت کی ڈوبتی ناؤ کو بچانے کی ایک کوشش اور کرنی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا آپ جانتی ہیں میں کون ہوں؟" یہ آواز اسے بالکل پاس سے سنائی دی تھی اور پھر اس کے کان بجے تھے مگر بے حد گھبرا کر اپنے ارد گرد دیکھتے ہوئے وہ پاس بیٹھی تعبیر کو چونکا گئی۔
"سونا! کیا ہوا؟" تعبیر نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔
"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پھر سے کتاب پر نظریں جما دیں۔
"تم اتنی ڈسٹرب کیوں ہو؟" تعبیر نے فکر سے سوال کیا مگر اس کا دل کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔ "کیا اس وقت بھی مجھے یاد کر رہا ہو گا۔"
وہ پچھلے دو دن سے شعوری، لاشعوری طور پر اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے کئی کام بگڑے تھے، کتنی باتیں بھول گئی تھی۔ کتنی چیزیں الٹ گئی تھیں اور نجانے کتنی ہی بار وہ تعبیر کو اپنی اس غائب دماغی کے باعث اپنی جانب متوجہ کر چکی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس نے کچھ کہا نہیں تھا مگر اب وہ بھی تشویش کا شکار ہو گئی تھی۔
"کیا بات ہے سونا! کافی پریشان لگ رہی ہو۔" کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سونا نے ایک نظر اسے دیکھا پھر کتاب بند کرتے ہوئے بولی۔
"نہیں میں پریشان نہیں ہوں۔ تمہیں وہم ہوا ہے۔"
"چلو پریشان نہ سہی مگر کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔" تعبیر نے اپنی بات پر زور دیا۔
وہ اس سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی کر سکتی تھی کہ اس وقت وہ اندرونی طور پر بہت زیادہ الجھی ہوئی تھی۔ شاید وہ تعبیر کو مطمئن کرنے کے بجائے مزید مشکوک کر دیتی اس لیے اس نے لیٹتے ہوئے چادر تان لی۔
"مجھے نیند آ رہی ہے تعبیر! لائٹ آف کر دو پلیز۔"
تعبیر ہکا بکا سی رہ گئی۔ "تمہیں اتنی جلدی نیند تو نہیں آتی سونا!"
"اف، کتنی تفتیش کر رہی ہو تم۔ کیا چاہتی ہو میں امی کے کمرے میں جا کے سو جاؤں؟"
وہ بری طرح چڑ گئی تھی۔ تعبیر کی آنکھوں میں چھلکتی بے یقینی دیکھ کر اس نے رخ ہی پھیر لیا۔
"سونا! تمہیں مجھے بتانا پڑے گا۔ بات کیا ہے؟" تعبیر نے غصے سے کہتے ہوئے اسے جھنجوڑا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو وہ کڑے تیور لیے اسے گھور رہی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔
"تم زین کو جانتی ہو۔" دل کی بڑھتی بے قراری سے مجبور ہو کر اس نے تعبیر سے دل کا حال کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تعبیر تو یہ سنتے ہی اچھل پڑی۔
"زین... یہ کون ہے؟" اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سونا کی اس کم صم کیفیت کے پیچھے وجہ کوئی لڑکا بھی ہو سکتا ہے۔
اس کے سوال پر سونا نے سب کچھ بتا دیا۔
"کہیں تم نے اس کی باتوں پر یقین تو نہیں کر لیا؟" کسی خدشے کے پیش نظر تعبیر نے بے تاب سے لہجے میں پوچھا تھا۔ اس نے نظریں چرا لیں۔
"میں یقین نہیں کرنا چاہتی لیکن میرے ذہن سے الجھن بھی نہیں جا رہی۔ میں اسے سوچنا نہیں چاہتی تعبیر! مگر میں اسے اپنے ذہن سے جھٹک بھی نہیں پا رہی۔ میں کیا کروں؟" بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔
"پاگل ہو تم۔" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے تعبیر نے ٹوک کر کہا۔ "اس بات کو اتنا سر پر سوار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر لڑکی کو زندگی میں ایسی صورت حال سے واسطہ پڑتا ہے۔ راہ چلتا کوئی بھی ہم سے ایسی بات کہہ دے تو کیا ہم اس کے لیے اپنی نیندیں اڑا لیں گے۔ یہ سراسر بے وقوفی ہو گی۔"
"وہ راہ چلتا نہیں ہے۔" تعبیر کی اس بات پر وہ بے ساختہ بول اٹھی۔ تعبیر نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ جز بز سی ہو گئی۔
"اگر وہ شخص واقعی سیریس ہے تو زبانی کلامی اظہار کے بجائے عملی قدم اٹھائے گا اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لینا کہ وہ واقعی کوئی راہ چلتا ہی تھا جو بس تمہارے سامنے آیا اور گزر گیا۔"
تعبیر نے بڑی سنجیدگی سے اپنی بات کہہ کر اس کے تاثرات کا جائزہ لیا تھا۔ سونا کی آنکھوں میں عجیب سی بے تابی ابھر آئی تھی۔
"اب سو جاؤ۔ مجھے امید ہے تمہیں اچھی نیند آئے گی۔" وہ اس کا رخسار تھپتھپا کر اٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں مرا ہوا تھا تو... تیرا موبائل بھی آف تھا۔" وہ زین سے ملنے اس کے گھر جا رہا تھا کہ وہ راستے میں ہی مل گیا۔
"یار! بتایا تو تھا تجھے۔ وہی گھر کے جھنجٹ۔ بھائی لوگ شفٹ کر رہے ہیں۔"
زین کے بھائی آپ اپنے حصے الگ کرنے کے بعد اب اس گھر سے شفٹ ہو رہے تھے جو زین کی خواہش پر اس کے حصے میں آیا تھا۔
"فصیح بھائی کو چھوڑ کے۔" ہادی چونک گیا۔
"کیوں، وہ نہیں جا رہے؟" وہ دونوں ٹہلتے ہوئے اسٹور کی سمت جانے لگے۔
"نہیں۔ انہوں نے مستقل لاہور شفٹ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ بھابھی کا میکہ بھی وہیں ہے اور فی الحال بچوں کے ایگزامز ہو رہے ہیں تو یہاں ٹھہرے رہنا ان کی مجبوری ہے۔" اس نے بات کرتے ہوئے ہادی کی طرف دیکھا جو الجھی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔
"کیا بات ہے، یہ تو نے بوتھی کیوں سجائی ہوئی ہے۔ کہیں روزی نے پھر جھنڈی تو نہیں دکھا دی۔"
"ہری جھنڈی تو اب میں اسے دکھانے والا ہوں۔" اس نے ہونٹ بھینچے تھے۔
"چلو دیر آید درست آید... تجھے عقل تو آئی۔"
زین نے جیسے کھل کر ہنسی اڑائی تھی۔
"میرا تو خیال تھا تو یہ خبر سنتے ہی خوشی سے بھنگڑا ڈالے گا۔" ہادی نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیا۔
"کیوں تو نے کیا مجھے میری شادی کی خبر سنانی ہے؟"
"شادی سے یاد آیا۔ تیری تو من کی مراد پوری ہونے والی ہے نا۔" ہادی ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔
"دیکھ لے۔" اس نے بے نیازی سے کندھے

اچکائے۔ "نیت صاف منزل آسان۔"

"کیوں میری نیت میں کوئی کھوٹ ہے؟" زین کی ایسی باتیں ہمیشہ اسے غصہ دلا دیا کرتی تھیں۔

"ہادی کے لیے نہ سہی۔ اپنی ماں کی آنکھوں میں تو دھول جھونکی ہے نا تو نے۔" زین نے جتانے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔

"یار! میری زندگی کسی فلم یا ڈرامے کی طرح آسان کھیل نہیں ہے۔" اس کا لہجہ بے بسی سے بھرا تھا۔

"تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا میرے بھولے بادشاہ! کہ فلموں میں سب آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جب تک گولیاں نہ چلیں' ڈھا ڈھا کی آوازیں نہ آئیں اور دس پندرہ بندے پھڑکائے نہ جائیں' تب تک تو ہیرو اور ہیروئن بھی نہیں ملتے۔"

"لیکن اینڈ تو ہیپی ہوتا ہے نا۔"

"تیری لو اسٹوری کا اینڈ بھی ہیپی ہوگا۔ میری یہ بات لکھ کر رکھ لے۔" زین نے تسلی آمیز انداز میں اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھے۔

"میں روحی سے ملنے جا رہا ہوں۔" سامنے آئے پتھر کو ٹھوکر مار کر اس نے دور اڑایا تھا۔

"ہری جھنڈی دکھانے؟" زین نے بے ساختہ پوچھا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

"یہی سمجھ! آخری بار ملنے جا رہا ہوں۔"

"چل یار۔ تجھے نواز حلوائی کی دکان سے ٹھنڈی میٹھی لسی پلاؤں۔ جلتے بھنتے دل کو خاصا سکون ملے گا۔"

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں تو تجھے صرف یہ بتانے آیا تھا کہ اماں نے تجھے بلوایا ہے۔ سونا کی امی تجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"کیا۔۔۔ تو نے مجھے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔" زین اس کی بات پر اتنا پرجوش ہوا کہ بیچ سڑک میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر دریافت کرنے لگا۔ ہادی نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر پیچھے آتی گدھا گاڑی کو۔

"سائیڈ پہ ہو جا۔ اس سے پہلے کہ تیرا یہ شریف و مسکین بھائی غصے میں دو لتیاں جھاڑ کر سونا کے گھر کے بجائے اسپتال پہنچا دے۔" زین منہ بنا کر ایک طرف ہوا۔

"اپنی منحوس زبان سے کبھی کوئی ڈھنگ کی بات بھی نکال لیا کر۔ خوامخواہ تیرے ساتھ یہاں تک آ گیا میں جا رہا ہوں۔"

"واپس جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیا مطلب ہے۔ اس حال میں اس کے سامنے جاؤں گا تو وہ تو چہرہ مانگنے والا سمجھ کر دروازہ میرے منہ پر ہی دے ماریں گی۔" زین نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"مجھے تو ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہا ہے۔ خیر تیری مرضی۔ میں روحی سے ملنے جا رہا ہوں۔ شام میں آتا ہوں تجھ سے۔ سن کہتا ہوں اگر وہ ہوا تو آئے یا رہے گا۔" آخری بات کرتے ہوئے وہ زیر لب مسکرایا۔

"تو چپ رہے تو زیادہ اچھا لگتا ہے۔" زین جھینپ گیا اور اس کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ حیرت اور بے یقینی کے عالم میں ہاتھوں پر نظریں جمائے اپنی زندگی میں آنے والی اس اچانک تبدیلی کا سوچ رہی تھی۔ کل تک اس کا دل عجیب سے خدشوں اور واہموں کے بیچ گھرا ہوا تھا اور اب اس قدر پرسکون اور مطمئن ہو گیا تھا جیسے بیٹھے بٹھائے دنیا بھر کی دولت پالی ہو۔ ابھی تین دن پہلے ہی امی نے ان کے کمرے میں آ کر یہ حیرت انگیز خبر سنائی تھی۔

"سکینہ! اپنے منہ بولے بیٹے کے لیے سونا کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔ ویسے تو یہ بات انہوں نے مجھ سے بہت دن پہلے کی تھی لیکن میں متردد تھی۔ اگر بات ہادی کی ہوتی تو میں سوچ بھی لیتی کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور چند مہینوں میں ہی میں اسے اچھی طرح جان گئی ہوں مگر ایک ایسا لڑکا جس سے نہ ملی ہوں۔ نہ میں نے اس کا گھر دیکھا ہے اور نہ ہی مجھے یہ پتا ہے کہ اس کا خاندان کیسا ہے' میں کیسے ہاں بھر لیتی۔ میں نے بجائے بھی گئی سب کہنا اسی لیے دو دن پہلے زین کی امی آئی تھیں۔ کافی سمجھ دار اور سلجھی ہوئی خاتون مجھے لگیں۔ اور باقی تسلی آج زین سے مل کر ہو گئی۔ بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا ہے اور پہلے ہی بہت اچھی پوسٹ پر اس کی جاب لگی ہے۔ اپنا گھر ہے اور ساس نندوں کا بھی کوئی جھنجٹ نہیں۔ اب تو میں شکر کر رہی ہوں کہ بنا سوچے سمجھے میں نے انکار نہیں کر دیا۔"

امی کہہ رہی تھیں اور تعبیر مسکراتے ہوئے پاس ہی بیٹھی سونا کو دیکھ رہی تھی۔

"تو ہاں کر دی آپ نے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں! سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے۔ ابھی سونا کی مرضی تو جان لوں۔" انہوں نے سونا کی طرف دیکھا جو سر جھکائے انگلیاں مسلنے لگی تھی۔

"میں جانتی ہوں سونا! تمہارے لیے یہ سب بہت جلدی اور اچانک ہوگا۔ مگر جو اللہ کو منظور۔ زین کی امی کہہ رہی تھیں انہیں [illegible] شفٹ ہونا ہے اس لیے وہ جانے سے پہلے منگنی کی رسم کرنا چاہتی ہیں۔ میں ان سے کہہ دوں گی۔ منگنی وہ جب بھی کریں مگر شادی تبھی ہوگی جب تعبیر کی شادی ہوگی۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے امی!" تعبیر اٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔ "بے شک وہ سادگی کی ایسے ہی کر لیں۔ آپ دیکھیے گا۔" امی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئیں۔ تعبیر سونا کو شرارتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"اماں! میں چاہتا ہوں۔ آپ تعبیر کی امی سے رشتے کی بات کرلیں۔"

اماں اس وقت کچن میں تھیں۔ اب وہ کافی حد تک اپنا کام کرنے لگی تھیں۔ اس وقت مٹر چھیلتے چھیلتے ان کے ہاتھ رکے اور انہوں نے پرسوچ نظروں سے اسے دیکھا۔ جو دروازے میں کافی دو ٹوک انداز لیے کھڑا تھا۔

"لیکن اس دن تو تو نے مجھے صاف منع کر دیا تھا؟"

"میں نے صاف منع نہیں کیا تھا۔ میں نے بس سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا اور اب میں سوچ چکا ہوں۔"

وہ انہیں اپنی رضامندی دے کر وہاں سے چلا گیا مگر جاتے ہوئے اس نے ان کے ہونٹوں پر بے اختیار امڈ آنے والی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔ وہ خود بھی ہلکا پھلکا ہو گیا۔

اس نے کبھی اتنی آسانی سے روحی سے دستبردار ہونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا مگر آج اس کے اس فیصلے کے پیچھے سب سے بڑی وجہ خود روحی ہی تھی۔

اس دن ہادی روحی سے ملنے بھابھی کے گھر گیا تھا کیونکہ وہ پچھلے ایک ہفتے سے وہیں مقیم تھی۔ اب یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اسے حویلی گیٹ کھلا ملا۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف آیا تھا مگر اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اسے تھم جانا پڑا۔

"مجھے سمجھ میں نہیں آتا یہ ہادی آخر مجھ سے چاہتا کیا ہے۔ اگر اس کی ماں بیمار ہے تو کیا میں کوئی نرس ہوں۔ میں نے ان کی تیمارداری کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟"

روحی کی غصے بھری آواز اس کے حواس مفلوج کر گئی۔ وہ ماں کا ذکر اتنے تنفر سے کر رہی تھی جیسے وہ اس کی خالہ نہیں اس کی کوئی دشمن ہو۔

"میں نے صرف ہادی سے پیار کیا ہے۔ میں صرف اس کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہوں جیسے آپ گزار رہی ہیں ملک بھائی کے ساتھ۔ صرف اور صرف ایک دوسرے کے سنگ اور ہادی تو ابھی سے مجھ سے اپنی اماں کی خدمتیں کروانا چاہ رہا ہے۔ ملازمہ بنانا چاہتا ہے مجھے ان کی۔ میں نے کبھی سسرالی جھمیلوں میں پڑنے کا نہیں سوچا اور پھر خالہ جیسی عورت جنہیں جھگڑنے کے لیے کسی بہانے کی بھی ضرورت نہیں

ہو گی۔ ویسے بھی تو ان کے خاص نشانے پر ہوں گی۔ آپ کی پوسٹ ... "
"تم تو بالکل پاگل ہو رہی ہو!" بھابھی نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اسے گھورا تھا۔

"وہ تمہیں اپنی ماں کی ملازمہ نہیں بنانا چاہتا۔ وہ تو انہیں راضی کرنے کے لیے تمہیں تھوڑا سا جھکنے کو کہہ رہا ہے اور اتنا تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ اگر میں حامد کے ساتھ اپنی الگ راجدھانی بنائے بیٹھی ہوں تو یہ سب آسانی سے نہیں ہوا۔ اس کے لیے مجھے کئی پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ جیسا کہ تم آج ہادی کو دیکھ رہی ہو، اس سے کہیں زیادہ حامد تھا۔ مگر دیکھ لو آج مجھ سے پوچھے بغیر ماں سے ملنے تک نہیں جاتا اور تمہیں تو صرف اپنا مطلب حاصل کرنا ہے۔ ایک بار تم ہادی کی بیوی بن جاؤ پھر اسے لے کر الگ ہوتے مہینہ سال بھر بھی مت لینا۔ مگر ابھی تو تمہیں کچھ دکھانی ہوگی۔ تھوڑا خوشامد سے کام لینا ہوگا۔ کہتے ہیں ناں مطلب پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔"

اس کے تن من میں اشتعال کی ایک تیز لہر اٹھی تھی۔ اس کا دل چاہا "ابھی اندر جا کر ان دونوں کو ان کی اوقات دکھلا دے۔

"آپ نہیں جانتیں آپی! ہادی حامد بھائی کی طرح نہیں ہے۔ یاد نہیں ہے آپ کو اس دن اپنی ماں کے لیے اس نے کیسے پل بھر میں مجھے ہلکا کر دیا تھا۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

"یہ سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں روزی! اور یہ ہادی بھی کوئی دودھ کا دھلا نہیں ہے۔ اس کی محبت کا بخار بھی اسے کبھی کبھار ہی چڑھتا ہے۔ بس۔ ان سے چوری چھپے تم سے ملتا ہے پیار جتاتا ہے" تھا فلسفہ دیتا ہے۔ "کیا اس کے بعد بھی تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ اسے مٹھی میں کرنے کے لیے تمہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ تم بس وہی کرو جو میں کہہ رہی ہوں۔"

انہوں نے قطعی لہجے میں کہا تھا۔ وہ یہ سب سننے کے بعد الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔

اسے بے یقینی نہیں تھی۔ کیونکہ آج جو بھی انکشافات اس پر ہوئے تھے وہ اتنے غیر متوقع بھی نہیں تھے مگر بقول زین، یہ اس کی محبت کا حد سے بڑھا ہوا اندھا پن ہی تھا کہ اسے کبھی کچھ نظر نہیں آیا مگر جب آنکھیں کھلیں تو اسے صدمہ نہیں ہو رہا تھا۔ غصہ آ رہا تھا اپنے آپ پر۔ لگتے بیوقوف بننے پر۔ جو چاہ رہا تھا اب بھی تہس نہس کر کے رکھ دے اور پھر اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ محبت کے نام پر اپنی پوری زندگی روزی جیسی خود غرض لڑکی کے لیے تباہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اب اپنی ماں کے لیے اس کے نفرت انگیز خیالات جاننے کے بعد وہ اس کے ساتھ زندگی گزار سکتا تھا۔ کیونکہ وہ جو بھی تھا جیسا بھی تھا مگر اپنی ماں کے لیے اس کی محبت دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر تھی اور وہ انہیں کسی کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہوئے میرے یار! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" زین اس اچانک کایا پلٹ پر حیران و پریشان سا اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"بس یار! سوچا تجھ جیسے خبیث انسان سے صرف دوستی ہی کافی نہیں رشتہ داری بھی بنانی پڑے گی۔ سو تیرا اہم راز افشا کرنے کا آئیڈیا سوجھ گیا۔"

زین چند لمحے کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"کر لے ہوشیاری مگر مجھ سے نہیں چھپا سکتا۔"

"اچھا کیا چھپا رہا ہوں میں؟" ہادی نے اسے گھورا۔

"یہی کہ انگور کھٹے نکلے۔ خیر جانے دے۔ میں تجھ سے تیرے ناکام عشق کی وجہ نہیں پوچھوں گا۔ بتا آگے کیا پلان ہے؟"

"مجھے تمہیں ایک بار بات کرنی ہے۔" اس نے بتایا تو وہ چونک گیا۔

"ٹھیک ہے ضرور کرو مگر خدا کے لیے وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس کے سامنے سچائی کا علمبردار بننے مت کھڑے ہو جانا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اس کے سامنے اپنی پہلی محبت کا قصہ چھیڑنے کی۔" زین نے بے حد سنجیدگی سے اسے سمجھایا تھا۔ پتا نہیں وہ سمجھا یا نہیں مگر اثبات میں سر ضرور ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے آپ کا اس طرح ملاقات کے لیے اصرار کرنا سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں منع بھی کر سکتی ہوں۔"

وہ چھت کے ایک ستون سے ٹیک لگائے سینے پر ہاتھ باندھے کچھ حیران سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا مگر موسم کافی خوشگوار تھا۔ آسمان پر سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ ٹکڑیوں کی صورت تیرتے ہوئے بادلوں کا کوئی ٹکڑا جب سورج کے سامنے آتا تو شام کا سماں لگنے لگتا۔ دھیمی دھیمی سبک رفتار ہوا نے تپش کا ہلکا سا احساس بھی ختم کر دیا تھا۔

"سوچا تھا لیکن پھر خیال آیا کہ آپ اپنے ذہن کو ادھر ادھر بھٹکانے کے بجائے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف اتنا سوچیں گی کہ اگر میں آپ سے ملنا چاہ رہا ہوں تو یقیناً کوئی اہم بات ہو گی۔"

سر ہلاتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ "آپ کو میری سمجھ داری کا اتنا یقین کیسے تھا۔ میں بے وقوفی کا مظاہرہ بھی تو کر سکتی تھی۔"

اس کی بات پر ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ کافی پر اعتماد لڑکی تھی۔ حالانکہ ان کے بیچ جو رشتہ بننے جا رہا تھا اس حوالے سے تعبیر کے انداز میں تھوڑی جھجک تو ہونی چاہیے تھی مگر وہ اس سے وہ بالکل نارمل انداز میں بات کر رہی تھی۔ جبکہ خود وہ بہت نروس ہونے لگا تھا۔

"دیکھیے تعبیر! ہمارے درمیان کبھی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ ہم زیادہ ملے بھی نہیں ہیں مگر اس کے باوجود میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ ایک بہت اچھی لڑکی ہیں اور اسی لیے میں ایک بات آپ کے سامنے کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔" وہ رک رک کر بولا تھا۔ تعبیر کچھ سیدھی ہو کر الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"امی نے یہ رشتہ میری مرضی سے کیا ہے اور میں اس سے خوش بھی ہوں مگر بات یہ ہے کہ میں آپ سے پیار نہیں کرتا۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے بالآخر کہہ ہی ڈالا۔

"بس اتنی سی بات۔ یہی کہنا تھا آپ کو؟" وہ اس سے تصدیق چاہ رہی تھی۔ ہادی ہکا بکا سا رہ گیا۔ اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ وہ اسے اتنی سی بات بھی قرار دے سکتی ہے۔

"آپ کو سن کر افسوس نہیں ہوا؟" وہ عجیب سے انداز میں پوچھنے لگا۔

"اگر میرے لیے یہ بات افسوس کرنے والی ہے تو مجھ سے زیادہ متاسف تو آپ کو بھی ہونا چاہیے۔"

"کیا مطلب۔ میں سمجھا نہیں۔" ہادی مزید الجھ گیا۔

"مطلب یہ کہ۔ میں بھی آپ سے پیار نہیں کرتی۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"کیونکہ میرے لیے یہ کوئی بڑا ایشو نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے خود کہا کہ ہمارے بیچ ڈھنگ سے کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تو ظاہر ہے۔ دو ایسے فریق جس میں کوئی باہمی ربط نہ رہا ہو۔ جن میں کبھی دوستی نہ رہی ہو۔ جن کے درمیان سلام دعا سے ہٹ کر کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اچانک ہی ایک نئے رشتے میں بندھ جانے کے بعد یکدم سے ان کے درمیان پیار آ بھی نہیں سکتا۔ یہ کوئی جادو ہے نہ اختیاری جذبہ۔ نئے رشتے کی بنیاد یقین، خلوص اور اعتماد پر ہوتی ہے۔ پیار تو ہوتے ہوتے ہو ہی جاتا ہے۔"

اس کی آواز دھیمی ہوئی تھی۔ ہادی یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے مگر پھر بھی آپ کچھ پوچھنا چاہیں تو بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں۔"

ہادی اس لمحے اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ آسمانی رنگ کے لباس میں ملبوس وہ اس گلابی شام کا سب سے دلکش منظر تھی۔

"آپ اس رشتے سے خوش ہیں؟"

"آپ کو شک ہے؟" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"نہیں 'میرے پوچھنے کا مطلب ہے آپ مجھے جانتی نہیں تو۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہمیں یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے اور اس عرصے میں 'زیادہ نہیں' تھوڑا بہت تو آپ کو جان ہی گئی ہوں ہاں! مجھنے کا دعوا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ہمارے بیچ کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ آپ کو شاید اس بات سے فرق پڑتا ہو مگر میں ذاتی طور پر انڈر اسٹینڈنگ کے نام پر بغیر کسی مضبوط رشتے کے ایک لڑکے اور لڑکی کے ملنے ملانے کو سخت معیوب سمجھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں مگر میں ذرا الگ مزاج رکھتی ہوں۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ ہادی کو ایک اپنی قسمت پر رشک سا آنے لگا تھا۔

"بے فکر رہیے میں دوبارہ کبھی آپ کو اس طرح ملنے کے لیے نہیں بلاؤں گا۔ تاوقتیکہ ہماری شادی کی اینٹی کلائمکس ہو جائے۔"

ہلکے پھلکے لہجے میں اسے یقین دہانی کراتے ہوئے وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔ تعبیر مسکراہٹ چھپانے کے لیے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

زین نے اس سے کہا تھا کہ تعبیر کے سامنے اپنی سچائی کا ڈھول پیٹنے مت بیٹھ جانا۔ لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں۔ ان کے لیے کوئی ایسا شخص قابل قبول نہیں ہوتا جو ان کی ذات کی نفی کرتے ہوئے اپنے بچے کھچے جذبے بھی بجائے ان کے نام کرنے کے اپنی ناکام محبت کے مقبرے پر چڑھا دے۔ گو کہ اس نے تعبیر سے صرف آدھا سچ بولا تھا مگر پھر بھی تعبیر نے اسے جتنا ہلکا پھلکا لیا تھا وہ اس کے لیے باعث حیرت تھا۔ وہ اتنی سلجھی ہوئی معاملہ فہم اور کھلے ذہن و دل کی لڑکی ہو گی یہ اس نے بالکل نہیں سوچا تھا۔

"میں آپ سے ایک اور بات بھی کہنا چاہ رہا ہوں۔ کہہ دوں؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اجازت چاہنے لگا۔

"بالکل کہیے۔ میں آپ ہی کی باتیں سننے کے لیے یہاں آئی تھی۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"آنے والے وقت میں اگر کبھی میں آپ سے اپنی محبت کا اظہار کروں تو آپ یہ مت سمجھیے گا کہ پہلی بار میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کیونکہ نہ یہ جھوٹ ہے اور تب نہ وہ جھوٹ ہو گا۔ جب آپ پہلی ملاقات میں ہی کسی کے ذہن و دل پر اس حد تک اثر انداز ہو سکتی ہیں کہ وہ اپنی کہی ہوئی باتیں ہی بھولنے لگے تو پھر کوئی آپ کے ساتھ رہے اور اسے آپ سے محبت نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ مجھے بھی یقین ہے کہ بہت جلد مجھے آپ سے پیار ہو جائے گا۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ تعبیر لاجواب ہو گئی تھی۔ پہلی بار گھبرا کر اس نے ہادی سے نظریں چرائیں اور پھر اپنی کیفیت چھپانے کے لیے رخ ہی موڑ گئی۔ ہادی کے چہرے پر ایک کھلی ہوئی مسکراہٹ در آئی۔

شام اپنی تمام تر خوبیوں سمیت ڈھلتے اندھیرے میں مدغم ہونے لگی تھی۔ مگر ہادی کے لیے زندگی کا ایک نیا در وا کر گئی تھی۔ اس پل سامنے کھڑے اس حسین وجود پر اپنا حق ملکیت محسوس کرتے ہوئے اس نے بے اختیار خدا کا شکر ادا کیا تھا اور پھر۔۔۔ امی کا! اگر وہ ان کی خواہش کو رد کر دیتا تو شاید آج وہ اس طمانیت اور سرشاری کو محسوس نہیں کر پاتا جس نے اس کے دل کا احاطہ کر لیا تھا۔

اب اسے قدر کرنی تھی اس موتی کی جو ان مانگے ہی اس کی جھولی میں آگرا تھا۔

ناولٹ



فائزہ افتخار

اک تھی سنڈریلا

سیف اللہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون ملک جاتے رہتے تھے۔ وہ نیپال کے دورے پر گئے تو واپسی پر بیتا ان کے ساتھ تھی۔ وہ ان کے دوست کی بیٹی تھی۔ اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تو سیف اللہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ سیف اللہ کی والدہ پرشکوہ خانم نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا مگر ان کی بیوی مہر نے اسے قبول نہ کیا۔ وہ ناراض ہو گئی اور دونوں بیٹیوں زینی اور ایلی کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی۔ سیف اللہ نے اپنی مینیجر تارا کو چھوڑ کر مہر سے پسند کی شادی کی تھی۔ وہ مہر کی جدائی میں راتوں کو جاگنے لگا۔ دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے انتقال پر مہر واپس آ گئی مگر وہ بیتا کو اس گھر سے نکال نہیں سکی کیونکہ وہ مکان پرشکوہ خانم کے نام تھا۔ اور وہ بیتا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ مہر نے بیتا کی تعلیم چھڑوا دی۔ کیونکہ کاروبار مہر کے نام تھا۔ وہ بیتا پر خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پرشکوہ خانم بیتا کو گھر ہی میں پڑھانے لگیں۔ انہیں بیتا کے خوابوں سے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کے خواب پراسرار ہوتے تھے اور اکثر سچے بھی ہوتے تھے۔

علاقے میں میلہ لگا تو مہر، ایلی اور زینی جوش و خروش کے ساتھ وہاں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ بیتا بھی جانا چاہتی تھی۔ مگر مہر اور زینی نے اسے روک دیا۔

بیتا نے تہیہ کر لیا کہ وہ سب سے چھپ کر سہی میلے میں ضرور جائے گی۔ بیتا نے پرشکوہ خانم کی پرانی ساڑھی اور مہر کے کمرے کے پردے کاٹ کر ایک خوب صورت لباس تیار کیا اور چہرے پر بھونڈے انداز میں میک اپ تھوپ لیا تاکہ



کوئی اسے دیکھ بھی تو پہچان نہ سکے۔ کانوں میں اس نے زینی کے بندے پہن لیے۔
یشا میلے میں گئی تو اسے وہاں دیر ہو گئی۔ اسے ماہر ہی ایک نوجوان ملا۔ یشا نے اسے گھر تک ساتھ چلنے کا کہا مگر اسے اپنا نام پتا نہیں بتایا۔ وہ ماہر کو اپنے ساتھ کشتی میں لے گئی۔ یشا کشتی سے اتری تو اس کا ایک بندا کشتی میں گر گیا۔ اس کے جانے کے بعد ماہر نے وہ بندا سنبھال کر رکھ لیا۔ یشا نے اپنی بے ساختہ باتوں سے اسے متاثر کیا تھا۔
میرے کارا کو دعوت پر بلایا کیونکہ وہ اس کے بیٹے ماہر سے اپنی کسی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ سارا دعوت پر گیا تو یشا بیماری کے باعث اس سے مل نہیں سکی۔
زینی نے وہ بندا جو اس رات یشا نے پہنا ہوا تھا اپنے دوپٹے میں بروچ کے طور پر لگایا تو ماہر اسے وہی لڑکی سمجھا جو اسے میلے میں ملی تھی۔
کارا نے خاندان اور قریب و جوار کی تمام لڑکیوں کو اپنے گھر مدعو کیا تاکہ ماہر شادی کے لیے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے۔ پر شکوہ خانم کا گھرانہ بھی مدعو تھا۔ مگر وہ لوگ یشا کو ساتھ نہیں لے گئے۔
یشا گھر میں تنہا بیٹھی رو رہی تھی کہ اچانک وہاں روحان آ گیا۔ اس نے اپنا تعارف پری زاد کی حیثیت سے کرایا۔ روحان نے بال میں جانے کے لیے یشا کے لباس کا انتظام بھی کر دیا۔ زینی سے وہ بندا ان میں پھینکا ہوا تھا۔ روحان نے وہ اٹھا کر یشا کے دوپٹے میں لگا دیا اور اسے دعوت میں لے گیا۔ یشا دعوت میں پہنچی تو ماہر اسے دیکھ کر چونک گیا۔

قسط 5

"اب دیکھنا کل کیا کرتی ہے زینی۔ میں نے اسے خوب چابی بھری ہے۔"
یشا مزے لے لے کر روحان کو اپنا تازہ ترین کارنامہ بتا رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ داد طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"تم نے جھوٹ بولا۔"
"ہاں بولا۔ جھوٹ لائی تو ویسے بھی ختم تھی اس پہ۔"
"تمہیں پتا ہے یہ کتنی بری بات ہے۔" روحان نے اسے شرم دلانا چاہی۔ جو ظاہر ہے کہ ایک ناکام کوشش ٹھہری۔
"ہونہہ۔ لوووو۔ تم نے تو جیسے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں ہے۔"
"ہاں۔ بولا ہے بہت بار۔ مگر جھوٹ جھوٹ میں بھی فرق ہوتا ہے یشا۔ بے ضرر جھوٹ سے کسی کو نقصان نہیں ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کو نقصان پہنچانے والا جھوٹ ہر حال میں غلط ہوتا ہے۔ سمجھیں۔"
"اچھا اب تمہاری نصیحتیں شروع۔ آئے بڑے کہیں کے۔" یشا نے منہ بنایا اور فلسفہ جھاڑنے کی سعی کی۔ "تم نے سنا نہیں۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔"
"اور لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ یہ تمہارے لیے محبت ہے یا جنگ۔"
روحان کے سوال نے لمحے بھر کے لیے اسے گنگ کر دیا۔ الفاظ کھو گئے تھے یا شاید خیال۔ پھر اپنی خفت چھپانے کے لیے سر جھٹک کر کمرے میں جانے کے لیے مڑی۔
"میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تم خود سب سے بڑے جھوٹے ہو۔ آئے مجھے سمجھانے والے۔ ہونہہ اور زینی۔ وہ اتنی بری ہے۔ جتنا کچھ کیا ہے میں نے اس کے ساتھ کہ بدلے میں میں اس کے ساتھ کتنا بھی برا کروں وہ کم ہے۔"
"یشا۔ سنو۔" روحان نے پکارا۔ وہ ان سنی کر گئی۔ مگر اس نے پھر بھی بات مکمل کرنا اپنا فرض جانا۔
"یشا۔ بلیز۔ محبت اور جنگ کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے کی غلطی مت کرو۔"

☼ ☼ ☼

یشا پہ اس کی نصیحت اور دوستانہ سرزنش کا خاک اثر نہ ہوا۔ اپنی بات پہ زینی کا ردعمل جاننے اس کے کمرے میں چلی آئی۔
"آؤ۔ تمہارے کپڑے پریس کر دوں۔ تمہیں جانا ہو گا ماہر آ گیا ہو گا۔"
"مجھے نہیں جانا کہیں اور نہ وہ آنے والا ہے۔"
وہ پچھاڑ کھانے والے انداز میں کہہ کر بیڈ پہ لیٹی لیٹی ٹانگیں جھلانے لگی۔
"میرے لیے اسٹرابری شیک بنا کے لاؤ۔ ٹھنڈا ٹھنڈا۔ شاید میرا غصہ کم ہو۔"
"تمہارا غصہ کم ہی تو نہیں کرنا مجھے۔ ابھی تو اس آگ کو مزید بھڑکانا ہے جیسے کہ ابھی تم بیٹا کارا آنٹی پہ نکالو گی تو میرا کام بنے گا۔"
یشا نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے سوچا اور کہنے لگی۔
"ٹھیک ہے مت جاؤ۔ مگر سوچ لو۔ کل ہی ہے وہ لکشن۔ اس لحاظ سے آج کا دن بہت اہم ہے۔"
"تم کیا سمجھتی ہو بھلا کہ میں کل کے فنکشن میں اپنے سر پہ ماہر کے نام کا آنچل اوڑھنے کی خاطر اپنی ہر طرح سے تسلط کروا سکتی ہوں تو مجھے یہ ہر حال میں غلط ثابت کرنا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ تم کرو یہ غلط ثابت۔ وہ کسی اور کو اپنی پسند ثابت کر دیں گی۔"
"تم اپنی بکواس بند رکھو۔ منحوس قسم کے اندازے بہت لگاتی ہو۔ ماہر مجھ سے محبت کرتا ہے وہ کسی اور کو کیسے پسند کر سکتا ہے ویسے بھی یہاں اور کوئی ہے بھی کون جو زینی کے مقابلے آئے۔"
پھر سیل فون۔ اس کا نام جگمگاتے دیکھ کے نخوت سے ناک چڑھانے لگی۔
"اب فون پہ فون کر رہا ہے۔ نہیں کروں گی بات تو خود ہی ہوش ٹھکانے آ جائیں گے اس کے۔"
یشا یہ سنتے ہی فکر مند سی ہو گئی۔ روحان کی باتیں اس کے ذہن میں گونجنے لگیں۔
(ارے روحان کہتا ہے کسی لڑکے کو کوئی لڑکی جتنا بھی اگنور کرتی ہے وہ اتنا اس کی جانب اٹریکٹ ہوتا ہے۔ کوئی اس کو جتنا دور بھگاتی ہے وہ اتنا قریب آتا ہے تو زینی کے اس طرح اگنور کرنے سے کہیں ماہر اس سے متنفر نہیں۔ نہیں۔) کچھ گھبرا اٹھی۔
"ٹھیک ہے۔ میں شیک لاتی ہوں۔ اور تمہیں نہیں جانا تو نہ سہی مجھے تو وہاں بہت سے کام ہیں اور میں ذرا جا کے نظر بھی رکھتی ہوں کہ کون تمہاری خالی کی ہوئی جگہ کو بھرنے والا ہے۔"
"کیا مطلب۔" زینی لیٹے لیٹے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔
"بھئی ظاہر ہے۔ میدان خالی ہو تو کوئی بھی قبضہ جما لیتا ہے۔ اور کارا آنٹی تو موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً ہی ماہر کا دھیان کسی اپنی پسند کی لڑکی کی جانب لگانا چاہیں گی۔"
وہ اس کو ہراساں کرنے کا سامان پیدا کر کے کمرے سے نکل گئی۔
اس بار فون کی گھنٹی بجی تو زینی نے نظر انداز کرنے کی غلطی نہیں کی۔ البتہ لہجہ ذرا اکھڑا ہی تھا۔
"ہاں ماہر بس آ رہی ہوں میں۔ مجھے تم سے ایک فائنل بات بھی کرنی ہے۔"

☼ ☼ ☼

روحان اپنے کشتی کے چند پرانے کپڑے اور کچھ پسندیدہ کتابیں لیے سارا کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ سامنے سارا کو خلاف معمول مسکراتے دیکھ کے کچھ ٹھٹکا سا گیا۔
"تشریف لائیے۔ مسٹر روحان۔"
"آپ تو ناراض ہو گئے کہ ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑنے کا طے کر لیا۔"
وہ لگاوٹ سے بولی تو روحان مرتے مرتے بچا۔
"نہیں۔ میں نے تو نہیں۔ وہ تو آپ نے خود

۔۔۔ خود ہی تو کہا تھا۔"

"غصے میں منہ سے کچھ نکل گیا تو تم سچ سمجھ بیٹھے۔ غصہ بھی تو اپنوں پہ ہی نکلتا ہے۔"

اس نے روحان کے شانے پہ ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

"دراصل وہ عمر بیگم نے کہا کہ میں وہاں ان کی انیکسی میں قیام کروں۔"

"ہوں، مجھے پتا ہے۔ تمہاری غلطی نہیں ہو گی۔ تم بہت اچھے ہو۔ میری سب باتیں مانتے ہو۔ آؤ ہم مل کے کھانا کھاتے ہیں۔"

"آپ کیوں تکلیف کر رہی ہیں۔ میں خود لگا لوں گا بیگم جی۔"

وہ اس کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر داخل ہوا۔

"تم بریڈ کیوں کھاؤ گے تم میں نے تمہارے لیے بڑے مزے کی چیز بنائی ہے۔"

"سچ؟"

"اور ہاں میں نے تمہارے لیے ایک بہت خوب صورت شرٹ بھی لی ہے۔ تم پہ بہت اچھی لگے گی۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت کیوں نہیں تھی؟ مجھے تمہیں ایسے پرانے کپڑوں میں دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔"

"کیا فائدہ سارا دن بھی آپ کے۔ کبھی فیکٹری کے تو کبھی عمر بیگم کے کاموں میں الجھا رہوں گا۔ نئے کپڑوں کا تو حشر ہو کر رہ جائے گا۔"

"تم کل سے عمر کے ہاں نہیں جاؤ گے۔ نہ اس کا کوئی کام کرو گے۔"

"لیکن اس سے تو میرا مقصد ادھورا... میرا مطلب ہے میرا کام ادھورا رہ جائے گا اور جب تک کام پورا نہ ہوا تو مجھے پیسے نہیں دیں گی۔"

"نہ دے۔ مجھے پیسے کی نہیں تمہاری فکر ہے۔"

"وہ کب سے؟"

بے ساختہ روحان کے لبوں سے پھسلا۔ اس نے سارا کے متوقع رد عمل سے گھبرا کے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے بلی کو دیکھ کے کبوتر آنکھیں میچ لیتا ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے اپنے رخسار پہ سارا کے ٹھنڈے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے گھبرا کے آنکھیں کھولیں۔

وہ اس کے بے حد نزدیک گہری محبت سے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"جب سے سب سے تم نے میرے دل میں جگہ بنائی ہے۔"

"سارا آنٹی؟" وہ وحشت زدہ سا نظر آنے لگا۔

"اوں ہوں۔ کتنی بار کہا ہے آنٹی نہ کہا کرو۔"

"وہ۔ بیگم۔ بیگم۔ آپ۔"

"نہیں! اب میں تمہاری بیگم نہیں ہوں۔ نہ تم میرے معمولی ملازم ہو۔ اب تم میری ہر چیز کے مالک ہو روحان۔"

"مالک وہ بھی۔ ہر چیز کا؟" اس کی آنکھیں اس سے زیادہ پھیلنے سے انکار کر چکی تھیں۔

"ہاں ہر چیز۔ کیونکہ میں تم سے بہت جلدی شادی کرنے والی ہوں۔"

سارا نے مسکرا کے انکشاف کیا۔ کچھ اس انداز میں جیسے وہ اسے کروڑوں کی لاٹری لگنے کی نوید سنا رہی ہو۔

"کیا شادی!" وہ کچھ ایسے ہراساں ہوا جیسے کسی نے اسے سزائے موت سنا دی ہو۔

"نہیں۔" وہ الٹے قدموں سرپٹ بھاگنے لگا۔

"روحان۔ رکو روحان۔"

✿ ✿ ✿

"تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔" زینی نے ماثر کے سامنے اپنی خفگی جتانی چاہی۔

"اور تم نے مجھے۔" ماثر نے بھی صاف گوئی سے کہہ دیا۔ وہ خود ناز و نعم میں پلا تھا اسے کہاں عادت تھی دوسروں کے ناز اٹھانے کی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ چلائی۔ البتہ ماثر نے یہی الفاظ اپنے مخصوص نرم لہجے میں دہرائے

"اور میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے میری بات نہیں مانی۔ میں نے کہا تھا کہ یہ فنکشن کینسل کرا دو۔ تم اپنی ماما سے اتنی چھوٹی سی

بات بھی نہیں منوا سکتے۔"

"کوئی وجہ بھی تو ہو۔ کیا میں ان سے جا کے یہ کہوں کہ آپ یہ تقریب اس لیے ملتوی کر دیں کیونکہ زینی کو ڈر ہے ہم اس کے بجائے کسی اور لڑکی کو نہ پسند کر لیں۔"

"کیا؟ میں کسی اور لڑکی سے کیوں ڈروں گی۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ کل جتنی بھی لڑکیاں آ رہی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی میرے برابر کی نہیں ہے۔ میرا ان سے کیا مقابلہ۔ تم نے یہ کہہ کر میری انسلٹ کی ہے۔"

اس کی مسلسل ناراضی اور چیخ و پکار سے اب ماثر کو کوفت ہونے لگی تھی۔

"تم ہر بات کو ایشو کیوں بنا لیتی ہو؟"

"میں نہیں۔ تم بنا لیتے ہو۔"

وہ اسی وقت وہاں سے چل پڑی اور ماثر نے بھی روکنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

✿ ✿ ✿

"سارا کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" عمر اندر ہی اندر بے حد مطمئن تھی کہ اب روحان مکمل طور پہ اس کی مٹھی میں آنے والا ہے۔

"جی۔ دماغ بھی۔ اور نیت بھی۔"

"تم فکر مت کرو۔ اور کوئی ضرورت نہیں ہے اس کے پاس دوبارہ جانے کی۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کے ہمارے ساتھ رہو۔"

"مگر میں کیسے... میرا مطلب ہے یہ مناسب نہیں۔" وہ بھی اوپر اوپر سے تکلف جھاڑنے لگا ورنہ بیتا کے کچھ اور قریب ہونے کا تصور اسے شاد کر رہا تھا۔

"تو کیا سارا کی پیشکش قبول کرنا مناسب ہو گا؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ بدک اٹھا۔

"میں بھی نہیں چاہتی کہ تم اپنی زندگی برباد کرو۔ مجھے تم ہمیشہ سے اپنے لگے ہو اور اگر ساتھ رہنے میں جھجک رہے ہو تو انیکسی میں رہ لو۔"

"میرے خیال میں یہ بہتر رہے گا۔ شکریہ۔"

☼ ☼ ☼

ماثر کے کمرے سے وہ اتنے خراب تیور لیے نکلی تھی کہ راہداری میں کارا سے اس کا سامنا نہ ہی ہوتا تو بہتر تھا۔ مگر قسمت کو بھی ایسے اتفاقات کروانے کا شوق ہوتا ہے جو بھس میں چنگاری ڈالنے کے مترادف ہوں۔

کارا نے اسے آتے دیکھ کے ایک ادائے بے نیازی سے اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویوں کی پروا کیے بغیر کہا۔

"زینی اور اتنا غصہ؟"

"آپ مجھ سے پوچھنے کی عادت ڈالیں۔ میں کیا کر رہی ہوں؟ کارا آنٹی!" زینی نے بدتمیزی سے اس کی بات کاٹی۔ وہ ششدر رہ گئی۔

"یہ کیسے بات کر رہی ہو تم؟"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ ہر بات میں آپ ایسے ہی کرتی ہیں۔ چاہے بات میری ہو یا ماثر کی۔ آپ پوچھتی ضرور ہیں مگر بعد میں فیصلہ آپ کا اپنا ہی ہوتا ہے تو جب ہونا وہی ہے جو آپ چاہتی ہیں تو پوچھنے کی زحمت بھی کیوں کرتی ہیں۔"

"تم میرے ساتھ بدتمیزی کر رہی ہو زینی۔"

"میں صرف آپ کو یہ بتا رہی ہوں کہ مجھ میں اتنی سیلف ریسپیکٹ ہے کہ میں اپنی انسلٹ ہوتے دیکھ کے آواز اٹھا سکوں۔"

وہ اپنی انگلی تک بجاتی وہاں سے نکل گئی۔ اور کارا کو اپنے کھولتے ہوئے خون کو اعتدال میں لانے میں کافی وقت لگا۔

☼ ☼ ☼

کارا نے ماثر کو بتانے میں اور ماثر نے سخت طیش کے عالم میں اسے فون کرنے میں ذرا وقت نہ لگایا۔

بیتا اپنے شرارتی لبوں میں مسکراہٹ دبائے ہوئے خاموشی سے ان کاموں میں لگی رہی جو کارا نے اس کے سپرد کیے تھے۔

"تم نے ماہم کے ساتھ مس بی ہیو کیا؟"

"اوہ۔ بہت جلدی بتا دیا انہوں نے۔ ابھی تو میں گھر تک پہنچی بھی نہیں۔" اس نے تمسخر سے کہا۔

"میں ماہم کے دل میں تمہارے لیے جگہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم نے ان کی نظر میں اپنا سارا امیج ہی خراب کر دیا۔"

"ان کی نظر میں میرا امیج ٹھیک کب تھا وہ سمجھتی ہیں کہ میں اتنی گری پڑی ہوں کہ تمہاری خاطر ان کی سب باتیں بھی برداشت کروں گی اور کسی ملازمہ کی طرح ان کے گھر کے معمولی کام بھی کروں گی۔"

"یہ بے کار کی بحث ہے۔ فی الحال میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم نے ماہم کے ساتھ جو بدتمیزی کی ہے اس کے لیے ان سے معافی مانگو۔"

"کیا؟ معافی اور میں؟ سوچنا بھی مت۔" زینی نے کھٹ سے فون رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

ماثر کی جھنجلاہٹ زینی کے فون بند کر دینے سے عروج پہ جا پہنچی۔

"عجیب اکھڑ اور ضدی ہے۔"

وہ جھیل کے پاس کھڑا اس کی ساکت سطح پہ اپنی ساکت نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ اسے رہ رہ کے اپنی اس سے وہ پہلی ملاقات یاد آ رہی تھی۔ وہ ملاقات۔ جس میں وہ اسے سب سے اچھوتی لگی تھی اور وہ اب اس اچھوتے پن کو تلاشتا پھر رہا ہے مگر وہ پلٹ کے ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتی۔

"پہلی ملاقات میں میں نے تمہاری صورت دیکھے بغیر ہی تمہیں دل دے دیا تھا۔ کاش کہ میں تمہاری صورت دیکھتا یا نہ دیکھتا مگر تمہارے دل کے اندر ضرور جھانک لیتا۔ تم جتنی خوبصورت ہو کاش تمہارا دل بھی اتنا ہی خوبصورت ہوتا۔"

وہ چپکے سے اپنے دل میں اس سے گلے کر رہا تھا جب عقب سے بیتا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پاس آ کے کھڑی ہو گئی۔

"موسم ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو گھر واپس جانا چاہیے۔"

"تو تم اتنے خراب موسم میں باہر کیوں ہو؟" وہ چمکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"میں بھی گھر ہی جا رہی ہوں۔"

"تم ماہم کی اطلاع کے لیے یہاں روز اپنا ٹائم نکال کر آتی ہو۔ ماہم کو چاہیے تھا کسی سے کہہ کر تمہیں گھر ڈراپ کروا دیا کریں۔"

"وہ روز ایسا ہی کرتی ہیں۔ آج وہ کسی ڈرائیور کو کہنا بھول گئی تھیں۔ ان کا موڈ بھی بہت تنگ تھا۔"

"ہاں! ان کا موڈ زینی نے۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ مگر بیتا نے موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

"ہاں! زینی کو ان کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ٹھیک ہے اس کی نیچر ہی ایسی ہے مگر پھر بھی کارا آنٹی بڑی ہیں۔"

اس کے دل میں چھپے بلکے سے گلے کو کچھ اور ہوا کرنے کے بعد اس نے قدم آگے بڑھائے۔

"میں چلتی ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔"

"تم کیسے جاؤ گی؟" اسے فکر لاحق ہوئی۔

"جھیل کے راستے کشتی سے۔"

"مگر ابھی تو تم مجھے جھیل کے پاس کھڑے ہونے سے بھی منع کر رہی تھیں کہ موسم ٹھیک نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے عادت ہے۔"

وہ ہلکا سا مسکرائی تو ماثر نے اپنی گاڑی کی جانب اشارہ کیا۔

"تم کہو تو میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے بیتا کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ آنکھوں میں تارے سے چمک اٹھے مگر اگلے ہی پل ریحان کی تنبیہہ کانوں میں گونجی۔

"جتنا اس سے دور بھاگو گی۔ وہ اتنا ہی تمہاری جانب کھچا آئے گا۔"

یہ یاد کرتے ہی اس نے بڑی سختی سے اپنے دل کو جھڑک کر اس کے اصل مقام پہ بٹھایا اور چہرے پہ بے اعتنائی سی سجا کے کہنے لگی۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پلیز تکلف نہیں کرو۔ میں بھی اس جانب ہی جا رہا ہوں۔"

ماثر نے دوبارہ اصرار کیا اس کی جان عذاب میں آ گئی۔ دل تھا کہ اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا اور دماغ تھا جو ریحان کے مشورے پہ عمل کر کے اسے آزمانا چاہتا تھا۔ بالآخر اس نے دل پہ پتھر رکھ کے لہجہ کچھ اور سخت بناتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں کشتی سے ہی جانا پسند کرتی ہوں۔"

اور قدم آگے بڑھا دیے۔ مگر عجیب مرے مرے انداز میں۔ اس کی پشت اب ماثر کی جانب تھی ورنہ وہ اس کے چہرے پہ صاف نظر آتے پچھتاوے اور افسوس کے تاثرات بھانپ لیتا۔ ست قدموں سے کشتی کی جانب بڑھتے اور پھر بیٹھتے ہوئے وہ مسلسل خود کو کوس رہی تھی کہ دماغ کی ماننے کی ضرورت کیا تھی بھلا۔

"اف۔ یہ کیا کیا میں نے۔ ریحان کی باتوں میں آ گئی اور ماثر کو انکار کر دیا۔ ماثر کو؟ اور اس نے دوبارہ کہہ دیا "اب اسے کیا ضرورت ہے تیسری بار آفر کرنے کی۔ اب پتا نہیں کبھی دوبارہ اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ تھینکو بیتا۔ اب بھگتو۔"

بڑبڑاتے ہوئے اس نے چپو ابھی پانی میں اتارے ہی تھے کہ ماثر کی آواز پہ چونک گئی۔

"بیتا۔ رکو۔"

اس نے نظر اٹھا کے سامنے دیکھا۔ حیران ہوئی۔ ماثر اسی جانب بھاگتا آ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا میں تمہارے ساتھ جا سکتا ہوں۔ اس پہ؟" اس نے اجازت طلب ضرور کی۔ مگر بیتا کا جواب سننے سے پہلے وہ اس کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ بیتا نے اپنی بے ساختہ خوشی کو چہرے پہ امنڈ آنے سے بڑے جتن کر کے روکا تھا۔

وہ اکثر اسی راستے سے آتی تھی۔ مگر آج سے پہلے جھیل اور یہ نظارے اتنے حسین کبھی نہیں لگے تھے۔

"ہم ابھی۔ او سوری۔ آپ بولیں۔"
"تم مجھے ماثر کہہ سکتی ہو۔"
اس کی جھجک دیکھ کے ماثر نے فراخ دلی سے کہا۔
"تم اپنی گاڑی میں کیوں نہیں گئے؟"
"ایسے ہی مجھے جھیل پسند ہے۔"
"اوہ۔" وہ بجھ گئی۔ سننا کچھ اور چاہتی تھی۔
"اور کشتی کا سفر کرنا بھی مجھے اچھا لگتا ہے۔"
"ہوں۔" زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ سرہلا کے وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔
(تمہیں میرے ساتھ جانا پسند ہے یہ کہہ دو گے تو کیا جاتا ہے تمہارا)
اچانک ماثر اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کے پاس آبیٹھا۔
"ویسے سچ بتاؤں۔ اصل وجہ کچھ اور ہے۔ میں کچھ کہنے آیا تھا تمہارے پاس۔"
بیتا پھر سے جی اٹھی۔ "کس وجہ سے؟"
اس وقت اس کی آنکھوں میں وہ سب جگنو اٹکھیلیاں کرتے اتر رہے تھے جو ریان کی مٹھی سے آزاد ہوئے تھے۔
"وہ مجھے تم سے۔" وہ ہچکچا کے چپ ہوا۔
"کہو ناں۔" بیتا کی بے تابی عروج پر تھی۔
"تمہیں برا تو نہیں لگے گا؟"
"بالکل بھی نہیں۔ کہو تو۔"
"دراصل۔ زینی۔ وہ مجھ سے ناراض ہے۔ ہمارے درمیان کچھ تلخی ہو گئی تھی۔ میں اسے ابھی فون نہیں کرنا چاہتا۔ جانتا ہوں وہ بات نہیں کرے گی۔ اس سے مجھے انسلٹ فیل ہو گی اور بات بڑھ جائے گی۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کی ناراضی طول پکڑے۔"
"تو۔" بیتا کا چہرہ اتر چکا تھا۔ وہ سپاٹ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
"اگر تم اسے بتا دو کہ میں اس سے اتنے برے لہجے میں بات کرنے پہ شرمندہ ہوں۔ اور اسے منانا چاہتا ہوں۔ تو بس۔ یہ میرا مطلب ہے۔"

بیتا نے پتھرائے چہرے کے ساتھ سامنے دیکھ کر کشتی روکی اور اترتے ہوئے کہا۔
"میں کوشش کروں گی۔"

☆ ☆ ☆

وہ روتے کرلاتے ہوئے کمرے کے چکر کاٹ رہی تھی۔
"میں اس کی اور زینی کی صلح کرا دوں۔ جھوٹ کہتا ہے ریان۔ ماثر کبھی میری طرف نظر نہیں کرے گا۔ میں زینی کی خوب صورتی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کبھی بھی نہیں چاہے کچھ بھی کر لوں۔"
پھر وہ طیش کے عالم میں اٹھی۔
"میں ذرا اس سے پوچھوں تو سہی۔ اس کی بتائی کوئی بھی بات کام نہیں کر رہی۔ نکما۔"
اس کا رخ سیدھا انیکسی کی جانب تھا جہاں اب ریان کے ڈیرے تھے۔

☆ ☆ ☆

"میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا ماثر کہ زینی مجھ سے الگ نہیں ہو سکتی اور وہی ہوا۔"
"ہاں۔ اس کے اور میرے درمیان کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اپ سیٹ تھی۔"
ماثر اگرچہ زینی سے خفا تھا پھر بھی اس کی جانب سے صفائی دینے لگا۔
"تمہارا مطلب یہ ہوا کہ اب جب بھی کبھی وہ اپ سیٹ ہو گی میرے ساتھ مس بی ہیو کرے گی؟"
"ایسا نہیں ہے مام۔ زینی بہت اچھی لڑکی ہے بس غصے کی تھوڑی تیز ہے۔"
"جسے اپنی زبان اور اپنے غصے پہ کنٹرول نہ ہو۔ وہ کبھی اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکتی۔ ابھی تمہیں صرف اس کی خوب صورتی نظر آرہی ہے مگر شادی کے لیے لڑکی میں اور بہت کچھ ہونا چاہیے۔"
"آپ بھول رہی ہیں مام۔ میں نے اسے اس کا چہرہ دیکھے بغیر پسند کیا تھا۔ خوب صورتی کی بنا پر شادی کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

ماثر کی مسلسل حجت سے بالآخر کار زچ ہو اٹھیں۔
"میں تمہیں صاف بتا رہی ہوں کہ تمہاری شادی اس سے کرنے کا اس وقت تک سوچوں گی بھی نہیں جب تک وہ کل کے فنکشن میں سب کے سامنے مجھ سے معافی نہیں مانگے گی۔"
"کیا؟ معافی؟" ماثر پریشان ہوا تھا۔
ابھی تو اسے منانے کا مرحلہ بھی سر نہیں کیا تھا اوپر سے یہ نیا مطالبہ۔

☆ ☆ ☆

"جھوٹے ہو تم۔ تمہاری ساری باتیں بھی جھوٹی ہیں۔ تم نے جو کہا میں نے کیا۔ مگر ماثر اب بھی زینی سے ہی محبت کرتا ہے۔ کوئی رزلٹ نہیں نکلا تمہاری باتوں کا۔"
وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور ریان ہونٹوں پہ ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں بے پناہ محبت لیے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ محبت جسے محسوس کرنے سے بیتا ابھی قاصر تھی۔ مگر مسکراہٹ سے چڑ ضرور گئی۔
"کمال ہے میں رو رہی ہوں اور تمہاری مسکراہٹیں ہی قابو میں نہیں آرہیں۔ کیا دیکھ رہے ہو؟"
"دیکھ رہا ہوں۔ تم سچ کہتی ہو۔ تم ہو کیوٹ۔"
تعریف سن کے بیتا رونا بھول بھال گئی اور ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔
"سچ میں؟ ہوں تو۔"
ریان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
"مگر ماثر کو نظر کیوں نہیں آتا؟" اس نے پیر پٹخ کے کہا۔
"آ تو گئی ہو نظر۔ تبھی تو اس نے تمہارا نمبر پوچھا۔ تم پہ توجہ دی۔ یہ سب میری باتوں پہ عمل کرنے کا رزلٹ ہی تو ہے اور جب اس نے تمہیں ڈراپ کرنے کا کہا تو میرے کہنے پہ تم نے انکار کیا اس وجہ سے تو وہ تمہارے پیچھے کھنچا چلا آیا۔"

"ہاں آیا۔ مگر میں نے بتایا تو ہے کہ بعد میں کیا ہوا؟ کیا فائدہ ہوا تمہاری باتوں پہ عمل کرنے کا؟"
"فائدہ اس لیے نہیں ہوا بیتا کیونکہ تم نے میری باتوں پہ عمل کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اور حرکتیں بھی کیں۔" اب وہ بے حد سنجیدہ نظر آرہا تھا۔
"کیسی حرکتیں؟"
"تم نے جھوٹ بولا۔ گندی والی سازشیں اور سیاستیں کھیلنے کی کوشش کی۔ دو لوگوں کے دل ایک دوسرے کے خلاف کرنے چاہے۔ اس لیے تمہارا کام بنتے بنتے رہ گیا۔"
بیتا نے شرمندگی اور تاسف سے سر جھکا لیا۔ ریان کو اس پہ بے حد پیار آیا۔ اور وہ نرمی سے اس کے سر کو تھپک کر بولا۔
"اگر تم واقعی دل سے شرمندہ ہو تو ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ کل کے فنکشن میں تم ایک اور کوشش کر سکتی ہو۔"
"وہ کیا؟"
"اب تمہیں ایک اور بات کرنی ہے جو بہت ضروری ہے۔ تمہیں ماثر کے سامنے خود کو بالکل ان پریڈکٹ ایبل (توقع کے خلاف) ثابت کرنا ہے۔"
"وہ کیسے؟"
"اگر وہ تمہیں بھولی بھالی سمجھتا ہے تو اچانک اس کے سامنے کوئی گہری بات کر جاؤ۔"
"کتنی گہری؟"
وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھولے اپنے سوال پہ سوال کر رہی تھی کہ وہ بالآخر چڑ گیا۔
"کنویں جتنی اور غور سے سنو۔ اس کے سامنے ویسی بن کے بھی مت آنا جیسی زینی ہے۔ زینی سے بالکل مختلف بلکہ الٹ۔ ذرا ہٹ کے۔ اتنا الگ کہ وہ چونک جائے۔"

☆ ☆ ☆

جیسے ریان بیتا کی کلاس لے رہا تھا ویسے ہی ممی زینی کو سبق پڑھا رہی تھیں۔

"ضرورت پڑنے پہ انسان گدھے کو بھی باپ بنا لیتا ہے۔ اگر ماز کو خوش کرنے کے لیے تم کارا کی تھوڑی بہت خوشامد کر لو۔ ایک سوری کہہ لو تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اور کسی کو پڑے نہ پڑے۔ زیبی کو پڑتا ہے۔" زیبی نے نخوت سے اپنے ابرو ترچھے کرتے ہوئے کہا۔

مہر نے اسے تاڑ کے رکھ دیا۔ "اپنے آپ کو کوئی توپ چیز سمجھنا چھوڑ دو۔ تمہارے پاس ہے کیا اس شکل و صورت کے علاوہ۔"

"کیا۔" اس نے سخت برا منایا۔

"سچ ہے یہ۔ اور کیا ہے تمہارے پاس۔ جس پہ تم اترا سکو۔ یہ سڑا ہوا بوسیدہ کھنڈر مکان۔ ایک بوڑھی دادی۔ جو مرتے مرتے یہ کھنڈر بھی ہم سے چھین کے کسی اور کے نام کر جائے گی۔ اور وہ ہر روز کھانے میں جانا لازم۔ ایسے میں اگر ماز جیسا لڑکا قسمت سے تمہیں مل ہی گیا ہے تو اسے اللہ کا احسان جانو۔ اور یہ نخرے بھی چھوڑ دو ورنہ وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

"وہ میرے ہاتھ میں ہے ہی کب؟ اس کی سب ڈوریں تو اس کی ماں کے ہاتھ میں ہیں۔"

"گلاب کے ساتھ کانٹے تو ہوتے ہی ہیں۔ کارا کو بھی تم ایسا ہی کانٹا سمجھو۔ اور برداشت کرو۔ میری مانو تو ابھی بات زیادہ نہیں بگڑی۔ اس سے ملو اور کچھ بھی کر کے مناؤ تاکہ وہ شام کے فنکشن میں تمہیں اپنانے کا اعلان کر دے۔"

مہر کے سمجھانے بجھانے کا زیبی پہ خاطر خواہ اثر نظر آ رہا تھا۔ وہ "تقریباً" رضامند لگ رہی تھی۔ مہر نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور ضرب لگائی۔

"یہ لو پکڑو فون۔ کرو اسے اور ابھی ملنے جاؤ۔"

اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ ماز کے ساتھ تھی۔

"تو تم نے اپنی ناراضی ختم کر ہی لی۔"

ماز مسکرایا۔ اور وہ اترا گئی۔

"کیا کروں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

"میں بھی۔ کل رات مجھ پہ بہت بھاری گزری۔ تمہاری ناراضی نے مجھے بہت بے چین رکھا۔"

"اتنی محبت کرتے ہو مجھ سے تو میری بات ماننے میں کیا حرج تھا۔"

زیبی نے اسے اپنے سامنے ڈھیر ہوتے دیکھا تو ایک بار اور کوشش کرنا چاہی۔

"زیبی۔ تم مجھ سے کچھ بھی ایسا کرنے کو کہو جس کا تعلق صرف مجھ سے ہے تو میں فوراً مان لوں۔ مگر جس معاملے میں ماما شامل ہیں اس میں میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایک ایسا فنکشن جسے ماما نے ارینج کیا ہے اور جس کے دعوت نامے بہت سے لوگوں کو جا چکے ہیں اسے صرف ایک دن پہلے میں بغیر کسی وجہ کے کیسے کینسل کرا دیتا۔"

زیبی نے اس بار بھی دال گلتے نہ دیکھی تو جبراً مسکرا دی۔

"میں سمجھ گئی ہوں۔ اسی لیے تو بات کو بڑھانے کے بجائے تم سے ملنے آ گئی ہوں اور میں کارا آنٹی کو سوری کہنے پہ بھی تیار ہوں۔"

"واقعی؟" ماز کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

"ہاں۔ صرف اور صرف تمہارے لیے۔ چلیں؟"

"کہاں؟"

"تمہارے گھر۔ کارا آنٹی سے سوری کہنے۔"

زیبی کی بات پہ ماز کو احساس ہوا۔ مرحلہ ابھی آسان نہیں ہوا۔

"مگر ابھی تو۔ میرا مطلب ہے شام کو تم فنکشن میں تو آ ہی رہی ہو۔۔۔ وہیں سوری کہہ دینا۔"

"کیا؟ سوری کہنے کے لیے وقت کچھ نامناسب نہیں ہو گا؟ میں اتنے مہمانوں میں کیسے سوری کہوں گی؟"

"زیبی! دراصل۔۔۔ دراصل ماما کی شرط ہے کہ تم سب لوگوں کے سامنے انہیں سوری کہو گی۔"

زیبی ششدر رہ گئی۔

"سب لوگوں کے سامنے۔"

☆ ☆ ☆

جب سے بیٹا کو پتا چلا کہ زیبی اور ماز کی ناراضی ختم

ہو گئی ہے اور وہ دونوں پھر ملنے گئے ہیں تو اس کی بے کلی عروج پہ پہنچ گئی۔ یہ وہاں کے پڑھائے سارے سبق بھک سے ذہن سے اڑ گئے اور وہ شرمندگی کا احساس جو اس نے جھوٹ بولتے پہ دلایا تھا وہ بھی زائل ہو گیا۔

اب اس کا ذہن تیزی سے کوئی اور راستہ نکال رہا تھا۔

"پلیز کارا آنٹی! کچھ تو لیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

اس نے نڈھال پڑی کارا کو جوس پیش کیا۔

"مجھ سے ماز کی پریشانی دیکھی نہیں جا رہی۔ اُف! اس لڑکی نے اسے پاگل کر کے رکھ دیا ہے۔"

"زیبی کی تو عادت ہے۔ ایسے ہی پاگل کر کے رکھ دیتی ہے لڑکوں کو۔ پھر انہیں اس کے علاوہ کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔"

بیٹا کی بات پہ کارا تو بری طرح چونکی ہی۔۔۔ سیڑھیاں اترتا ماز بھی وہیں ٹھٹھک کے رک گیا۔

"مطلب ہے۔۔۔ ماز سے پہلے وہ کسی اور کو۔"

"زیادہ نہیں۔۔۔ بس دو تین۔"

بیٹا نے بھولپن سے پلکیں پٹ پٹائیں۔

"دو تین!"

"جی کارا آنٹی۔۔۔ ایک سال میں بس صرف دو تین۔ سال سے زیادہ نہیں۔۔۔ بڑی لڑکی ہے زیبی۔"

کارا کے چہرے پہ تو ہوائیاں اڑی ہی۔۔۔ ماز بھی واپس پلٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

زیبی بڑی تپ کے گھر لوٹی تھی۔ ماز نے مطالبہ ہی ایسا کیا تھا کہ جو اس کے لیے بالکل بھی قابل قبول نہیں تھا۔

"سمجھتا کیا ہے خود کو۔۔۔ میں اس کی ماما سے سوری کہنے پہ مان کیا گئی۔ اب مجھے اتنے مہمانوں کے سامنے شرمندہ کرانا چاہتا ہے اور وہ کارا آنٹی۔۔۔ ایسی ایسی شرطیں رکھ رہی ہیں۔ ہونہہ۔۔۔ میں نے بھی ان کا بیٹا ان سے چھین کے نہ رکھ لیا تو میرا نام بھی زیبی نہیں ہے۔"

اس کی مسلسل بڑبڑاہٹ پہ ایلی نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

"تم اس سے لڑنے گئی تھیں یا اسے منانے؟"

"اب وہ منائے گا مجھے۔۔۔ میں تو اسے فون نہیں کرنے والی۔ وہ سمجھے گا کہ میں ہی مر رہی ہوں نا میں اسے پانے کے لیے یا اس کے علاوہ میرے پاس کوئی۔"

کہتے کہتے وہ رکی پھر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"آئیڈیا۔ اب میں اس پہ بھی ظاہر کروں گی کہ وہ اکیلا نہیں ہے میری زندگی میں بلکہ اس جیسے تو چار پانچ لائن میں لگے ہوئے ہیں میری ایک نظر کے منتظر پھر اسے احساس ہو گا کہ میں کیا چیز ہوں۔"

عین اسی وقت ماز کا فون آ گیا۔

ایلی نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا اور فروٹ سلاد کے پیالے میں گم ہو گئی۔

"ہیلو۔" زیبی نے لٹھ مار لہجے میں کہا۔

"زیبی! میں تم سے جو پوچھوں اس کا صحیح صحیح جواب دینا۔"

"جلدی بولو ماز! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"میں بہت الجھن میں ہوں۔ دل کہتا ہے یہ بات غلط ہو گی۔ تم ایسی ہو ہی نہیں سکتیں۔۔۔ مگر میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں تب یقین کرے گا دل کو۔"

ماز کی بے چینی اور اضطراب اس کے ہر لفظ سے جھلک رہا تھا۔

"کہو نا۔۔۔ جلدی کہو نا ماز۔۔۔ سعد میرا ویٹ کر رہا ہو گا۔"

"کون سعد؟" وہ چونکا۔

"میرا دوست۔" زیبی کے لہجے میں یکایک شیرینی بھر گئی۔

"ابھی تک تو صرف دوست ہی ہے مگر وہ کافی عرصے سے مجھے پسند کرتا ہے۔ وہ تو میں نے ہی کبھی پازیٹو ریسپانس نہیں دیا۔ کس کس کی محبت کا جواب محبت

سے دوں — صارم ہے ' ڈیڈی ہے ' زوہیب ہے۔ اچھے تو سب ہی ہیں مگر شادی تو مجھے کسی ایک سے ہی کرنا ہے۔ ہیلو، ہیلو، ماثر! تم نے کچھ پوچھا تھا مجھ سے۔"

وہ پکارتی رہ گئی مگر دوسری جانب سے فون بند ہو چکا تھا۔ ماثر جو پوچھنا چاہتا تھا اس کا جواب اسے مل گیا تھا۔

"ہونہہ — دیکھا ایمی! ایسے مل گیا — اب پتا چلا اسے۔"

☼ ☼ ☼

کارا کا دل خوشی سے جھوم اٹھا مگر اوپری دل سے ماثر سے ہمدردی بھی دکھانی تھی۔

"میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ دل اب بھی نہیں مانتا کہ وہ۔" اسے پھر سے کشمکش کا شکار دیکھ کے کارا نے جلدی سے کہا۔

"ماثر! اس عمر میں دل ایسے دھوکے کھاتا ہی ہے۔ اب تم زیادہ مت سوچو۔ نکلو اس موڈ سے۔ شام کو بہت سے مہمان آنے والے ہیں۔"

پھر بیشا کو نیپکنز کا ڈھیر ہال کی طرف لے جاتے دیکھ کے روکنے لگی۔

"بیشا! میں نے شام کی پارٹی کے لیے تمہارا ڈریس بنوایا ہے۔ ریکا سے کہہ کر منگوا لو۔"

پل بھر کے لیے بیشا کا دل بلیوں اچھلا — مگر پھر فوراً بے نیازی ظاہر کرنے لگی۔

"تھینک یو کارا آنٹی — لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"ضرورت کیوں نہیں ہے جو بھی ہے۔ تم ہو تو اس فیملی کا ایک حصہ — اور تمہاری گرینی میری آنٹی ہیں مجھے اتنا خیال تو کرنا ہے تمہارا — ویسے بھی میں نہیں چاہتی پارٹی میں آئے لوگ تمہیں اس طرح کے کپڑوں میں دیکھ کے کچھ کہیں اور تمہیں برا لگے۔"

"مجھے برا نہیں لگتا آنٹی کیونکہ میں نہیں سمجھتی لباس ہی انسان کی پہچان ہوتا ہے بلکہ مجھے یہ برا لگتا ہے کہ مجھے اچھا لگنے کے لیے کسی سے مانگ کے کچھ پہننا پڑے — میں جیسی ہوں ویسی رہنا پسند کرتی ہوں۔"

بظاہر سرسری انداز میں کہتے ہوئے اس نے ایک وزدیدہ نظر ماثر پہ ڈالی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ رومان کتنا سچ کہتا تھا — اور یہاں رومان نے سچ کہا تھا۔

وہ واقعی چونکا ہوا لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

زینی مسلسل فون کو گھورے جا رہی تھی جو کب سے خاموش پڑا تھا۔

"وہ نہیں کرے گا اب اس کا فون۔"

ایمی نے مزید خون جلایا۔

"تم چپ رہو منحوس شکل، منحوس باتیں۔"

"منحوس تم خود ہو — اپنی بات تم نے خود بگاڑی ہے کیا ضرورت تھی ماثر سے یہ سب کہنے کی۔"

"تمہیں کیا۔ تم جاؤ جا کے ٹھونسو کیک۔"

زینی اس وقت سب سے بے زار لگ رہی تھی — ایمی سے تو حد سے زیادہ جبکہ ایمی آج انتہائی ستانے کے موڈ میں تھی۔

"تمہیں شکر کرنا چاہیے کہ ماثر کسی اور کے دھوکے میں ہی سہی — مگر تم پہ توجہ تو دے رہا ہے اور تم اس پہ بھی نخرے دکھا رہی ہو۔"

زینی بری طرح چونکی۔

"کیا مطلب؟ کسی اور کے دھوکے میں؟ وہ صرف اور صرف مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"میں سب جانتی ہوں زینی۔" وہ خباثت سے مسکرائی۔

کچھ دیر کے لیے تو زینی گنگ سی ہو گئی۔ پھر تڑخ اٹھی۔

"منہ بند رکھو اپنا — خبردار جو یہ بات تم نے دوبارہ کسی سے کی — اصل میں تم مجھ سے جیلس ہو رہی ہو — ماثر جیسا لڑکا مجھ سے محبت کرتا ہے — میں کارا فیملی کا حصہ بننے جا رہی ہوں میری ساری زندگی شہزادیوں کی طرح گزرنے والی ہے اور تم — تم ساری

اسی کھنڈر میں گزارنے والی ہو — رومان جیسے پھیچر کے ساتھ۔"

"شٹ اپ زینی۔" ایمی کے دل پہ گھونسہ پڑا — رومان کے ساتھ زندگی اس بوسیدہ مکان میں گزارنے کے خیال سے نہیں بلکہ اپنی ہی سگی بہن کے لہجے، نظروں اور الفاظ میں ہر ہر انداز سے جھلکتی حقارت اور نفرت دیکھ کے۔

"یہی سچ ہے ایمی! اور تم ہو بھی اسی قابل۔"

ایمی روتے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور زینی نے وہاں اپنی منتظر نظریں فون پہ جما دیں۔

☼ ☼ ☼

بیشا گلدان میں پھول سجاتے ہوئے ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔

"تم ہر وقت اتنی خوش کیسے رہ لیتی ہو؟"

ماثر نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں خوشیاں خود ہی مجھے تلاش کرتی رہتی ہیں اور پھر آ کے میرے گلے لگ جاتی ہیں۔"

ماثر کو اس پہ رشک سا آیا۔

"تم بہت لکی ہو۔"

اور پھر پاس سے گزرتے ایک ملازم کو روکا۔

"ایک کافی — تم کافی پیو گی بیشا؟"

"ہاں مگر کولڈ کافی — دل چاہ رہا ہے۔"

"او کے — ایک کولڈ کافی — ایک بلیک کافی۔"

ملازم کے آگے بڑھ جانے کے بعد اس نے دوبارہ بیشا سے سوال کیا۔

"تم نے مام کو انکار کیوں کیا؟ وہ پیار سے تمہیں گفٹ دے رہی تھیں۔ گفٹ لینے سے منع نہیں کرتے۔"

"میں گفٹ بہت شوق سے لیتی ہوں۔ اچھا لگتا ہے گفٹ لینا اور دینا بھی — مگر میں وہی گفٹ لیتی ہوں جو جواب میں دے بھی سکوں۔ کارا آنٹی اپنی حیثیت کے مطابق دے رہی تھیں — میں وہ لیتی تو جواب میں کون سا ہی تحفہ کیسے دیتی بھلا —"

"تم دیکھنے میں بہت معصوم لگتی ہو — مگر باتیں اپنی عمر سے بڑی کرتی ہو۔"

وہ مسکرا اٹھا تھا اس کا فلسفہ سن کر۔

"کیا سمجھ داری کی باتیں کرنے والے معصوم نہیں ہوتے۔"

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"ستاسی۔" بیشا نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا؟ ستاسی — ؟"

"ہاں انیس میری اور اڑسٹھ گرینی کی — انہوں نے اپنے اڑسٹھ سالوں کی ساری سمجھ مجھے دے دی ہے۔"

اس نے سفید جھوٹ بولا — ورنہ تو گرینی بے چاری کی حسرت ہی رہی ساری عمر — کہ وہ اس کو کچھ ایسا گھول کے پلا دیں جس سے وہ تھوڑی سی ذہانت دار اور سمجھ دار ہو جائے — وہ تو بس رٹے رٹائے جملے بول رہی تھی — رومان کے کہنے کے مطابق۔

"کاش تمہاری گرینی اس میں سے تھوڑی بہت زینی کو بھی دے دیتیں۔"

ماثر نے سرد آہ بھری — دل پھر سے بوجھل ہو گیا۔

بیشا نے زینی کے ذکر پہ دانستہ بے نیازی ظاہر کی اور پھول ترتیب دیتی رہی۔

ملازم نے دونوں کے سامنے کافی پیش کی۔

"تمہاری کولڈ کافی بیشا۔"

ماثر نے اسے ہاتھ جھاڑ کے وہاں سے اٹھتے دیکھا تو توجہ دلائی۔

"نہیں — مجھے نہیں پینی اب۔"

"مگر تمہارا دل چاہ رہا تھا۔"

"اب نہیں چاہ رہا۔ جس چیز پہ بہت دل آیا ہو اسے چھوڑ دینا یا اس سے بچ کر نکلنے کا بھی اپنا ہی ایک مزا ہے۔"

وہ ماثر کو الجھن میں ڈال کے چلی گئی۔

وہ کھوئے کھوئے انداز میں اپنے سامنے رکھے دونوں طرح کی کافی کے پیالوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے

کولڈ کافی اٹھائی اور بلیک کافی اسی طرح سامنے پڑی دھواں چھوڑتی رہی۔ بلیک کافی جسے پینے کا ماثر کا بہت دل چاہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایمی کے دل پہ روحان کی باتوں سے بہت چوٹ لگی تھی۔

وہ باغیچے میں موتیا کے جھنڈ کے پاس بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ روحان کی نظر پڑی تو اس کے پاس چلا آیا۔

"ایمی... کیا ہوا؟"

پکارنے پہ بھی اس نے سر نہ اٹھایا تو پوچھ بیٹھا۔

"بھوک لگی ہے کیا؟"

بس اتنا پوچھنا غضب ہو گیا۔ وہ پھٹ پڑی۔

"تم بھی دوسروں کی طرح یہ سمجھتے ہو کہ میں اس دنیا میں صرف کھانے کے لیے آئی ہوں۔ بھوک اور پیاس کے علاوہ مجھے کوئی فیلنگز ہو ہی نہیں سکتیں۔"

اس کی لودرنگ آنکھیں۔ ہچکیوں کی زد میں آیا وجود

روحان پگھل کے رہ گیا اور قدموں کے بل اس کے پاس زمین پہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں نے ایسا کب کہا ایمی۔"

"مگر زبی نے کہا۔ اس نے کہا مجھے کوئی پیٹیر سا غریب مسکین سا لڑکا ہی سوٹ کرے گا۔ کیونکہ میری یہی اوقات ہے اور مجھے اس سے زیادہ اونچے خواب دیکھنے ہی نہیں چاہئیں۔"

"کوئی کسی کو خواب دیکھنے سے نہیں روک سکتا۔ تم خواب دیکھو ایمی۔ جو تمہارا دل چاہے تم ویسے خواب دیکھو۔ کسی کو حق نہیں ہے تمہاری آنکھوں سے خواب چھیننے کا۔"

"لیکن صرف خواب دیکھنے سے کیا ہوتا ہے کون سا میرے خواب پورے ہو سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں ہو سکتے؟"

"کوئی مجھ سے محبت کیوں کرے گا۔ کیا ہے مجھ میں؟"

"جس کو تم سے محبت ہو گی۔ وہ خود ہی تم میں کچھ نہ کچھ ڈھونڈ لے گا۔ اور دیکھ لینا ایمی۔ اس دنیا میں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہو گا جو صرف تمہارے لیے ہے اور جس کو صرف تم سے محبت ہو گی اور تمہیں صرف اس کے ہی خواب دیکھنے چاہئیں۔"

نجانے وہ اتنے جگنو کہاں سے لاتا تھا۔ سدا اس کی مٹھی جگنوؤں سے بھری رہتی تھی کسی کو آس کے تھماتا۔ کسی کو امید کے کسی کو خواب کے جو جگنو بن جاتے ان کو اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں سمو کے پھرا رہتا۔

☼ ☼ ☼

ماثر اداس سی نظروں سے لان کا جائزہ لے رہا تھا جہاں رات کی تقریب کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ اس کا دل نجانے کس دھند میں گھرا ہوا تھا۔ ایک عجیب سا ملال اس پہ طاری تھا۔

کچھ کھو دینے کا۔

یا شاید نہ پانے کا۔

"تم اداس ہو؟" ہیثا اس کے پاس آ کے کھڑی ہو گئی

"ہاں... کچھ کچھ۔"

"کیونکہ زبی نہیں آ رہی اس لیے؟" ہیثا کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکا سا رشک اور حسد جھلکنے لگا۔

"نہیں۔" ماثر کا جواب خلاف توقع تھا۔

"تو پھر؟"

"پتا نہیں۔ مجھے لگتا ہے جس کی مجھے تلاش ہے وہ میں پا کے پھر سے کھو دیتا ہوں بار بار۔"

"ہو سکتا ہے جسے تم پاتے ہو وہ اصل میں وہ ہو ہی نہ... جس کی تمہیں تلاش ہے اسے تم نے اصل میں کبھی پایا ہی نہ ہو۔"

ہیثا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو تم... کبھی کبھی میں

بھی اسی الجھن میں پڑ جاتا ہوں۔ مجھے شک سا ہونے لگا ہے"

کہتے کہتے وہ رکا اور بات بدل دی۔

"تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئیں؟"

"ٹھیک ہوں میں ایسے ہی۔"

"بہت سے لوگ آ رہے ہیں۔"

"مگر وہ سب میرے لیے تھوڑا ہی آ رہے ہیں اور کیا میں اچھی نہیں لگ رہی؟"

"نہیں تو... لگ رہی ہو بہت۔"

مبہم سا مسکرا دیا۔ مگر وہ اس پہ بھی خوش ہو گئی۔

"کیا لگ رہی ہوں؟ کیوٹ ناں؟"

ماثر کھو سا گیا۔ بے ساختہ ذہن کے پردے پہ جھیل کے پانیوں پہ لرزتا وہ عکس جھلملا گیا۔

"میں بہت کیوٹ ہوں ناں؟"

وہ مزید غور سے اسے دیکھنے لگا جو اپنی دھن میں کہتی جا رہی تھی۔

"ویسے بھی اتنا تیار ہونے کا کیا فائدہ۔ ایک تو یہ پارٹی میرے لیے نہیں ہو رہی اور وہ سرا کیا پتا ہو گی بھی یا نہیں؟"

"کیا مطلب؟ کیوں نہیں ہو گی؟"

ماثر نے چونک کے پوچھا تو وہ سٹپٹا گئی اس کی کسی بات کا کوئی مطلب بھی ہو... یہ ضروری تھوڑا ہی ہے۔ ایسے ہی بے دھیانی میں ہانک لگا دی تھی۔ حسب عادت اور حسب معمول۔

"کیا پتا کسی بھی وجہ سے کینسل ہو جائے۔"

وہ بات بنا کے چلی۔

☼ ☼ ☼

"تھینک یو... سو سویٹ۔"

مسز انور کسی سے فون پہ بات کرتے ہوئے خاصی سوگوار سی لگ رہی تھیں۔

ماثر نے اندر داخل ہوتے ہوئے بغور دیکھا۔

"ہاں... یہ تو ہے... ظاہر ہے ایسے میں تقریب کیسے ہو سکتی ہے۔"

اس نے فون رکھتے ہوئے ماثر کو اطلاع دی۔

"تمہارے فادر کے کزن کی وائف کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔"

"اوہ۔"

"تمہیں جانا ہو گا ماثر۔"

"اور وہ پارٹی...؟"

"او ہاں... وہ تو کینسل ہی سمجھو... مگر سب کو انفارم بھی کرنا ہو گا۔ میں کیا کرتی ہوں میں تعزیت کے لیے جاتی ہوں۔ تم یہ سب سنبھال لو۔"

ماثر حیران پریشان سا کھڑا تھا۔ اسے ہیثا کی بات یاد آ رہی تھی۔

"کیا پتا کسی بھی وجہ سے پارٹی کینسل ہو سکتی ہے۔"

وہ الٹے قدموں باہر پلٹا۔ اسے ابھی اسی وقت ہیثا سے ملنا تھا مگر وہ اب یہاں نہیں تھی اور وہ جانتا تھا۔ ہیثا اسے کہاں ملے گی۔ وہ اسی وقت جھیل کے کنارے جا پہنچا۔ اندازہ درست نکلا۔ وہ چہرے پہ زمانے بھر کی کوفت اور بے زاری سجائے پانی میں پیر ڈالے بیٹھی تھی۔

"توبہ... کتنی بورنگ باتیں کی ہیں میں نے۔ روحان نے بھی کیسی عجیب عجیب فضول باتوں کے رٹے لگوائے ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے اندر کوئی بوڑھی روح گھس گئی ہو اور فائدہ کیا ہوا؟ وہ وہاں پارٹی انجوائے کریں گے اور میں یہاں اکیلی... زبی نہیں تو کوئی اور لڑکی آ جائے گی ماثر کی زندگی میں۔"

اس کی بڑبڑاہٹ اس وقت تھمی۔ جب اس نے عقب سے ماثر کی پکار سنی۔

"ہیثا..." ہیثا نے پلٹ کر دیکھا۔

"تم کیا ہو ہیثا؟ کوئی جادوگرنی؟"

ماثر کے پوچھنے پہ اس نے ترنت جواب دیا۔

"کوئی نہیں جی... جادوگرنیاں کوئی اتنی حسین ہوتی ہیں۔"

اس کے کہنے پہ ماثر ایک بار پھر سے کھو سا گیا۔ جھیل کے پانیوں پہ سفر کرتی ایک گم گشتہ آواز فاصلے

ملے کرتی پھر سے اس کی ہاتھوں تک تن پہنچی۔
"جادوگرنیاں کوئی اتنی حسین ہوتی ہیں؟"
وہ ابھی اس پہیلی کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یشا نے سوال داغ دیا۔
"تم یہاں جھیل پہ کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو اس وقت اپنے گھر پہ ہونا چاہیے تھا۔"
"تمہاری بات سچ ثابت ہوئی ۔۔۔ پارٹی واقعی کینسل ہو گئی ہے۔"
یشا کا منہ حیرت کے مارے کھلے کا کھلا رہ گیا۔
ماہر نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔
"اچھا ہے اس بہانے میں آج یہاں کا چپہ چپہ دیکھ لوں گا۔ تم مجھے دکھاؤ گی بیوٹی؟"
یشا نے مسکرا کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☼ ☼ ☼

ریحان اپنے بازو کو تکیہ بنائے تنکوں کے بستر پہ لیٹا ایسے مسکرا رہا تھا جیسے ریشم محو استراحت ہو۔ یہ مسکان یشا کے تصور کی دین تھی۔ اسے وہ وہ گھڑیاں یاد آ رہی تھیں جب اس نے یشا کو دکھانے یا دوسرے لفظوں میں متاثر کرنے کے لیے جگنو پکڑ کے مٹھی میں قید کیے تھے۔
"آنکھیں بند کرو۔"
اس نے کہا تھا اور یشا نے فٹ انکار کر دیا تھا۔
"کوئی نہیں جی۔ گرینی نے مجھے بہت سمجھداری کی باتیں بتائی ہیں کہ کبھی اکیلے میں کسی جوان لڑکے کے سامنے آنکھیں بند مت کرنا ۔۔۔ دیکھو ناں۔ رات کا وقت ہے۔ جنگل ہے۔ ہم اکیلے ہیں تو پھر سے میں کیوٹ اور تمیز بھی ہو۔ میری آنکھیں بند دیکھ کے تم نے مجھے پیار کر لیا تو؟"
یہ بات یاد آتے ہی ریحان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اس نے پیار سے سرگوشی کی۔
"پگلی۔"

☼ ☼ ☼

"تم نے تو بہت ہی خوب صورت جگہیں دکھا دیں اب میری باری ہے۔ اتنی حسین جگہ دکھانے والا ہوں تمہیں اور ہاں ابھی مڑ کے مت دیکھنا۔"
ماہر نے اس کا ہاتھ پکڑ کے گاڑی سے اتارا۔ یشا چھو تھما رہا تھا۔
"کیا؟ کون سی جگہ ہے؟"
"پہلے اپنی آنکھیں بند کرو۔"
"آنکھیں بند کروں۔" یشا ماہر کی فرمائش پہ کچھ گم صم ہو گئی۔
"مگر گرینی کہتی ہیں کہ۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔
"کیا کہتی ہیں گرینی؟ آنکھیں بند کرنے سے منع کرتی ہیں وہ کیوں؟"
ماہر اس منطق پہ حیران تھا۔
"وہ کہتی ہیں اگر میں نے آنکھیں بند کیں تو تم۔" کہتے کہتے رک کر اس نے شرما کے نگاہ نیچی کر لی۔
"تو تم ۔۔۔ کیا میں؟"
"نہیں ۔۔۔ کچھ نہیں۔"
یشا نے یہ کہہ کر ہولے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے سے ہیجان ظاہر ہو رہا تھا۔ پلکیں کپکپانے لگیں۔ لبوں کی پنکھڑیاں لرزنے لگیں ۔۔۔ پھر ماہر کے ہاتھ اس کے شانوں پہ ٹھہرے ۔۔۔ یشا نے آنکھیں بھینچ لیں اور زور سے بیچ لیں دل جیسے پسلیوں پہ دستک دینے لگا۔
دھڑ ۔۔۔ دھڑ ۔۔۔ دھڑ۔
شانوں پہ ٹھہرے ماہر کے ہاتھوں نے اسے بڑی نرمی اور آہستگی سے موڑا۔
"اب آنکھیں کھولو۔" ماہر کے مدھر نرم لہجے پہ یشا کا دھڑ دھڑ کرتا دل کپکپایا اور وجود ساکت سا ہو گیا۔
"کھولو یشا ۔۔۔"
"بس؟ کھول دوں آنکھیں؟"
اس کے لہجے میں مایوسی سی آ گئی۔
"ہاں ۔۔۔" ماہر کے جواب پہ اس نے آنکھیں کھولیں اور حیرت سے اس کے چہرے پہ نظر جما دی۔
"نہال ہو گیا۔ مجھے نہیں' وہاں سامنے دیکھو حسین منظر ہے۔"

ماہر نے اس کا چھوا انگلی کی پور سے چھو کر سامنے آبشار کی جانب کیا۔
"ہوں ۔۔۔" یشا کے انداز سے بے دلی ظاہر تھی۔
"کیا ہوا؟ اچھا نہیں لگا؟"
"اچھا ہے۔"
"اوہ ۔۔۔ تمہارے لیے تو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہو گی ۔۔۔ پتا نہیں کتنی بار دیکھ چکی ہو گی ۔۔۔ کیا سوچ رہی ہو میں۔"
"نہیں ۔۔۔ میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔"
"کیا؟"
"یہی ۔۔۔ یہی کہ ۔۔۔ کہ گرینی نے کتنا جھوٹ بولا مجھ سے۔"
اس نے ہونٹ لٹکا لیے۔

☼ ☼ ☼

زیبی کو جیسے ہی تقریب کے ملتوی ہونے کی خبر ملی اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا اور فوراً "کارا" مینشن چلی آئی۔
"فنکشن میں تو میں کبھی بھی کارا آنٹی کو سوری نہ کہتی ۔۔۔ مگر یہ موقع اچھا ہے وہ تو ہیں نہیں ۔۔۔ میں ماہر سے یہی کہوں گی کہ میں اس کی بات ماننے کے یہاں آئی ہوں۔ صاف مکر جاؤں گی کہ مجھے کیا پتا فنکشن نہیں ہو رہا۔"
طے ہی دل میں اپنی تدبیروں پہ شاد ہوتی زیبی نے ایک ملازمہ کو روک کر پوچھا۔
"ماہر کہاں ہے؟"
"وہ تو بہت دیر سے گھر پہ نہیں ہیں۔"
"کارا آنٹی کے ساتھ گیا ہے؟" اسے فکر لاحق ہوئی۔
"نہیں' اسے میڈم کے جانے سے پہلے ہی نکل گئے تھے۔" زیبی نے شک بھرے انداز میں پھر سے پوچھا۔
"کس کے ساتھ؟"
"پتا نہیں۔"
مگر ملازمہ کے جواب سے بھی اسے تسلی نہیں ہوئی ۔۔۔ وہ وہیں بے چینی سے چکر کاٹنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ماہر یشا کی کسی بات پہ کھل کے ہنس رہا تھا اور وہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی مسحور سی ہو کے تک رہی تھی۔
"میں کبھی اتنا نہیں ہنسا یشا تم بہت مزے کی باتیں کرتی ہو۔"
"میں جو کرتی ہوں دل سے کرتی ہوں۔"
"عرصے بعد مجھے تمہارے جیسی دوست ملی ہے۔"
اب کافی دیر کے بعد یشا کو ریحان کی بد اعتمادی پہ عمل کرنا یاد آیا۔
"مگر دوستی کبھی بھی یک طرفہ نہیں ہوتی۔ ہاں محبت ضرور یک طرفہ ہو سکتی ہے جیسے تمہیں زیبی سے ہے۔"
اس نے سرسری سا کہتے ہوئے آگے قدم بڑھائے اور ماہر کے ذہن میں اس کی بات کا بس پہلا حصہ اٹک گیا۔
"دوستی یک طرفہ کیسے ہے؟"
"وہ ایسے کہ تم مجھے اپنی دوست کہہ رہے ہو ۔۔۔ میں نہیں۔ جب تک میں تمہیں اپنا دوست نہ کہہ دوں دوستی کیسے ہو سکتی ہے۔"
"یشا۔" حیران پریشان ماہر نے اسے روکنا چاہا۔
"مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ ابھی بنی چلتی جا رہی تھی۔
"ہاں تو میں چھوڑ آتا ہوں ناں۔"
وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بازو سے تھام کر لے گاڑی کی جانب لے گیا جیسے اس کے انکار کا ڈر ہو۔

پھر راستے میں دوبارہ گفتگو کا سلسلہ وہاں سے جوڑا۔
"کیا تم واقعی اس دوستی کو یک طرفہ سمجھتی ہو؟"
"ہاں ۔۔۔ ابھی تک تو ۔۔۔"
"اور تم نے یہ بھی کہا کہ زیبی سے میری محبت بھی یک طرفہ ہے؟"

"ہاں۔۔۔ وہ تو تم ہو ہی۔"

اس کی حالت دیکھ کے میشا کو اتنا مزا آ رہا تھا کہ اپنی مسکراہٹ اس سے چھپانے کے لیے منہ ہی پھیر لیا۔

"کیا تمہیں واقعی ایسا لگتا ہے؟" وہ پریشان ہوا تھا۔

"ہاں۔۔۔ تمہیں نہیں لگتا کیا؟"

اب میشا نے اس کے چہرے کے تاثرات جانچنا چاہے۔

وہاں ہنوز الجھن سی تھی۔

"پتا نہیں۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید نہیں۔"

پھر اس کے لہجے میں ایک اعتماد سا جھلکا۔

"مگر مجھے یہ ضرور پتا ہے کہ میری تم سے دوستی یک طرفہ نہیں ہے یا نہیں ہونی چاہیے۔ تم کیا کہتی ہو؟"

"ہوں۔۔۔ سوچوں گی۔" کتنی دقت ہو رہی تھی اسے اپنے اندر کی خوشی چھپانے میں۔

"ابھی بھی سوچنے کی ضرورت ہے؟"

"ہاں۔۔۔ کم از کم ایک رات۔"

میشا نہ خود کو زیادہ امتحان میں ڈالنا چاہتی تھی۔ نہ اسے لیے بس ایک رات کی مہلت پہ اکتفا کیا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر صبح میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

اس نے سیف کالج کے بالکل سامنے گاڑی روکی۔ میشا سیڑھیوں پہ قدم جما جما کے اوپر جانے لگی۔ مگر جیسے ہی ماہر کی گاڑی گلی کا موڑ مڑی۔۔۔ وہ ٹیکسی کی جانب بھاگ گئی۔

"پہلے رومان کو تو بتا کے آؤں۔"

☼ ☼ ☼

ماہر کے ہونٹوں سے سارے راستے مسکراہٹ جدا نہیں ہوئی۔۔۔ میشا کی سنگت میں گزارے لمحات اسے تتلی کے پروں جیسا ہلکا پھلکا کر رہے تھے۔۔۔ مگر گھر کے اندر قدم دھرتے ہی وہ حیران رہ گیا۔

زینی اس کی منتظر تھی۔

"زینی۔۔۔ تم؟"

"مجھ سے رہا نہیں گیا ماہر! میں نے سوچا بلاوجہ کی ضد میں تمہیں کھو نہ دوں میں۔۔۔ اس لیے تمہاری بات مانتے ہوئے کارا آنٹی سے سوری کہنے گئی تھی۔ مگر پتا چلا وہ تو ہیں ہی نہیں ورنہ میں تو صرف تمہارے لیے گئی تھی۔ تمہارا کہنا کیسے ٹال سکتی تھی میں۔"

"کیوں نہیں ٹال سکتی تھیں۔"

"کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے ماہر۔"

ماہر ہلکا سا مسکرا دیا۔

"یعنی وہ غلط کہتی تھی کہ میری تم سے محبت یک طرفہ ہے۔"

"کون؟" وہ چونکی۔

"کچھ نہیں۔ چلو میں تمہیں واپس گھر چھوڑ آؤں۔"

اور راستے میں زینی نے کچھ اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس کے دل سے پچھلے سارے گلے بھی دھو ڈالے۔

☼ ☼ ☼

"میں اتنی خوش ہوں۔ اتنی خوش ہوں۔۔۔ اتنی خوش کہ مجھ سے خوشی سنبھالی نہیں جا رہی۔"

وہ دونوں بازو کھولے گول گول گھومتے ہوئے ستاروں بھرے آسمان کو دیکھتی جا رہی تھی۔

اور رومان اس کی آنکھوں میں جگمگ کرتے ستاروں کو دیکھتا جا رہا تھا۔

"تو اس نے کہہ دیا کہ وہ تم سے شادی کرے گا؟" وہ رومان کے سوال پہ گھومتے گھومتے رک گئی۔

"نہیں یہ تو نہیں کہا۔"

"تم سے محبت کرتا ہے یہ تو کہا ہی ہو گا۔"

"نہیں۔۔۔ یہ بھی نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"تو؟"

"اس نے پورے چار گھنٹے میرے ساتھ گزارے رومان۔۔۔ پورے چار گھنٹے۔۔۔ اور ابھی وہ اور بھی کچھ وقت میرے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ مجھ سے دوستی کو اور مضبوط کرنا چاہتا تھا۔"

"اور تم اس پہ خوش ہو گئیں؟"

"ہاں! مگر اس خوشی میں بھی میں آپے سے باہر نہیں ہوئی۔ مجھے تمہاری ساری باتیں یاد تھیں۔ میں نے اس پہ بالکل بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھے اس کا ساتھ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ وہ مجھ سے کل پھر ملنا چاہتا ہے۔"

"تم نے تو فوراً "ہاں" کر دی ہو گی۔" رومان کے لہجے سے بے ساختہ حسد جھلک پڑا۔

"نہیں! قسم سے۔۔۔ مگر منع بھی نہیں کیا۔ یہ کہا کہ میں صبح فون کر کے بتاؤں گی۔"

"اور تم اسے صبح بالکل فون نہیں کرو گی۔" رومان نے تنبیہہ کی۔

"مگر وہ میرے فون کا۔۔۔ میرے جواب کا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"کرنے دو۔۔۔ لینے دو اسے انتظار اور بے چینی کا مزا۔" ایسے کہتا ہوا وہ میشا کو حد سے زیادہ کٹھور لگا۔

"کوئی نہیں جی۔ وہ مزا نہیں۔ تکلیف ہوتی ہے۔"

"محبت میں تکلیف ہی تو مزا دیتی ہے۔"

"او ہو ہو۔۔۔ آئے بڑے۔" میشا نے اسے منہ چڑایا۔ "تمہیں کیسے پتا تم نے کی ہے محبت۔ تم نے کیا ہے کبھی انتظار۔ تمہیں پتا ہے تکلیف میں مزا؟"

میشا کے سوال کے جواب میں رومان کی آنکھوں میں ایک ہلکا سا درد اور ہونٹوں پہ ایک بھیگی بھیگی سی مسکان تھی۔

"میں تو کروں گی اسے فون۔" وہ اپنی ضد پہ اڑی تھی۔

"یہ مناسب وقت نہیں ہے میشا۔" رومان نے سمجھانا چاہا۔

مگر اس پہ اثر ہو تب نا۔

"تو نہیں۔۔۔ یہی ہے مناسب وقت۔ کیا تب کہو گے جب وہ مجھ سے مایوس ہو کر کسی اور کی طرف۔۔۔"

"تجھ سا انسان ہے یا تعلق کا بیگن۔"

رومان نے اس کی بات کاٹ کر آہستہ سے کہا۔

میشا کو غصہ آ گیا۔

"کیا بولا تم نے؟"

"ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ ایک لڑکی کے ذرا اِدھر اُدھر ہونے سے فوراً دوسری جانب لڑھک جاتا ہے۔"

"خبردار۔۔۔ ماہر کو کچھ نہ کہنا۔"

"کہوں گا۔ سوچو زینی اس سے ناراض ہے۔ وہ بجائے اسے منانے کے اس سے اپنی غلط فہمی کو دور کرنے کے تمہارے ساتھ چار گھنٹے گھومتا پھرتا رہا۔"

"ہاں تو کیا اس فضول لڑکی کے لیے جوگ لے لیتا، اور بات سنو میں تو اب صبح تک کا انتظار بھی نہیں کرنے والی۔۔۔ ابھی اسے فون کر کے بتانے والی ہوں کہ میرے دل میں بھی اس کے لیے وہی فیلنگز ہیں جو اس کے دل میں میرے لیے ہیں۔"

"یعنی تم یہ بتانا چاہتی ہو اسے کہ۔۔۔"

گاڑی کے بانٹ پہ وہ دونوں بات کرتے کرتے رک گئے۔

گیٹ کے نزدیک ماہر زینی کو اپنی گاڑی سے اتار رہا تھا۔ دونوں کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



نمرہ احمد

جنت کے پتے

سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں۔ حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکا گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سبین پھپھو کے بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ سبین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ وہ کئی سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب ہی بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تایا فرقان کے بیٹے داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا رہا ہے۔ حیا ہاشمی کے خلاف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے۔ وہاں میجر احمد اس کی شکایت پر وہ ویڈیو ہٹا رہا ہے۔ داور کی شادی میں سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کی غرض سے تعارف کرواتے ہیں۔ وہ ولیمہ والے دن حیا سے بیہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی حیا کی عزت بچاتا ہے۔ ڈولی اور اس کا دوست ہنگی حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتے رہتے ہیں۔ حیا یورپی یونین کی طرف سے ملنے والے اسکالرشپ پر اپنی کلاس فیلو خدیجہ عرف ڈی جے کے ساتھ ترکی جاتی ہے۔ اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں اور ابوظہبی ائیرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ ترک لڑکی ہالے ان کو ہر جگہ گائیڈ کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق مسز عبداللہ حیا اور ڈی جے کی دعوت کرتی ہیں۔ وہاں حیا کو پاشا کے متعلق پتا چلتا ہے۔ حیا جہان کے گھر جاتی ہے۔ جہان سرد مزاجی سے ملتا ہے تاہم سبین پھپھو بہت محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو سفید پھول ملتے ہیں۔ جہان خفا ہوتا ہے۔ جہان کو حیا کے ساتھ

مکمل ناول



اپنے نکاح کا علم ہے۔ اپنے باپ کے غدار ہونے پر اسے شرمندگی ہے۔ ویلنٹائن کی رات حسب معمول حیا کو سرخ والے سفید پھولوں کے ساتھ کاغذ پر حیا کے دوست مستقیم کریسوں کا رس لگا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ کو تپش پہنچاتی ہے تو وہاں "اے آر پی" لکھا ہوتا ہے۔ حیا، جہان اور ڈی جے بیوک ادا کی سیر پر جاتے ہیں۔ وہاں ایک بنگلے پر اے آر پاشا لکھا ہوتا ہے۔ ایک بچہ حیا کا پرس چھین کر اسی بنگلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ حیا اس کے پیچھے پیچھے اس بنگلے میں داخل ہو جاتی ہے، جہاں اس کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک شادی میں پاشا نے پہلی بار حیا کو دیکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ سفید پھول بھیجے تھے اور میجر احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو ہٹائی تھی۔ میجر احمد کرنل گیلانی کا بیٹا ہے۔ ننھے جہان کے ابا پھنسا کر ترکی چلے گئے تھے۔ پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب کبھی حیا کے راستے میں نہیں آئے گا اور اسے اس کا گفٹ دے کر جانے دیتی ہے۔ حیا پاشا سے جہان کے ریسٹورنٹ کے لیے مدد مانگتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسے جہان کے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت پچھتاتی ہے۔ ترکی میں ڈی جے مر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ حیا اور جہان بھی پاکستان آجاتے ہیں۔ جہان سے حیا کی والدہ کے علاوہ تمام لوگ سرد مہری سے ملتے ہیں، تاہم آخر میں سلیمان صاحب کے دل میں بھی جہان کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

سونیا کی شادی والے دن پنکی حیا کو ڈولی کی طرف سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا باکس دیتا ہے، جو ایک پہیلی سے کھلے گا اور جب تک وہ کھولے گی ڈولی اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ وہ پہیلی حیا کو کھولنے کی حیا بہت کوشش کرتی ہے۔ جہان سے بھی کسی ہے۔ پھر ترکی لے جاتی ہے۔ ڈبا کھلوانے کے لیے حیا مستقیم کی مدد لیتی ہے۔ ڈبے کا کوڈ یونانی مفکر ہیراقلیطس کے کسی قول میں پوشیدہ ہے۔ مسز عبداللہ کے گھر سے نکلتے ہوئے کوئی اسے اغوا کر لیتا ہے۔ وہاں ایک روز کی حیا کے سر پر گرم گرم ویکس ڈالتا ہے اور گرم سلاخوں سے اس کے بازو پر WHO لکھ دیتا ہے۔ حیا عثمان شبیر کے بیٹے سفیر کو فون کرتی ہے۔ وہ پاشا کو اطلاع دیتا ہے اور حیا وہاں سے پاشا کے بنگلے پر پہنچ جاتی ہے جہاں عائشے اور بہارے اس کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مختلف پہیلیوں پر رکھے گئے کوڈ والے ووڈن باکس عائشے اور بہارے بناتی ہیں۔ حیا کے اغوا سے سب بے خبر ہیں سوائے میجر احمد کے۔ میجر احمد حیا کو بتا دیتا ہے کہ وہ ڈی جے کی ... اور ڈبے پر پہیلیاں بھی وہی لکھتا ہے۔ جہان حیا سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور روحیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ روحیل سے تصدیق کرتی ہے۔ وہ اقرار کر لیتا ہے کہ جہان کو کال کی تھی اور اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ ادم کی گمشدگی ہو جاتی ہے۔ عائشے اور بہارے کی غیر موجودگی میں حیا پاشا کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے۔ اسی وقت پاشا کا فون آتا ہے اور اس کے کمرے میں جانے پر حیا کو ڈانٹتا ہے۔

قسط، 8

پاشا کے لیے یہ حملہ قطعاً غیر متوقع تھا۔ گو کہ ردعمل کے طور پر اس نے چہرہ فوراً پیچھے کیا تھا، اس کے باوجود کافی اس کے رخسار کو جھلسا گئی تھی۔

"چابک، چابک۔" (جلدی، جلدی) ہالے نے اس کا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہی لمحے وہ دونوں باہر بھاگ گئی تھیں۔

کافی گرم تھی اور اس نے پاشا کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔ وہ بلبلا کر چہرہ ہاتھوں سے صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے گارڈ اور ویٹرز اس کی جانب لپکے تھے۔ یہ وہ آخری منظر تھا جو حیا نے باہر نکلنے سے پہلے دیکھا تھا۔

"وہ نہیں آرہا، جلدی چلو!" گلی میں لوگوں کے رش میں سے رستہ بناتے ہوئے تیز قدموں سے دوڑتے ہالے بار بار گردن موڑ کر دیکھتی تھی۔

"یہ برگر کنگ سامنے ہی ہے، جلدی سے اس میں چلے جاتے ہیں، اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلے۔"
"مگر تمہیں اس پہ کافی الٹنے کی کیا ضرورت تھی؟" ہالے جھنجلائی۔
(کچھ پرانے حساب اتارنے تھے۔)
"تم خود ہی تو میرے کپ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔"
"میرا مطلب تھا کہ کپ چھوڑو اور باہر نکلو۔"
وہ مزید بحث کیے بنا ہاتھ سے ہالے کو ساتھ کھینچتی برگر کنگ کا گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ وہ دونوں ایسے اندھا دھند طریقے سے دوڑتی آئیں اور استقبالیہ کاؤنٹر پہ آکر دم لیا کہ وہاں موجود لڑکا قدرے گھبرا گیا۔
"کیا ہوا؟ جہان کہیں ہے ادھر۔" وہ سمجھا وہ دونوں جہان کے لیے آئی ہیں۔
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!" حیا نے پھولے تنفس کے درمیان ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تمہارے کچن میں کوئی دروازہ ہے جو پچھلی گلی میں کھلتا ہو؟"
"کچن میں نہیں، مگر پینٹری میں بیک ڈور ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔" شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں کسی سے بچنا چاہ رہی ہیں، سو بنا کوئی مزید سوال کیے وہ انہیں اپنی رہنمائی میں پینٹری میں لے آیا۔
پینٹری مستطیل سی تھی اور اس میں اسٹوریج شیلف اور بڑے بڑے فریزر رکھے تھے۔ کچھ دوسرا کباڑ بھی تھا۔
"وہ رہا دروازہ۔" اس نے ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا اور ایک مشکوک نظر ان پہ ڈالتا واپس پلٹ گیا۔
ہالے نے پینٹری سے کچن میں کھلنے والا دروازہ بند کیا اور پھر قدرے تذبذب سے پچھلی گلی کے دروازے کو دیکھا۔
"ابھی باہر نکلنے کا فائدہ؟ گورسل تو ڈیڑھ بجے آئے گی، تب تک یہیں بیٹھتے ہیں۔" وہ ایک کونے سے دو پلاسٹک کی کرسیاں اٹھا لائی اور کمرے کے وسط میں فرش پہ آمنے سامنے رکھیں۔
"ویسے اب میں سوچ رہی ہوں کہ تم نے ٹھیک ہی کیا۔ استقلال جدیسی میں اکثر ایسے ڈرنک لوگوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے جو عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔"
"تب ہی میں نے کافی الٹی، تاکہ وہ فوراً ہمارے پیچھے نہ آسکے۔"
وہ کرسی پہ نہیں بیٹھی، بلکہ دروازے کے قریب چلی آئی تھی۔ دروازے کے ساتھ ایک چوکور کھڑکی نما روشن دان تھا۔ وہ بہت اونچا نہیں تھا، بلکہ حیا کے چہرے کے بالکل برابر آتا تھا۔ اس نے روشن دان کی شیشے کی سلائیڈ ایک طرف کی تو ٹھنڈی ہوا اور پچھلی گلی کی آوازیں اندر آنے لگیں۔
وہ استقلال اسٹریٹ کی بغلی گلی تھی۔ استقلال اسٹریٹ کی دونوں جانب ایسی ہی گلیاں تھیں جو ذرا تنگ اور چھوٹی مگر دونوں اطراف سے عمارتوں سے گھری تھیں۔
"اب تم مجھے بتاؤ، یہ منگنی کا کیا قصہ ہے؟" ذرا سکون کا سانس ملا تو ہالے کو ادھوری بات یاد آگئی۔ وہ پرجوش سی کرسی پہ آگے ہو کر بیٹھی۔
حیا نے پلٹ کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔ جو تناؤ اور پریشانی وہ تھوڑی دیر قبل محسوس کر رہی تھیں، وہ پینٹری کی فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔
"بتاتی ہوں۔" وہ کرسی پہ آبیٹھی اور گورسل کے آنے تک وہ سارا قصہ سنا چکی تھی۔ بس میں بھی سارا راستہ وہ دونوں یہی باتیں کرتی رہیں۔
"اگر وہ جانتا تھا تو اس نے پہلے اظہار کیوں نہیں کیا؟"
"اب کر دیا، یہی بہت ہے۔ وہ بہت پریکٹیکل اور کم گو سا آدمی ہے۔ اس سے وابستہ توقعات میں نے اب کم کر دی ہیں۔" اس نے شانے اچکا کر کہا تھا۔
کمرے میں آکر ہالے تو سونے چلی گئی۔ ٹالی اور چیری بھی تب تک سو چکی تھیں، جبکہ اس نے پہلے تو

اپنی میز کی دراز میں اس ڈبیا کی تصدیق کی جس میں موبائل شاپ کے لڑکے نے جی پی ایس ٹریسر ڈال کر دیا تھا۔ وہ دراز میں ہی رکھی تھی جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ پھر پاشا کو کیسے پتا چلا کہ وہ کہاں ہے؟ ہو سکتا ہے اس کی کسی اور شے میں بھی ٹریسر ہو' یا پھر وہ محض اتفاق ہو' لیکن اس کے اتفاقات تو کم ہی ہوتے تھے' اتنا تو اسے یقین تھا۔

جو بھی ہے' وہ ہر شے کو ذہن سے جھٹک کر اپنا پزل باکس نکال کر دبے قدموں باہر آگئی۔ بالکونی کی بتی اسے دیکھتے ہی جل اٹھی۔ وہ وہیں پہلے زینے پہ بیٹھ گئی اور پزل باکس چہرے کے سامنے کیا۔

چاروں پہیلیاں ایک چوکور کی صورت میں باکس کی چاروں اطراف پہ لکھی تھیں۔ چوکور' اسکوائر' تاکسم اسکوائر۔

دھڑکتے دل اور نم ہتھیلیوں کے ساتھ وہ سلائیڈز اوپر نیچے کرنے لگی۔ Taksim کا آخری حرف ایم جیسے ہی جگہ پہ آیا۔ کلک کی آواز کے ساتھ باکس کی دراز اسپرنگ کی طرح باہر نکلی۔

وہ پلک جھپکے بے یقینی سے باکس کے اندر دیکھ رہی تھی۔ اس نے میجر احمد کا پزل حل کر لیا تھا۔ وہ باکس کھول چکی تھی۔

دراز میں ایک سفید مستطیل کاغذ رکھا تھا۔ وہ کاغذ پوری دراز پہ فٹ آرہا تھا۔ اس نے دو انگلیوں سے پکڑ کر کاغذ باہر نکالا۔ بالکونی کی مدھم روشنی میں وہ کاغذ پہ لکھی تحریر بنا کسی دقت کے پڑھ سکتی تھی۔

Two full stops under the key

(چابی کے نیچے دو فل اسٹاپس)

اس نے بے یقینی سے وہ سطر پڑھی جو کاغذ کے اوپری حصے پہ لکھی تھی۔ کیا یہ کوئی مذاق تھا؟ اپریل فول؟ اس کاغذ کے ٹکڑے کے لیے اس نے اتنی محنت کی؟

کاغذ کے چاروں کونوں میں چھوٹا چھوٹا سا چھ (6) کا ہندسہ بھی لکھا تھا۔ اس نے کاغذ پلٹا۔ اوپر کی پشت پہ بالکل وسط میں ایک بار کوڈ چھپا تھا۔ سیاہ عمودی ایک انچ کی لکیریں اور ان کے نیچے ایک سیریل نمبر' شیمپو' لوشن اور ان گنت دوسری اشیا کے لفافوں اور ڈبوں کے کونوں میں' اکثر ایسے ہی بار کوڈ چھپے ہوتے تھے اس بار کوڈ کا وہ کیا کرے گی؟

مگر نہیں' باکس میں کچھ اور بھی تھا۔

دراز کی زمین سے ایک لمبی سی لمبی اور عجیب وضع کی چابی چپکی تھی۔ اس نے دو انگلیوں سے چابی کو کھینچا تو وہ جو گوند کے محض ایک قطرے سے چپکائی گئی تھی' اکھڑ کر حیا کے ہاتھ میں آگئی۔ حیا نے دیکھا' چابی کے پیچھے موجود لکڑی پہ دو موٹے موٹے نقطے لگے تھے اور ان کے درمیان لکھا تھا۔ "Emanet"

پھر کوئی پزل؟ پھر پہیلیاں؟ چابی تلے دو فل اسٹاپ؟ وہ دونوں نقطے اسے مل گئے تھے مگر اب وہ ان کا کیا کرے؟ کاش! وہ یہ سب اٹھا کر میجر احمد کے منہ پہ دے مار سکتی۔

یہ چابی کس شے کی تھی؟ کسی کمرے' کسی گاڑی' کسی گھر کی؟ اگر پہاڑ کھودنے پہ مرا ہوا چوہا ہی نکلنا تھا تو بہتر تھا وہ اسے توڑ کر ہی نکال سکتی۔ اچھا مذاق تھا۔

اس نے خفگی سے دراز بند کی تو وہ پھر باہر نکل آئی۔ اس نے دوبارہ دراز کو اندر دھکیلا اور اسے پکڑے پکڑے سلائیڈز اوپر نیچے کیں۔ کوڈ ورڈ کا سات حرفی لفظ بگڑ گیا۔ باکس پھر سے لاک ہو گیا۔ اس نے ہاتھ ہٹایا تو دراز باہر نہیں آئی۔

واپس بستر پہ لیٹتے ہوئے وہ بے حد کوفت میں گھری تھی۔ ایک چابی سے کوئی اور پزل باکس کھلے گا اس سے کوئی اور اس سے کوئی اور....

کیا وہ ساری زندگی مقفل ڈبے ہی کھولتی رہے گی؟ اچھا مذاق تھا۔

پھر وہ ذہن سے یہ سوچیں جھٹک کر پاشا کے بارے میں سوچنے لگی۔ ایک مطمئن مسکراہٹ خود بخود اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

بہت اچھا کیا اس نے کافی الٹ کر۔ وہ اسی قابل تھا۔

حقیقت میں اپنے روبرو پاشا کو دیکھتے ہوئے اسے تصاویر سے بہتر لگا تھا۔ اس کا قد کافی اونچا تھا۔ چھ فٹ سے بھی اوپر اور لباس بھی مناسب تھا۔ آنکھوں پہ بغیر فریم کی گلاسز لگائے اور ذرا ذرا سی بڑھی شیو۔

وہ بظاہر دیکھنے میں بس ایسا تھا کہ مقابل اس کی عزت کرے۔ مگر اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ہینڈسم تو وہ اسے کبھی نہیں لگا تھا۔ نہ ہی اس کی شخصیت میں کوئی سحر تھا۔ جس کی باتیں بہارے کرتی تھی۔ وہ دیکھنے میں بس ایک درمیانے درجے کا ترک لگتا تھا یا شاید استقلال اسٹریٹ میں چہل قدمی کرنے کے لیے اس نے خود کو ایک عام ترک کی طرح ڈریس اپ کر کے کیموفلاج کر رکھا تھا۔ شاید یہی بات ہو۔

وہ ان ہی سوچوں میں گھری کب نیند کے سمندر میں ڈوب گئی' اسے علم ہی نہ ہو سکا۔

✲ ✲ ✲

اس نے چابی کی ہول میں گھمائی اور پھر الماری کا پٹ کھولا۔ سامنے والے خانے میں جہاں چند کاغذات کے اوپر اس نے جلی ہوئی اطراف والا پزل باکس رکھا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کے ذہن نے کھوئی کڑیوں سے کڑیاں ملائیں' اگلے ہی پل وہ پٹ بند کر کے باہر آیا تھا۔

"بہارے گل!" سیڑھیوں کے دہانے پہ کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔

بہارے کافی دنوں سے اس آواز کی منتظر تھی مگر عبدالرحمن کو اپنی مصروفیت میں الماری کھولنے کا موقع شاید آج ملا تھا۔ اسی لیے اب آواز سن کر وہ جو ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی' تابعداری سے اٹھی اور سر جھکائے مودب انداز میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

تیسری منزل کے دہانے پہ پہنچ کر اس نے جھکا سر اٹھایا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی ہوٹل سے آیا تھا' سوٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے' کوٹ کے بغیر تھا۔ اسے متوجہ پا کر عبدالرحمن نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

"کیا بہارے گل مجھے بتانا پسند کریں گی کہ وہ پزل باکس کہاں ہے؟"

"نہیں پسند کروں گی۔" بہارے نے سادگی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں نے وہ حیا کو واپس کر دیا۔"

وہ چند لمحے کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ مگر بہارے جانتی تھی کہ اسے دھچکا لگا ہے۔

"کس کی اجازت سے؟"

"وہ تمہاری چیز نہیں تھی عبدالرحمن! جس کی تھی میں نے اسے دے دی۔"

وہ چند ثانیے اسے دیکھتا رہا' پھر اس کے سامنے ایک پنجے کے بل فرش پہ بیٹھا اور سیدھا بہارے کی آنکھوں میں دیکھا۔

"کیا تم نے مجھ سے رازداری کا وعدہ نہیں کیا تھا؟"

"میں رحمن کے بندے کو خوش کرنے کے لیے رحمن کو ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔" اس کی بڑی بڑی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"جو جتنا اچھا جھوٹ بولتا ہے بہارے! یہ دنیا اسی کی ہوتی ہے۔"

"لیکن پھر اس کی آخرت نہیں ہوتی' یہ عائشے گل کہتی ہے۔"

وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔

"پھر تو مجھے تمہارے دوسرے وعدے کا بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔"

"نہیں! ہم واقعی جزیرے پہ کسی سے تمہارے بارے میں بات نہیں کرتے۔"

"وہ نہیں' ایک اور وعدہ بھی تھا ہمارے درمیان' ہمارا آفیشل سیکرٹ۔"

بہارے کے کندھوں پہ ایک دم بہت بھاری بوجھ سا آگرا۔ اس نے اداسی سے عبدالرحمن کو دیکھا جو

منتظر سا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بہت پہلے عبدالرحمن نے اس سے عہد لیا تھا کہ اگر وہ مر گیا تو وہ اسے جنازہ بھی دے گی اور اس کی میت کو دفن بھی کرے گی۔

"تم سچ بولنے والی بہارے گل پہ اعتبار کر سکتے ہو۔ پورا ادالار' بلکہ پورا ترکی تمہیں چھوڑ دے' مگر بہارے گل تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گی۔"

"اور ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کرو۔ تم کہو' کون عبدالرحمن؟ کہاں کا عبدالرحمن؟"

"تم ایسی باتیں مت کیا کرو' مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"اور اس بارے میں بھی عائشے گل کی کوئی کہاوت ضرور ہوگی۔" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"اس کو چھوڑو' وہ تو بہت کچھ کہتی رہتی ہے۔ میں دوسرے کان سے نکال دیتی ہوں۔" اس نے ناک پہ سے مکھی اڑا کر گویا عبدالرحمن کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ "وہ تو مجھ سے اتنی خفا ہوئی تھی کہ میں نے تم سے شادی کی بات کیوں کی۔" لمحے بھر کو رک کر بہارے ذرا تشویش سے بولی۔ "تم مجھ سے شادی کرو گے نا عبدالرحمن؟" ساتھ ہی اس نے گردن موڑ کر ادھر ادھر دیکھ بھی لیا۔ عائشے قریب میں کہیں نہیں تھی۔

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"مگر میں تمہاری نئی دوست میں دلچسپی رکھتا ہوں۔"

"وہ تم سے شادی کیوں کرے گی؟ وہ اپنے کزن کو پسند کرتی ہے اور اس کا کزن بہت ہینڈسم ہے۔"

بہارے کو جیسے بہت غصہ آیا تھا۔

"اور تمہاری دوست کو عبدالرحمن جیسا کوئی بدصورت نہیں لگتا ہوگا' ہے نا؟"

"یہ سچ ہے۔ اسے تم بالکل پسند نہیں ہو' مگر مجھے تم سے زیادہ کوئی ہینڈسم نہیں لگتا۔"

مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ بہارے نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

"سنو! وہ حیا کے پزل باکس پہ جو پہیلی کھدی تھی' وہ کس نے لکھی تھی؟" وہ جاتے جاتے ذرا چونک کر واپس پلٹا۔

"مجھے کیسے علم ہو سکتا ہے؟ میں نے تو ابھی تک اس باکس پہ غور ہی نہیں کیا تھا۔"

"نہیں' دراصل میرے باکس کی پہیلی اور حیا کی پہیلی بالکل ایک سی لکھی تھیں' تب ہی حیا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میری پہیلی کس نے لکھی ہے؟"

وہ واقعتاً چونکا تھا۔ اس نے یہ محسوس کیوں نہیں کیا؟ وہ یہ بات نظرانداز کیوں کر گیا؟

"پھر تم نے کیا کہا؟ بلکہ ٹھہرو! تم نے کہا ہوگا کہ عبدالرحمن کے پاس ہر کام کے لیے بہت سے بندے ہوتے ہیں۔"

بہارے کا منہ کھل گیا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"بہارے گل! میں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے تمہیں جانتا ہوں۔" وہ کہہ کر رکا نہیں۔ بہارے نے آزردگی سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ اس سے خفا تھا' وہ جانتی تھی مگر عائشے کہتی تھی' بندہ خفا ہو جائے مگر یہ بہتر ہے بجائے اس کے کہ رحمٰن خفا نہ ہو۔

"اف!" اس نے سر جھٹکا۔ "عائشے گل کی کہاوتیں!!"

☼ ☼ ☼

آڈیٹوریم اسٹوڈنٹس سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ باسکٹ بال کا میچ جاری تھا۔ کورٹ میں لڑکے نارنجی گیند اچھالتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ تماشائیوں کی نگاہیں بھی گیند پہ لگی تھیں۔ مخصوص شور' ہنگامہ اور رش۔

حیا ان سب سے بے نیاز' اپنا بیگ تھامے کرسیوں کی قطاروں کے درمیان سے راستہ بناتی آگے بڑھ رہی تھی۔ امتحان قریب تھے اور ان دنوں وہ اتنی مصروف رہی تھی کہ معتصم سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ابھی لطیف نے بتایا کہ وہ آڈیٹوریم میں ہے تو وہ یہاں

آئی۔ سو ویسے بھی اب وہ فلسطینی لڑکوں سے بات چیت میں ذرا احتیاط کرتی تھی۔

نہیں' وہ تو ویسے ہی ڈیسنٹ اور بھائیوں جیسے تھے' مگر وہ وہی نہیں رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اسکارف لیتی ہے' سو اس کے نام کے ساتھ کوئی غلط بات جڑی تو بدنام اس کا اسکارف ہوگا۔ اس لیے اس کی کوشش ہوتی کہ وہ معتصم یا حسین وغیرہ سے تنہائی میں نہ ملے بلکہ کسی ایسی جگہ پہ ملے' جہاں سب سامنے ہی ہوں۔

وہ تیسری قطار میں بیٹھا تھا۔ نگاہیں کھیل پہ مرکوز کیے کرسی پہ آگے ہو کر بیٹھا وہ میچ کی طرف متوجہ تھا۔ اس کے بائیں طرف دو کرسیاں خالی تھیں۔ وہ ایک کرسی اپنے اور اس کے درمیان چھوڑ کر بیٹھ گئی اور بیگ سے پزل باکس نکال کر اس کے سامنے کیا۔ وہ چونکا۔

"میں نے اسے کھول لیا۔ اس کا کوڈ "ناظم" تھا۔ کیا تم آگے میری مدد کر سکتے ہو؟"

"او' سلام! مجھو' میں دیکھتا ہوں۔" معتصم نے دراز کھولی اور کاغذ پہ لکھی تحریر پڑھی پھر اسے پلٹا۔

"بار کوڈ؟ بار کوڈ تو اشیا کے پیکٹس پہ لگا ہوتا ہے' جسے کوئی مشین ہی ڈی کوڈ کر سکتی ہے۔ یہ بار کوڈ بھی کسی مشین کے لیے ہے تاکہ وہ اسے پہچانے' مگر کدھر؟ ہوں۔ شاید اس سطر سے کوئی مدد ملے۔" وہ پھر سے کاغذ پلٹ کر سطر پڑھنے لگا' پھر نفی میں سر ہلا کر دراز سے چابی اٹھائی۔

"بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ یہ سطر اس چابی تلے لکھے نمبر اور اس لفظ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔"

"اور یہ لفظ کسی تالے کی طرف اشارہ کر رہا ہے' مجھے emanet کہتے کسے ہیں؟" اس نے ذرا بجھے بجھے سے پوچھا۔

"یہ امانت ہے نا' ہمارا والا امانت' ترک میں بھی اس کو یہی کہتے ہیں۔" اس نے بے اختیار گہری سانس اندر کھینچی۔

ایک تو ترک اور اردو کی مماثلت!

"مجھے یہ لگتا ہے حیا! کہ اس نے تمہاری کوئی امانت کہیں لاک لگا کر رکھی ہے اور اس کی چابی تمہیں دی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی عظیم الشان سا محل ہو یا کوئی برانڈ نیو گاڑی۔" وہ اپنی بات پہ خود ہی دھیرے سے ہنسا۔

"مجھے ایسا کچھ بھی نہیں لگتا۔"

"ہو سکتا ہے اس باکس میں کوئی تحریر لکھائی ہو اور تم نے دیکھا نہ ہو۔"

"میں کوشش کر چکی ہوں۔ اس ایک لفظ امانت کے سوا اس میں کچھ نہیں لکھا ہے۔" اس نے باکس میں ساری چیزیں واپس ڈالیں اور اسے بند کر کے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ معتصم مزید اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اب جو بھی کرنا تھا اسے خود کرنا تھا۔

"امتحانوں کے بعد کچھ سوچوں گی۔ ابھی تو اس قصے کو بند ہی کر دیتے ہیں۔" جواباً معتصم نے مسکرا کر شانے اچکا دیے۔

وہ آڈیٹوریم سے نکل رہی تھی جب اس کا موبائل بجا۔ لالہ اس وقت تو فون نہیں کرتی تھیں' پھر؟ اس نے بیگ سے موبائل نکال کر دیکھا۔ یہ وہی پاکستان کا نمبر تھا جس سے پہلے بھی میجر احمد نے فون کیا تھا۔

"ہیلو!" کرسیوں کی قطار سے راستہ بناتے وہ ذرا اونچا بولی تھی۔ ارد گرد کے شور میں میجر احمد کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ حیا؟" وہی نرم' خوب صورت' ٹھہرا ہوا انداز۔ اب وہ اس سے چڑتی نہیں تھی بلکہ ذرا احتیاط سے بات کرنے لگی تھی۔

"وعلیکم السلام! میری خیریت تو آپ کو پتا لگتی ہی رہتی ہوگی۔" وہ باہر کاریڈور میں تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ جواباً وہ دھیرے سے ہنسا۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ کو لگتا ہے' مجھے آپ کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے؟"

"مجھے لگتا تو خیر یہی ہے کہ آپ کو اور پاشا کو میرے

علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔"

"ایسے میں ہیں شخصیت؟"

"کوئی مذاق کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ؟ میں کتنی پہیلیاں بوجھوں؟" اس نے زچ سے انداز میں کہتے ہوئے اپنا بیگ اتار کر سماحی کی عمارت کی بیرونی سیڑھیوں پہ رکھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ بعض چیزیں اتنی حساس ہوتی ہیں کہ انہیں بہت رازداری سے کسی کے حوالے کرنا ہوتا ہے' تاکہ وہ غلط شخص کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ویسے ایک گھنٹے کا کام تھا' آپ نے ہی اتنے دن لگا دیے۔"

"خیر! آپ کا پزل تو میں حل کر ہی لوں گی مگر کیا گارنٹی ہے کہ آخر میں مجھے "سپرل فل" کے الفاظ نہیں ملیں گے؟" وہ وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی تھی۔ استنبول کی دھوپ اردگرد سبزہ زار کو سنہری پن عطا کر رہی تھی۔

"اتنا غیر سنجیدہ سمجھتی ہیں آپ مجھے؟"

"کیوں؟ کیا آپ وہی نہیں ہیں جو خواجہ سرا بن کر مجھ سے ملے تھے؟ کبھی شرمندگی نہیں ہوئی آپ کو اس حلیے پہ؟"

"شرمندگی کیسی؟ میں خواجہ سرا بن کر آپ سے ملا ہی تھا' خواجہ سرا بن کر کوئی محفل تو نہیں لوٹی تھی۔" وہ شاید برا مان گیا تھا۔

"مگر خواجہ سرا بننا بذات خود بہت عجیب ہے۔"

"کیوں؟ کیا خواجہ سرا انسان نہیں ہوتے؟ کیا وہ جانور ہوتے ہیں؟ میں نے ان کا حلیہ اپنایا تھا مگر آپ کے لیے نہیں۔ میں تو اپنے کام سے وہ سب بنا تھا۔ بس اسی دوران ... آپ مل گئیں۔"

"آپ اپنے کام خواجہ سرا بن کر نکلواتے ہیں؟" وہ محظوظ ہوئی۔ پہلی دفعہ کوئی سوال اس نے بچوں کی سی دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"کبھی میرے آفس آئیے گا۔ میں آپ کو اپنے کام کی تفصیل بتاؤں گا۔"

"آپ کے آفس میں کبھی نہیں آؤں گی' مگر وہ امانت'

وہ کیسے ڈھونڈوں میں؟"

"جو لکھا ہے' اس پہ غور کریں۔ وہ ڈول کی امانت ہے اور وہ اسی کو ملنی چاہیے جو اپنی صلاحیتوں سے خود کو اس کے قابل ثابت کر سکے۔ کیا آپ اتنی باصلاحیت ہیں؟"

"گڈ بائی!" اس نے چبا کر کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ سماحی کی دھوپ ابھی تک سیڑھیوں پہ اس کے قدموں میں گر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کلینک کی انتظار گاہ میں ٹھنڈی سی خنکی چھائی تھی۔ وہ کاؤچ پہ خاموش سی بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ سبانجے کے توسط سے اس نے ایک ڈرماٹولوجسٹ سے وقت لیا تھا۔ اس کے ہاتھ بظاہر ٹھیک نظر آتے تھے' اور عائشے کے دیے گئے لوشن کام کر رہے تھے مگر ہاتھ لگنے پہ پہلے سے زیادہ دکھتے اور سرخی جلد جو خراب ہوئی تو وہ الگ۔

حیا نے اپنا پرس ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ ٹریسر والی بات ذہن میں ہی تھی۔ اب وہ اسے استنبول میں اپنے ساتھ لے کر نہیں جاتی تھی۔

تب ہی اس کے ساتھ والی نشست پہ ایک سیاہ عبایا والی لڑکی آبیٹھی۔ بیٹھتے ہی اس نے چند گہرے سانس لے کر نقاب کھول لیا' پھر ٹشو سے نقاب کے اندر منہ تھپتھپانے لگی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پیدل آئی ہے اور بہت تھک گئی ہے۔

حیا لاشعوری طور پہ نگاہوں کا زاویہ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ جانے کیوں آج کل وہ عبایا اور حجاب والی لڑکیوں کو بہت غور سے دیکھا کرتی تھی۔ استنبول میں ایسی لڑکیاں بہت کم ہی نظر آتی تھیں' البتہ اسکارف اور لانگ اسکرٹس والی مل جاتیں۔ اکثریت ایسی لڑکیوں کی ہوتی جن میں سے ایک اس کے سامنے کاؤچ پہ بیٹھی تھی۔ مختصر اسکرٹ' بنا آستین کے بلاؤز اور خوب صورت بال۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی گھٹنے پہ پھیلا میگزین پڑھنے میں مگن تھی۔ استنبول کی

ماڈرن لڑکی۔ اس کے اسکرٹ کا رنگ نارنجی تھا' بالکل ان دو گولڈن فش جیسا جو ان دونوں کاؤچز کے درمیان رکھی میز پہ ایکوریم میں تیر رہی تھیں۔ ننھی ننھی سی نارنجی مچھلیاں جن کی زندگی جن کی سانس اور جن کی تو سب پانی تھا۔

عبایا والی لڑکی اب پرس کھول کر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ حیا ابھی تک اسے یوں ہی دیکھ رہی تھی۔

"الحمدللہ" اس نے پرس سے ایک اورنج جوس کی بوتل نکالی اور اس کا ڈھکن اتارا' پھر ذرا رکی اور حیا کی طرف بڑھائی۔

"نو تھینک یو۔" وہ ذرا سنبھل کر سیدھی ہوئی۔

وہ لڑکی مسکرا کر بوتل میں اسٹرا ڈالنے لگی۔ سیاہ نقاب میں اس کی سرمئی آنکھیں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔

"آپ ہمیشہ یہ عبایا کرتی ہیں؟" رہ نہیں سکی اور پوچھ ہی بیٹھی۔

"ہوں۔" نقاب تلے ایک گھونٹ لیتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کو گھٹن نہیں ہوتی اس میں؟"

"میرا اللہ نے اس کے لیے کھول دیا ہے' سو گھٹن کیسی... اور ویسے بھی مسلمان لڑکی تو بہت مضبوط ہوتی ہے۔" اس نے بوتل کا ڈھکن بند کرتے ہوئے کہا۔ "مگر مجھے تو نقاب کا سوچ کر ہی گھٹن ہوتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے' یہ سب صرف آپ کے ذہن میں ہو۔"

"آپ کے ذہن میں بھی ایسی باتیں آتی ہوں گی نا؟" وہ اس کی طرف رخ موڑے غیر ارادی طور پہ بحث کرنے لگی تھی۔

"مگر بہت پڑھے لکھے' ماڈرن قسم کے لوگوں کے درمیان بیٹھے آپ کو احساس کمتری نہیں ہوتا؟" ساتھ ہی ایک نگاہ اس نے ایکوریم کے پار بیٹھی ترک لڑکی پہ ڈالی جو ابھی تک اپنے میگزین میں گم تھی۔

"ماڈرن قسم کے لوگ تو میرے جیسے ہی ہوتے ہیں نا۔ میری شریعت تو دنیا کی سب سے ماڈرن (جدید) شریعت ہے۔ احساس کمتری تو انہیں ہونا چاہیے' جو جاہلیت کے زمانے کا تبرج کرتے ہیں۔ تبرج سمجھتی ہو؟"

اسے اندازہ تھا' پھر بھی اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"تبرج۔ اونہہ۔ کیسے سمجھاؤں؟" اس لڑکی نے لمحے بھر کو سوچا۔ "تم نے دبئی کے وہ اونچے اونچے ٹاورز تو دیکھے ہوں گے۔ برج العرب' برج الخلیفہ؟"

"ہاں تصاویر میں۔"

"بس! اسی برج سے یہ تبرج نکلا ہے۔ کسی شے کو اتنا نمایاں اور خوب صورت بنانا کہ وہ دور سے نظر آئے۔ وہ صدیوں پہلے یوسف علیہ السلام کے مصر کی عورتیں تھیں جو تبرج کرتی تھیں۔ وہ ابو جہل کے عرب کی عورتیں تھیں جو زیب و زینت کر کے مردوں کے درمیان سے گزرتی تھیں۔ اگر استنبول کی لڑکیاں ان زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی پیروی کرتی ہیں تو وہ ماڈرن تو نہ ہوئیں نا۔ ماڈرن تو میں ہوں' تم ہو' پھر کیسی شرمندگی۔" اس نے رسان سے کہتے ہوئے شانے اچکائے۔

"اللہ اللہ' یہ احمد؟" وہ دم بخود رہ گئی۔ (آخر کون کا اثر تھا وہ بھی اللہ اللہ کہنے لگی تھی۔)

"تمہیں لگتا ہے' تم بھی نقاب نہیں پہن سکتیں؟" وہ اب ٹشو سے پیشانی پہ آئے پسینے کے قطرے تھپتھپا رہی تھی۔

"شاید نہیں' میری دوستوں اور فرسٹ کزنز میں سے کوئی نقاب نہیں لیتا۔" اسے شہلا یاد تھی' مگر وہ اس کے سیکنڈ کزن کی بیوی تھی۔

"تو تم یہ رواج ڈالنے والی پہلی لڑکی بن جاؤ۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" جواب میں اس لڑکی نے مسکرا کر دوسرے شانے اچکائے۔

"جو غار ثور کے آخری سوراخ پہ اپنا پاؤں رکھ دیتا ہے اور ساری رات سانپ سے ڈسے جانے کے باوجود اف نہیں کرتا' اس کی اس ایک رات کی نیکیاں عمر بن

خطاب شی زندگی بھر کی نیکیوں کے برابر ہوتی ہیں۔ مگر ہر شخص ابوبکر نہیں بن سکتا۔ ابوبکر صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ چیلنجوں میں پہل کرنے والا۔"

اس کی باری پکاری گئی تو وہ چونکی۔ پھر سلام کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اب اس لڑکی سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ اس کا ذہن صاف تھا' ان کراؤن فرش کے ماربل کی طرح' شفاف اور صاف' مگر وہ جانتی تھی کہ وہ کبھی اپنا چہرہ نہیں لپیٹ سکتی۔ اس تصور سے ہی اس کا دم گھٹتا تھا۔

ایکوریم کے پانی میں اسی طرح بلبلے بن اور مٹ رہے تھے۔ دونوں مچھلیاں پنکھ جھٹکے ایک دوسرے کے پیچھے دائرے میں دوڑ رہی تھیں۔ دائرہ۔ جس میں آغاز اور اختتام کی تفریق مٹ جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

استقلال جدیسی میں معمول کی چہل پہل تھی۔ ٹھنڈی سی دھوپ گلی کی دونوں اطراف میں اٹھی قدیم عمارتوں پہ گر رہی تھی' گویا سنہری برف ہو۔

وہ جہان کے ساتھ ساتھ چلتی گلی میں آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر اتفاق ہوا تھا کہ اس نے سیاہ اسکارف اور سیاہ اسکرٹ کے ساتھ گرے بلاؤز پہن رکھا تھا اور جہان نے سیاہ جینز پہ گرے آدھی آستین والی شرٹ۔ آج جب وہ ادھر آئی تھی تو اس نے خواہش کی تھی کہ وہ استقلال اسٹریٹ کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اسے اس گلی کا اینڈ دیکھنا تھا۔ اب وہ اسی لیے چلتے جا رہے تھے۔

"کچھ پیو گی؟" جہان نے رک کر پوچھا' پھر جواب کا انتظار کیے بنا ایک کیفے میں چلا گیا۔ جب باہر آیا تو اس کے ہاتھوں میں دو ڈسپوزیبل گلاس تھے اور بغل میں رول شدہ اخبار۔

"شکریہ۔" اس نے مسکراتے ہوئے گلاس تھاما۔ جھاگ سے بھرا پینا کولاڈا۔ ناریل اور اناناس کی دہکتی خوشبو اور دور تقسیم اسکوائر سے اٹھتی ٹیولپس کی مہک۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سانس اندر کھینچی۔ جہان سکندر کا استنبول بہت خوب صورت تھا۔

"ہوں' اچھا ہے۔" وہ خود بھی تھوڑا تھوڑا گھونٹ بھر رہا تھا۔ حیا نے اس کے گلاس پکڑے ہاتھ کو دیکھا۔ اس نے وہ پلاٹینم بینڈ نہیں پہن رکھا تھا۔ یہ ان کی منگنی کے بعد پہلی ملاقات تھی اور اس میں اتنی انا تو تھی کہ اسے خود سے کبھی اس موضوع کو نہیں چھیڑنا تھا۔

"تم اس روز دو دفعہ آئی تھیں؟ بیک ڈور کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟" وہ سرسری انداز میں پوچھ رہا تھا۔ یقیناً" اس کے ورکر نے اسے پوری رپورٹ دی ہوگی' مگر جواب اس کے پاس تیار تھا۔ عائشے گل نے بے شک کہا تھا کہ سچ سے بہتر جواب کوئی نہیں ہوتا' مگر اس وقت عائشے کون سا دیکھ رہی تھی۔

"کوئی جاننے والا نظر آ گیا تھا۔ ہالے اور میں نے اس سے ٹکرانے سے بہتر سمجھا کہ دوسری گلی میں چلے جائیں' ویسے بھی ہشیل کے آنے تک ہمیں انتظار تو کرنا تھا نا۔"

"مگر کبھی پچھلی گلی میں کوئی جاننے والا ملے اور تمہیں استقلال میں آنا پڑے تو بے شک برگر کنگ کے اسی دروازے کو استعمال کر لینا۔ اس کے پچھلی طرف کھلتی گلی ہے۔" گلاس خالی کر کے جہان نے کچرے دان میں اچھال دیا۔ حیا کا ابھی آدھا گلاس باقی تھا۔

"تم بتاؤ! تمہیں لندن کب جانا ہے۔" وہ کافی بلند آواز میں بول رہی تھی۔ قریب سے گزرتے نارنجی سرخ ٹرام میں سوار سیاحوں کا گروہ اونچی اونچی سیٹیاں بجا رہا تھا۔ جس کے باعث کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

"اگلے ماہ کا سوچ رہے ہیں۔ تب تک تم بھی فارغ ہوگی۔ سبانجی! ایکسچینج اسٹوڈنٹس کہاں جا رہے ہیں؟"

"کچھ ترکی میں ہی گھومیں پھریں گے' اور کچھ تو پیرس وغیرہ جا رہے ہیں۔"

"تو تم ہمارے ساتھ لندن چلو نا۔ پھر جولائی میں

واپس آ کر کلیئرنس کروا لینا اور پاکستان چلی جانا۔"

"میں اپنی دوستوں کے ساتھ یورپ ٹور میں رہنا چاہتی ہوں۔" گو کہ جہان کے ساتھ لندن جانے کا خیال کافی پرکشش تھا' مگر اس نے فوراً" ہامی بھرنا مناسب نہ سمجھا۔

"ڈونٹ ٹیل می کہ تم ابھی تک وہی رپورٹ سوچ رہی ہو۔"

جہان نے ہاتھ ہلا کر گویا ناک سے مکھی اڑائی۔ حیا نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ ہالے کی دوست چھاپنے کے لیے تیار تھی' مگر جہان کے منع کرنے پہ اس نے وہ رپورٹ بند کر دی تھی۔ آج صبح تک جب وہ اس بارے میں سوچ رہی تھی تو اسے لگا اسے یہ سب کسی بااعتماد شخص سے شیئر کرنا چاہیے اور میجر احمد سے بڑھ کر کسی پہ اعتبار نہیں تھا۔ تب ہی صبح اس نے میجر احمد کو ٹیکسٹ کیا تھا کہ وہ بات کرنا چاہتی ہے' مگر کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

"نہیں' میں نے اسے ذہن سے نکال دیا ہے۔"

"گڈ گرل!" وہ ایک دم اس کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا' یوں کہ حیا کا سامنے کا منظر چھپ گیا۔ وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"بعض دفعہ جو ہم دیکھتے ہیں' وہ ہو نہیں رہا ہوتا اور جو ہو رہا ہوتا ہے' وہ ہم دیکھ نہیں رہے ہوتے۔"

کہتے ہوئے اس نے رول شدہ اخبار کھولا اور پھر سے لپیٹنے لگا' یہاں تک کہ کون آئس کریم کی سنہری کون کی طرح اس نے اخبار کو رول کر دیا۔ پھر اس نے حیا کا گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حیا نے نا سمجھی سے گلاس اسے پکڑا دیا۔

"ایک چیز ہوتی ہے' نظر کا دھوکا' لوگ وہ نہیں ہوتے جو وہ نظر آتے ہیں اور جو وہ ہوتے ہیں' اسے وہ چھپا کر رکھتے ہیں۔" اس نے گلاس کون کے منہ میں انڈیل دیا۔ جوس دھار کی صورت اخبار کی کون میں بہنے لگا۔ جہان نے خالی گلاس حیا کو تھمایا اور اخبار کی کون کو مزید لپیٹنا شروع کیا۔ پھر اس کا منہ بند کر دیا اور دوسری سمت سے اخبار کھولنے لگا۔ تہیں کھلتی گئیں اور پورا اخبار سیدھا کھل کر سامنے آ گیا۔ صفحے سوکھے تھے اور جوس غائب۔

"زبردست!" وہ مسکراتے ہوئے تالی بجانے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی ٹرک تھی۔ اس نے یقیناً" کمال مہارت سے جوس کہیں آس پاس گرا دیا تھا یا پھر کچھ اور کیا ہوگا' بہرحال اس کا انداز متاثر کن تھا۔

وہ دونوں پھر سے ساتھ چلنے لگے تھے۔ جہان نے اخبار اب دوبارہ تہ کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

دفعتاً" حیا کا فون بجا۔ اس نے پرس سے موبائل نکال کر دیکھا۔ میجر احمد کی کال آ رہی تھی۔ اس نے کال کاٹ دی اور فون رکھ دیا۔ جہان اتنا مہذب تو تھا کہ کوئی سوال نہ کرتا' مگر وہ خود بتانا چاہتی تھی۔

"میجر احمد کی کال تھی' کچھ کام تھا ان سے۔" وہ چلتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔ یہ سراسر جھوٹ تھا۔ جہان کے مزاج کا کچھ بھروسا نہ تھا' مگر وہ اس پہ بھروسا کرنا چاہتی تھی۔

"میجر احمد کون؟" اس نے نا سمجھی سے حیا کو دیکھا۔

"پاکستان میں ہوتے ہیں' سائبر کرائم سیل میں انٹیلی جنس آفیسر ہیں۔ تمہارے ابا کو بھی جانتے ہیں۔" وہ ذرا رکی۔ "میں ان سے بات کروں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا نا؟"

"آف کورس نہیں!" اس نے شانے اچکا دیے۔ "لیکن کتنا قابل اعتبار ہے' یہ فیصلہ تم خود کر سکتی ہو' کیونکہ میرے نزدیک تو سب لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اتنی بے یقینی بھی اچھی نہیں ہوتی جہان!"

"تسلی؟ جیسے تمہیں یقین ہے کہ تمہارا جوس میں نے کہیں گرا دیا تھا؟" وہ پھر سے اس کے مقابل آ کھڑا ہوا اور گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو جانے کیوں ابھی تک وہ پکڑے کھڑی تھی۔

"یقیناً" تم نے ایسا کیا ہوگا۔" اس نے گلاس جہان کو تھما دیا۔ تب تک وہ اخبار کو دوبارہ کون کی شکل میں لپیٹ چکا تھا۔ گلاس لے کر اس نے اخبار کی کون کا کھلا منہ گلاس میں الٹا۔ پینا کولاڈا ایک دھار کی صورت

گلاس میں گرنے لگا۔

وہ بے یقینی سے ساکت کھڑی دیکھ رہی تھی۔

"یہ تم نے کیسے کیا؟ میں نے... میں نے خود دیکھا تھا کہ اخبار سوکھا تھا۔ پھر یہ جوس کہاں سے آیا؟"

"اگر جادوگر اپنی ٹرک کے فوراً بعد ہی راز بتا دے تو کیا فائدہ؟ کبھی فرصت میں بتاؤں گا کہ یہ کیسے ہوا۔ البتہ اگر تم میری جگہ پہ کھڑی ہو کر دیکھتیں تو جان جاتیں کہ میں نے یہ کیسے کیا ہے۔ جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا ہو کر نہیں دیکھتا، اسے پوری بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"تم عجیب ہو جہان!" اس نے تحیر سے سر جھٹکا۔ "ان دونوں چیزوں کو ٹریش میں پھینکو، میری پیاس مر گئی ہے۔"

وہ ہنس پڑا۔ "نہیں! تمہاری پیاس ڈر گئی ہے۔" پھر شعبدہ باز نے دونوں چیزیں ایک قریبی کچرے دان میں اچھال دیں۔

وہ سامنے گلی کے اختتام پہ ایک اونچا ٹاور تھا۔ جس نے گلی کا دہانہ بالکل بلاک کر رکھا تھا جیسے زمین سے اگ آیا ہو۔ وہ یوں تھا جیسے پاکستان میں لوہے کی کوئی سی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے، ویسا ہی سلنڈر نما ٹاور جس کا گنبد کون کی شکل کا تھا۔

"یہ رہا وہ انت Galata ٹاور (غلطہ ٹاور) جسے جاننے کا تمہیں تجسس تھا۔" اس نے ٹاور کی طرف اشارہ کیا۔

"اور انت جاننے کا سب سے بڑا نقصان پتا ہے کیا ہوتا ہے جہان؟"

جہان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"انسان کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔" اس نے گہری سانس لی اور پلٹ گئی۔ وہ شانے اچکا کر اس کے پیچھے ہو لیا۔

☼ ☼ ☼

"ترکی والوں کو سلام۔" واپسی پہ گورسل میں بیٹھے جب اس نے میجر احمد کو کال بیک کی اور جو لیا، احمد نے کال کٹ کر خود سے فون کیا تو اس کا ہیلو سنتے ہی وہ جیسے کسی خوشگوار حیرت کے زیر اثر بولا تھا۔

"زندگی میں پہلی دفعہ آپ نے میجر احمد کو خود یاد کیا ہے، مگر جب آپ نے کال نہیں اٹھائی تو میں سمجھا کہ وہ ٹیکسٹ آپ نے غلطی سے کیا ہو گا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں اس وقت جہان کے ساتھ تھی۔ سو بعد میں تفصیلی بات کروں گی۔"

"اچھا۔" وہ جیسے چپ ہو گیا۔ شاید اسے جہان کا ذکر ناگوار گزرا تھا۔

"میں نے جہان کو آپ کے بارے میں بتایا، مگر وہ آپ کو نہیں جانتا تھا۔"

"کیوں؟ آپ نے کیوں بتایا؟" وہ بہت حیران ہوا۔

"شوہر کو علم ہونا چاہیے کہ اس کی بیوی کس سے بات کرتی ہے۔" وہ ذرا جتا کر بولی۔ جانتی تھی کہ اس کا اتفاق سے شوہر کی بات کرنا احمد کو کتنا برا لگتا تھا۔

"شوہروں کا بھروسا نہیں ہوتا۔ احتیاط کیجیے گا آپ پھنس ہی نہ جائیں۔"

"مطلب کام تو نہیں کر رہی کہ پھنسوں۔ بہرحال ہم کام کی بات کریں؟" اس کا لہجہ بے لچک ہو گیا۔ ساتھ ہی جو کچھ بیوک ادا میں وہ جان پائی تھی، اس سے وہ احمد کو بتا دیا۔

"میں وہ رپورٹ شائع کروانا چاہتی تھی مگر جہان نے منع کر دیا۔" روانی میں وہ کہہ گئی، پھر ایک دم خاموش ہو گئی۔

"وہ تو منع کرے گا۔ اس کا بہت کچھ داؤ پہ جو لگے گا۔ خیر آپ بالکل وہ رپورٹ شائع کروائیں مگر حیا! اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ جہان والی بات نظر انداز کر گئی۔ وہ ذاتی عناد کے باعث کہہ رہا تھا یقیناً۔

"ایک رپورٹ سے اے آر پی جیسے بڑے گروپ کا کیا بگڑے گا؟ دنیا کے ایک ایک ترک کے پیچھے پوری کی پوری نیٹ ورکنگ ہوتی ہے۔ عبدالرحمٰن پاشا مشہور ہے۔ "میرے تو صرف پل کا کام کرتے ہیں" ایسے کہ اپنے دامن پہ کوئی چھینٹا نہ پڑے، سوائے خلاف نہ ثبوت ہوتے ہیں نہ کبھی کوئی گواہ نکلتا ہے۔"

"مگر میں نے سنا ہے کہ اس کے عالمی دہشت گرد تنظیموں سے بھی..."

"کس سے سنا ہے؟" وہ بات کاٹ کر بولا۔

"لیڈی کیبری سے، اور ادالار میں۔"

"بہرحال! یہ دوسری دنیا کے لوگ ہیں۔ آپ ان معاملوں میں مت پڑیں۔"

"تو پھر یہ پاشا میرے پیچھے کیوں پڑا ہے آخر؟" وہ تلخ ہو کر بولی۔

"مجھے تو لگتا ہے حیا! کہ اس نے آپ کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ اب صرف آپ اس کے پیچھے پڑی ہیں۔"

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"ویسے ضروری نہیں تھا کہ آپ جہان سکندر کو میرے بارے میں بتاتیں۔ انسان کو کچھ باتیں اپنے تک بھی رکھنی چاہئیں۔"

بس باسفورس برج پہ سے گزر رہی تھی اور وہ کھڑکی سے باہر پل کے نیچے بہتا سمندر دیکھ سکتی تھی۔ وہاں حسب معمول ایک فیری تیر رہا تھا۔

"میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میرے اور آپ کے اس رابطے کو کبھی بھی غلط طریقے سے استعمال کر کے مجھے رسوا کر سکے۔"

"اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا حیا! جنت کے پتے تھامنے والوں کو اللہ رسوا نہیں کرتا۔"

اسی لمحے دور نیچے سمندر کے کناروں پہ بگلوں کا ایک غول پھڑپھڑاتا ہوا اڑا تھا۔ وہ نگاہیں ان کے چھوٹے سفید پروں پہ مرکوز کیے بالکل ٹھہری سی گئی تھی۔

"آپ جنت کے پتے کسے کہتے ہیں؟"

احمد نے گہری سانس لی اور کہنے لگا۔

"آپ جانتی ہیں، جب آدم علیہ السلام اور حوا جنت میں رہا کرتے تھے، اس جنت میں، جہاں نہ بھوک تھی، نہ پیاس، نہ دھوپ اور نہ ہی برہنگی، تب اللہ نے انہیں ایک ترغیب دلانے والے درخت کے قریب جانے سے روکا تھا، تاکہ وہ دونوں مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

بس اب پل کے آخری حصے پہ تھی۔ بگلوں کا غول فیری کے اوپر سے پھڑپھڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ سمندر پیچھے کو جا رہا تھا۔

"اس وقت شیطان نے ان دونوں کو ترغیب دلائی کہ اگر وہ اس ہمیشگی کے درخت کو چھو لیں تو فرشتے بن جائیں گے یا پھر ہمیشہ رہیں گے۔ انہیں کبھی نہ زائل ہونے والی بادشاہت ملے گی۔"

پل پیچھے رہ گیا۔ گورسل اب پرانے شہر (استنبول یا ایشیائی حصے) میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ ہر شے سے بے نیاز یکسوئی سے سن رہی تھی۔

"سو انہوں نے درخت کو چکھ لیا۔ حد پار کر لی۔ تو ان کو فوراً بے لباس کر دیا گیا۔ اس پہلی رسوائی میں جو سب سے پہلی شے، جس سے انسان نے خود کو ڈھکا تھا، وہ جنت کے پتے تھے 'ورق الجنۃ'۔"

پرانے شہر کی سڑک پہ کوئی ٹریفک جام تھا۔ گورسل بہت سست روی سے چل رہی تھی۔ سڑک کنارے چلتے لوگ اور دکانوں پہ لگا رش، اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بس سن رہی تھی۔

"آپ جانتی ہیں، ابلیس نے انسان کو کس شے کی ترغیب دلا کر اللہ کی حد پار کروائی تھی؟ فرشتہ بننے کی اور ہمیشہ رہنے کی۔ جانتی ہیں حیا! فرشتے کیسے ہوتے ہیں؟"

اس نے نفی میں گردن ہلائی، گو کہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے نہیں دیکھ سکتا۔

"فرشتے خوب صورت ہوتے ہیں۔" وہ لمحے بھر کو رکا۔ "اور ہمیشہ کی بادشاہت کسے ملتی ہے؟ کون ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے؟ وہ جنہیں لوگ بھول نہ سکیں، جو انہیں مسحور کر دے، ان کے دلوں پہ قبضہ کر لے۔ خوب صورتی اور امر ہونے کی چاہ، یہ دونوں چیزیں انسان کو دھوکے میں ڈال کر ممنوعہ حد پار کرواتی ہیں اور پھل کھانے کا وقت نہیں ملتا، انسان چکھتے ہی بھری دنیا میں رسوا ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر وہ خود کو ڈھکے تو

اسے ڈھکنے والے جنت کے پتے ہوتے ہیں۔ لوگ اسے کپڑے کا ٹکڑا کہیں یا کچھ اور' میرے نزدیک یہ ورق الجنۃ ہیں۔"

پرانے شہر کی قدیم اونچی عمارتوں پہ سے دھوپ رینگ گئی تھی اور اب چھاؤں کی نیلاہٹ ان پہ چھا رہی تھی۔ وہ سانس روکے موبائل کان سے لگائے دم سادھے بیٹھی سن رہی تھی۔

"جنت کے پتے صرف اسی کو ملتے ہیں جس نے ترغیب کو جھٹکنے کی کوشش کی ہوتی ہے اور ان کا سفر ان کو خود پہ لگا لینے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا کیونکہ ان کو تھامنے سے پہلے انسان جنت میں ہوتا ہے۔ تھامنے کے بعد وہ دنیا میں اتار دیا جاتا ہے۔ بخشش مل جاتی ہے مگر دنیا شروع ہو جاتی ہے اور پھر۔"

وہ بہت دھیرے سے مسکرایا۔

"دنیا والوں نے جنت تو نہیں دیکھی ہوتی نا' سو ان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ جنت کے پتے کیسے دکھتے ہیں۔ سو وہ ان کے ساتھ سلوک بھی وہی کرتے ہیں جو کسی شے کی اصل جانے بغیر اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آپ دنیا میں اترنے کے بعد دنیا والوں کے رویے سے پریشان مت ہوئیے گا۔"

وہ خاموش ہوا تو کوئی طلسم ٹوٹا۔ سحر کا ایک بلبلہ جو اس کے گرد تن چکا تھا پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

"تھینک یو میجر احمد!" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ اس وقت وہ کچھ زیادہ کہنے کے قابل نہیں تھی۔

"آپ اچھے انسان ہیں' آپ اچھی باتیں کرتے ہیں۔"

"شکریہ' میں اب فون رکھتا ہوں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔" اس نے فون کان سے ہٹایا۔ اس کا ذہن سن ہو چکا تھا۔

قدیم شہر کی عمارتوں سے اس کو ابھی تک میجر احمد کی باتوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

"اناطولین سٹی میں ایک سیمینار ہے' چلو گی؟" ہالے نے ڈورم کے دروازے سے جھانک کر اسے مخاطب کیا۔ وہ جو اپنی کرسی پہ بیٹھی میز پہ پھیلی کتابوں میں منہمک تھی' چونک گئی۔

"ابھی تو ممکن نہیں ہے' میرے اور سے دو چیپٹرز رہ گئے ہیں۔" حیا نے صفحے آگے پلٹ کر دیکھا اور پھر نفی میں گردن ہلائی۔

"کار میں پڑھ لینا' کتاب ساتھ لے چلو۔"

"اتنا ضروری کیا ہے؟"

"تم پچھتاؤ گی نہیں۔ لکھ کر رکھ لو۔" ہالے مصر تھی' سو اس نے کتاب ساتھ رکھ لی۔ پرس اس کی بیگ میں ڈال لیا اور بھنی مونگ پھلی کا پیکٹ جو کل ہی وہ اسٹور سے لائی تھی' ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"کپڑے ٹھیک ہیں؟" اس نے گردن جھکا کر صبح کے پہنے لباس کو دیکھا۔ گرے اسکرٹ کے ساتھ لائم گرین بلاؤز اور اوپر گرے اسکارف جو ابھی ابھی پن اپ کیا تھا۔

"ہاں! ٹھیک ہیں' چلو۔" ہالے نے پرس اور چابی سنبھالی۔ یہ اس کا خوش قسمت دن تھا کہ آج اس کے پاس کار تھی۔

وہ سیمینار ہوٹل کے جس ہال میں تھا' وہ ہال سب سے اوپر والے فلور پہ بنا تھا۔ اس کی دو متوازی دیواریں گلاس کی بنی تھیں۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ لڑکیاں' عورتیں اور بے حد معمر خواتین' خالص نسوانی ماحول تھا۔

ان دونوں کو شیشے کی دیوار کے ساتھ جگہ ملی۔ حیا کی کرسی قطار کی پہلی کرسی تھی' سو اب اس کے دائیں طرف گلاس وال تھی اور بائیں جانب ہالے۔ درمیان میں اس نے مونگ پھلی کا پیکٹ کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہی ڈی جے کے ساتھ بیچ کلاس میں کھانے کی عادت۔

روسٹرم کے عقب میں دیوار اس خوب صورت بینر سے ڈھکی تھی جس پہ انگریزی میں یہ چھپا تھا۔

Face veil mandatory or recommended

(چہرے کا حجاب' واجب یا مستحب؟)

اس نے دو انگلیوں اور انگوٹھے کو پیکٹ میں ڈال کر چند دانے نکالے اور منہ میں رکھے۔ وہ اسکارف کر لے' یہ اس کے تقویٰ کی انتہا تھی۔ سو اب چہرے

کا نقاب واجب تھا یا مستحب' کیا فرق پڑتا تھا؟

سیمینار انگریزی میں تھا۔ روسٹرم سنبھالے کھڑی میرون اسکارف والی عربی خاتون انگریزی میں ہی کہہ رہی تھیں۔

"واجب وہ چیز ہوتی ہے جو کریں تو ثواب' نہ کریں تو گناہ ہے' جبکہ مستحب وہ عمل ہے جو کریں تو ثواب مگر نہ کرنے پہ گناہ نہیں ہے۔ اب اس بات پہ تو سب راضی ہیں کہ لڑکیوں کا سر اور جسم ڈھکنا واجب' لیکن کیا چہرہ بھی ڈھکنا لازمی ہے؟"

حیا کے دائیں جانب گلاس وال پہ ایک دم سے کوئی پرندہ آ ٹکرایا تھا۔ وہ چونکی۔ وہ ننھی سی چڑیا تھی جو شیشے سے ٹکرا کر نیچے گر گئی تھی۔

"جب ہم کہتی ہیں کہ چہرہ ڈھکنا واجب نہیں' صرف مستحب ہے تو اس کی وجہ وہ حدیث ہے کہ جب حضرت اسما بنت ابوبکر' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور ان کا لباس ذرا باریک تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اسما! جب لڑکی جوان ہو جاتی ہے تو سوائے اس اور اس کے (چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے) کچھ نظر نہیں آنا چاہیے۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چہرہ کھلا رکھنے پہ گناہ نہیں ہو گا۔"

گری ہوئی چڑیا اب سنبھل کر فرش پہ پھدک رہی تھی۔ پھر ایک بار اس نے شیشے کی دیوار پہ پنجے مار کر چڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

"اور پھر جب حج کے موقع پہ ایک لڑکی جو اونٹ پہ بیٹھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے باپ کے حج کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے فضل لاشعوری طور پہ اس لڑکی کے چہرے کو دیکھ رہے تھے تو آپ نے ہاتھ پیچھے کر کے فضل کا چہرہ دوسری جانب پھیر دیا' جبکہ اس لڑکی کو چہرہ ڈھکنے کا نہیں کہا۔ دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ازواج مطہرات اور صحابیات جو جلباب اوڑھتی تھیں' وہ مستحب کے درجے کا تھا۔ واجب کا نہیں۔ سو جو آیت سورۂ نور میں ہے کہ وہ اپنی

زینتیں چھپائیں' سوائے اس کے کہ جو خود ظاہر ہو جائے تو اس "وہ جو خود ظاہر ہو جائے" میں سرمہ' انگوٹھی وغیرہ کے ساتھ چہرہ بھی شامل ہے۔"

چڑیا پھڑپھڑاتی ہوئی کب کی اڑ چکی تھی۔ وہ مونگ پھلی چباتے ہوئے سر اثبات میں ہلاتی مقررہ کو سن رہی تھی۔ وہ مزید چند دلائل دے کر اپنی کرسی پہ واپس جا چکی تھیں اور تب تک وہ مطمئن ہو چکی تھی۔ اسے ان کی ساری بات ٹھیک لگی تھی۔

"میں ڈاکٹر فریحہ سے اختلاف کی جسارت کروں گی۔" ڈائس پہ آنے والی گرے اسکارف والی مقررہ اپنی بات شروع کر چکی تھیں۔ وہ دراصل بحث تھی۔ حیا اور ہالے باری باری پیکٹ میں انگلیاں ڈال کر مونگ پھلی نکالتے ہوئے' پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھیں۔

"رہی اسما بنت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث' اس کی تشریح تو محرم رشتوں کے لحاظ سے بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی تھیں اور اسی حدیث سے ہم دلیل لیتے ہیں کہ بہنوئی سے چہرے کا پردہ نہیں ہوتا اور حضرت فضل والا واقعہ حج کے موقع کا تھا اور حج پہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے نقاب یا دستانے پہننے سے منع فرمایا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نقاب کرنا اس زمانے میں ایک کامن پریکٹس تھی۔"

دو فاختائیں تیزی سے اڑتی آئیں اور شیشے کی دیوار سے ٹکرائیں۔ حیا نے ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ اب ٹکرا کر نیچے جا گری تھیں اور اگلے ہی پل اٹھ کر اڑ گئی تھیں۔

"عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب گریبانوں کو ڈھانپ لینے کا حکم نازل ہوا تھا تو مدینے کی عورتوں نے وہ حکم سنتے ہی اپنی اوڑھنیاں حصوں میں پھاڑیں اور سر سے پاؤں تک خود کو ان سے ڈھانپ لیا۔ یہاں ڈھانپنے سے مراد چہرہ ڈھانپنا بھی ہے۔ سو "وہ جو خود ظاہر ہو جائے" میں انگوٹھی' سرمہ' جوتی تو آتی ہے' مگر چہرہ نہیں۔ پھر جب ابن عباسؓ سے آیت حجاب کی

تقریر پوچھی گئی تھی تو آپ نے اپنی چادر سر سے لپیٹ کر بکل مار کے دکھائی یوں کہ بس ایک آنکھ واضح تھی۔ آیت حجاب میں اللہ نے "اے ایمان والو!" کہہ کر حکم دیا ہے اور جب اللہ تعالیٰ مومن کو اس کے ایمان کا واسطہ دے کر حکم دیتا ہے تو وہ حکم بے حد اہم ہو گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صرف سر اور جسم ڈھکنا واجب نہیں' بلکہ چہرہ ڈھکنا بھی واجب ہے۔"

وہ گردن ذرا سی پھیرے شیشے کی دیوار کو دیکھ رہی تھی' جہاں تھوڑی ہی دیر میں بہت سے پرندے ٹکرائے تھے۔ کیا فرحان کہتے تھے کہ پرندے یوں اس لیے کرتے ہیں 'کیونکہ وہ پچھلے سال جب یہاں سے گزرے تھے تو وہ عمارت وہاں نہیں تھی۔ اب وہ راستے پہ اپنی رو میں اڑتے جا رہے ہوتے ہیں تو ٹکر لگنے پہ معلوم ہوتا ہے کہ راستہ بلاک ہے۔ معلوم نہیں فرحان کی فلاسفی کتنی درست تھی' بہرحال وہ ہوٹل نیا تعمیر شدہ ہی تھا۔ شاید وہ واقعی پرندوں کی گزرگاہ کے درمیان بن گیا تھا۔

"مستحب اور واجب' بحث بہت پرانی ہے۔"

ڈائس پہ اب ایک سیاہ عبایا اور سیاہ اسکارف والی دراز قد' شہد رنگ آنکھوں والی خاتون آچکی تھیں۔ خوب صورت' شفاف چہرہ' نرم سی مسکراہٹ۔ سب بہت توجہ سے انہیں سن رہے تھے۔

"آپ نے مستحب والوں کے دلائل سنے "آپ کو لگا ہو گا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ نے پھر واجب والوں کا بیان سنا' تو لگا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ دونوں ٹھیک کہہ سکتے ہیں؟ تو وہی لطیفہ ہو جائے گا کہ آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔"

ہال میں بے اختیار قہقہہ بلند ہوا' شیشے کی دیواریں بھی مسکرا اٹھیں۔

"میں سمجھا ہے کہ میں ان دونوں میں سے کسی گروہ کی حمایت یا مخالفت کرنے کے لیے نہیں آئی۔ میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں۔"

وہ لمحے بھر کو رکیں۔ پورا ہال بہت دلچسپی سے سن رہا تھا۔

"ہم عموماً دنیا اور آخرت کی مثال کسی کالج ایگزام سے دیتے ہیں' رائٹ؟ تو وہی مثال لے لیتے ہیں۔ دنیا اور آخرت کے کسی بھی اسکول یا کالج کا جب پیپر سیٹ کیا جاتا ہے تو اس میں چند سوال بہت آسان رکھے جاتے ہیں۔ جو کوئی اوسط درجے کا طالب علم بھی حل کر کے 33% سے زیادہ نمبر لے کر پاس ہو سکتا ہے۔ پھر چند سوال ذرا مشکل ہوتے ہیں جو صرف اچھے طلبہ حل کر کے ستر اسی فیصد نمبر لے جاتے ہیں اور آخر میں ہر پیپر میں کچھ سوال بہت پیچ دار ۔۔۔ اور مشکل رکھے جاتے ہیں۔ وہ سوال پوزیشن ہولڈرز کا فیصلہ کرتے ہیں' اسی لیے عموماً پوزیشن ہولڈرز کے آپس میں چند نمبر یا پرسنٹیج کے ذرا سے تبسب کا فرق ہوتا ہے۔ یہ سوال "مستحب" ہوتے ہیں۔ ہم عموماً سمجھتے ہیں کہ مستحب وہ ہوتا ہے کہ جب پانچ میں سے چار سوال حل کرنے ہوں' تو چاروں میں سے کوئی غلط ہونے کے ڈر سے پانچوں بھی اٹیمپٹ کر دیا جائے' ایکسٹرا سوال' جبکہ وہ مستحب نہیں ہوتا۔"

وہ اب کرسی پہ ذرا آگے ہو کر بیٹھی غور سے سن رہی تھی۔ استنبول کی خوب صورت عورتوں کی خوب صورت باتوں کا بھی ایک اپنا سحر تھا۔

"اب ہوتا یہ ہے کہ" شفاف چہرے والی ڈاکٹر شائستہ کہہ رہی تھیں۔ "کہ اس مسئلے پہ واجب والے' مستحب والوں پہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ اپنی مرضی کا دین چاہتے ہیں اور خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔ جبکہ مستحب والے انہیں کہتے ہیں کہ آپ شدت پسند ہو رہے ہیں۔ الزامات کی اس جنگ میں لڑکیوں کے پاس بہانہ آجاتا ہے کہ 'ہمیں حجاب کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں' کیونکہ یہ تو ثابت ہی نہیں ہے کہ اسلام میں چہرے کا پردہ ہے بھی یا نہیں۔ جبکہ یہ غلط تاثر ہے۔ بحث نقاب کے "ہونے" یا "نہ ہونے" کی نہیں ہے' بلکہ بحث اس کے واجب یا مستحب ہونے کی ہے۔ آسان الفاظ میں کہتی ہوں' ہم سب راضی ہیں کہ نقاب کرنے پہ ثواب ہے' جبکہ اختلافی نقطہ یہ ہے کہ کیا نقاب نہ

کرنے پہ گناہ بھی ہوتا ہے یا نہیں؟"

اس نے اسکارف کے چہرے کو دیکھتے انگلیاں پاکٹ میں ڈالیں تو پوروں نے خالی پلاسٹک کو چھوا۔ مونگ پھلی کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے انگلیاں نہیں نکالیں' وہ ویسے ہی پوری یکسوئی سے اسٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں سمجھتی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے اگر ہم اختلافی نقطہ یعنی گناہ ہے یا نہیں۔ چھوڑ دیں اور صرف "متفق نقطے" پہ غور کریں تو اس مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ گناہ کو چھوڑ دیں۔ "کامن پوائنٹ" دیکھیں کہ نقاب کرنا ایک نیکی ہے۔ بہت بڑی نیکی۔ تو کیا جو چیز مستحب ہوتی ہے' اسے نفل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے؟ جیسے مستحب والے کرتے ہیں۔ وہ نقاب کو غیر واجب قرار دے کر اس کی ترویج تبلیغ کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف 33 فی صد والے جواب دے کر کسی بقایا سوال کے بغیر ہی ہم پاس ہو جائیں گے؟ کیا ہمیں یقین ہے کہ ہمارا 33 فی صد کا جواب بھی درست لکھا گیا ہے؟"

ان کے سوال پہ ہال میں خاموشی چھائی رہی۔ مرعوب سی خاموشی۔

"ادھر ہم سب عورتیں اور لڑکیاں ہی موجود ہیں۔ ایک بات کہوں آپ سے؟ ہم میں یہ چند باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ ساری نہیں تو کچھ تو ضرور ہی۔ ہم جلد جیلس ہو جاتی ہیں' کسی کے پیچھے اس کی برائی بھی کر لیتی ہیں۔ منہ سے جھوٹ بھی پھسل جاتا ہے۔ نمازیں ہم پوری پڑھتی نہیں۔ جو پڑھتی ہیں ان میں بھی دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔ ان کا بھی پتا نہیں' کتنا' پانچواں' نواں یا دسواں حصہ لکھا جاتا ہو گا۔ رمضان کے روزے رکھ لیں تو چھوٹے روزوں کی قضا ہی بھول جاتے ہیں۔ یہ تھا وہ 33 فی صد پرچہ' جو کتنا اچھا ہم حل کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں لگتا ہے کہ ہمیں کسی ایکسٹرا عمل کی ضرورت نہیں؟ بلکہ فیز لیڈرز یا جنت صرف خواہش کرنے سے نہیں مل جاتی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آدم کی اولاد میں ہر ایک ہزار میں سے 999 جہنم میں ڈالے جائیں گے اور صرف ایک جنت میں داخل کیا جائے گا؟ یہ میں نہیں کہہ رہی' یہ بخاری کی حدیث ہے۔ کیا ہم اس اعمال نامے کے ساتھ اس "ایک" میں شامل ہو سکتے ہیں؟"

وہ بالکل ساکت بیٹھی' بنا پلک جھپکے مقررہ کو دیکھ رہی تھی۔ "جہنم" کے لفظ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم چلا دی تھی۔

ہر اللطس کی دائمی آگ' بھڑکتا آتش دان' دہکتے انگارے۔

"آج ہم بحث کرتے ہیں کہ نقاب واجب ہے یا نہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ کل کو قیامت کے دن جب ہم ایک ایک نیکی کی تلاش میں ہوں گے تب ہم شاید رو رو کر کہیں کہ آخر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ حجاب واجب تھا یا مستحب' تھا تو نیک عمل۔ تھا تو ثواب ہی نا' تو ہم نے کیا کیوں نہیں؟" انہوں نے رک کر ایک گہری سانس اوپر کو کھینچی۔ "یقین کریں' میں واجب والوں اور مستحب والوں' کسی کی حمایت یا مخالفت نہیں کر رہی۔ میں بس ایک بات کہہ رہی ہوں کہ حجاب کرنا نیکی ہے۔ چاہے آپ اسے واجب سمجھ کر کریں یا مستحب سمجھ کر۔ اسے کریں ضرور اور اسے پھیلائیں بھی ضرور۔ ہمارے جھوٹ' خیانتیں اور دھوکے ہمارے لیے جو آگ تیار کر رہے ہیں' اس سے دور ہونے کے لیے جو کرنا پڑے کریں اور ایک آخری بات۔" وہ پھر سانس لینے کو رکیں۔ ہال میں اسی طرح مکمل خاموشی تھی۔

"آپ حجاب کے جس بھی درجے پہ ہوں' صرف اسکارف لیں یا عبایا بھی لیں یا ساتھ میں نقاب بھی کریں' جو بھی کریں' اس پہ قائم ہو جائیں۔ اس سے پیچھے بھی نہ جائیں اور پھر اس کے لیے لڑنا پڑے تو لڑیں۔ مرنا پڑے تو مریں' مگر اس پہ سمجھوتا کبھی نہ کریں۔ مجھے نہیں معلوم کہ حجاب واجب ہے یا مستحب' میں بس یہ جانتی ہوں کہ یہ اللہ کو پسند ہے تو پھر یہ مجھے بھی پسند ہونا چاہیے۔"

وہ اسٹیج سے اتریں تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

گرے اسکارف والی اور میرون اسکارف والی دونوں خواتین متفق انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلا کر تالی بجا رہی تھیں۔

وہ بالکل چپ خاموش سی بیٹھی تھی۔ دل و دماغ جیسے بالکل خالی ہو گئے تھے۔ جیسے ہی وہ سیاہ عبایا والی ڈاکٹر شائستہ ہمدانی روسٹرم کی طرف بڑھیں، وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور ان کی جانب لپکی۔

"میم!" وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے ان تک آئی۔

"یس؟" وہ پلٹیں۔ ساتھ ہی وہ ایک ہاتھ میں اپنا فون پکڑے تیز تیز کچھ ٹائپ کر رہی تھیں۔

"وہ... میں بھی... میں بھی کرنا چاہتی ہوں نقاب... مگر..." اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنی بات سمجھائے۔ "انگلش میں کیسے کہوں؟"

"بہت آسان!" ڈاکٹر شائستہ نے موبائل بیگ میں ڈالا اور پھر آگے بڑھ کر اس کے اسکارف کا سامنے کو گرا دایاں بکھرا پلو اٹھایا۔ اسے پہلے بائیں گال کے ساتھ اسکارف کے ہالے میں اڑسا، پھر کچھ حصہ دائیں گال کے اس طرف اڑسا یوں کہ اس کے چہرے کو ایک نفیس سے نقاب نے ڈھانپ دیا۔

"بس۔ اتنی سی بات تھی۔" مسکرا کر کندھوں کو ذرا سی جنبش دے کر وہ موبائل نکالنے کے لیے پرس کو ٹٹولتے ہوئے پلٹ گئیں۔

اتنی سی بات تھی؟ وہ اپنی جگہ منجمد سی کھڑی رہ گئی۔

بس؟ اتنی سی بات تھی؟ اس کا سانس گھٹا، نہ دل تنگ ہوا، نہ ہی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھایا۔ سب ویسا ہی تھا۔ بس اتنی سی بات تھی؟

استقلال کے بازار میں چہل قدمی کرتے، ہوٹل کی نشست سے کھڑکی کے باہر دیکھتے، سبانجی کے کیمپس میں داخل، بس سے اترتے، ہر جگہ اس نے لوگوں کو، دیواروں کو، منظر کو کھوجنے کی سعی کی۔ کیا کوئی فرق پڑا تھا؟ مگر اسے احساس ہوا کہ سب ویسا ہی تھا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ ڈاکٹر شائستہ کا پہنایا گیا نقاب اگر کبھی، سو وہ استنبول میں اسی نقاب کے ساتھ لیے پھرتی رہی۔ پر کہیں کوئی گھٹن اتری تھی نہ تھی۔ انسان وہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، نہ کہ رخسار، ناک، ٹھوڑی یا پیشانی سے، سو ان کے ڈھکے ہونے کے باوجود منظر وہی رہتا ہے، پھر کیسی پریشانی؟

لیکن پھر بھی اسے عجیب سی غفلت ہو رہی تھی۔ باوجود اس کے ہالے کا اندر ویسا ہی تھا جیسا پہلے تھا۔

اودم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے حسین اور معتصم اترتے دکھائی دیے۔ حسین بس لمحے بھر کو ٹھٹکا تھا، پھر دونوں مسکرا کر سلام کرتے نیچے اتر گئے۔ سب پہلے جیسا تھا۔

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیں اپنی بیویوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں، تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور وہ ستائی نہ جائیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

وہ اپنی کرسی پہ بیٹھی 'کتاب' جس کی کوئی جلد ابھی تک اسی ہال میں تھی، جہاں شیشے کی دیواروں سے پرندے ٹکرایا کرتے تھے۔ جب واپسی کے وقت پس منظر میں کسی نے یہ آیت چلا دی تھی تو وہ اس کے خول سے باہر ہی نہ آ سکی۔ اسے لگا وہ کبھی اس کے اثر سے نہیں نکل سکے گی۔ لمحے بھر میں اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ آج تک حجاب یا نقاب کیوں نہیں پہن سکی تھی۔ بلو وہ اس کے گر نہ پایا، "ابا اور وہ جلیل بھی اسے بہت تاکید کرتے تھے۔ وہ یہ نہیں کر سکی۔ اس لیے کیونکہ انہوں نے ہمیشہ اپنی کہی۔ کبھی اللہ کی بات سنائی ہی نہیں۔ جبر کی طرح اپنی بات مسلط کرنی چاہی اور اکثر باپ بھائی یہی تو کرتے ہیں۔ اپنی ہی کہتے رہتے ہیں، پھر شکایت کرتے ہیں کہ بچیاں مانتی کیوں نہیں ہیں؟ کبھی اللہ کی سنوا کر تو دیکھیے، پھر معلوم ہو کہ مسلمان لڑکی چھوٹی ہو یا بڑی، نرم مزاج ہو یا سخت، کافی دل اس کا ایک ہی ہوتا ہے، وہ دل جو اللہ کی سن کر جھک ہی جاتا ہے۔ پھر کسی وعظ، تقریر یا درس کی ضرورت نہیں رہتی۔

ایک آیت... ایک آیت زندگی بدل دیتی ہے۔ بس ایک آیت۔

☼ ☼ ☼

بیوک ادا کے ساحل پہ لہریں پتھروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ ان کا شور اس اونچے سفید قصر عثمانی کے اندر تک سنائی دے رہا تھا۔ محل اندھیرے میں ڈوبا تھا، راہداریاں تاریک تھیں۔ صرف دوسری منزل کی اسٹڈی میں نیم روشنی سی پھیلی تھی۔ اندر ایک مدھم سا لیمپ جل رہا تھا، یا پھر میز پہ کھلا دھرا عبدالرحمن کا لیپ ٹاپ۔ البتہ وہ اسکرین کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ ریوالونگ چیئر کی پشت سے سر گرائے، سوچتی نگاہوں سے چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی دونوں سونے کی انگوٹھیاں اور سنہرے فریم کے گلاسز میز پہ لیپ ٹاپ کے ساتھ رکھے تھے۔

بے خیالی میں اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی۔ اسے دیکھا اور پھر ذرا کوفت سے واپس میز پہ پھینک دیا۔ اس سگریٹ نوشی سے اسے چھٹکارا لے لینا چاہیے تھا اب تک۔ بلکہ اور بھی بہت چیزوں سے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور انگلیوں سے کنپٹیوں کو دھیرے دھیرے مسلنے لگا۔ اس کے سر میں کافی دیر سے درد تھا، شاید بہت سوچنے کے باعث اعصابی دباؤ۔

"اف! ہولا!" اس نے نفی میں سر جھٹکا۔ اس کے اعصاب بہت مضبوط تھے اور وہ کبھی بھی اس قسم کے دباؤ سے نہیں ہار سکتا۔ اس نے خود کو یقین دلایا، ویسے بھی سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ ہر شے حسب منشا جا رہی تھی۔ جو تاش کے پتوں کا گھر اس نے تیار کیا تھا، وہ اپنے آخری مرحلے میں تھا۔ کامیابی بہت نزدیک تھی، سو جو وہ چاہتا تھا، سب ویسے ہی ہو رہا تھا۔ مگر اب سے زیادہ توانائی اور زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ پچھلی دفعہ کھیل آخری مرحلے میں بگڑ گیا تھا۔ ہر شے رجب سے اس پہ آ گری تھی اور وہ بھی اس دوست کے طفیل، "دوست" دھوکا دے، اس سے بڑھ کر تکلیف دہ شے کوئی نہیں ہوتی۔ کچھ پل کے لیے وہ اذیت ناک دن اس کی نگاہوں کے سامنے لہرائے تھے۔ اپنے قابل سے قابل دوستوں اور جاننے والوں کو چھوڑ کر وہ اس قابل نفرت آدمی کے پاس گیا تھا مدد کے لیے اور اس نے جو کیا، وہ بہت برا تھا۔

عبدالرحمن نے خفگی سے سر جھٹکا۔ اس وقت کم از کم وہ اس واقعے اور اس شخص کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا جس نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔ اللہ ضرور اسے موقع دے گا کہ وہ اس سے اپنا انتقام لے اور وہ بھی وہ موقع ضائع نہیں کرے گا۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی، مگر اس وقت اسے وہ سب بھلا کر ان مواقع پہ توجہ مرکوز رکھنی تھی جو اس کے سامنے تھے۔ عبدالرحمن نے کبھی بھی موقعوں کا انتظار نہیں کیا تھا۔ اس نے موقعے ہمیشہ خود پیدا کیے تھے اور پھر اپنے کام نکلوائے تھے۔ اب بھی وہ یہی کر رہا تھا۔

مگر اس سب سے پہلے اسے اس چھوٹے سے مسئلے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا جو چار، پانچ ماہ قبل اس نے خود کھڑا کیا تھا۔ گو کہ چیزیں ویسے نہیں ہوئی تھیں جیسے اس نے سوچا تھا۔ بڑی غلطی ہوئی اس سے ہاشم پہ اعتبار کر کے، مگر پھر بھی اس سب کا اختتام ویسے ہی ہو گا جیسے اس نے سوچا تھا۔ جیسے اس نے پلان کیا تھا، جیسے ڈیوٹ فردوس نے مشورہ دیا تھا۔

ایک اتفاقیہ موقع اسے مزید پیدا کر رہا تھا۔

اس نے میز پہ رکھا اپنا فون اٹھایا اور فون بک کھولی۔ وہ نمبرز بھی لوگوں کے اصل نام سے محفوظ نہیں کرتا تھا۔ یہ نمبر بھی اس نے ایکسچینج اسٹوڈنٹ کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے وہ اس نمبر پہ میسج لکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

چھبیس مئی سے سبانجی میں امتحانات کا موسم چھا گیا۔ اس کٹھن موسم کو تو جون تک جاری رہنا تھا۔ ٹرم کا جھنجٹ... استقلال جدیسی کے چکر، جواہر کی شاپنگ اور پزل باکس کی پہیلیاں، اسے سب بھول گیا

تھا۔ اولاد میں ہونے کے باعث ہونے والا نقصان تو وہ پورا کر چکی تھی مگر یہاں صرف پاس نہیں ہونا تھا' بلکہ ڈسٹنکشن لینی تھی۔ اس کا رزلٹ برا ہوا تو پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی ناکامی ہوگی اور رزلٹ اچھا آیا تو پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ کی کامیابی ہوگی۔ وہ حیا سلیمان کو بھلا کر صرف اور صرف "پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس" رہ گئی تھی۔

اکتیس مئی کی صبح استنبول پہ کسی قہر کی طرح نازل ہوئی تھی۔ وہ رات دیر تک پڑھنے کے بعد فجر کے قریب سوئی تھی کہ آج چھٹی تھی مگر صبح صبح ہالے کسی آندھی طوفان کی طرح ڈورم میں بھاگتی آئی تھی۔

"حیا۔ حیا۔ اٹھو!" وہ ہالے کے زور زور سے پکارنے پہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا؟" نیچے اپنے بینک کی سیڑھی کے ساتھ کھڑی ہالے کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ لحاف پھینک کر تیزی سے نیچے اتری۔

"حیا۔" ہالے کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔ حیا نے بے اختیار اس کے ہاتھ پکڑے جو سرد ہو رہے تھے۔

"ہالے؟"

"حیا۔ فریڈم فلوٹیلا۔ جو غزہ جا رہا تھا۔ اسے روک دیا گیا ہے' اسرائیل نے اس پہ اٹیک کر دیا ہے۔ پتا نہیں کتنے فلسطینی اور ترک مارے جا چکے ہیں۔"

"اللہ!" اس نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔ "مگر۔ مگر وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ ان۔ ترکی جہازوں میں تو خوراک تھی' دوائیاں تھیں۔"

"وہ کہتے ہیں کہ ان میں اسلحہ تھا اور دہشت گرد بھی۔ پھر انہیں پوچھنے والا کون ہے؟"

"خدایا! معتصم وغیرہ کتنے پریشان ہوں گے۔ ان کے تو دوست بھی تھے مسافر بردار جہاز میں۔" اسے بے اختیار یاد آیا۔

"ہمیں ان کے پاس جانا چاہیے' چلو جلدی کرو۔"

اس نے جلدی جلدی بال جوڑے میں لپیٹے اور پھر لباس بدل کر اسکارف لپیٹ کر اور نقاب نفاست سے سیٹ کر کے وہ ہالے کے ساتھ باہر آگئی۔ کامن روم کے راستے میں اس نے موبائل چیک کیا تو ادھر رات کے کسی ایک پہر ترک موبائل نمبر سے پیغام آیا ہوا تھا۔

"میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے' اے آر پی۔"

"جہنم میں جائے اے آر پی۔" وہ اس وقت اس پریشانی میں اے آر پی کا سرپرائز کے بارے میں کہاں سوچتی۔

کامن روم میں پانچوں فلسطینی لڑکے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میز پہ لیپ ٹاپس کھلے پڑے تھے اور موبائل ہاتھوں میں لیے وہ سب اپ ڈیٹس کے منتظر تھے۔ ان کے چہرے دیکھے تو وہ افسوس کے سارے الفاظ بھول گئی۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ وہ اور ہالے خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔

"آئی ایم سو سوری' معتصم!" اس کے کہنے پہ معتصم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بجلی سی چمکتی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دی اور دوبارہ اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ وہ اس کی تکلیف محسوس کر سکتی تھی' بلکہ نہیں وہ کیسے محسوس کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ وہ خود کو ان کی جگہ پہ رکھے۔ وہ تصور کرے کہ (اس نے لمحے بھر کو آنکھیں میچ کر سوچا) اگر خدانخواستہ اسلام آباد میں جنگ جاری ہو' پورا شہر اپنے گھروں میں محصور ہو' اس کے گھر والے بیمار اور زخمی ہوں اور پھر ادھر ترکی سے ایک فلوٹیلا انہیں دوائیاں اور خوراک بھیجے مگر وہ فلوٹیلا کراچی کے ساحل پہ روک لیا جائے' اس میں سوار کچھ لوگوں کو مار دیا جائے اور اس کے گھر والے تڑپتے رہیں۔ ہاں (اس نے تکلیف سے آنکھیں کھولیں۔) اب وہ محسوس کر سکتی تھی۔ جب تک اپنے ملک اور اپنے گھر پہ یہ بات نہ آئے' کسی دوسرے کا درد محسوس ہی نہیں ہوتا۔

کامن روم کا دروازہ کھول کر ٹالی اندر داخل ہوئی۔

حیا اور ہالے نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو۔ ٹالی چلتی ہوئی سامنے آئی۔ وہ لڑکوں کو دیکھ رہی تھی مگر ان میں سے کسی نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"معتصم! کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟"

معتصم اپنے جوتوں کو دیکھتا رہا۔ اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

"حسین۔!" وہ حسین کے قریب صوفے پہ بیٹھی' اس کا بیٹھنا گویا کسی کرنٹ کا جھٹکا تھا۔ حسین تیزی سے اٹھا۔ ساتھ ہی چاروں لڑکے اٹھے اور وہ سب اکٹھے باہر نکل گئے۔

ٹالی لب کاٹتے ہوئے انہیں جاتے دیکھتی رہی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دن اس کی اور فلسطینیوں کی دوستی کا آخری دن تھا۔

ان کے نکلتے ہی دوسری طرف سے لطیف کمرے میں داخل ہوا۔ آہٹ پہ ٹالی اور ان دونوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ لطیف نے جینز پہ سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی' جس پہ کالے مارکر سے نمایاں کر کے لکھا تھا۔

"شیم آن یو اسرائیل!"

ٹالی نے وہ تحریر پڑھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ ہالے زیر لب مسکرائی اور حیا کو دیکھا۔ وہ بھی ہولے سے مسکرائی۔

"ٹالی۔ ٹرسٹ می' یہ صرف۔" لطیف ہاتھ اٹھا کر مت دینے انداز میں اب ٹالی کو سمجھا رہا تھا کہ اس کی یہ تحریر صرف اسرائیلی حکومت اور اسرائیلی فوج کے لیے تھی۔ اسے ٹالی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس سے ناراض تھا۔ ٹالی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے سمجھنے والے انداز میں سنتی رہی۔ لطیف کینسر لک تھا' ترک تھا۔ وہ یہ سب کہہ سکتا تھا مگر فلسطینیوں کی بات اور تھی۔ جو انہوں نے کیا ہالے اور حیا کو بالکل درست لگا تھا۔

وہ ماتم کا دن تھا۔ گو کہ یونیورسٹی میں سارے کام معمول کے مطابق ہو رہے تھے مگر در و دیوار پہ چھایا سوگ اور قوت دل کو کاٹتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں' کس سے انصاف مانگیں۔

"ہٹلر کہتا تھا میں چاہتا تو تمام یہودیوں کو مار دیتا' مگر میں نے بہت سوں کو چھوڑ دیا' تاکہ دنیا جان سکے کہ میں نے ان کے بھائی بندوں کو کیوں مارا تھا۔"

اور اس جیسی دوسری بہت سی "ہٹلر کوٹس" اسٹوڈنٹس اپنی اپنی شرٹس پہ لکھ کر پہنے گھوم رہے تھے۔ وہ اور ہالے بھی سارا دن یونیورسٹی میں ذیلی راہ داریوں میں بے مقصد چلتی رہی تھیں۔

پاکستان میں اپنے لاؤنج میں بیٹھے ریموٹ پکڑے ٹی وی پہ فریڈم فلوٹیلا کی خبر دیکھنا اور افسوس کر کے چینل بدل دینا اور بات تھی مگر ترکی میں رہ کر اس ساری اذیت و تکلیف کا حصہ بننا دوسری بات تھی۔

وہ ایکسپریس پہ طلعت حسین کا شو کبھی بھی نہیں دیکھتی تھی مگر یہ بات کہ وہ بھی ان سیکڑوں لوگوں کے ساتھ قید تھے' بہت دل دکھانے والا تھا۔ یہ چھ جہاز تھے' تین کارگو اور تین مسافر بردار۔ یہ سب مختلف جگہوں سے آکر مرمرا میں ایک مقام پہ اکٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے یہ پورا فلوٹیلا غزہ کی جانب گامزن ہوا تھا' تاکہ غزہ کے محصورین کو امداد پہنچا سکے۔ جب فلوٹیلا غزہ کے قریب پہنچا تو اسرائیلی فوج نے جہازوں پہ حملہ کر دیا۔ کتنے ہی لوگ شہید کر دیے اور باقی سب قید۔

دوپہر میں وہ اور ہالے باہر سبانجی کے کیفے کے فوارے کے ساتھ کرسیوں پہ بیٹھی چارٹس اور پلے کارڈز بنا رہی تھیں۔

انہوں نے سنا تھا کہ پورا استنبول سڑکوں پہ نکل آیا ہے۔ (سبانجی شہر میں نہیں' بلکہ مضافات میں واقع تھی) سو ان کا ارادہ بھی آج جا کر اس احتجاج میں شامل ہونے کا تھا۔

مئی کے آخر کی دھوپ فوارے کے پانی سے اٹھ رہی تھی۔ وہ کہنیاں میز پہ ٹکائے سر جھکائے پوسٹر میں رنگ کر رہی تھی۔ اسکارف کے ایک پلو سے نفاست سے کیا گیا نقاب اس کے چہرے کا حصہ بن گیا تھا۔ صرف بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نظر آتیں جو پہلے سے

زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ انسان ایک ہی دریا میں دو مرتبہ نہیں اتر سکتا۔ وہ بھی اب وہ والی حیا سلیمان نہیں رہی تھی جو چار ماہ قبل ترکی آئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نامحسوس طریقے سے بدلتی جا رہی تھی۔

ایک ثانیے کو اس کا ذہن صبح آئے پیغام کی جانب بھٹک گیا۔

"کون سا سرپرائز؟ کیسا سرپرائز؟" خیر! عبدالرحمن کی ہر بات ہی سرپرائز ہوتی تھی۔ اب تو اس نے حیران ہونا بھی ترک کر دیا تھا۔

پلے کارڈز اور پوسٹرز لپیٹ کر جب وہ کامن روم میں آئی تو سینڈرا، چیری اور سارہ کتابیں گودوں میں رکھے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ پہلے سے رکھے اپنے بیگ میں وہ چیزیں ڈال رہی تھی اور فلسطینی لڑکے بھی افراتفری کے عالم میں آ جا رہے تھے۔ سب کو احتجاج کے لیے استنبول جانا تھا۔

"کیا تم لوگ نہیں چلو گے سارہ؟" اس نے ٹی وی میں مگن تینوں لڑکیوں کو مخاطب کیا۔

"وہ نہیں۔" سارہ نے اسکرین پہ نگاہیں جمائے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ چیری اور سینڈرا نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ وہ اسی طرح کھڑی ان کے چہرے دیکھے گئی۔

ہالے اور فلسطینیوں کے ساتھ سامان پیک کروانے اور احتجاجی شرٹس پہن کر اس کارروائی میں شامل ہونے کے لیے بہت سے ترک اسٹوڈنٹس بھی آ گئے تھے۔ وہ لڑکیاں تھیں جو گرمی، سردی، ہر موسم میں منی اسکرٹس میں ملبوس ہوتی تھیں۔ وہ لڑکے جن کا دین، مذہب سے کوئی دور دور کا واسطہ بھی نہ تھا، کانوں میں بالی اور قابل اعتراض تصاویر والی ٹی شرٹس اور جینز پہننے والے لڑکے اب سب ایک ہو گئے تھے۔ مگر وہ لڑکیاں، چیری، سارہ، سینڈرا، کلیٰ، وہ جن کے ساتھ حیا اور ڈی جے رات کو گھنٹوں باتیں کرتی تھیں، جو ساتھ کھاتی پیتی، سوتی جاگتی، ہنستی بولتی تھیں، اب وہی لڑکیاں اجنبی بنی بیٹھی تھیں۔

"یہ لوگ کیوں نہیں چل رہے؟" سب واضح تھا، پھر بھی اس نے الجھن بھرے انداز میں ہالے سے دھیرے سے پوچھا۔ ہالے نے سارہ وغیرہ کو بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہیں حیا!"

وہ بالکل چپ کھڑی رہ گئی۔ ان چار ماہ میں انہیں ترک، پاکستانی، فلسطینی، نارویجین، ڈچ، جاپانیز، اسرائیلی اور ایسی ہی دوسری مختلف تفریقات میں بانٹا گیا تھا، مگر آج قومیت کے سارے فرق مٹ گئے تھے۔ یہودی، عیسائی، بدھسٹ، سب ایک طرف ہو گئے تھے اور مسلمان اسٹوڈنٹس ایک طرف۔

اور وہ بھی کن سرابوں کے پیچھے دوڑا کرتی تھی؟ اسے بھی کن لوگوں کا لباس، کن کا رہن سہن اچھا لگتا تھا؟

انجم باجی اور جاوید بھائی سمیت وہ سب جب تاقسم پہنچے تو وہ پانچ منٹ کے لیے معذرت کر کے تیزی سے استقلال اسٹریٹ کی طرف چلی آئی۔ اسے جہان کو بھی اپنے ساتھ لینا تھا۔ جتنے زیادہ مسلمان ہوں، اتنا بہتر تھا۔ برگر کنگ پہ معمول کی گہما گہمی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ کی میزوں سے ہٹ کر اندر جانے والے دروازے میں داخل ہو گئی۔ کچن میں ایک ترک لڑکی اور ایک نیا لڑکا کام کر رہے تھے۔ دونوں شیف تھے۔

"سلام! جہان کہاں ہے؟" اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے لڑکے کو مخاطب کیا۔

"وہ ابھی تو یہیں تھا۔ گوشت کاٹ رہا تھا۔ اب شاید۔" لڑکے نے مڑ کر ایک دوسرے دروازے کی طرف دیکھا۔ "شاید ڈریسنگ روم میں ہو یا کہیں اور روم میں۔"

اسی پل ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا۔ حیا نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔ جہان اندر داخل ہو رہا تھا، یوں کہ سر جھکائے وہ آنکھوں کو انگلیوں سے رگڑ رہا تھا۔

"جہان!" اس نے پکارا تو جہان نے چونک کر گردن

اٹھائی۔ اس کی آنکھیں بھیگی اور سرخ سی ہو رہی تھیں۔ وہ بمشکل مسکرایا اور سلیب کی طرف آیا۔

"السلام علیکم! تم کب آئیں؟" وہ اس سے نظر ملائے بغیر گردن جھکا کر ٹرے سے گوشت کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔

"ابھی۔ تم۔ تم ٹھیک ہو؟" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"ہاں! بس پیاز کاٹنے سے آنکھوں میں تھوڑی جلن ہو رہی تھی تو ابھی منہ دھونے گیا تھا۔" "اتنی لمبی وضاحت؟" بھلا جہان دے؟ اور پیاز۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، پیاز تو کہیں نہیں تھی۔

"تم بتاؤ، کیسے آئیں؟"

"وہ۔ ہم اسٹریٹ پروٹسٹ کے لیے جا رہے ہیں، فریڈم فلوٹیلا پہ حملے کے خلاف۔ تم چلو گے؟"

"پروٹیسٹ کیوں؟ ان بحری جہازوں میں اسلحہ نہیں تھا؟"

"اسلحہ؟ نہیں جہان! ان میں دوا اور خوراک تھی۔" اس نے اچنبھے سے جہان کو دیکھا۔ کیا وہ اتنا بے خبر تھا؟

"یہ تو تم کہہ رہی ہو..... اسلحہ نہ ہوتا تو اسرائیلی کیوں روکتے اسے؟" وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کھٹا کھٹ کاٹ رہا تھا۔

"جہان! کیا تمہیں لگتا ہے کہ ان کو کسی وجہ کی ضرورت ہے؟"

"یہ ان کی آپس کی جنگ ہے حیا! یہ فلسطینی بھی اتنے سیدھے نہیں ہوتے۔ یہ جہاد وغیرہ کچھ نہیں ہوتا، سب دہشت گردی کی قسمیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ فلوٹیلا کو واقعی ناجائز روکا گیا ہو، مگر ہمیں فلسطینیوں سے زیادہ فلسطینی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"جہان! یہ کیسے ہمارا مسئلہ نہیں ہے؟ ہمارے مسلمان بھائی کو ہماری ضرورت ہے۔"

"ہمارا مذہب ہمارے پیدا ہونے سے پہلے بھی

تھا اور ہمارے مرنے کے بعد بھی رہے گا۔ اسے ہماری قطعاً ضرورت نہیں ہے اور پلیز! تم اس محمد بن قاسم ازم کے رومانس سے نکل آؤ۔"

وہ بہت بے زاری سے گردن جھکائے کام کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ کیسا جہاد ہے کہ بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر بندوق اٹھائے نکل پڑو۔ جہاد تو وہ ہوتا ہے جو ایک آدمی اپنے گھر والوں کے لیے مشقت کر کے روزی کماتا ہے، جو میں کرتا ہوں، جو اس ریسٹورنٹ میں میرے ورکرز کرتے ہیں۔"

"جہنم میں گیا تمہارا ریسٹورنٹ۔ بہرحال میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ اور اگر تم غلط ہو کر اتنے پراعتماد ہو سکتے ہو تو میں صحیح ہو کر پراعتماد کیوں نہ ہوؤں؟" وہ کہتی ہے کہہ کر پلٹ گئی۔

جہان نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا، پھر سر جھکا کر کام کرنے لگا۔

مسلمان اسٹوڈنٹس کا دوسرے ترک باسیوں کے ساتھ اسٹیشن پروٹیسٹ جاری تھا۔ پلے کارڈز اور بینرز اٹھائے وہ نعرے بلند کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک شخص زور سے پکارتا تھا "ڈاؤن وِد؟" تو باقی لوگ ہم آواز ہو کر "اسرائیل!" چلاتے۔ ہر طرف "Down with Israel" کے نعروں کی گونج تھی۔ پاکستان میں ایسے مظاہروں میں عموماً مردوں، عورتوں کے درمیان تفریق سی ہوتی تھی، مگر ترکی میں دونوں صنف اکٹھے ہی ریلی میں چل رہے تھے۔ یوں بہت بیچ بچ کر چلنا پڑتا، لیکن اس کا ذہن ابھی تک جہان میں اٹکا تھا۔

ہر ایک کے سیاسی تجزیات الگ ہوتے ہیں۔ سب کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے، پھر اسے کیوں بار بار رونا آ رہا ہے اور وہ کیوں بار بار اپنے آنسو بمشکل روک رہی ہے؟

وہ اسرائیلی ایمبیسی کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے۔ مقتصم کلوچہ بوداشہ ہو سکا، مگر ان کا احتجاج شان

راز رہا۔ اگلے روز اس کا پیپر تھا۔ وہ بے دلی سے تھوڑا بہت پڑھ کر جلدی سو گئی اور پھر صبح منہ اندھیرے اٹھ کر کتابیں لیے جھیل پہ آگئی۔

ہر سو نیلا سا اندھیرا چھایا تھا۔ جون شروع ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گرمی صرف دن میں ہوا کرتی تھی۔ وہ پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گئی اور گھٹنوں پہ کتاب رکھ لی۔ ہوا کے باعث شال سر سے پھسل کر گردن کی پشت پہ جا ٹھہری۔ دور دور تک کوئی نہ تھا' وہ وہاں اکیلی تھی۔

رونا تو اسے رات سے ہی آرہا تھا' مگر اب اس میں شدت آگئی تھی۔ وہ سر جھکائے بے آواز آنسو بہاتی رہی۔ کمرہ امتحان' وہ جھیل سب بے معنی ہو رہے تھے۔ "دفعتا" اس کا فون بجا۔ اس نے گھاس پہ رکھا موبائل اٹھایا۔

"جہان کالنگ" اس وقت؟ خیریت؟ وہ حیران ہوئی۔

"جہان! کیا ہوا؟" وہ ذرا نم زدہ آواز میں ذرا پریشانی سے بولی۔

"تم جاگ رہی ہو؟ آج تمہارا پیپر ہے نا۔"

"ہاں! میں جھیل پہ ہوں' تم کہاں ہو؟"

"ایک کام سے قریب میں آیا تھا' بس تم رکو' میں آرہا ہوں۔"

حیا نے موبائل بند کیا اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑے۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنا غیر متوقع رویے رکھنے والا شخص نہیں دیکھا تھا۔

"ہیلو!" چند ہی منٹ بعد وہ اس کے ساتھ آ بیٹھا تھا۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ جینز اور جیکٹ' گرے شرٹ میں وہ بہت تر و تازہ لگ رہا تھا۔

"تم اتنی صبح کیسے؟"

"یہاں مجھے قریب میں پہنچنا تھا' سات بجے تک۔ سوچا جلدی آجاؤں تاکہ پہلے تم سے مل لوں۔ مجھے لگا' تم کل ذرا ناراض ہو گئی تھیں۔" وہ اسی کے انداز میں آلتی پالتی بیٹھا اب جھیل کے پانی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی پانی کو ہی دیکھ رہی تھی۔

"نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

"حیا! ایک بات کہوں؟ کبھی بھی اپنے قرابت داروں سے ان کے پولیٹیکل رویوں کے باعث ناراض نہیں ہوتے۔" وہ بہت نرمی سے دھیمے انداز میں سمجھا رہا تھا۔ وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔

"ہر شخص کے رویے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ جب تک آپ کسی دوسرے کی جگہ پہ کھڑے ہو کر نہیں دیکھتے' آپ کی سمجھ میں پوری بات نہیں آسکتی۔ ہر کہانی کی ایک دوسری سائیڈ ضرور ہوتی ہے۔" اس نے چہرہ موڑ کر حیا کو دیکھا۔ "اب بتاؤ کیوں رو رہی تھیں؟"

"یونہی۔" وہ فورا" نگاہ چرا کر پانی کو دیکھنے لگی۔ "بس گھر یاد آرہا تھا۔"

"صبر کرلو' انسان کو ہمیشہ اتنی ہی تکلیف ملتی ہے جتنی وہ سہہ سکے۔"

"اور اگر وہ نہ سہہ سکے؟ آخر کیوں انسان کو سہنا پڑتا ہے سب کچھ؟ زندگی آسان کیوں نہیں ہوتی جہان؟" اس کی آنکھیں پھر سے بھیگ گئیں۔ وہ ابھی تک پانی کو دیکھ رہی تھی جو چمک رہا تھا۔ جیسے نیلے آسمان پہ چاندی کے تھال کی طرح کے چاند سے قطرہ قطرہ چاندی پگھل کر جھیل کی سطح پہ گر رہی تھی۔

"ابھی تمہاری اسٹوڈنٹ لائف ہے' اسے جتنا انجوائے کر سکتی ہو کرو۔ کیونکہ اس کے بعد زندگی اپنا نقاب اتار پھینکتی ہے اور چیزیں بہت مشکل ہو جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی تمہاری زندگی مشکل ہو جائے گی۔ تم کرو گی مجھ سے شادی؟"

لمحے بھر کو چاندی کی تہہ جھیل کی سطح سے پھسل کر سارے سبزہ زار پہ چڑھتی گئی۔ وہ ہر شے کو چاندی بناتی گئی اور وہ دونوں بھی چاندی کے مجسمے بنے رہ گئے۔ چمکتے ہوئے سلور مجسمے۔

"تمہاری شادی ہو نہیں چکی؟"

"وہ تو ہمارے بڑوں نے کی تھی۔ اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ تم مجھے جانتی ہو۔ میں کوئی ہر وقت ہنستا مسکراتا لڑکا نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں' میں بعض دفعہ بہت سخت ہو جاتا ہوں اور تب تمہیں میں بہت برا لگتا ہوں۔ مجھے پتا ہے' مگر میں ایسا ہی ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ ساری زندگی رہ لو گی؟" وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ حیا نے دھیرے سے شانے اچکا دیے۔

"استنبول میں ہر حالات میں رہنے کے لیے تیار ہوں میں۔"

"اللہ نہ کرے جو ہم یہاں رہیں۔" وہ ایک دم بالکل غیر ارادی طور پہ چونک کر بولا۔ چاندی کے دوسرے مجسمے نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟"

"یونہی کہہ رہا تھا۔" پہلے مجسمے نے گردن موڑ لی۔

"تمہیں پھپھو نے کب بتایا کہ ہم۔۔۔؟" وہ بات ادھوری چھوڑ گئی۔

"وہ کیوں بتاتیں؟ میں اس وقت آٹھ سال کا تھا اور آٹھ سال کے بچے کا حافظہ اچھا خاصا ہوتا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے پتا تھا۔"

"میں سمجھی تھی کہ تمہیں نہیں پتا۔" بے اختیار اس نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ زبان بھی چاندی بن چکی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' میں ہر کسی سے معذرت کرنے آجاتا ہوں یا ہر لڑکی کو ڈنر کے لیے لے جاتا ہوں؟" وہ ذرا خفگی سے اس معذرت کا حوالہ دینے لگا' جب اس نے اس کا جنجر بریڈ ہاؤس توڑا تھا۔

"تم میری بیوی ہو اور میرے لیے بہت خاص ہو۔ مگر میرے کچھ مسئلے ہیں۔ وہ ٹھیک ہو جائیں تو ہم اپنی زندگی شروع کریں گے۔"

چاندی کی تہہ اب سبزہ زار کے دہانوں سے پھیلتی ٹاورم پلاس پہ چھائی جا رہی تھی۔ پوری دنیا' زمین' آسمان' سب چاندی بنتا جا رہا تھا۔

"حیا! ہمارے بہت مسئلے رہے ہیں' مگر میری ماں' ہم انہیں ٹھیک کر لیں گے۔" وہ زخمی انداز سے مسکرایا۔ "ہم ہمیشہ سے ساتھ مل کر اپنے مسئلے ٹھیک کرتے آئے ہیں۔ ہم نے بہت اذیتیں جھیلی ہیں۔ بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ مگر میری ماں بہت مضبوط عورت ہے' بہت نڈر' بہت بہادر۔ انہوں نے ساری زندگی بوتیکس کے لیے کپڑے سی کر مجھے کسی قابل بنایا ہے۔ وہ اب بھی یہ کام کرتی ہیں' مگر انہوں نے تمہیں نہیں بتایا ہو گا۔ وہ اپنے مسئلے کسی سے بیان نہیں کرتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اتنی ہی مضبوط اور بہادر بن جاؤ۔" دھیرے سے مجسمہ اٹھ کھڑا ہوا تو چاندی کا خول چٹخا۔ سبزہ زار پہ چڑھے ورق میں دراڑیں پڑ گئیں۔

"میں چلتا ہوں' تم اچھا سا ایگزام دو اور اگر لندن جانے کا موڈ ہو تو بتانا۔" ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔

وہ بھیگی آنکھوں اور نیم مسکان کے ساتھ اسے جاتے دیکھتی رہی۔

چاندی کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر جھیل کے پانی میں گم ہو رہے تھے۔ چاند اب سرخ نارنجی روشنی کے نقطوں سے دور کر بادلوں کی اوٹ میں تیرنے لگا تھا۔ فسوں ختم ہو چکا تھا' حقیقی دن کا آغاز ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

چھ جون کو جب تک اسرائیل نے سارے قیدی رہا کر دیے' تب تک سبانجی اور استنبول میں غم و غصے کی فضا چھائی رہی۔ قیدیوں کی رہائی کے لیے مظاہرے' طیب اردگان کے سخت بیانات اور فلسطینی اسٹوڈنٹس کا تناؤ اور بھی بہت کچھ ہوا جو ہماری کہانی کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ بہرحال' نادی' مرمرا اور فریڈم فلوٹیلا کی پریشانی ختم ہوئی تو سب ایگزامز کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ امتحان بھی اسی لمبے اسکرٹ' فل سلیوز اور

اسکارف سے کیے گئے نقاب میں اوجھی تھی اور اب اسے اپنے اسی چہرے کی عادت ہوتی جارہی تھی۔ کندھے پہ بیگ لٹکائے اور سینے سے فائل لگا کر بازو لپیٹے وہ سر اٹھا کر بہت اعتماد سے جب ساتھی کی ہمراہ داری میں چلتی تو اسے نتالی اور اس کی دوستوں کی تو انصاف کی پروا نہ ہوتی۔

نتالی ابھی بھی اسے استہزائیہ انداز میں "Arap" کہتی تھی۔ (عرب بلقی "baci" یہ اردو والا باجی ہی تھا کہ ترکوں کا "C" "جیم کی آواز سے پڑھا جاتا تھا۔) البتہ نتالی اور فلسطینی لڑکیوں کے درمیان فریڈم فلوٹیلا کی کھینچی گئی لکیر ہنوز قائم تھی گو کہ ڈی جے اپنی دلی خواہش کی تکمیل دیکھنے کے لیے زندہ نہیں تھی۔

لوجوں کو امتحان ختم ہوئے تو الوداعی دعوتوں کا آغاز ہو گیا۔ پچاس ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس میں سے کچھ آخری مہینے میں دوسرے ممالک جارہے تھے، جبکہ کچھ ترکی میں ہی رہ رہے تھے۔ وہ عائشے کے پاس بیوک ادا جانا چاہتی تھی مگر وہاں عبدالرحمن تھا اور ابھی کالی تو اسے یاد ہو گی۔ وہ بدلہ بھی لے گا کہ گھر سے پروا نہیں تھی۔ بس چند دن ہیں پھر وہ پاکستان چلی جائے گی تو نہ وہاں عبدالرحمن ہو گا نہ تو از نے کنے والی نظر۔ وہاں اس کے حجاب کی عزت ہو گی۔ پہلی دفعہ اسے لگا فرقان کے نظریات برے نہیں لگے تھے۔ وہ ٹھیک ہی اس پہ روک ٹوک کرتے تھے۔ ابا اور تایا کتنے خوش ہوں گے اس کے حجاب پہ۔ مگر نہیں اسے ان کی خوشی سے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ کسی کی ستائش کے لیے تو یہ سب نہیں کر رہی۔

"ستائش کے لیے اگر کوئی حجاب لے تو جلد ہی چھوڑ دے کیونکہ یہ وہ کام ہے جس میں ریا ہو ہی نہیں سکتی۔" عائشے نے اس کی بات پہ ہنس کر کہا تھا۔

وہ اتنے دنوں بعد آج بیوک ادا آئی تھی اور اب وہ تینوں ساحل کے کنارے ایک اوپن ایئر کیفے میں بیٹھی تھیں۔

اس سے قبل وہ ان دونوں بہنوں کے ساتھ حلیمہ آنٹی کی طرف بھی ہو آئی تھی۔ آنٹی عثمان انکل اور سفیر کے ساتھ کہیں نکل رہی تھیں۔ بس دروازے پہ ہی کھڑے کھڑے سلام دعا ہو سکی۔ عثمان انکل ویسے ہی تھے بھاری بھرکم اور خوش مزاج۔ ڈی جے کا افسوس کرنے لگے تو خاموش ہوتے ہی چلے گئے اور بہارے کل بہت برے منہ بنا کرنے لگی۔ ایک وہی تھی جو اپنے تاثرات نہیں چھپایا کرتی تھی سفیر سے البتہ بہارے اور عائشے دونوں بور نہیں ہوتی تھیں۔ وہ اکثر اس کا ذکر کرتی تھیں اور اب حیا کی سفیر سے سرسری سی ملاقات بھی ہو گئی تھی۔ وہ بیس چوبیس برس کا خوش مزاج سا لڑکا تھا جیسا کہ یورپ میں مقیم پاکستانی لڑکے ہوتے ہیں۔

اس کی شادی اس کے والدین پاکستان میں زبردستی کرنے کے خواہاں تھے اور یہ قصہ بہارے اتنی دفعہ دہرا چکی تھی کہ وہ حیا کے لیے اہمیت کھو چکا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا ہوٹل گرینڈ میں کام کرتے تھے اور اس دس منٹ کی ملاقات میں بھی چند ایک بار سفیر کے لبوں سے "عبدالرحمن بھائی" ضرور نکلا تھا۔ وہی ستائش، فخر سے نام لینے کا انداز جو ان دونوں بہنوں کا بھی خاصہ تھا۔ پتا نہیں ان سب کو عبدالرحمن میں کیا نظر آتا تھا۔

جانے سے قبل اس نے ایک دفعہ سوچا کہ عثمان شبیر سے پوچھ لے کہ جہاز میں انہوں نے اگلی نشست پہ بیٹھی ترک عورت کو کیا کہا تھا کہ وہ خفگی سے واپس مڑ گئی تھی، مگر پھر اس نے جانے دیا۔ بعض باتیں ادھوری ہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے۔

"اور ریاکاری کی ایک پہچان ہوتی ہے حیا!" عائشے کہہ رہی تھی۔ "بعض دفعہ بندے کو خود بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ دکھاوا کر رہا ہے مگر ایسے کام کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اللہ اس پہ کبھی ثابت قدمی عطا نہیں کرتا۔"

ساحل کے کنارے پر سیاحوں کا خاصا رش تھا۔ بیوک ادا استنبول والوں کا "مری" تھا۔ موسم کیسا بھی ہوتے ہی سیاحوں کا رش لگ جاتا تھا۔

بھورے، سرمئی پروں والے سمندری بگلے بھی ساحل کی پٹی کے ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے۔

بہارے کے ہاتھ میں روٹی تھی اور وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بگلوں کی طرف اچھال رہی تھی۔ ایک ٹکڑا بھی زمین پہ نہ گرتا، بگلے فضا میں ہی اسے چونچ میں دبا لیتے۔

"ثابت قدمی واقعی مشکل ہوتی ہے عائشے! میری ساتھی اسٹوڈنٹس اکثر مجھ پہ آوازیں کس کر پوچھتی ہیں کہ میں نے اس چہرے سے اسکارف کے اندر کیا چھپا رکھا ہے؟"

"تم آگے سے کہا کرو، خودکش بم چھپا رکھا ہے۔" بہارے نے اس کی طرف گردن جھکا کر رازداری سے کہا تھا مگر اس کی بہن نے سن لیا۔

"بری بات بہارے!" عائشے نے خفگی سے اسے دیکھا۔ "جب اچھی لڑکیاں کوئی فضول بات سنتی ہیں تو اسے بہت باوقار طریقے سے نظر انداز کر دیتی ہیں۔"

بہارے نے اتنی ہی خفگی سے سر جھٹکا اور روٹی کے ٹکڑے توڑنے لگی۔

"خیر ہے بہارے! بس جولائی میں میں واپس چلی جاؤں گی اور وہاں نہ ترک حکومت کی سختی ہو گی نہ سرائیکی بٹنے، میں ادھر پوری آزادی کے ساتھ حجاب لے سکوں گی۔"

"ضرور، مگر خندق کی جنگ میں ایک بنو قریظہ مل ہی جاتا ہے حیا!"

"مطلب؟" اس نے ناسمجھی سے ابرو اٹھائی۔

جواباً عائشے اپنے خاص انداز میں مسکرائی جیسے اس حجاب کے لیے کوئی خاص خواہ ہو۔

"تم نے کبھی سوچا ہے حیا کہ آیت حجاب سورۃ احزاب میں ہی کیوں آئی ہے؟" اس نے جواب دینے کے بجائے ایک نیا سوال کیا۔

اس نے ذہن پہ زور دیا، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"شاید اس لیے کہ یہ حکم غزوہ احزاب کے قریب ہی اترا تھا۔"

"یہ تو سب کو نظر آتا ہے حیا!" "میں تمہیں وہ سمجھاؤں جو سب کو نظر نہیں آتا؟ یقین کرو، یہ تمہارے پزل باکس کی پہیلیوں سے زیادہ دلچسپ ثابت ہو گی۔"

حیا لاشعوری طور پہ کرسی پہ ذرا آگے ہوئی۔ بہارے برے برے منہ بنا کر روٹی کے ٹکڑے اچھال رہی تھی۔ وہ بول نہیں سکتی تھی کیونکہ عائشے گل سکتی اور سب کے سامنے وہ ہمیشہ عائشے کی وفادار رہتی تھی، لیکن اس نے ایک قدیم لوک کہانی میں پڑھا تھا کہ مرمرا کے بگلے ان کہی باتیں بھی سن لیتے ہیں، سو اس نے دل ہی دل میں ان پھڑپھڑاتے بگلوں کو مخاطب کیا تھا۔

(عبدالرحمن ٹھیک کہتا ہے، میری بہن کو لیکچر دینے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ کیا تم نے سنا میں نے کیا کہا؟)

"اللہ چاہتا تو کسی اور سورۃ میں یہ حکم نازل کر دیتا، یا اس سورۃ احزاب کا نام کچھ اور رکھ دیتا، مگر کسی کا نام کیوں؟"

ایک چھوٹے بگلے نے فضا میں ہی بہارے کا پھینکا ٹکڑا اچکا اور پر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ گیا۔ بہارے نے گردن اٹھا کر اسے اور اڑتے دیکھا۔ کیا اس نے سنا تھا جو وہ اس سے کہہ رہی تھی؟

"تمہیں پتا ہے احزاب کہتے ہیں گروہوں کو اور "غزوہ احزاب" دراصل غزوہ خندق کا دوسرا نام ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم یہ سارا واقعہ جانتی ہو کہ کس طرح مسلمانوں نے خندق کھودی، مگر پھر بھی میں تمہیں یہ دوبارہ سنانا چاہتی ہوں۔"

(میری بہن حیا کو بور کر رہی ہے۔ اگر عبدالرحمن ادھر ہوتا تو یہی کہتا۔ کیا تم نے اب سنا؟) مگر بگلے بس روٹی چونچوں میں دبا کر اڑ جاتے۔

"تمہیں پتا ہے مدینہ میں یہود کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ تھا کہ مدینہ پہ حملہ ہوا تو مل کر دفاع کریں گے مگر یہود تو پھر یہود ہوتے ہیں۔ بنو قریظہ، یہود کے گروہ نے اہل مکہ سمیت کئی گروہوں کو جا جا کر اکسایا کہ مدینہ پہ حملہ کر دیں، وہ ان کے ساتھ ہیں۔ یوں جب سارے گروہوں نے لشکر کی صورت مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈال دیا

تو بنو قریظہ "آپ کا اتحاد توڑ کر یہ گروہوں" کے ساتھ جا ملا۔" عائشے سانس لینے کو رکی۔ بہارے پلکوں کو جھپکا کر بولی تو زرتاشہ چھوڑ کر عائشے کو دیکھ رہی تھی۔

"تب مسلمانوں نے اپنے اور دشمن کے گروہوں کے درمیان ایک بہت لمبی، بہت گہری خندق کھودی تھی۔ سردی اور بھوک کی تکلیف واحد تکلیف نہیں تھی۔ اصل اذیت کسی حلیف کے دھوکا دینے کی ہوتی ہے۔ باہر والے تو دشمن ہوتے ہیں، مگر جب کوئی اپنا بیچ جنگ میں چھوڑ کر چلا جائے، وہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی لیے جب یہ گروہ محاصرے سے تنگ آکر ایک عرصے بعد واپس چلے گئے اور بنو قریظہ خوف کے مارے اپنے قلعوں میں چھپ گئے تو ان کو سزا دی گئی۔ بنو قریظہ کے ایک ایک مرد کو چن چن کر مارا گیا کہ یہ اللہ کا حکم تھا۔ جانتی ہو میں نے تمہیں اتنی لمبی کہانی کیوں سنائی؟"

"کیوں؟" حیا کے بجائے بہارے کے لبوں سے پھسلا۔ وہ اب ساری خفگی بھلائے عائشے کی طرف پوری محو ہو بیٹھی تھی۔

"کیونکہ حجاب پہننا، جنگ خندق کو دعوت دینا ہے۔ گروہوں کی جنگ۔ جب حجابی لڑکی کو دل پہ پتھر باندھ کر اپنے گرد خندق کھودنی پڑتی ہے، اتنی گہری کہ کوئی پار آنے کی جرات نہ کرسکے۔ اور پھر اسے اس خندق کے پار محصور رہنا پڑتا ہے۔ اس جنگ میں اصل دشمن اہل مکہ نہیں ہوتے، بلکہ اصل تکلیف بنو قریظہ سے ملتی ہے۔ یہ جنگ ہوتی ہی بنو قریظہ سے ہے اور خندق کی جنگ کبھی بھی بنو قریظہ کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔"

عائشے خاموش ہوئی تو کوئی سحر سا ٹوٹا۔ حیا نے سمجھ کر سر ہلایا۔ قرآن کی پہیلیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو، مگر شکر ہے میری فیملی حجاب کی بہت حامی ہے۔ میرا ان سے ساری زندگی نقطہ اختلاف یہی رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تمہاری اس جنگ میں کوئی بنو قریظہ نہ ہو۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" عائشے نے مسکرا کر دعا دی تھی۔

"مگر عائشے۔۔۔!" بہارے کچھ کہتے کہتے الجھ کر رک گئی۔ ان دونوں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ قدرے مبہم سے تاثرات کے ساتھ کچھ سوچ رہی تھی۔

"کیا ہوا بہارے؟"

"کچھ نہیں۔" بہارے سنبھل کر مسکرائی۔ اسے حیا کے سامنے عائشے کا ہمیشہ وفادار رہنا تھا، لیکن بعد میں تنہائی میں وہ اسے بتائے گی کہ اس نے ابھی پوری پہیلی حل نہیں کی۔ وہ احزاب کی پزل میں کچھ مس کر گئی تھی۔ وہ اصل نتیجہ نہیں جان سکی تھی اور وہ تو بہت سامنے کی بات تھی۔ بہارے نے ذرا سا غور کیا تو وہ اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے دل ہی دل میں وہ بات جگنوؤں سے کہہ دی۔

(کیا تم نے اب سنا؟ کیا تم نے سنا؟)

تب ہی ساحل پہ چہل قدمی کرتے بگلے نے ریت میں کچھ ڈھونڈنے کے لیے گردن جھکائی تھی۔ کیا یہ اثبات کا اشارہ تھا؟ بہارے گل سمجھ نہیں سکی۔

❂ ❂ ❂

امتحانات کا موسم ختم ہوا تو الوداعی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسٹوڈنٹس نے اب آخری مہینے کی سیاحت کے لیے روانہ ہونا تھا، سو سبانجی میں ایک دفعہ پھر سے وہی ماحول چھا گیا جو اسپرنگ بریک سے پہلے چھایا تھا۔ روانگی کی تیاریاں، پیکنگ، "آخری شاپنگ"، نقشے، گائیڈ بکس۔ صرف وہی تھی جس نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

اس رات ان کے ڈورم میں پوٹ لک Potluck ڈنر تھا۔ سب ایکسچینج اسٹوڈنٹس اپنے ممالک کی ڈشز تیار کر کے لا رہے تھے۔ دیسی کھانوں میں بریانی کے علاوہ اسے صرف چکن کڑاہی بنانی آتی تھی، سو انجم باجی کے اپارٹمنٹ پہ ان کے ساتھ مل کر اس نے وہی بنائی۔ نمک مرچ البتہ ذرا تیز ہو گیا تھا۔

"چلو خیر ہے، ہم نے ہی تو کھانی ہے، ہم ہی کھائیں گے سب۔" انجم باجی نے اسے تسلی دی۔ ابھی وہ دونوں ان کے

کمرے میں بڑے آئینے کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھیں۔ حیا اپنا سیاہ اسکارف ٹھوڑی تلے پن اپ کر رہی تھی، جبکہ انجم باجی آئی شیڈ لگا رہی تھیں۔ انہوں نے سلک کا نارنجی سا جوڑا پہن رکھا تھا۔ جوڑا اچھا تھا، مگر قمیص کافی چھوٹی اور شلوار کھلی تھی۔ یا تو انجم باجی ذرا آؤٹ ڈیٹڈ تھیں یا انڈیا میں ابھی تک پٹیالہ شلوار اور چھوٹی قمیص کا فیشن چل رہا تھا (پاکستان سے تو وہ عرصہ ہوا غائب ہو چکا تھا) اس نے سوچا مگر کہا نہیں۔

"تم آج تو نقاب مت کرو، آج تو پارٹی ہے۔" اسے نقاب اوڑھتے دیکھ کر انجم باجی ذرا سے چڑ کر بولی تھیں۔ "بس ذرا اچھی لگتی ہو۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"پارٹی تو ہے انجم باجی، مگر لوگ تو وہی ہیں جن سے سارا دن نقاب کرتی ہوں۔ اب اتار دوں تو کتنا برا لگے گا۔" اس نے بے حد رسان سے سمجھایا۔ تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔"

"آپ دیسی لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں نا، حجاب پہ آپ کو ویسے اذیت نہیں دیتے جیسے ترکی میں لوگ دیتے ہیں۔"

شکر ہے انجم باجی نے دوبارہ اعتراض نہیں کیا۔ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ بھی تو ان کے پرانے فیشن پہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے پیشانی سے اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے سوچا تھا۔

آج اس نے سیاہ سلک بلاؤز اور اسکرٹ کے ساتھ سیاہ اسکارف لیا تھا۔ پورا لباس سیاہ تھا۔ بس آستینوں پہ کلائیوں کے گرد سفید موتیوں کی دوہری لڑی لگی تھی، جو مدھم سی چمکتی تھی۔

ڈورم بلاک کے کامن روم میں روشنیوں کا سا سماں تھا۔ کرسیوں کے پھول ویسے ہی بنے تھے جیسے [illegible] کی سالگرہ کے دن بنائے گئے تھے۔ (کوہس کا تجربہ، بیڈ ہاؤس اور ڈی جے) یورپین لڑکیاں بہت دل سے تیار ہوئی تھیں۔ شولڈر لیس میلو سائٹ جو گھٹنوں سے اوپر آتے تھے، جیسے وہ کوئی ہوم ٹنٹ ہو۔ بیچ میں وہ سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں خاموش سی بیٹھی تھی۔ فلسطینی لڑکے اور ہالے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے، سو نہیں آسکے تھے۔ وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ دل میں عجیب سی ویرانی چھائی تھی، جیسے وہ کسی غلط جگہ پہ آگئی ہو۔

اگر وہ پہلے والی حیا ہوتی تو ایسے تیار ہوتی کہ کوئی اسے نظر انداز نہ کر پاتا۔ وہ موقع کی مناسبت سے ساڑھی، اونچا جوڑا اور ہیلز پہنتی اور اس نے سر جھٹکا۔ زمانہ جاہلیت کی کشش ثقل آخر مری کیوں نہیں ہے؟ وہ کیوں بار بار کھینچتی رہتی ہے؟ حالانکہ وہ قطعاً واپس اس دور میں نہیں لوٹنا چاہتی تھی، وہ تو اس پہاڑی پہ قدم بہ قدم اوپر چڑھنا چاہتی تھی۔ پھر اب وہ پیچھے کیوں دیکھ رہی تھی؟ پیچھے تو کھائی تھی۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ اسٹوڈنٹس ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے پلیٹیں لیے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ٹالی اپنی ڈش اٹھائے لے آئی تھی۔ پتا نہیں گوشت اور گاجر کا کیا ملغوبہ تھا جس کا وہ ایک بہت مشکل سا عبرانی نام لے رہی تھی۔ اس نے بہت خوش دلی سے حیا کے آگے ڈش کی تو حیا نے شکریہ کہتے ہوئے ذرا سا پلیٹ میں ڈالا۔ ٹالی مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ حیا نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے کانٹے میں گوشت کا ٹکڑا پھنسایا، پھر ایک دم ٹھہر گئی۔

وہ تو نقاب میں بیٹھی تھی۔ نقاب کے ساتھ وہ کیسے کھا سکتی تھی؟ اسے کیوں بھول گیا کہ وہ نقاب کے ساتھ نہیں کھا سکتی؟

اس نے بے بسی سے اردگرد دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، مگر وہاں بہت سے لڑکے تھے۔ وہ نقاب نہیں اتار سکتی تھی۔ کم از کم ٹالی کے اس ملغوبے کے لیے تو نہیں۔

اس نے بے دلی سے کانٹا پلیٹ میں گرا دیا۔ دل کی ویرانی بڑھ گئی تھی۔ اتنے سارے ایک جیسے لوگوں میں ایک ہی مختلف سی لڑکی، پتا نہیں کہاں سے آگئی تھی۔ وہ ان سب میں بالکل مس فٹ تھی۔ اجنبی، ایلین۔ کسی اور دنیا سے تعلق رکھنے والی۔ یہ اس کی دنیا نہیں تھی۔ آگے پاکستان میں بھی تو دعوتیں اور تقریبات

ہوں گی۔ وہ تو ادھر بھی مس فٹ لگے گی۔ یوں اس لبادے میں خود کو لپیٹے 'الگ تھلگ' 'خاموش سی' لوگ تو اسے پاگل کہیں گے۔ اسے اجنبی کہیں گے۔ اسے لوگوں کی باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا مگر خود اس کو سارا منظر بہت اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ وہ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں "اوڈ ون آؤٹ" وہ وہی بن چکی تھی۔

گھٹن بڑھ گئی تھی۔ اسے لگا اگر وہ کچھ دیر مزید یہیں کھڑی رہی تو رو دے گی۔ اسے یہاں سے کہیں بہت دور چلے جانا چاہیے، کسی جنگل میں، جہاں وہ اجنبی نہ ہو۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ راستے میں تالی دیتی لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اسے گزرتے دیکھ کر وہ شرارت سے مسکرائی۔

"حیا! تم نے اپنے اسکارف میں کیا چھپا رکھا ہے؟"

اور جواب گھماتے ہوئے حیا نے پلٹ کر دیکھا اور سنجیدگی سے بولی۔

"خود کش بم! کیا دکھاؤں؟" اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

تالی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اس کے سنبھلنے کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گئی۔

اپنے ڈورم میں آ کر اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور پھر دروازے سے کمر لگائے آنکھیں بند کیے تیز تیز سانس لینے لگی۔ چند ثانیے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمرہ خالی تھا۔ چاروں ڈبل اسٹوری بنکس نفاست سے سجے پڑے تھے۔

وہ اسی طرح دروازے سے لگی زمین پہ بیٹھتی گئی۔ اسکارف کی پن نوچ کر اتاری اور اسے اپنی میز کی طرف اچھالا۔ وہ کرسی پہ جا گرا اور ایک پلو لٹکتا ہوا زمین کو چھونے لگا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے نہیں اٹھی۔ بس نم آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

وہ تو کبھی محفلوں کی جان ہوتی تھی۔ اتنی سحر انگیز کہ اسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اب؟ اب وہ کیسے ایک دم سے اجنبی بن گئی تھی؟

بیپ کی آواز کے ساتھ پاکٹ میں رکھا فون بجا۔ اس نے فون نکال کر ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ میجر احمد کا میسیج آیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" بس تین الفاظ۔ شاید اس کے دل نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ بہت ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی سی ہے اس وقت۔ یہ کوئی بگ پی ایس نیٹ ورکنگ نہیں تھی۔ وجدان کا تعلق تھا، خیال کا رشتہ۔

وہ جوابا" ٹائپ کرنے لگی۔

"مجھے جنت کے ان پتوں نے دنیا والوں کے لیے اجنبی بنا دیا ہے میجر احمد!"

پیغام چلا گیا۔ آنسو اسی طرح اس کے چہرے پہ لڑھکتے رہے۔ اسے پرانی زندگی یاد نہیں آ رہی تھی۔ اسے نئی زندگی مشکل لگ رہی تھی۔ احزاب کی جنگ کی خندق تو بہت گہری مگر بہت تاریک تھی۔ اس میں تو دم گھٹتا تھا۔ وہ کیسے اس پہ قائم رہ پائے گی؟

احمد کا جواب آیا تو اسکرین جگمگا اٹھی۔ اس نے پیغام کھولا۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

اسلام شروع میں اجنبی تھا۔

عنقریب یہ پھر اجنبی ہو جائے گا۔

اور

سلام ہو ان اجنبیوں پہ!"

اسکرین پہ ٹپ ٹپ اس کے آنسو گرنے لگے۔ وہ اللہ! اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں میں سر گرا لیا۔ وہ کیوں نہیں سمجھ سکی کہ یہی اجنبی پن تو اسلام تھا۔ ایسی ہی تو ہوتی ہیں اچھی لڑکیاں۔ عام لڑکیوں سے الگ، منفرد، مختلف۔ وہ دنیا میں کم نہیں گھلتیں۔ قہقہے لگاتی، پیرٹیوں، کانفرنسوں اور ڈراموں میں مگن لڑکیاں جیسی تو نہیں ہوتیں۔ اجنبیت ہی ان کی شناخت ہوتی ہے۔ وہ ساحل کی کیچڑ پہ چمکنے والا الگ سا موتی ہوتی ہیں، اجنبی سوتی۔

وہ دھیرے سے مسکرائی اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑے۔ وہ ایک مضبوط لڑکی ہے۔ اسے اتنی جلدی ہار نہیں ماننی۔ وہ اسی اجنبی طریقے سے اس کا

میں سر اٹھا کر سب کے درمیان بیٹھے گی اور وہ دنیا والوں کو یہ کر کے دکھائے گی۔ آئندہ وہ کوئی پارٹی چھوڑ کر نہیں آئے گی، وہ پورے اعتماد سے ان میں بیٹھے گی۔

وہ اٹھی اور اپنا اسکارف اٹھایا۔ پھر فون پہ عائشے کا نمبر ملانے لگی۔ اچھی لڑکیوں کو اپنے جیسی اہلمنز سے زیادہ سے زیادہ ان ٹچ رہنا چاہیے تاکہ جب خلق کھو دے کوئی اپنے دل پہ رکھا ایک پتھر دکھائے تو آپ اسے اپنے دو پتھر دکھا سکیں۔

"اسلام علیکم حیا!" دوسری جانب بہارے چہکی تھی۔ "میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔"

"اچھا تم کیا سوچ رہی تھیں؟" وہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کا جوڑا کھولنے لگی۔ نرم ریشمی بال کھل کر کمر پہ گرتے چلے گئے۔ وہ اب بھی اتنی ہی خوب صورت تھی جتنی پہلے تھی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں کہ تمہارا باکس کھلا یا نہیں؟"

"ارے ہاں، وہ کھل گیا۔ مگر اس میں صرف ایک چابی تھی۔"

"کھل گیا؟ تم نے پہیلی بوجھ لی؟" بہارے ایک دم سے بہت پرجوش ہو گئی۔

"ہاں مگر سنے بوجھی۔"

"تو اس باکس کی 'کی' کیا تھی؟ کون سا لفظ تھا؟" بہارے کو بہت بے چینی تھی۔ اس نے بھی حیا کے باکس پہ زور آزمائی کی تھی مگر سب اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔

"اس کی Key (چابی) قسم ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ عائشے اور بہارے باکس کے کوڈ کو ہمیشہ 'کی' کہا کرتی تھیں۔ مقفل باکس کی چابی۔

بالوں میں برش چلاتی وہ ایک دم بالکل ٹھہر گئی۔ اس کے ذہن میں روشنی کا کوندا سا لپکا تھا۔

"کی؟" اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ "بہارے! میں تمہیں بعد میں کال کرتی ہوں۔ ابھی کچھ کام آن ہے۔" اس نے جلدی سے فون بند کیا اور اپنے

دروازے سے پزل باکس نکالا۔ بہت تیزی سے اس نے سلائیڈز اوپر نیچے کیں۔ تاقسم کا لفظ سامنے آیا تو مقفل باکس کھل پڑا۔ مقفل باکس کی کنجی تاقسم تھی۔

اندر دھرے کاغذ پہ لکھی تحریر واضح تھی۔

"چابی کے پیچھے وہ قفل اسٹاپ ہیں۔"

چابی! او خدایا! اسے پہلے کیوں سمجھ میں نہیں آیا۔ پہلی نے کہا تھا 'توڑ کر کھولنے پہ کسی کام کا نہیں رہے گا۔' اس نے وہ تحریر توڑ کر کھولنے والے کے لیے لکھی تھی تاکہ وہ سمجھے کہ "چابی" سے مراد لوہے کی چابی ہے جبکہ پہیلی بوجھ کر کھولنے والے کو علم ہو کہ چابی سے مراد "تاقسم" ہے۔

تاقسم کے پیچھے وہ قفل اسٹاپس لگانے سے کیا بنتا تھا؟ وہ سوچنا چاہتی تھی مگر لڑکیاں واپس آ گئیں تو اس کی یکسوئی متاثر ہونے لگی۔ اس نے باکس لیا، اسکارف لپیٹا اور اسٹڈی روم میں آ گئی۔ وہاں ان کے ڈورم بلاک کی وہ ترک اسٹوڈنٹس بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھی ایک کرسی پہ آ بیٹھی اور ایک کاغذ پہ لکھا "تاقسم" پھر اس کے پیچھے تین جگہوں پہ نقطے لگا کر دیکھے مگر کچھ نہیں بن رہا تھا۔ انگریزی حروف میں لکھا تب بھی کچھ نہیں بنا۔

"سنو۔" اس نے ان دونوں لڑکیوں کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔

"تاقسم کے پیچھے ترکی میں 'تاقسم اسکوائر' کے پیچھے اگر ہم فل اسٹاپس لگائیں تو ہمیں کیا ملے گا؟"

ایک لڑکی الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔ جبکہ دوسری نے بہت بے نیازی سے شانے اچکائے۔ "لگانے سے اگر تمہارا مطلب ٹریول کرنا ہے تو پھر سسلی!"

"کیا؟" حیا کو سمجھ نہیں آیا۔

"تاقسم کے پیچھے اگر تم میٹرولائن پہ وہ پورے اسٹاپ ٹریول کرو تو سسلی کا اسٹاپ آئے گا نا!"

وہ بالکل سناٹے میں رہ گئی۔

"اوہو، وہ تاقسم لفظ کی بات کر رہی ہے، سسلی والے اسکوائر کی نہیں۔" دوسری لڑکی نے اپنی ساتھی کو ٹوکا تھا۔ جوابا" اس لڑکی نے سوالیہ نگاہوں سے حیا کو

دیکھا۔ وہ بیک وقت مسکرائی۔

"نہیں میں اصلی والے تاقسم اسکوائر کی ہی بات کر رہی تھی۔" وہ کرسی پہ واپس گھوم گئی اور وہ تحریر پڑھی۔

چابی تلے وہ قفل اسٹالز۔ یعنی تاقسم کے نیچے وہ (پورے اسٹالز یعنی اسٹالز سے مراد لفظی نہیں، بلکہ میٹرو کے اسٹاپ تھے اور لوہے کی چابی تلے وہ قفل تھے) اس نے توڑ کر کھولنے والے کے لیے بطور دھوکے کے لگائے تھے۔

"وہ سسلی!" اس نے زیر لب دہرایا۔ سسلی میں اس کی امانت تھی۔ ڈولی کی امانت جسے میجر احمد سے چھپایا تھا۔ اسے اب کل صبح تاقسم کے نیچے پورے وہ اسٹالز تک سفر کرنا تھا۔

میجر احمد کا پزل آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح بہت سنہری، نرم گرم سی طلوع ہوئی تھی۔ وہ تاقسم جانے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑی گیلے بال ڈرائر سے سکھا رہی تھی۔ وہ کبھی بھی نم بالوں کو اسکارف میں نہیں باندھتی تھی۔ اسکارف پہننے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ گندا میلا رہا جائے۔ وہ اب بھی اپنے بالوں کی خوب صورتی کا انتہائی خیال رکھتی تھی جتنا کہ پہلے۔ جب تک بال خشک ہوئے، ہالے ایک پیکٹ اٹھائے اندر چلی آئی۔

"وہ فلسطینی اسٹوڈنٹس صبح سویرے قطر جانے کے لیے نکل گئے تھے۔ وہ مجھے یہ تمہارا گفٹ دے گئے تھے۔ تب تم سو رہی تھیں۔ انہوں نے سب کو گفٹس دیے ہیں۔"

"اچھا دکھاؤ۔" وہ برش رکھ کر بہت اشتیاق سے پیکٹ کھولنے لگی۔ اندر اس کے تحفے پہ ایک سادہ موٹے کارڈ پہ لکھا تھا۔

"لطیف نے بتایا تھا کہ کل ہماری پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ اپنے نقاب کی وجہ سے کھانا نہیں کھا سکی تھیں۔ اس لیے ہم یہ لے آئے۔ اس میں آپ کو بھی بھوکا نہیں رہنا پڑے گا۔ منجانب فلسطینی ایکسچینج اسٹوڈنٹس!"

اس کے نیچے ایک سیاہ سلک کا لبادہ رکھا تھا۔ اس نے وہ اٹھایا تو وہ نرم ریشمی سا کپڑا انگلیوں سے پھسلنے لگا۔ سیاہ لمبا عبایا جو "حریر" کا بنا تھا۔ وہ عام ریشم نہیں تھا بلکہ ذرا مختلف تھا۔ اس میں بہت ہلکی سی چمک تھی جتنی چائنا سلک کے دوپٹے میں ہوتی ہے۔ آستینوں کی کلائیوں کے گرد موٹے موٹے سبز پتھر لگے تھے کسی لیس کی طرح۔ وہ بادام کے سائز کے تھے اور بالکل زمرد کی طرح لگ رہے تھے۔ سوائے سبز اسٹونز کی لیس کے سارا عبایا سادہ تھا۔ اس کا اسٹول البتہ ریشم کے بجائے کسی نرم کپڑے کی تھی اور ساتھ میں ایک علیحدہ نقاب بھی تھا۔ لفافے کارڈ پہ لکھی تحریر کا مطلب سمجھ آ گیا۔ اس علیحدہ نقاب کو (جس میں آنکھوں کا خلا بنا تھا) پیشانی پہ رکھ کر سر کے پیچھے پن اپ کرنا تھا۔ یوں نقاب کی سائیڈ کھلی ہوتیں اور وہ اس سے کھا سکتی۔

"یہ تو بہت مہنگا لگ رہا ہے۔ تمہیں پتا ہے یہ انہوں نے ضرور جواہر سے لیا ہوگا۔ وہاں ایک شاپ سے سعودیہ کے امپورٹڈ عبایا ملتے ہیں۔ یہ وہی ہے اور تمہارے پاکستانی روپوں میں یہ دس پندرہ ہزار سے کم کا نہیں ہوگا۔" ہالے ستائش سے اس خوب صورت عبایا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اور ان کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں گرمی نہیں لگتی۔ پتا نہیں کیا میٹیریل ہے مگر اس کو تم گرم سے گرم ماحول میں بھی پہنو تو تمہیں ٹھنڈک ہی رہے گی، گرمی نہیں لگے گی۔"

"واقعی؟" وہ بہت متاثر سی عبایا کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنا خوب صورت اور باوقار تھا کہ نظر نہیں ہٹتی تھی۔ اس نے اپنے لباس پہ ہی اس کو پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر پنیں بند کرنے لگی۔ عبایا اس کے قدموں تک گرتا تھا۔ جیسے کسی رائل پرنس کا ریشمی لبادہ ہو۔ ایک بہت شاہانہ سی جھلک تھی اس میں۔

"بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔ کہیں جا رہی ہو

تم؟" ہالے کو کچھ یاد آیا۔ "اگر مارکیٹ جا رہی ہو تو مجھے کچھ منگوانا تھا۔" وہ جلدی سے ایک کاغذ پہ کچھ چیزیں لکھنے لگی۔

"ہاں ٹھیک ہے لے آؤں گی۔" اس نے عبایا کی اسٹول چہرے کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ "بس مجھے سسلی سے ایک امانت اٹھانی ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

ہالے نے جو میز پہ کاغذ رکھے لکھ رہی تھی، بھنچی سی سر اٹھایا۔

"امانت؟ کیا کسی نے تمہارے لیے رکھوائی ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔" اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

"چابی ہے تمہارے پاس؟" ہالے نے عادتاً پوچھا۔ وہ ہمیشہ باہر جانے سے قبل پوچھ لیا کرتی تھی کہ کون سی شے رکھی اور کون سی نہیں، مگر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"کس چیز کی چابی؟"

"امانت کی چابی۔ اس کے بغیر تو نہیں کھلے گی نا۔"

"ہالے!" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "تم امانت کسے کہتی ہو؟"

"امانت لاکرز کو۔ تم ان ہی کی بات کر رہی ہو نا؟ ہم لیفٹ لگیج لاکرز Left luggage کو ترکی میں امانت کہتے ہیں نا۔"

"اوہ۔ لیفٹ لگیج لاکرز!" اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ "وہ لاکرز جہاں لوگ سامان محفوظ کر کے چلے جاتے ہیں کہ بعد میں اٹھالیں گے؟" اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ چابی کسی لیفٹ لگیج لاکر کی بھی ہو سکتی ہے۔

"ہالے۔ ہالے۔" وہ تیزی سے اس کے قریب گئی۔ "تمہیں پتا ہے سسلی میں امانت لاکرز کہاں ملیں گے؟" اس کی بات پہ ہالے متذبذب سی سوچنے لگی۔

"سچ کہوں تو میں نے کبھی استنبول میں کوئی پبلک لاکر نہیں دیکھا، مگر عموماً ریلوے اسٹیشنز پہ لاکرز ہوتے ہیں۔ تم سسلی کے اسٹاپ پہ دیکھنا، وہاں شاید کوئی مل جائے۔"

تاقسم کے نیچے وہ پورے میٹرو اسٹالز۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کوئی امانت لاکر تھا۔ اس نے ذہن میں اس پہیلی کو ڈی کوڈ کیا۔

☼ ☼ ☼

سسلی کے میٹرو اسٹاپ پہ معمول کی گہما گہمی تھی۔ وہ پرس کندھے پہ لٹکائے بہت پراعتماد طریقے سے چلتی ٹکٹ کاؤنٹر تک آئی۔

"اسلام علیکم۔ مجھے کچھ سامان ڈمپ کرنا ہے۔ لگیج امانت کس طرف ہے؟" اس نے سرسری سے انداز میں لاکرز کا پوچھا۔ اس لیے کہ وہ مشتبہ نہ لگے۔ اس نے یہ نہ بتانا ہی بہتر سمجھا کہ کسی نے اس کے لیے امانت رکھوائی ہے۔

"میڈم! یہاں اس اسٹاپ میں تو کوئی لاکر نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟ یہاں کوئی لاکر نہیں ہے؟" اس نے پیچھے سے اردگرد نگاہ دوڑائی۔

"جب سے میں یہاں کام کر رہا ہوں، تب سے تو اس اسٹاپ پہ کوئی لاکر نہیں ہے۔ شاید پہلے ہوتے ہوں۔ آپ کو پتا ہے نائن الیون کے بعد یورپ کے بہت سے ریلوے اسٹیشن سے لاکرز ختم کر دیے گئے تھے۔" معمر ترک کلرک نے تفصیلاً بتایا۔

"اچھا!" اس کا دل مایوسی میں ڈوب گیا۔ تاقسم سے میٹرو میں سوار ہونے کے بعد وہ پہلے اسٹیشن پہ نہیں اتری، پھر دوسرے یعنی سسلی پہ اتر گئی۔ تاقسم سے میٹرو لائن کا آغاز ہوتا تھا، میٹرو ایک ہی سمت میں جاتی تھی، سو دو پورے اسٹاپس کا اختتام سسلی پہ ہی ہوتا تھا۔

"آپ کو سامان رکھوانا ہے تو میرے پاس رکھوا دیں، پھر بعد میں لے لیجئے گا۔" وہ جانے لگی تو کلرک نے بہت خلوص سے پیش کش کی۔

"نہیں خیر ہے۔ میں اٹھا لوں گی۔" اس نے غیر شعوری طور پہ پرس کو ذرا مضبوط پکڑ لیا۔ "بس مجھے

جواہر سے ذرا سی شاپنگ کرنی ہے، میں مینیج کرلوں گی۔" بہن کی آواز میں واضح مایوسی تھی۔

"اچھا آپ جواہر جارہی ہیں؟ تو پھر آپ سامان وہیں رکھوا دیجیے گا بلکہ ـــــ" وہ ذرا سا رکا۔ "جواہر میں امانت لاکرز ہوتے ہیں۔ وہ انٹرنس کے قریب ہی بنے ہیں۔"

"واقعی؟" وہ جھٹکے سے واپس پلٹی تھی۔ "امانت لاکرز؟ جو چابی سے کھلتے ہیں؟"

"ارے نہیں میم! وہ زمانے گئے جب لاکرز چابی سے کھلا کرتے تھے۔ سلطنت ترکیہ اب بہت ترقی کرچکا ہے۔" ترک بوڑھے نے فخر سے گردن اٹھا کر کہا۔ "ہمارے امانت لاکرز بار کوڈ سے کھلتے ہیں۔"

"آف کورس!" حیا نے گہری سانس لی اور مسکرائی۔ "اللہ ترقی یافتہ سلطنت ترکیہ کو سلامت رکھے، بار کوڈ!" اس نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

بالآخر سارے ریڈ کمبز ملتے جارہے تھے۔ نسلی ہے کے اسٹاپ سے ایک ڈائریکٹ ایگزٹ تھی جو جواہر مال میں کھلتی تھی۔ وہ مال میں آئی اور تیزی سے ان لاکرز کی طرف لپکی جو داخلی حصے کے قریب ہی بنے تھے۔ ایک دیوار پہ چھوٹے چھوٹے لاکرز جیسے کچن کیبنٹس ہوں۔ سب پہ ایک ایک نمبر لکھا تھا۔ اس نے پرس سے چابی اور بار کوڈ سلپ نکالی اور پورے اعتماد سے چلتی لاکرز کے قریب آئی۔ وہاں کھڑا گارڈ بے اختیار اسے دیکھنے لگا۔

حیا نے وہاں لاکرز کی مشین کا طریقہ دیکھا۔ اسے پہلے لاکر نمبر ٹائپ کرنا تھا۔ وہاں بنے کی پیڈ پہ اس نے 6 کا ہندسہ دبایا۔ یہی ہندسہ اس کی بار کوڈ کی رسید کے چاروں کونوں میں لکھا تھا۔ یہی لاکر نمبر ہو سکتا تھا۔

مشین کی سیاہ اسکرین پہ "6" لکھا آیا، پھر اس نے بار کوڈ مانگا۔ حیا نے بار کوڈ والی طرف سے کاغذ شناخت کے لیے مشین کے سامنے کیا۔ ٹوں ٹوں کی آواز آئی اور اسکرین پہ سرخ عبارت ابھری۔ بار کوڈ غلط تھا۔

اس نے بے یقینی سے رسید کو دیکھا اور پھر مشین کو۔ شاید کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ گارڈ اب پوری گردن موڑ کر مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حیا نے جلدی سے مشین ری سیٹ کی اور 6 پہ انگلی رکھی، پھر بار کوڈ سامنے کیا۔ سرخ عبارت پھر سے ابھری۔ بار کوڈ غلط تھا۔

گارڈ کی نظریں اور بے بسی بھری پریشانی۔ وہ کپکپاتی انگلیوں سے تیسری دفعہ مشین ری سیٹ کرنے لگی تو رسید ہاتھ سے پھسل کر فرش پہ جا گری۔ وہ تیزی سے اسے اٹھانے کے لیے جھکی۔

رسید کا کاغذ الٹا گرا تھا، یوں کہ الفاظ سر کے بل الٹے نظر آرہے تھے۔ چاروں کونوں میں لکھا 6 اب الٹا ہو کر 9 لگ رہا تھا۔ کاغذ اٹھا کر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ 9 نمبر لاکر اوپر والی قطار میں سب سے آخری تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے مشین کے کی پیڈ پہ 9 پہ انگلی رکھی، پھر بار کوڈ سامنے کیا۔ بیپ کی آواز آئی اور سبز رنگ کی عبارت ابھری۔ 9 نمبر لاکر کھل گیا تھا۔

وہ جلدی سے آگے بڑھی اور 9 نمبر لاکر کا دروازہ کھولا (جیسے کچن کیبنٹ کو کھولتے ہیں) اندر ایک چوکور سی تجوری رکھی تھی، جو پیچھے کہیں سے چپکی تھی۔ (یہ وہ تجوری تھی جس کی دھات کی تہوں میں شیشے کی تہہ ہوتی ہے اور اگر اسے غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش کی جائے تو اندرونی شیشہ ٹوٹ کر تجوری کو جام کردیتا ہے۔) اس نے تجوری کے کی ہول میں وہ چابی ڈال کر گھمائی۔ تجوری کھل گئی۔ حیا نے جلدی سے اسے کھولا۔ اندر ایک چھوٹی سی سیاہ مخملیں ڈبی رکھی تھی جیسے انگوٹھی کی ڈبی ہوتی ہے۔ اس نے وہ ڈبی مٹھی میں دبائی اور اس احتیاط سے اپنے کھلے بیگ کے اندر گرائی کہ پیچھے کھڑا گارڈ نہ دیکھ سکے۔

وہ منٹ بعد وہ مال کے باہر کھڑی تھی۔ اس نے بیگ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ترکی اور ترکی کے ایڈونچرز۔ کبھی وہ ان پہ ایک کتاب ضرور لکھے گی، اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ فی الحال اسے ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں بیٹھ کر وہ آرام سے وہ ڈبی کھول سکے۔

دفعتاً اس کا موبائل بجا۔

"آپ کا سرپرائز برگر کنگ کی پینٹری میں آپ کا انتظار کر رہا ہے اے آر پی۔" وہ سطور کا وہ مختصر سا پیغام اس کو سن کر گیا۔ کہیں عبدالرحمن، جہان کے پاس تو نہیں چلا گیا؟ اس کی نگاہوں کے سامنے جہان کا ٹوٹا پھوٹا ریسٹورنٹ گھوم رہا تھا۔ اوہ نہیں۔

وہ الٹے قدموں زیر زمین میٹرو کی طرف بھاگی تھی۔

برگر کنگ میں معمول کا شور اور رش تھا۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی کچن میں آئی تھی۔

"جہان کہاں ہے؟" اس کے حواس باختہ انداز پہ وہاں شیف لڑکے نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ "وہ ـــــ پینٹری میں ہے، مگر ٹھہریں، آپ ادھر نہ جائیں۔" وہ پینٹری کی طرف بڑھی تو وہ لڑکا سامنے آگیا۔

"مگر ـــــ"

"میم پلیز! اس کا کوئی مہمان آیا ہے، وہ اندر ہے۔ اس نے کہا ہے ـــــ کسی کو اندر نہ آنے دوں ورنہ میری نوکری چلی جائے گی۔"

"کچھ نہیں ہوگا، مجھے دیکھنے دو۔"

"پلیز مجھے سسٹر کی فیس دینی ہے۔ آپ تو مت جائیں، وہ مجھے واقعی جان سے مار دے گا۔ اگر آپ کو اندر جانا ہی ہے تو آپ پچھلی گلی سے چلی جائیں، پچھلے دروازے کی گھنٹی بجا دیجیے گا تو ـــــ" اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ باہر نکل چکی تھی۔

دس منٹ بھی نہیں لگے تھے اسے پچھلی گلی سے پینٹری کے دروازے تک پہنچتے۔ اگر عبدالرحمن ادھر آیا تو وہ اسے جان سے مار دے گی، اس نے سوچ لیا تھا۔

پینٹری کا روشن دان کھلا تھا۔ وہ حیا کے چہرے کے برابر آتا تھا۔ اس سے اندر کا منظر اور آوازیں صاف سنائی دے رہا تھا۔ وہ جو گھنٹی بجانے ہی لگی تھی، بے اختیار رک گئی۔

جہان جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے حیا کی طرف پشت کیے کھڑا کہہ رہا تھا۔

"آواز نیچی رکھو۔ یہ تمہارا اولار نہیں ہے جہاں میں تمہاری ساری بکواس چپ کرکے سنتا رہوں گا۔ یہ میری جگہ ہے!"

اس کے مخاطب نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ سرمئی برسائی آنکھوں پہ عینک اور وہ ناقابل فراموش چہرہ جس پہ چند روز قبل اس نے کافی انڈیلی تھی۔ وہ پاشا کا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

"ہا! تمہاری جگہ! مت بھولو کہ یہ جگہ میں نے تمہیں دی تھی جب تمہیں یوک اوا سے فرار ہو کر چھپنے کی جگہ چاہیے تھی۔ مگر تم دنیا کے سب سے بڑے احسان فراموش ہو جہان!"

وہ دیوار سے لگی پتھر کا مجسمہ بنی رہ گئی۔ استقلال اسٹریٹ کا شور غائب ہو گیا۔

"میرا بھی اپنے بارے میں یہی خیال ہے۔" وہ بولا۔ کمال بے نیازی سے شانے اچکا کر بولا تھا۔

"اور میرے کام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، کیا وہ اڑتالیس گھنٹے میں ہو جائے گا؟"

"نہیں۔" جہان اسی رکھائی سے بولا تھا۔ "کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں تمہارے باپ کا ملازم نہیں ہوں اور دوسری یہ کہ تم اپنے لالچ کے ہاتھوں بے صبرے ہونے کے بجائے تھوڑا انتظار کرو تو بہتر ہوگا۔"

"لالچ؟" پاشا نے بے یقینی سے دہرایا۔ "میرا سب کچھ داؤ پہ لگا ہے اور تم کہتے ہو کہ میں لالچی ہوں؟"

جہان نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"تمہارے اپنے جرائم کی سزا ہے، میرا کیا قصور؟"

"اور تمہیں تمہارے جرائم کی سزا کب ملے گی جہان سکندر؟" وہ لب بھینچے اتنی سختی سے بول رہا تھا کہ جبڑے کی رگیں تن گئی تھیں۔ "یاد رکھنا جس دن میں نے زبان کھولی اس دن تم سیدھے پھانسی چڑھو گے۔"

جہان بے اختیار ہنس پڑا۔

"اور تمہیں لگتا ہے کہ میں پھانسی چڑھ کر تمہیں اولار میں عیش کرنے کے لیے چھوڑ جاؤں گا؟ ایسی فیری ٹیل تم ہی گھڑ سکتے ہو پاشا بے!"

بے ترک میں صاحب یا مسٹر کے لیے استعمال ہوتا

تھا۔
پاشا بہت تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"تم ایک دفعہ پہلے بھی مجھے دھوکا دے چکے ہو، میں اس دفعہ تمہارا اعتبار نہیں کروں گا۔"
"تو نہ کرو!" اس نے بے نیازی سے کندھوں کو جنبش دی۔ "جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔"
پاشا چند لمحے بہت ضبط کیے اسے دیکھتا رہا، پھر کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ نگاہ روشن دان سے جھانکتے چہرے پہ پڑی۔ سیاہ لبادے میں سے صرف اس کی بڑی بڑی آنکھیں نظر آ رہی تھیں، جن میں سارے زمانے کی بے یقینی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔
"تمہاری بیوی باہر کھڑی ہے جہان! اسے اندر نہیں بلاؤ گے؟"
وہ جو چہرے پہ ڈھیروں بے زاری لیے کھڑا تھا، کرنٹ کھا کر پلٹا۔ حیا اسی طرح ساکت سی روشن دان کے پار کھڑی تھی۔
"کیا؟" جہان نے بے یقینی سے دہرایا۔ اسے شاید لگ رہا تھا کہ اس نے غلط سنا ہے۔ پاشا زیر لب مسکرایا۔
"تمہاری بیوی، سبانجی یونیورسٹی کی ایکسچینج اسٹوڈنٹ، ڈورم نمبر بھی بتاؤں؟ حیران مت ہو جہان! تم نے پاشا بے کو انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے۔ میں تمہاری بیوی کو اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ کچھ دن پہلے ہی ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ کیوں مادام؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" اس نے آگے بڑھ کر چینجری کا دروازہ کھولا اور اسے جیسے اندر آنے کا راستہ دیا۔
"ملاقات؟" جہان کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ اس نے ششدر نگاہوں سے حیا کو دیکھا۔ وہ اتنی ہی بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بے یقینی، بے اعتباری، فریب، جھوٹ۔
"حیا۔۔۔ یہ۔۔۔ تم اس کو جانتی ہو؟" وہ متحیر سا تھا، جیسے اسے یقین ہی نہ آیا ہو کہ وہ اس سب سے بے خبر تھا۔ "یہ سچ کہہ رہا ہے؟"

اس نے بمشکل اثبات میں گردن ہلائی۔ وہ اتنی ہی بے اعتبار نگاہوں سے پلک جھپکے بنا جہان کو دیکھ رہی تھی۔ "یہ کون تھا" وہ نہیں جانتی تھی۔
"اب بتاؤ جہان! میرا کام اڑتالیس گھنٹوں میں ہو جائے گا یا نہیں؟" وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ جہان نے اسے دیکھا، پھر اس کی پیشانی کی رگیں تن گئیں۔ وہ آگے بڑھا اور اپنے ساتھی کو گریبان سے پکڑ لیا۔
"میری بات کان کھول کر سن لو۔ میں تمہارا کام کروں گا اڑتالیس گھنٹوں سے بھی پہلے، لیکن اگر تم نے میری بیوی کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو استنبول کے کتوں کو کھلانے کے لیے تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔"

ایک جھٹکے سے اس نے پاشا کا گریبان چھوڑا۔ اس کی آنکھوں میں وہ خون اترا تھا کہ حیا دو قدم پیچھے ہٹی۔ اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ پاشا کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔
"مجھے تمہاری بیوی سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، نہ میں نے پہلے اسے کچھ کہا، نہ اب کہوں گا۔ مجھے صرف اپنے کام سے غرض ہے۔"
"ہو جائے گا۔ گیٹ لاسٹ!" وہ بہت ضبط سے بولا تھا۔
پاشا نے اپنی برساتی کا کالر ٹھیک کیا اور پھر بنا کسی کو دیکھے باہر نکل گیا۔ حیا ابھی تک بغیر پلک جھپکے جہان کو دیکھتی دروازے میں کھڑی تھی۔
"تم اسے کیسے جانتی ہو، میں کچھ نہیں پوچھ رہا۔" وہ اس کے قریب آیا تو وہ بے اختیار دو قدم مزید پیچھے ہٹی۔ وہ رک گیا۔
"میں نہیں جانتا کہ تم نے کیا سنا مگر تم نے ادھوری باتیں سنی ہیں۔ میرا اس آدمی سے کوئی تعلق نہیں ہے حیا۔۔۔ تم، تمہیں مجھ پہ اعتبار ہے نا، میری بات سنو!" وہ بے بسی سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسے اب جہان سکندر کی کسی بات پر اعتبار نہیں رہا تھا۔
وہ ایک دم مڑی اور اسکوائر کی جانب واپس بھاگی۔ وہ اسے پکار رہا تھا، پریشانی سے، بے بسی سے، مگر وہ کچھ بھی سنے بغیر دوڑتی جا رہی تھی۔
"میری لینڈ لیڈی نے خوب ہنگامہ کیا۔ میں آج کل اس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ یہاں کوئی عبدالرحمن پاشا نہیں ہے۔ یونہی کسی نے اپنے بارے میں افواہیں پھیلائی ہوں گی۔"
"جھوٹ۔ جھوٹ تھا، سب فریب تھا۔" آنسو اس کی آنکھوں سے گرتے حجاب کو بھگو رہے تھے۔ ایک لمحہ بس ایک لمحہ لگتا ہے اعتبار ٹوٹنے میں اور سب ختم ہو جاتا ہے۔
وہ اسے مسلسل فون کر رہا تھا۔ مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ سبانجی واپس پہنچنے تک وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے جہان کی بات سن لینی چاہیے، ایک دفعہ اسے وضاحت دینے کا موقع دینا چاہیے، مگر وہ اس بے اعتباری کے دکھ سے بچنا چاہتی تھی جو اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ پاشا نے اسے مہرے کے طور پہ استعمال کیا۔ ایک بلیک میلنگ ہتھیار کے طور پہ۔ یہ سب جرم کی دنیا کے ساتھی تھے، کرمنلز۔ اسے ان کے درمیان نہیں رہنا تھا۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔
پہلی دفعہ اسے استنبول سے بہت ڈر لگا تھا۔ اسے جلد از جلد واپس پاکستان پہنچنا تھا۔ اس کا گھر دنیا میں اس کی واحد محفوظ پناہ گاہ تھی۔
[illegible] اس سے پوچھ رہی تھی، مگر وہ کچھ بھی بتائے بغیر مسلسل بے آواز روتی سامان پیک کر رہی تھی۔
[illegible] اسے اپنا آخری سمسٹر پاکستان میں گزارنا تھا۔ پھر جولائی میں وہ دن کے لیے وہ آ کر ایگزامز کروا لے گی۔
فلائٹ رات کی تھی مگر تب تک ہر مرحلے پہ [illegible] اس کی بہت مدد کی۔ سبانجی کو وہ ایسے چھوڑے گی، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ سب کچھ ادھورا رہ گیا [illegible] بھی کبھی نہیں ملا جو [illegible] کر آئی تھی۔ ادھوری یادیں، ادھورے دکھ۔
اس نے ابا کو مختصر سا بتا کر فون بند کر دیا تھا۔ وہ بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔ اسے بس جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔ ایئرپورٹ پہ بھی وہ بہت پریشان اور چڑچڑی سی ہو رہی تھی۔ جب آفیسر نے اسے لیپ ٹاپ ہینڈ کیری میں رکھنے کو کہا تو وہ رو پڑی۔
"مجھے اتنا بھاری ہینڈ کیری نہیں اٹھانا بس۔" یہ اس کا ڈی جے کو ایک آخری خراج تھا۔
جب فلائٹ نے استنبول سے ٹیک آف کر لیا اور مرمرا کے قدموں تلے آ گیا تو اسے کیبل [illegible] ملا۔ بالآخر۔ وہ اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ بس بہت ہو گیا ایڈونچر، بہت ہو گئے پزل۔
"پزل؟" وہ چونکی اور پھر جلدی سے پرس کھولا۔ کلیس، سیاہ ڈبی اندر محفوظ پڑی تھی۔ وہ سارا دن اتنی پریشان رہی کہ اسے بھول ہی گئی۔ جانے اس میں کیا تھا؟
دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ایک ہاتھ میں ڈبی پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کا ڈھکن کھولا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

گھوم پھر کر اسی کوچے کی طرف آئیں گے
دل سے نکلے بھی اگر ہم تو کہاں جائیں گے

ہم کو معلوم تھا، یہ وقت بھی آ جائے گا
ہاں مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ پچھتائیں گے

یہ بھی طے ہے کہ جو بوئیں گے وہ کاٹیں گے یہاں
اور یہ بھی کہ جو کھوئیں گے، وہیں پائیں گے

کبھی فرصت سے ملو تو تمہیں تفصیل کے ساتھ
امتیازِ ہوس و عشق بھی سمجھائیں گے

کہہ چکے ہم، ہمیں اتنا ہی فقط کہنا تھا
آپ فرمائیے، کچھ آپ بھی فرمائیں گے

ایک دن خود کو نظر آئیں گے ہم بھی اجمل
ایک دن اپنی ہی آواز سے ٹکرائیں گے

اجمل سراج

محبت اک روگ

خواب بُننے کی رُت گزر گئی
وہ سیلابی عمر بیت گئی
تو کُھلا
محبت زندگی کی جھلستی دُھوپ میں
تپتے سورج کی مانند ہوتی ہے
محبت فقط رائیگانی ہوتی ہے
محبت اک روگ ہے ایسا
جو دلوں کی بستیاں تاراج کر کے
سوائے دُکھ کے کچھ نہیں دیتا
پوری زندگی کے بدلے
اور کچھ نہیں لیتا..!

توقیر اقبال نوشی

ایک میری رہی کمی مجھ میں
اور کوئی نہیں کمی مجھ میں

گھر بناتے ہی میں نے دیکھی ہے
ایک عورت ڈری ڈری مجھ میں

تیرے جانے کے بعد ایسا ہوا
ناچتی خامشی رہی مجھ میں

تیرے بارے میں سوچنے والے
اب وہ دیوانگی نہیں مجھ میں

کوئی احساس جاگتا ہی نہیں
بھف کیسی ہے آ جمی مجھ میں

اک قیامت سی بپا کر ڈالیں
تیری یادیں کبھی کبھی مجھ میں

سانس تو اک ڈھکوسلہ ہے ندا
زندگی کب کی مر چکی مجھ میں

ملی ندا

جرم گر میں نے کیا ہے تو بتایا جائے
ایسے چپ چاپ نہ سُولی پہ چڑھایا جائے

یہ عداوت کی فضا راس کیسے آئی ہے
کیوں نہ اک دیپ محبت کا جلایا جائے

میں نے بھی آبلہ پائی کا کرب جھیلا ہے
میرے بھی نام پہ اک محل بنایا جائے

دل کی نگری میں تو انبار لگے ہیں غم کے
تم بتاؤ کیسے اشکوں میں بہایا جائے

رو پڑے گی میرے اندر کی اُداسی لوگو
دل کے ایوان کو ایسا نہ سجایا جائے

نازیہ کنول نازی

زمانے کی مسکراہٹیں

رپورٹ

ایک امریکی اخبار کی انتظامیہ نے اپنے ایک رپورٹر کو سمندر کے سفر پر بھیجا۔ جس دن جہاز جاپان کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا' اسی دن بڑے زور کا طوفان آ گیا۔ جس سے بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ اخبار کا ایڈیٹر بڑا پرجوش تھا کیونکہ صرف اسی اخبار کا رپورٹر موقع پر موجود تھا۔ ایڈیٹر کو رپورٹ کا شدت سے انتظار تھا۔ بالآخر رات گئے رپورٹر کا پیغام موصول ہوا۔

"میں بالکل خیریت سے ہوں سر! آپ فکر مند نہ ہوں۔"

سعدیہ ثاقب۔ ڈیفنس

علاج

ایک عورت نے اپنی سہیلی سے سر درد کی شکایت کی تو سہیلی نے مشورہ دیا۔

"جب میرے سر میں درد ہوتا ہے تو میرا شوہر بڑے پیار سے میرا سر دباتا ہے اور اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے درد غائب ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں تم بھی یہ نسخہ آزما کر دیکھو۔"

"ہاں ہاں ضرور۔۔۔ تمہارا شوہر کب تک گھر آئے گا؟" عورت نے اشتیاق سے پوچھا۔

سمیرا علی۔ لاہور

حسب توفیق

ایک نوجوان ایک مہنگے اور فیشن ایبل علاقے کے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوا اور سیلز گرل سے بولا۔

"میں اپنی منگیتر کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ خریدنا چاہتا ہوں۔"

"یہ سیلینگ گاؤن لے جائیں۔ چار ہزار روپے کا ہے۔" سیلز گرل نے مشورہ دیا۔

"نہیں نہیں یہ تو بہت مہنگا ہے۔" نوجوان بولا۔

"تو پھر یہ میک اپ کٹ لے جائیں ڈھائی ہزار روپے کی ہے۔"

"یہ بھی مہنگی ہے اس سے کم قیمت کوئی چیز دکھائیں۔"

"یہ پرفیوم لے جائیں' سات سو روپے کا ہے۔" سیلز گرل بولی۔

"یہ بھی میری گنجائش سے زیادہ ہے۔ اس سے بھی سستی کوئی چیز دکھائیے۔" نوجوان نے فرمائش کی۔

"پھر آپ ایسا کریں۔ یہاں سے کوئی چیز خریدنے کے بجائے کونے والے موچی سے اپنی منگیتر کے جوتوں میں نئی ایڑیاں لگوا دیں۔" سیلز گرل نے تیرین لہجے میں مشورہ دیا۔

سرور شد آسی۔ اقوال

پرانی فرم

نئی ملازمت کا ایک امیدوار اپنی پرانی فرم کی بے انتہا تعریفیں کر رہا تھا۔

"پرانی فرم اپنے ملازمین کو بچوں کی تعلیم کا الگ خرچ دیا کرتی تھی۔ فلیٹ کا کرایہ' میڈیکل کے اخراجات اور چھ ماہ کا بونس بھی دیا کرتی تھی۔"

"پھر آپ نے وہ نوکری کیوں چھوڑ دی؟" منیجر نے پوچھا۔

"میں نہیں چھوڑی جناب!" امیدوار نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "وہ فرم ہی دیوالیہ ہو گئی تھی۔"

نرمین لودھی۔ سرگودھا

تسلی

ملبوسات کی دکان پر سیلز گرل ایک خاتون کو مختلف قسم کے ملبوسات دکھا دکھا کر تھک گئی۔ خاتون کے سامنے کپڑوں کا انبار لگ گیا مگر انہیں کوئی لباس پسند نہ آیا۔ آخر میں سیلز گرل تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

"مجھے افسوس ہے' آپ کو کوئی ڈریس پسند نہیں آیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" خاتون نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں تو ویسے بھی فریج خریدنے کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی۔"

شائستہ جاوید۔ اقبال ایریا

خطرے کا نشان

سیلاب کے دنوں میں ایک علاقہ آفیسر نے کہا۔

"دریائے چناب میں پانی کا زبردست ریلا آیا ہے اور پانی خطرے کے نشان سے دو فٹ اوپر آ گیا ہے۔"

لوگوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "اب کیا ہو گا؟"

آفیسر نے اطمینان سے جواب دیا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے انتظام کر لیا ہے۔ خطرے کا نشان پانی سے چار فٹ اونچا کر دیا ہے۔"

ملیحہ طاہر۔ جھمبراں

مناسب مشورہ

ایک مقدمے میں استغاثہ کے بیانات سننے کے بعد جج نے ملزم کے وکیل سے کہا۔

"اگر آپ چاہیں تو ملزم کو الگ لے جا کر اسے مزید کارروائی کے سلسلے میں مناسب ترین مشورہ دے سکتے ہیں۔"

یہ سن کر وکیل ملزم کے ساتھ ایک طرف چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ اکیلا واپس آیا تو جج نے اس سے پوچھا۔

"ملزم کہاں ہے؟" وکیل نے جواب دیا۔

"وہ تو بھاگ گیا۔ میں اسے مناسب ترین مشورہ یہی دے سکتا تھا۔"

نمود رزاق۔ ڈیفنس

سرکاری ملازم

ایک سرکاری ملازم ناشتا کرنے کے لیے میز پر بیٹھا تو گھنٹہ بھر تک اخبار ہی پڑھتا رہا' پھر اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر اس نے آواز دی۔

"چائے لاؤ۔"

"چائے تو میں لے آئی ہوں۔" اس کی بیوی نے کہا۔

"لیکن کیا آپ آج دفتر نہیں جائیں گے؟"

"دفتر۔" وہ چونک کر بولا۔ "یا اللہ! میں تو اپنے دفتر میں چائے منگوا رہا تھا' یہ گھر کیسے پہنچ گیا۔"

غزالہ شہباز۔ ہجرت کالونی

غیر شادی شدہ؟

نیویارک کے ایک ہوٹل میں ہوٹل کا سراغ رساں ایک کمرے میں داخل ہوا' جہاں ایک نوجوان جوڑا مقیم تھا۔ اس نے جوڑے پر الزام لگایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں اور ان کا ہوٹل ایسے جوڑوں کو قیام کی اجازت نہیں دیتا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" لڑکی غصے سے چلائی۔

"تم مجھے غیر شادی شدہ کہہ رہے ہو؟ اگر میرا شوہر یہاں موجود ہوتا تو تمہارے دانت توڑ دیتا۔"

کومل عدنان۔ گلستان جوہر

فی الحال

دوسری عالمی جنگ میں جب لندن میں بمباری ہو رہی تھی تو ہوائی حملے سے بچاؤ کی ایک پناہ گاہ سول ڈیفنس وارڈن نے چلا کر پوچھا۔ "اس پناہ گاہ میں ایک

کی عورت تو نہیں جو ماں بننے والی ہو۔" تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی پھر کہیں سے ایک عورت کی آواز آئی۔
"فی الحال کچھ بتانا مشکل ہے جناب! ابھی ہمیں سال بنانے کے لیے ہوئے چند منٹ ہی تو ہوئے ہیں۔"

منزہ قیصر۔ لودھراں

نئی بکری

ایک سیاح افریقہ کے چڑیا گھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شیر اور بکری ایک ہی پنجرے میں بند ہیں۔ گائیڈ نے کہا۔
"جناب! یہ باہمی اخوت کا ایک عملی مظاہرہ ہے۔ ہمارے ہاں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں۔"
سیاح پرجوش لہجے میں بولا۔ "میں اس کے بارے میں اپنے وطن جا کر لکھوں گا۔ مگر اس کامیابی کا راز کیا ہے؟"
"بس روزانہ ایک نئی بکری پنجرے میں ڈالنی پڑتی ہے۔" گائیڈ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

صالحہ ام قیس۔ میرپور آزاد کشمیر

ایمان داری

ایک مجبور شخص نے ایک تاجر سے کہا۔
"میں سخت بھوکا ہوں۔ اگر آپ مجھے کھانا کھلا دیں تو میں اس کے بدلے میں آپ کا کوئی ایک کام کر دوں گا۔"
تاجر نے کہا۔ "اگر مجھے یقین ہو جائے کہ تم ایمان دار ہو تو میں تم سے مرغی خانے میں انڈے جمع کرنے کا کام لوں۔ مگر تم شکل و صورت سے ایمان دار نہیں لگتے۔"
مجبور شخص نے کہا۔ "میں آپ کے اطمینان کے لیے بتا دوں۔ شاید ہی کوئی مجھ سے زیادہ ایمان دار ہو کہ میں نے ایک حمام میں پانچ برس نوکری کی مگر اس تمام عرصے میں ایک دفعہ بھی غسل نہیں کیا۔"

تو بیہ کاشف۔ باغبان پورہ

کوشش

ایک بے وقوف اسکیم والی بوتل کا ڈھکن بار بار کھول کر بند کر رہا تھا۔ کسی دوست نے پوچھا۔
"کیا ہوا؟"
بے وقوف "یار! کیا کروں جب بھی ڈھکن کھول کر رکھتا ہوں تو اس کے نیچے لکھا نظر آتا ہے "کوشش جاری رکھیں۔"

(فاطمہ طاہر۔ گلشن)

مشغلہ

ایک سیٹھ صاحب سے انٹرویو لینے والے نے پوچھا۔
"آپ فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"
"پینٹنگ کرتا ہوں۔" سیٹھ صاحب نے جواب دیا۔
"بہت خوب! ذرا ہمیں بھی اپنے شاہکار دکھائیں۔" اینکر نے کہا۔
سیٹھ صاحب خوش ہو کر بولے۔ "یہ جو آپ دیواریں دیکھ رہے ہیں نا! یہ میں نے ہی پینٹ کی ہیں۔"

بنت لیفی۔ ملتان

شگفتہ جاہ

حسن خیال

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سب سے بہترین عمل یہ ہے کہ تم غرباء اور مساکین کو کھانا کھلاؤ اور ہر شخص، خواہ وہ شناسا نہ ہو، اسے سلام کرو۔"

(بخاری 2-7)

صبر و قناعت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔
ایک انصاری بہت ضرورت مند اور غریب تھا۔ اس کے گھر والوں کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ گھر سے باہر چلا گیا۔ اس کی بیوی نے اپنے دل میں کہا۔ اگر میں چکی چلاؤں اور تنور میں کھجور کی ٹہنیاں ڈال کر آگ جلاؤں تو پڑوسی چکی کی آواز سنیں گے اور دھواں دیکھیں گے۔ اس سے وہ یہ سمجھیں گے کہ ہمارے پاس کھانے کو کچھ ہے اور ہمارے پاس فقر و فاقہ نہیں ہے۔
سو اس نے اٹھ کر تنور میں آگ جلائی اور چکی چلانے لگی۔ اتنے میں اس کا خاوند آ گیا۔ اس نے باہر سے چکی کی آواز سنی، پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیوی نے دروازہ کھولا۔ خاوند نے پوچھا۔
"تم کیا پیس رہی ہو؟"
بیوی نے ساری کارگزاری سنا دی۔ جب وہ دونوں اندر گئے تو دیکھا چکی خود بخود چل رہی ہے اور اس کے اندر سے آٹا نکل رہا ہے۔ بیوی بڑی خوش ہوئی۔ آٹا پھر نے کی وجہ سے گھر کے سارے برتن آٹے سے بھر گئے۔ پھر اس نے باہر جا کر تنور کو دیکھا تو وہ روٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ خاوند نے جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سارا واقعہ کہہ سنایا۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔
"پھر چکی کا کیا ہوا؟"
خاوند نے کہا۔ "میں نے اسے اٹھا کر جھاڑ دیا تھا۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر تم چکی کو اس کے حال پر رہنے دیتے تو وہ میری زندگی تک یونہی چلتی رہتی (یا فرمایا تھا کہ تمہاری زندگی تک یونہی چلتی رہتی)۔"

(حیاۃ الصحابہ، جلد سوم)

وقت ضائع کرنا:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "مجھے اس آدمی پر بہت غصہ آتا ہے جو مجھے فارغ نظر آتا ہے، نہ آخرت کے کسی عمل میں لگا ہوا ہے اور نہ دنیا کے کسی کام میں۔"

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا:

حضرت عبدالرحمن بن یزید بن جابر کہتے ہیں۔
حضرت ابو امامہ کی ایک باندی نے (جو کہ پہلے عیسائی تھیں) مجھے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت ابو امامہ کو دوسروں پر خرچ کرنا بہت پسند تھا اور وہ اس کے لیے مال جمع کیا کرتے تھے اور کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرتے تھے۔ کچھ نہ ہوتا تو ایک پیاز یا ایک کھجور یا کھانے کی کوئی چیز ہی اسے دے دیتے۔
ایک دن ایک سائل ان کے پاس آیا۔ اس وقت ان کے پاس ان میں سے کوئی چیز نہیں تھی۔ صرف تین دینار تھے۔ اس سائل نے جب مانگا تو انہوں نے ایک دینار اسے دے دیا۔ پھر دوسرا آیا تو ایک

دینار اسے دے دیا۔ پھر تیسرا آیا تو ایک دینار اسے دے دیا۔ جب تینوں نے دے دیے تو مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ آپ نے ہمارے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ پھر وہ دوپہر کو آرام کرنے لیٹ گئے۔ جب ظہر کی اذان ہوئی تو میں نے اٹھایا۔ وہ وضو کر کے مسجد چلے گئے۔ چونکہ ان کا روزہ تھا۔ اس لیے مجھے ان پر ترس آ گیا۔ پھر میں نے قرض لے کر ان کے لیے رات کا کھانا تیار کیا اور شام کو ان کے لیے چراغ بھی جلایا۔ پھر جلانا ٹھیک کرنے کو ان کے بستر کے پاس گئی۔ بستر اٹھایا تو اس کے نیچے سے تین دینار کے بجائے ٹکے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے تین دینار کی سخاوت کی ہے۔ (میں نے سوچا)

عشاء کی نماز کے بعد وہ گھر آئے تو دستر خوان اور چراغ دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے۔

"معلوم ہوتا ہے یہ سب تیرے اس سے آیا ہے۔"

(کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ گھر میں کچھ بھی نہیں تھا اس لیے یہ کھانا ہوگا اور چراغ) میں نے قرضے ہو کر ہی نہیں کھانا کھلایا۔ پھر میں نے کہا۔

"اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے سارے دینار ہی بانٹ دیے۔ ان کے گم ہونے کا خطرہ تھا۔ مجھے بتایا بھی نہیں کہ میں اٹھا کر رکھ لیتی۔"

پوچھا۔ "کون سے دینار۔ میں تو کچھ بھی نہیں چھوڑ کر گیا۔"

میں نے بستر اٹھا کر وہ دینار دکھائے۔ وہ دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی کہ اللہ نے اپنے غیبی خزانے سے عطا فرمائے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں بھی متاثر ہوئی اور میں نے کفر سے ہر گز نا تاکا ٹ ڈالا۔ (زنار اس دھاگے یا زنجیر کو کہتے ہیں جسے عیسائی کمر میں باندھتے ہیں) اور مسلمان ہو گئی۔

حضرت ابن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے اس باندی کو حمص کی مسجد میں دیکھا کہ وہ عورتوں کو قرآن، فرائض اور سنتیں سکھا رہی تھی اور دین کی باتیں سکھا رہی تھی۔

(حیاۃ الصحابہ۔ جلد سوم)

مردم شناس؛

کئی سال پیشتر ایک عالم اور مردم شناس عرب دوست نے بہت اہم تبصرہ کیا تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ انسانی کردار اور اعمال کے مشاہدہ کی بنیاد پر یہ تو میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ بدشکل انسان میں عقل و فہم کا فقدان پائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس فرد کو اپنی رحمت سے نواز کر عقل و فہم دیتا ہے اس کو کم از کم خوش شکل بھی بناتا ہے۔

ایک خوبصورت پھول بدبودار نہیں ہوتا اسی طرح اللہ تعالیٰ عیار، مکار اور ناقابل بھروسہ فرد میں عیب ظاہری عیب دے دیتا ہے تاکہ دوسرے لوگ ہوشیار رہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ بات مدنظر رکھ کر لوگوں کا مشاہدہ کیا اور اس بیان کی صداقت کا قائل ہو گیا۔ حکمران، سیاستدانوں اور دوسرے لوگوں سے جب میرا سابقہ پڑتا ہے تو یہ بات خیال میں آ جاتی ہے۔

(سحر ہونے تک۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان)

اقوال زریں؛

- ہم درحقیقت جو کچھ سیکھتے ہیں مکتب حیات ہی سے سیکھتے ہیں۔ مدرسے، کالج اور کتابیں ہمیں کچھ نہیں سکھا سکتیں۔
- کھوکھلے قہقہے کے مقابلے میں ایک مسکراہٹ زیادہ قیمتی ہے۔
- ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ کر نہیں پاتے لیکن ہمیں وہ سب کچھ سننا پڑتا ہے جو ہم سننا نہیں چاہتے۔
- جو قومیں تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتیں ان کا جغرافیہ بدل جاتا ہے۔
- زندگی کی ناکامیوں کو ہمیشہ ہنس کر سہو، ایسا نہ ہو کہ لوگ تمہارے آنسوؤں کا مذاق اڑائیں۔
- خرابی ہمارے اندر ہوتی ہے نہ کہ ہمارے ستاروں میں۔
- جو رشتہ ٹوٹ جائے وہ زندگی کی شاخ سے گرے پتے جیسا ہوتا ہے۔ پتے گر گیا اور سوکھ گیا پھر کم ہی ہرا ہوتا ہے۔

طیبہ طاہرہ۔ جہلم

کامیابی؛

- اونچے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے آہستہ آہستہ چلنا چاہیے۔ (شیکسپیئر)
- میں نے شجر علم کا میوہ توڑ لیا ہے جس پر لکھا ہے کامیابی ان کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔ (ڈسرائیلی)
- ہماری سب سے بڑی خوبی کبھی نہ گرنے میں نہیں بلکہ ہر دفعہ گرنے کے بعد اٹھنے میں ہے اور یہی کامیابی کا راز ہے۔ (گولڈ اسمتھ)
- شکست، کھلنے والا ارادہ، پریشان نہ ہونے والا خیال اور ختم نہ ہونے والی جدوجہد کامیابی کے ضامن ہیں۔ (بروک)

بھروسے میں بڑی طاقت ہے اور وہ ہمیں کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ وہ ناممکنات کی نفی "ناممکن" ہے اور بار بار کہتا ہے یہ ہونا ہے۔

ارم کمال۔ فیصل آباد

تنگ مزاجی؛

قاضی یحییٰ صاحب کی موجودگی میں خلیفہ مامون نے ایک دفعہ ایک غلام کو آواز دی۔ مگر کوئی نہیں بولا۔ پھر پکارا تو ایک ترکی غلام حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ یہ بڑبڑانے لگا کہ "کیا غلام کھانے پینے نہیں، جب ذرا کسی ضرورت کے لیے باہر گئے تو آپ غلام غلام چلانے لگتے ہیں۔ آخر غلام کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

یہ سن کر مامون نے سر جھکا لیا اور کچھ دیر کے بعد قاضی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تنگ مزاجی میں یہ بڑی آفت ہے کہ نوکر اور غلام شریر اور بدخو ہو جاتے ہیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کو نیک خو کرنے کے لیے میں بد مزاج بن جاؤں۔"

عائشہ۔ شہزاد محمد خان

حضرت عمر فاروقؓ کا رعب و دبدبہ؛

قریش کے تمام قبائل معرکہ بدر میں مسلمانوں کے مقابلے آئے لیکن بنو عدی یعنی حضرت عمرؓ کے قبیلے میں ایک شخص بھی شریک نہیں ہوا۔ یہ امر جہاں تک قیاس کیا جا سکتا ہے صرف حضرت عمرؓ کے رعب و دبدبہ کے باعث تھا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا؛

- وہ گناہ جس کا تمہیں رنج ہو ایسی نیکی سے بہتر ہے جس سے تم میں غرور پیدا ہو جائے۔
- برا دوست آگ کی طرح ہوتا ہے۔ اگر ملے گا تو آپ کو بھی جلائے گا اور اگر بجھ جائے گا تو پھر آپ کے ہاتھ کالے کر دے گا۔
- آزمائے ہوئے کو آزمانا بے وقوفی ہے۔
- سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو کرنے والے کی نظر میں چھوٹا ہو۔
- غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔
- اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بری چیز جھوٹ بولنے والی زبان ہے۔

نوال افضل حسین۔ گجرات

حضرت عمرؓ نے فرمایا؛

- جو شخص اپنا راز چھپاتا ہے وہ اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔
- جس سے تمہیں نفرت ہے اس سے ڈرتے رہو۔
- جو شخص برائی سے واقف نہیں وہ برائی میں مبتلا ہوگا۔

حمزہ اقرا۔ کراچی

طوطا انصافی؛

ایک گاؤں سے طوطا اور طوطی گزر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ گاؤں کی حالت بہت خستہ ہے۔ پیڑ پودے مرجھائے ہوئے ہیں۔ صرف چند ٹوٹی پھوٹی حویلیاں کھڑی نظر آ رہی ہیں۔ طوطے کی نظر ایک سوکھے ہوئے درخت پر پڑی۔ اس پر ایک الو بیٹھا ہوا تھا۔ طوطے نے کہا۔

"اس الو کی وجہ سے گاؤں برباد ہوا ہے۔"

الو نے جب یہ الفاظ سنے تو فوراً ان کے پاس

پہنچا اور کہا۔
"یہ لڑکی میری بیوی ہے۔"
لومڑے نے کہا: "کچھ عقل سے کام لو۔ یہ میری بیوی ہے۔ اس کا رنگ، آواز غرض کوئی بھی چیز تم سے نہیں ملتی۔"
الو نے کہا: "چلو گاؤں والوں سے اس کا انصاف کروا لیتے ہیں۔" گاؤں کے چوہدری نے فیصلہ الو کے حق میں دے دیا۔ الو نے لوگوں کی طرف دیکھا جو صرف سر ہلا رہے تھے۔ انہوں نے اس ظلم اور ناانصافی پر کوئی احتجاج نہ کیا۔
لومڑا دکھ سے بلبلاتا ہوا چلا گیا تو الو اس کے پیچھے لومڑی کو لے کر گیا اور اس سے کہا۔
"اپنی بیوی کو ساتھ لے جا۔ نحوست میری وجہ سے نہیں اس ظلم اور ناانصافی کی وجہ سے ہے جس کا سب ساتھ دے رہے ہیں۔"
عائشہ، گوجرہ

اللہ کا ساتھ

جب یزدگرد کے زمانے میں ایران مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا تو ایرانی حیران تھے کہ یہ جاہل، اجڈ اور گنوار عرب ان سے جب بھی ہماری لڑائی ہوتی، ہم ان کو ملیامیٹ کر دیتے اور ان پر قابض ہو جاتے۔ تندو کی محکوم رہتے۔ اب کیا ہو گیا!
یزدگرد کے ایک بوڑھے مشیر نے کہا: "اس دفعہ عرب اکیلے نہیں تھے۔ ان کا خدا ان کے ساتھ تھا۔"
تحریم۔ گوجرہ

انمول موتی

* خاموشی بغیر تخت کے بادشاہی ہے۔
* دعا مانگتے رہو کیونکہ دعا گناہوں کے داغ ایسے مٹاتی ہے جیسے بارش کا پانی اپنے نشانات۔
* روز و شب با مقصد طریقے سے گزارو ورنہ ایسے گزر جاؤ گے جیسے سر کٹے ہوئے پھٹے۔
* اپنا غم کسی دوسرے کو مت سناؤ کیونکہ اس سے دشمن خوش، دوست پریشان اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔
* باتوں رنگوں کی زبان ان کے قالب میں نہیں ماتی وہ سچ چاہتے ہوئے بھی بولتے ہیں۔
فرانہ تنویر۔ سوہاوہ

زم زم

زم زم کا چشمہ چار ہزار سال قدیم ہے۔ تیرہ فٹ چوڑا اور گیارہ فٹ لمبا ہے۔ تیتیس میٹر گہرا ہے۔ ایک پاور فل موٹر آٹھ ہزار لیٹر فی سیکنڈ کے حساب سے اس میں سے چوبیس گھنٹے پانی پمپ کرتی رہتی ہے مگر اس میں آج تک کمی نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی پانی کا ذائقہ بدلا۔ پورا دن پانی پمپ کرنے کے صرف گیارہ منٹ بعد ہی پانی اپنے اصل لیول پر آ جاتا ہے اور اسی قدرت کی بنا پر آج تک زم زم خشک نہیں ہوا۔ سبحان اللہ۔
مشرف اعجاز۔ کراچی

اصولِ دعا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک جگہ سے گزر ہوا جہاں ایک آدمی بڑے خشوع و خضوع سے دعا مانگ رہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔
"اے پروردگار! اگر اس کی حاجت پوری کرنا میرے اختیار میں ہوتا تو میں ضرور پوری کر دیتا۔"
اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی نازل فرمائی: "میں تجھ سے زیادہ اس پر رحم کھاتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مجھ سے دعا تو مانگ رہا ہے لیکن اس کا دل اپنی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں متوجہ ہے اور میں ایسے بندے کی دعا قبول نہیں کرتا جو دعا تو مجھ سے مانگ رہا ہو لیکن اس کا دل میرے علاوہ کسی اور چیز میں متوجہ ہو۔"
موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات اس دعا مانگنے والے آدمی کو بتائی تو اس نے اپنا دل ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا تو اس کی حاجت پوری کر دی گئی۔
مہوش منور۔ گوجرانوالہ

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

نوشین اقبال نوشی ـــــــ گاؤں بدوملہی

آنکھیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں ہمیشہ
اور زخم جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا
دل کو تیری چاہت پہ بھروسا بھی بہت ہے
اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

نمرہ عظمی ـــــــ کراچی

غنیمت ہے کہ ہنس کے بات کر لیں
ہمیں مت چھیڑیے ہم سر پھرے ہیں

نوال افضل گلشن ـــــــ گجرات

منسوب تھے جو لوگ میری زندگی کے ساتھ
اکثر وہی ملے ہیں بڑی بے رخی کے ساتھ
چہرے بدل بدل کر مل رہے ہیں مجھے لوگ
اتنا برا سلوک میری سادگی کے ساتھ

رشیدہ بتول ـــــــ کراچی

میں اور التجائے کرم کروں آپ سے
یہ بھیک اسے دیجیے جس کا خدا نہ ہو

رقیہ افتخار خان ـــــــ خوشاب

تیرے فراق کے لمحے شمار کرتے ہوئے
بکھر چلے ہیں ہم تیرا انتظار کرتے ہوئے
اسے خبر ہی نہیں ہے کہ کوئی ٹوٹ گیا
محبتوں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے

ثمرہ احمد بٹ ـــــــ پتوکی

مل جانے کی خواہش بھی، بچھڑ جانے کی ضد بھی
ہاں اس کی محبت بھی، عداوت بھی عجب تھی
اک ہم تھے کہ خوش فہمی حالات میں گم تھے
لیکن اسے حاجت مری اب تھی نہ جب تھی

ثریا ـــــــ گوجرانوالہ

کیوں نہ آئے یقین دعاؤں پر
گر کے پھر سنبھل گیا ہوں میں
آئینہ بھی گواہی دیتا ہے
تیرے پیکر میں ڈھل گیا ہوں میں

بنت گلشن ـــــــ میانوالی

کیسی تعلق نگاری، کیسی اجرت، کیسی قربانی!
اس کی بات نہ کیجیے صاحب وہ سب کھیل تماشا ہے

غلام صغری لاکھو ـــــــ نواب شاہ

زباں خاموش ہو جائے تو چہرہ بات کرتا ہے
محبت کے مراحل میں عجب موسم گزرتا ہے

نعمہ اکرم ـــــــ لیاری کراچی

یہاں اب ایک ہی منظر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے
کھلی فضا میں پرندے دکھائی دیتے ہیں
عجب قفس کا منظر دکھائی دیتا ہے

سدرہ حنا بخاری ـــــــ حیدر آباد

کیا سانحہ گزرا ہے ماحول نہیں لگتا
یہ شہر بھی اب سیر کے قابل نہیں لگتا
ٹھہرے گا کہاں غم کا سفینہ مرے دلبر
تا حد نظر کوئی بھی ساحل نہیں لگتا

ادم کمال ـــــــ فیصل آباد

حرف حرف درد کر بھی آگہی نہیں ملتی
اک نام دل کہنے سے روشنی نہیں ملتی
آدمی سے انسان تک آ گئے تو سمجھو گے
کیوں چراغ کے نیچے روشنی نہیں ملتی

عروج انجم ـــــــ بہاؤ الدین پور

تم وہ اوروں کی سے بالا ہے یہ انداز وفا
تم کو اندیشہ رسوائی بھی ہے اور محبت بھی

ملائکہ کوثر ـــــــ بسم اللہ پور

مجھے حیرت ہے میرے پاس کچھ بھی نہیں بچتا
میں اپنی ذات سے جب بھی تجھے تفریق کرتا ہوں

راشدہ مریم ـــــــ جھال پور

میرے لفظوں سے نکل جائے اثر
کوئی خواہش جو تیرے بعد کروں

نوشین اقبال نوشی ـــــــ گاؤں بدوملہی

میرے نصیب شوق میں لکھا تھا یہ مقام
ہر سو تیرے خیال کی دنیا ہے نوشین

مدیحہ جاوید ـــــــ سرگودھا

منیر اب بھی جان لے تو مقدر کی حقیقت کو
جو ہے وہ بھی ضروری ہے جو گزرا وہ ضروری تھا

مدیحہ احمد ـــــــ گلشن اقبال

میرے واسطے یکم نہیں کسی انجمن میں کبھی کبھی
میرا نام آئے تو کہنا اسے یہ نام تو ہے سنا ہوا

اقرا اکرم ـــــــ سیالکوٹ

عکس جاناں کی خیر ہو مولا
خواب آنکھوں سمیت ٹوٹا ہے

نمرہ رزاق ـــــــ ڈیفنس

دھڑکنوں کی ڈگڈگی پہ کب سے ہے محو رقص
دل تھک کے گر جائے، تماشا نہ ختم ہو

عروسہ شہوار ـــــــ کامرہ گوجرانوالہ

میرے پر کھلے ہوئے دیکھے جاتے ہیں دکھ
عمر گزری ہے اس نے جو ڈالے ہیں دکھ
جس طرح ہوا نہ بھی زیست کا
میں نے یوں زندگی بھر سنبھالے ہیں دکھ

نسیم سحر ـــــــ گلشن اقبال

احساس نہ اخلاق، محبت نہ تعلق
اس دور کے انساں ہیں کہ پتھر کے مجسمے

نسرین صلاح الدین ـــــــ میشروٹل

دل کو اسی فریب میں رکھا ہے عمر بھر
اس امتحاں کے بعد کوئی امتحاں نہیں

رشیدہ بتول ـــــــ بلدیہ ٹاؤن

کیا دیدہ ناور، کیا شوکت تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرق مئے ناب آخر

الماس تنویر ـــــــ ہری پور ہزارہ

کیا غضب ہے ہجر کے دن بھی
زندگی میں شمار ہوتے ہیں

صائمہ عمران ـــــــ سرجانی ٹاؤن

ہم اہل سخن کی قسمت ہے اقبال زبانی طعنہ زنی
کل محفل میں جو ہم کو ملی، وہ داد بھی مرعوب تھی

رباب مرتضی ـــــــ ملتان

میری زندگی کے مزاج کا یہ مزاج کوئی نیا نہیں
کبھی تیرگی کبھی روشنی، کبھی جلا ہوا کبھی بجھا ہوا

نیرہ تنویر ـــــــ لاہور

مجھے جو بھی دشمن جاں ملا، بڑا پختہ کار جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی، نہ کسی کا تیر خطا ہوا

ربیعہ تجمیر اعوان ـــــــ کوئٹہ

تیرے آنے کا انتظار رہا
عمر بھر موسم بہار رہا

شائستہ جاوید ـــــــ الف بی ایریا

جو کہتا ہوں وہی بولنے کا عادی ہوں
میں اپنے شہر کا سب سے بڑا فسادی ہوں

ملیحہ طاہر ـــــــ جہلم

اس میں قسمت کی خطا ہے نہ زمانے کا قصور
غم تو انسان کے جینے کی سزا ہوتے ہیں

نمرہ اقبال ـــــــ کراچی

پرندے دیکھے ہوئے سپنے کہیں بکھر نہ جائیں
گھر دونے دینے کے تعمیر کرکے چھوڑ دیتا ہوں
میں اب تک وہی بچپن، وہی تجربہ کاری ہے
قفس کو توڑ دیتا ہوں، پرندے چھوڑ دیتا ہوں

رفعت اخلاص ـــــــ کراچی

موت آئے تو دن پھریں شاید
زندگی نے تو مار ڈالا ہے

شاعری سچ بولتی ہے

کرن شبیر

میرے سامنے ڈائریوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ان کو ورق ورق پلٹتے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ساتھ ساتھ زندگی کے بھی ورق پلٹ رہی ہوں۔ میرا انتخاب آپ کو اچھا لگے یا برا، اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔
سب سے پہلے ”شعاع“ کے لیے ابن انشا کے لفظوں میں کچھ کہنا چاہوں گی۔

- دیکھ ہماری دید کے کارن کیسا قابل دید ہوا
ایک ستارہ بیٹھے بیٹھے تابش میں خورشید ہوا

ہمارے ادبی افق پر اتنے روشن ستارے جگمگا رہے ہیں کہ ان کی تعریف لفظوں میں ممکن ہی نہیں۔
پڑھیے ذرا محسن نقوی کیا کہہ رہے ہیں۔

کاش کوئی ہم سے بھی پوچھے
رات گئے تک کیوں جاگے ہو
کون سی بات ہے تم میں ایسی
اتنے اچھے کیوں لگتے ہو

امجد اسلام امجد لفظوں کے جادوگر جب بھی کچھ کہتے ہیں سحر سا باندھ دیتے ہیں۔

میرے چارہ گر
میرے درد کی تجھے کیا خبر
تو میرے سفر کا شریک ہے
میں نہیں ہم سفر
میرے چارہ گر، میرے چارہ گر
میرے ہاتھ سے تیرے ہاتھ تک
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اسے ناپتے اسے کاٹتے
میرا سارا وقت نکل گیا
نہیں جس پہ کوئی نشان پا
میرے سامنے ہے وہ رہ گزر
میرے چارہ گر
میرے دکھ کی تجھے کیا خبر

نصیر ترابی کے بیان سے لفظ زندگی ہی سے زندگی کے نشیب و فراز کا عکس ہمیں دکھاتے ہیں۔

- یادوں میں اک یاد، کوئی دل شکن سی یاد
وہ یاد اب کہاں ہے کہ فرصت نہیں رہی

- رنگوں میں ایک رنگ، تری سادگی کا رنگ
ایسی ہوا چلی کہ وہ رنگت نہیں رہی

- باتوں میں ایک بات، تری چاہت کی بات
اور اب یہ اتفاق کہ چاہت نہیں رہی

شاعری کی بات ہو اور میں مشرور جمیل کا تذکرہ نہ کروں، یہ نہیں ہو سکتا۔

- عجب خواہش ہے شہر دل کی جب چھپ کر کتاب لکھوں
تمہارے نام اپنی زندگی کی کتاب کا انتساب لکھوں

- تم ہی نے میرے اجاڑ رستوں پہ خواہشوں کے دیے جلائے
تم ہی نے چاہا تھا کہ خشک ہونٹوں سے چاہتوں کے گلاب لکھوں

- عجب تمنا کی دیار شب میں جلا کے جگنو کہاں تلک
سیاہ کاروں کی سلطنت میں کس طرح آفتاب لکھوں

نجم الثاقب کہتے ہیں۔

- اس کو تو بچھڑنے کے ڈھنگ بھی نہیں آتے
مجھ سے دور رہ کر بھی قربتوں میں رہتا ہے
ایک ایسا انسان ہے مجھ کو لگتے ہیں جو
دوستی نہیں کرتا دوستوں میں رہتا ہے

اقبال ساجد کا انداز ملاحظہ ہو۔

- کل شب دل آوارہ کو سینے سے نکالا
یہ آخری کافر بھی مدینے سے نکالا

محسن بھوپالی زندگی کے بارے میں کچھ خاص کہہ رہے ہیں۔

- تیرے ہر روپ میں بدگمانیاں کیسی
جب تک ہے دنیا میں اعتبار دنیا کر
جس نے زندگی دی ہے وہ بھی سوچتا ہوگا
زندگی کے بارے میں اس قدر نہ سوچا کر

اب ذکر کچھ ذاتی بھی چلتے چلتے شاعری کے درمیان کچھ تعارف کی رسم بھی نبھ جائے۔ میرا نام کرن شبیر ہے روشنیوں کے شہر کراچی سے تعلق ہے۔ ایک بہترین ڈاکٹر ہوں۔ اور دعا ہے اگر یجوکیشن کے بعد ماسٹرز کا ارادہ ہے۔ میرا خیال ہے اتنا تعارف کافی ہے۔
بات ہو رہی تھی زندگی کے بارے میں۔ اس لحاظ سے یہ قطعہ بھی خوب ہے۔ یقیناً آپ بھی متفق ہوں گے۔

- جام عشرت کا ایک گھونٹ نہیں
تلخی جام آرزو کی مینا ہے
زندگی حادثوں کی دنیا میں
راہ بھولی ہوئی حسینہ ہے

کافی عرصے سے ہمیں متفرق اشعار نہیں لکھ رہی میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں لکھوں۔ لیجیے حاضر ہیں۔

- دعا کے روشن چراغ اپنی ہتھیلیوں پر جلائے ہم نے
خدا سے لیکن سوال کرنا نہ اس کو ... آیا نہ کچھ کہا یا
(سعید واثق)

- ہر جو فیصلہ وہ سنائیے اسے حشر پر نہ اٹھائیے
جو کریں گے آپ ستم وہاں وہ ابھی سہی وہیں سہی
(نصیر ترابی)

- یوں تو ہے نیا زمانہ عمر کا تیرے لیکن
اس گھڑی تو چپ رہیے جب گلہ ضروری ہو
(خالد معین)

چلتے چلتے ایک آخری نظم کو بھی برداشت کر لیں۔ اس نظم کے تخلیق کار اللہ جانے کون ہیں۔

وہ نقیبہ خود مطلب
جب سے بند کر بیٹھا
شہر کے دریچوں کا
شام کے اترتے ہی
تجھ کو ڈھونڈتا ہوں میں
ٹوٹتا بدن لے کر

ایک اپنی ذاتی کاوش آپ کی نذر کرنا چاہوں گی۔

میری زندگی اک لہر کی مانند ہے
جو پل میں بدل جاتی ہے
کبھی خوشی مل جاتی ہے بہت
کبھی غم مل جاتے ہیں بہت
کبھی وقت دوڑتا ہے لہر کی طرح
کبھی صبح ہونے کا انتظار کرتی ہے رات
کبھی تو دن گزرتا ہے مشکل سے
کبھی تو رات آنکھوں میں گزر جاتی ہے
یہی حال ہے میری زندگی کا
اور ایسے ہی میری زندگی ختم ہو جائے گی

اس انتخاب کو میں نے بہت محنت سے سجایا ہے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ آپ سب کو اللہ تعالیٰ اپنی حفظ و امان میں رکھے اور کبھی بھی کہیں بھی کسی کے ساتھ کچھ بھی برا نہ ہو۔ آمین۔



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

گول گپے

اجزا :

آٹا	ڈھائی پیالی
سوجی	آدھی پیالی
املی کا رس	ایک پیالی
کالے چنے	ایک پیالی
مرچ	چار کھانے کے چمچے
سونٹھ	آدھا چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کالا نمک	ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

آٹا اور سوجی ملا کر اس میں تقریباً تین کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے ملائیں اور نیم گرم پانی سے سخت گوندھ لیں اور گیلے کپڑے سے ڈھک کر بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پیڑے بنا کر پتلی روٹی کی طرح بیل لیں اور کسی کٹوری یا گلاس سے ایک سائز کی ٹکیاں کاٹ لیں۔ گرم تیل میں ڈالیں اور درمیان سے چمچے کی مدد سے دبائیں۔ اس طرح وہ پھول جائیں گی۔

املی کے رس میں چار پیالی پانی کے ساتھ تمام اجزا ڈال کر پانچ منٹ کے لیے پکائیں۔ کالا نمک پکانے کے بعد ڈالیں۔

پھولی ہوئی پوریوں میں انگلی سے سوراخ کر کے تھوڑے سے کالے چنے ڈالیں اور کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

پالک پنیر

اجزا :

پالک	ایک کلو
مکئی کا آٹا	چار چائے کے چمچے
پنیر	ایک پاؤ

...ناز	چار عدد
...درک	ایک بڑا ٹکڑا
...ری مرچ	تین عدد
...سی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
...مک	حسب ذائقہ
...تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :
پالک کو اچھی طرح دھو کر باریک کاٹ لیں اور ایک کپ پانی ڈال کر دس منٹ تک پکائیں پھر پانی الگ کر کے پیس لیں۔ پنیر کے چوکور ٹکڑے ڈال کر خوب مکس کر لیں پھر مکئی کا آٹا ڈال کر تھوڑی دیر تک پکائیں تاکہ وہ گاڑھا ہو جائے۔

فرائنگ پان میں تیل گرم کر کے ادرک اور پیاز باریک کاٹ کر فرائی کر لیں پھر سرخ مرچ ڈال کر چمچہ ملائیں اور اسے پالک پنیر والے آمیزے پر بگھار کی طرح ڈال کر مکس کر لیں اور تقریباً پانچ منٹ تک پکائیں۔ ہری مرچ باریک کاٹ کر اوپر چھڑک دیں۔ چاہیں تو دو چائے کے چمچے کریم بھی ڈال سکتی ہیں۔ مزے دار پالک پنیر تیار ہے۔

چکن ہانڈوی کباب

اجزا :

چکن قیمہ	ایک کلو
مکھن	سو گرام
پیاز	دو عدد
شملہ مرچ	دو عدد
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
سرخ پسی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
چائنیز نمک	آدھا چائے کا چمچہ
پسا دار چینی	دو چائے کے چمچے
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
مسٹرڈ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :
ایک بڑے پیالے میں قیمہ ڈال کر تمام اجزا شامل کریں اور خوب اچھی طرح مکس کر کے دو مرتبہ گرائنڈ کر لیں۔ زیادہ بہتر ہو گا کہ قیمہ والی مشین سے دو مرتبہ گزار لیں۔ پھر کوئلے گھنٹے بعد تھوڑی مقدار لے کر سیخ پر چڑھائیں۔ ہاتھ سے دبا کر لمبائی میں کباب کا شیپ دیں۔ شملہ مرچ کا ایک ٹکڑا سیخ پر چڑھائیں پھر دوبارہ تھوڑا سا قیمہ سیخ پر چڑھائیں۔ اسے پیچھے شملہ مرچ کا ایک ایک ٹکڑا لگاتے جائیں۔ کوئلوں پر سینک لیں۔ بیچ بیچ میں ایک دو مرتبہ پگھلے ہوئے مکھن کا برش کریں۔ تیار ہو جائیں تو چپاتی یا نان کے ساتھ پیش کریں۔

ملائی پان پورا

اجزا :

میدہ	چار کھانے کے چمچے
گاڑھی کریم	چار کھانے کے چمچے
دودھ	ایک کپ
چینی	چار کھانے کے چمچے
الائچی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
کیوڑہ	ایک چائے کا چمچہ
چاندی کے ورق	تین عدد
کاجو / بادام	بیس عدد
گھی	تلنے کے لیے

ایک پیالے میں دودھ، کریم اور میدے کو اچھی طرح مکس کر کے کچھ دیر کے لیے ڈھک کر رکھ دیں۔ چینی میں تھوڑا سا پانی ملا کر شیرہ بنا لیں اور ہلکا سا پکائیں۔ فرائنگ پان میں تھوڑا سا گھی گرم کر کے دودھ والا آمیزہ ڈالیں۔ پین کیک کی طرح سنہری ہو جائے تو کسی فلیٹ پلیٹ میں نکال لیں۔ سارے پین کیک ایک ساتھ رکھیں۔ ہر ایک پر تھوڑی تھوڑی کریم لگاتے جائیں۔ کاجو یا بادام اور تھوڑا سا الائچی پاؤڈر بھی چھڑکیں۔ پھر انہیں کون شیپ میں موڑ دیں۔ اوپر سے شیرہ ڈال دیں۔ چاندی کے ورق لگائیں اور بادام اور کیوڑہ چھڑک کر پیش کریں۔

شعاع کے سنگ

ادارہ

عاصمہ۔۔۔ خانیوال

1۔ عمر رفتہ کو آواز دی۔ یاد آیا چھٹی یا ساتویں میں تھی جب پہلی بار شعاع پڑھا۔ گویا پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ خالہ لوگ رسالے پڑھا کرتی تھیں ان سے مانگ کر لایا کرتی اور امی اور پھوپھو سے چوری چوری پڑھا کرتی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ دیا اور لالٹین کی روشنی میں سخت گرمیوں میں کمرے میں گھس کر ایک ہاتھ میں رسالہ دوسرے ہاتھ سے پسینہ صاف کرتے ہوئے شعاع اور خواتین پڑھا کرتیں۔ (میں اور خالہ) ہلکی سی آہٹ پر رسالہ نیچے اور سوتے بن جاتیں۔ آخر کار امی اور پھوپھو کو پتا چل گیا خوب خوب "عزت افزائی" ہوئی مگر یہ آغاز تھا۔

ایک گرمیوں میں خالہ سے چھ سات رسالے مانگ کر لائے۔ ابھی پڑھے نہ تھے کہ امی کو پتا چل گیا۔ پھر "کیا تھا" میرے اور خالہ کے آنسوؤں کی پروا نہ کرتے ہوئے امی اور پھوپھو نے رسالے پھاڑ کر توی میں پھینک کر آگ لگا دی۔ گویا ہمارے ارمان جل گئے۔ دو دن کر صبر کیا۔ بہن بھائی سب دھمکیاں دیا کرتے جب رسالہ پڑھتے دیکھتے تو "فوراً" کہتے کہ ابھی ابو کو بتاتے ہیں یا امی یا پھوپھو کو بتاتے ہیں پھر ان کی منت سماجت کی جاتی۔

میٹرک کے بعد ہاسٹل میں ذرا آزادی سے پڑھنے لگی۔ اب ایم اے کے بعد گھر میں کوئی روک ٹوک یا پابندی نہیں ہے۔

2۔ صبح کا آغاز سردیوں میں آصف کے جھنجوڑ کر اٹھانے پر ہوتا ہے۔ گرمیوں میں خود ہی اٹھ جاتی ہوں نماز کے بعد قرآن مجید اور اللہ اللہ کرتی ہوں۔ سوتی نہیں ہوں۔ گھر میں پھرتی رہتی ہوں۔ سورج نکلنے پر ابو جی اپنے لیے چائے بناتے ہیں۔ اس کے بعد گھر والوں کا ناشتا شروع ہوتا ہے۔ ناشتے کے بعد آصف برتن دھوتی ہے۔ عاصمہ صفائی کا کام کرتی ہے۔ کبھی میں بھی کروا دیتی ہوں۔ دودھ گرم کر لیتی ہوں اور کوئی چھوٹا موٹا کام کر لیتی ہوں۔ امی سلائی کا کام کرتی ہیں۔ میں کٹنگ اور ڈیزائننگ میں مدد کروا دیتی ہوں۔

ہم لوگ اپنی زمینوں پر رہتے ہیں۔ ہمارے کھیتوں میں تقریباً گھر کے ساتھ ہی آم، آڑو، امرود، جامن، مالٹا اور کیلوں وغیرہ کے درخت ہیں۔ سبزیاں بھی ہیں ہم لوگ کوئی کوئی پھل یا سبزی لینے باہر جاتے ہیں۔

ہمارا ماحول بہت اچھا ہے ملازم باہر کام کر رہا ہو تو ہم لوگ باہر نہیں نکلتے۔ سبزہ دیکھ کر موڈ خوشگوار ہو جاتا ہے۔ بارہ بجے تک کوئی خاص کام نہیں ہوتا۔ ٹھیک بارہ بجے دوپہر کے لیے روٹیاں پکاتی ہوں۔ سالن تیار ہوتا ہے سب گھر میں ہوں مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ تھوڑی دیر ریسٹ کرتے ہیں۔ ظہر کی نماز پڑھ کر اگر کوئی کام ہو تو کر لیا ورنہ فارغ۔ تین یا چار بجے چائے بنائی جاتی ہے۔

ہم بہنوں نے کام کے لیے باری مقرر کی ہے چائے کے بعد جس کی باری ہو وہ برتن دھوتی ہے۔ دوسری بہن سبزی تیار کرتی ہے۔ عصر کی نماز پڑھ کر سالن تیار کیا جاتا ہے۔ تیسری بہن آٹا گوندھتی ہے۔ مغرب کی نماز پڑھ کر میں روٹیاں پکاتی ہوں۔ سب اکٹھے کھانا کھا کر کمروں یا صحن کا رخ کرتے ہیں، باتیں کرتے ہیں۔

اذان ہونے پر دودھ پی لیتے ہیں۔ میں نماز پڑھ کر سو جاتی ہوں۔ جب مہمان یا بڑی بہن بچوں سمیت آئی ہیں تو خوب رونق لگی رہتی ہے۔ سارا دن مصروفیت میں گزر جاتا ہے۔

چونکہ ہم کسان لوگ ہیں اس لیے کپاس، گندم اور سرسوں کے موسم میں بہت مصروفیت ہوتی ہے۔

3۔ جب میں آٹھویں میں تھی تو ایک ناول پڑھا تھا جس کی ہیروئن کا نام نجا تھا۔ ساری اسٹوری یاد ہے۔ کہانی کا نام اور رائٹر کا نام ذہن سے محو ہے۔ مجھے تمام کہانیاں اچھی لگتی ہیں تمام رائٹرز پسند ہیں۔ ذہن میں اکثر کوئی نہ کوئی کہانی گردش کرتی رہتی ہے۔ مجھے کسی کہانی میں اپنا عکس نظر نہیں آیا۔ مجھے مزاحیہ، سنجیدہ ہر طرح کی اسٹوری اچھی لگتی ہے۔ میں ہر کہانی بہت غور سے پڑھتی ہوں۔ پچھلے سال خالدہ نے راجہ گدھ پڑھنے کو دی تو دماغ گھوم گیا۔ مجھے تو وحشت سا ناول لگا۔ لوگ اس کی بہت تعریفیں کرتے ہیں۔ مجھے تو اچھا نہیں لگا اس کے علاوہ سارے ناولز پسند ہیں۔

4۔ کبھی خوبیاں حاوی ہو جاتی ہیں کبھی خامیاں۔ اسکول و کالج میں اللہ نے بہت عزت دی تھی۔ ٹیچرز اور فرینڈز بہت تعریفیں کرتی تھیں۔ حمیرا نے کہا تھا "تم بہت اچھی ہو۔" فرح نے تو ڈائری بھر دی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "بہت سگھڑ ہو، ہر کام میں ماہر۔" اکثر فرینڈز کہا کرتی تھیں کہ عاصمہ ذہین ہے۔ (حالانکہ میں صرف محنتی ہوں) سکینہ نے اکثر کہا کہ "عاصمہ صاف گو ہے۔" میں نے گھر والوں سے خوبیاں خامیاں پوچھیں تو امی نے کہا "تمہیں پتا ہی ہے۔"

پھوپھو نے کہا "خوبیاں ہی خوبیاں" مزید کہا کہ "عاصمہ رسالے پڑھتی ہے مگر گھر کی باتوں کا کچھ نہیں پتا۔"

بھائی نے کہا "سو تم نے کیا کرنا ہے۔"

آصف نے کہا "خامی کوئی نہیں ہے۔"

چلیں میں خود ہی بتاتی ہوں۔ صاف گو، رحمت گو، مذہبی اور سادہ سی ہوں۔ پوزیسو بھی ہوں۔ حقوق العباد کا خیال رکھتی ہوں صلہ رحمی کرتی ہوں۔ اچھی بات پک کر لیتی ہوں معاف بھی کر دیتی ہوں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتی ہوں۔

خامیاں۔

بقول یاسمین "تم لڑائی ختم ہونے کے بعد پھر چھیڑ دیتی ہو۔" کبھی کبھار غصہ آ ہی جاتا ہے۔ ویسے صاف گوئی اکثر نقصان دہ بھی ہوتی ہے۔ اس کا کئی بار تجربہ ہوا ایم اے کے بعد عقل آ گئی ہے پہلے سیدھی سادی دوسرے معنوں میں بدھو تھی مگر اب نہیں ہوں۔ مجھے اپنی جو بات بری لگتی ہے وہ یہ کہ کبھی درست موقع پر بات نہیں کرتی۔ میں نے بڑی بہن خالدہ سے خوبی یا خامی پوچھی تو خوب ہنسی پھر کہا سوچ کر بتاؤں گی اور ابھی تک فون نہیں کیا۔

5۔ ساون کے مہینے میں کپاس کی فصل تیار ہو رہی ہوتی ہے اس لیے بارش اچھی نہیں لگتی۔ ہمیشہ وہی بارش اچھی لگتی ہے جو فصل کے لیے مفید ہو۔ تیز بارش سے ڈر لگتا ہے۔ رات کو ہو تو بہت بے چینی ہوتی ہے۔ میں تو اکثر دعائیں مانگنے لگتی ہوں اور استغفار کرنے لگتی ہوں۔ اسکول کے دور میں بارشیں اچھی لگتی تھیں اب بوندا باندی اچھی لگتی ہے۔ ساون کے حوالے سے کوئی واقعہ نہیں ہے۔

6۔ مجھے قرآن مجید بہت پسند ہے۔ شاعری کبھی کبھی پڑھتی ہوں۔ کسی بور وقت میں پڑھ لیتی ہوں اور کبھی پڑھتے ہوئے بور ہو جاتی ہوں لیکن یہ شعر پسند ہے بلکہ ساری نعت پسند ہے۔

میرے ہاتھوں سے اور میرے ہونٹوں سے خوشبو جاتی نہیں
کہ میں نے اسم محمد کو لکھا بہت اور چوما بہت

پچھلے دنوں ایک دوست نے یہ مزاحیہ شعر بھیجا جو کہ کنواری لڑکیوں کے لیے ہے۔

"نہ چاند ہو گا نہ تارے ہوں گے
کیا ہم اس سال بھی کنوارے ہوں گے
اس دنیا میں کتنوں کے نکاح ہو گئے
کیا ہمارے نصیب میں صرف نکاح کے چھوہارے ہوں گے!!"

تحسین نشاط



یادگار تقریب

یہ زیادہ عرصہ پرانی بات نہیں جب ایک لڑکی جو خود کو پرنسز کہلاتی تھی ٹی وی پر تبصرے کرتے ہوئے نظر آئی کہ "کوئی ہے میرا راجہ، میرا ماہیا۔"

یہ صدا کیا گونجی ہر لڑکا خوش فہمی کا شکار ہو گیا اور خود کو اس پرنسز کے خوابوں کا شہزادہ سمجھنے لگا اور یہ گانا تو اس قدر مقبول ہوا کہ جھٹ ایک بھارتی فلم ساز نے اس پر قبضہ کیا اور فوراً اسے اپنی فلم کا حصہ بنا ڈالا (ہوش اڑ گیا، گانا نہ ہوا کشمیر ہو گیا) اب اسی پرنسز بینی کے خوابوں کا شہزادہ سب کے سامنے آ گیا ہے کہ گزشتہ دنوں پرنسز بینی کی شادی انجام پا گئی ہے۔ ہم یہ شادی "تکبیر و دخول" جیسے الفاظ سے اسی طرح محروم رہی جس طرح عوام بجلی سے۔ ویسے تو شادی کا موقع صرف دولہا دلہن ہی کے لیے زیادہ یادگار ہوتا ہے لیکن بینی کی شادی کی تقریب صرف دولہا دلہن ہی کے لیے نہیں بلکہ اس میں شرکت کرنے والے مہمانوں کے لیے بھی یادگار رہی کہ یہ تقریب عام تقریبات سے ذرا ہٹ کے ثابت ہوئی۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ کسی شادی کی تقریب میں کوئی ایک مہمان بھی نہ آئے تب بھی شادی تو ہو ہی جاتی ہے۔ تاہم ذرا چشم تصور وا کیجیے اور سوچیے شادی کی اس تقریب کے بارے میں کہ جہاں دیگر سارے مہمان تو ہوں مگر خود دولہا اور دلہن ہی موجود نہ ہوں۔ پرنسز بینی اور ملک نوید اعوان کی شادی ایک ایسی ہی

شادی تھی۔ دلہن بیٹی تو ذہنی بخار کا شکار ہو کر اسپتال پہنچیں۔ مگر وہ لسانی زمانے کی ستم ظریفی کا ہدف بنے۔ یعنی انہیں پولیس لے گئی۔

جی نہیں! شادی پر اکیس توپوں کی سلامی دینے کے لیے نہیں' بلکہ چار چوٹ کی مار کے لیے کہ لاہور میں منعقد ہونے والی یہ تقریب مقامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رات گئے تک جاری رہی تھی۔ (ائے ہے' اپنا "لاہور" سعودی عرب چلا گیا ہے یا یہ پنجاب کے وزیر اعلا کے کچھ عرصہ سعودی عرب میں مقیم رہنے کا نتیجہ ہے؟) پولیس جاتے ہوئے صرف تقریب کے دولہا کو ہی نہیں لے گئی' بلکہ اس نے پرنسز بیٹی کے والد ڈاکٹر خالد اور سسر مشتاق اعوان کے خلاف مار پیٹ اور سرکاری کام میں مداخلت کا مقدمہ بھی درج کر لیا ہے۔ یوں یہ شادی پرنسز بیٹی کے گانے سے بھی زیادہ مشہور ہو گئی ہے۔ (اب دیکھیں اب کوئی بھارتی فلم ساز اس سین کو اپنی فلم میں شامل کرتا ہے کہ انہیں تو ہمارا ہر عمل پیچھے رہا تھا



صاف کرنے کی علامت جو ہے۔) یعنی کا وہم ان کے ذہنی سے نجات پانے کے بعد ہوگا۔ (ذہنی کے چھٹکارا یعنی میں کچھ خون سسرال والوں کے لیے بھی چھوڑ دیا تھا انہوں نے۔)

اعتبار

آج کل ایک نجی چینل پر گلوکار عاطف اسلم پڑوسی ملک کے گلوکار ہمیش ریشمیا کو سروں کا چیلنج دیتے نظر آرہے ہیں۔ اس پروگرام میں عاطف کے کئی ساتھی ان کے ساتھ سُر سے سُر اور قدم سے قدم ملاتے گزرے ہیں۔ تاہم اب حقیقی زندگی میں بھی عاطف کا ساتھ دینے والی آگئی ہے کہ خیر سے اپنے عاطف اسلم منگنی شدہ ہو گئے ہیں۔ لیکن اس خبر سے ابھی بہت سے لوگ بلاواقف ہی ہیں کہ اپنے ہر گانے سے دھوم مچانے والے عاطف نے اپنی زندگی کا سب سے اہم رنگ بے حد خاموشی سے چپ چپاتے ہی چھیڑ دیا۔ جسے بعض لوگوں نے سنا اور بعض بے خبری رہے۔

عاطف اسلم کی منگیتر سارہ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ لاہور کے کینیرڈ کالج سے گریجویٹ اور ڈیزائنر ہیں۔ یہ منگنی عاطف کی پسند سے ہوئی ہے۔ کہانی وہی روایتی ہے کہ سارہ' عاطف اسلم کی مداح ہیں۔ وہ عاطف اسلم کے شو میں شرکت کرنے آئیں تو عاطف کا دل انہیں دیکھ کر گنگنا اٹھا۔

"تیرے جیسا کوئی نہیں' ہر جگہ تم ہی ہو۔"

یوں دونوں کی منگنی ہو گئی۔ عاطف اسلم ابھی اس خبر کی تشہیر نہیں چاہتے تھے۔ (شاید وہ ابھی "سر کشیترا" میں اپنے ووٹ کھونا نہیں چاہتے۔) لیکن لوگ بھی بہت سیانے ہو گئے ہیں۔ خبر کا سراغ کسی طور پا ہی لیتے ہیں۔ عاطف کی منگنی کی یہ اطلاع انٹرنیٹ پر گزشتہ چند ماہ سے موجود تھی۔ تاہم اب یہ خبر چند نجی چینلز سے بھی نشر ہو گئی ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر کوئی نسوانی۔ اوف۔ عوامی رد عمل سامنے نہیں آیا ہے۔ (عاطف دل! آپ حوصلہ رکھیں۔ آپ کی مقبولیت میں

کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے' بلکہ اس عوامی خاموشی کی وجہ ہر امریکی ڈرامے میں شریک ہمارے میڈیا کی لڑکھڑائی ہوئی ساکھ ہے۔ سو کئی لڑکیاں بالیاں یہ سمجھتی ہوئی پائی گئی ہیں کہ "منگنی" سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔)

توجہ

مونا لیزا خوب صورت اور باصلاحیت اداکارہ ہیں۔ کئی ڈراموں میں کام کر چکی ہیں' مگر تاحال عوامی پسندیدگی کی سند سے محروم ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ابھی کسی کی توجہ ان کی طرف نہیں ہے۔ اس کا احساس مونا کو بھی ہے' سو انہوں نے بھرپور عوامی توجہ حاصل کرنے کے لیے پاکستان میں کھل کر کام کیا' کیونکہ ہماری بیشتر اداکاراؤں کا خیال ہے کہ جب تک وہ کوئی متنازعہ کام نہ کریں' شہرت کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتیں۔ (یعنی ہماری اداکارائیں "شہرت کی بلندیوں" اور "بدنامی کی پستیوں" کے فرق سے ناواقف ہیں شاید۔) مگر شومئی قسمت مونا لوگوں کی توجہ سے پھر بھی محروم ہی رہیں۔

مونا نے مزید کچھ بڑھ کر کرنے کا سوچا اور وہ بھارت جا کر ہمیش کے ساتھ فلم "کجرارے" میں کام کر آئیں۔ بلاشبہ وہ کام ایسا تھا کہ سب کی توجہ کھینچ لیتا مگر ہائے ری قسمت! کہ مونا ایک بار پھر اپنا مطلوبہ ہدف حاصل نہ کر سکیں۔ ساتھی اداکاراؤں کے ایک کے بعد ایک نت نئے "کارنامے" مونا کو تڑپاتے رہے۔ تاہم اب شاید مونا سب کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں۔

خبر آئی ہے کہ مونالیزا "مُوڑ تھری" یا بھارتی فلم میں کام کرنے جا رہی ہیں۔ اس فلم سے قبل پوجا بھٹ اور مہیش بھٹ اس سلسلے کی دو فلمیں بنا چکے ہیں۔ جنہوں نے عوامی دیدہ بازی کے تمام سابقہ ریکارڈز توڑ دیے تھے۔ اب اس سلسلے کی تیسری فلم میں مونا کام کر رہی ہیں۔ مونا نے فلموں میں کام کرنے کے لیے اپنا نام بھی



تبدیل کر لیا ہے۔ وہ "سارہ لوزین" کے نام سے بھارتی فلموں میں کام کر رہی ہیں۔ (کاش! اسی طرح وہ اپنی شہرت بھی تبدیل کر لیتیں۔) مونا کے خیال میں یہ نیا نام شاید انہیں راس آجائے اور وہ لوگوں کی ساری توجہ کھینچ لیں۔ دیکھتے ہیں اب کیا ہوتا ہے۔ (بھئی لوگو! اپنی سابقہ روش برقرار رکھو کہ اب بھی کوئی توجہ نہ دے)

ذاتی فعل

شوخ و شریر نٹ کھٹ سی ٹی وی اینکر شائستہ واحدی کچھ وقت اسکرین سے آؤٹ رہنے کے بعد آج کل پھر "ان" ہیں۔ شائستہ واحدی کمپیئرنگ کو تو کوئی خاص نیا انداز نہ دے سکیں' تاہم اس حوالے سے انہوں نے ایک نئی روایت کا آغاز ضرور کیا ہے کہ وہ جب غیر حاضری کے بعد پروگرام کرنے آئیں تو انہوں نے ناظرین اور اپنے مداحوں کو اعتماد میں لیتے ہوئے اپنی ذاتی زندگی کے ایک تکلیف دہ پہلو پر گفتگو کی۔ یعنی انہوں نے ناظرین کو خود اپنی شادی کے ناکام ہونے کی اطلاع دی۔ ناظرین کے لیے یہ ایک یقیناً نیا



تجزیہ تھا۔ کچھ لوگوں نے دل جلے تبصرے بھی کیے کہ اپنے ہر انٹرویو میں خود کو "جائنڈ سیٹ کیس" قرار دینے والی شائستہ جب بڑی ہوئیں تو بزرگوں کی طے کردہ شادی توڑ دی۔ خیر! یہ شائستہ کی ذاتی زندگی ہے جس میں مداخلت کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ (سوائے ان کے قریبی لوگوں کے۔)

تاہم طلاق کے بعد ایک خاص مدت تک گھر میں ہی "گزارنے" کا فیصلہ شائستہ کا ذاتی فعل ضرور ہے۔ مگر ان کا یہ عمل معاشرے پر کسی طور اثر انداز بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے مداحوں کا ایک حلقہ ہے اور اعلا تعلیم یافتہ ہونے کے سبب بہت سے لوگ شائستہ سے سلجھے ہوئے اقدامات کی توقع بھی رکھتے ہیں۔ (شاید اسی لیے لوگ شوبز میں آنے سے ڈرتے ہیں کہ عقل و تعلیم شوبز کے معاملات پر اتنا اثر انداز نہیں ہوتی جتنا شوبز کی چکاچوند انہیں متاثر کر دیتی ہے۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ ہر وقت پاکستان میں ناشکرے اس میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں۔ ایک بار انڈیا سے ایک بہت بڑی علمی شخصیت پاکستان تشریف لائے۔ انہیں یہاں لوگوں کی شاہانہ طرز زندگی اور اس کے ساتھ ناشکری کے مناظر دیکھنے کا موقع ملا تو انہوں نے ایک محفل میں بہت دکھ سے کہا۔

"مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو کہیں اس کفران نعمت کی سزا نہ دے۔"

(عطاء الحق قاسمی۔ روزن دیوار سے)

☆ بلدیہ ٹاؤن میں لگنے والی آگ بھتہ کا شاخسانہ ہے۔ اس میں دو نکات غیر منطقی ہیں۔ اگر آگ پٹرول کے گودام سے شروع ہوئی آپس کی ۔۔۔ حدت اتنی زیادہ نہیں ہونی چاہیے تھی کہ وہ ٹھوس لوہے کے گارڈز پر اثر انداز ہو۔ اگر شارٹ سرکٹ سے ہو تو بھی اتنی تیزی سے نہیں پھیلتی جبکہ فیکٹری میں جنریٹر بجلی کے کیبل اور وائر بالکل صحیح حالت میں ہیں۔

(ایکسپریس نیوز)

☆ افتخار چوہدری کو کوئی پانچ برس پہلے نوکیلے سینگوں والے ایک بدمست بھینسے کا ہدف ٹھہرا تھا۔ 9 مارچ 2007ء کو اسے آرمی ہاؤس طلب کر کے کئی باوردی جرنیلوں کے جھرمٹ میں بٹھایا گیا۔ بعد کی کہانی رعونت میں لتھڑے ہوئے ایک فرعون صفت شخص کی خودسری اور اپنے اقتدار پر یقین کرتے والے بے وسیلہ شخص کی استقامت کی ایسی داستان ہے جو پاکستان کی سجلیہ سی تاریخ کا سنہری ورق ہے۔

(عرفان صدیقی۔ نقش خیال)

☆ بلدیہ ٹاؤن میں فیکٹری کی آتش زدگی نہ حادثہ تھا نہ ہی سانحہ یہ سیدھا سادہ دہشت گردی کا واقعہ تھا۔ جس کو اس سے فائدہ پہنچا اس کے بارے میں بھی کوئی خاص قیاس آرائی اور تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر صرف ایک آزاد تھانے دار کو بھی یہ مقتول سمجھانے پر مامور کر دیا جائے تو دو دن میں سب سامنے آجائے گا۔

(طلعت حسین۔ راہ راست)

تاریخ کے جھروکوں سے

امت المنیر

بادشاہ کی روٹی

ملا احمد جیون اورنگ زیب عالمگیر کے استاد تھے۔

ایک دن اورنگ زیب عالمگیر عصر کی نماز پڑھنے کے لیے جامع مسجد میں تشریف لائے تو کیا دیکھا کہ ملا احمد جیون حوض پر بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ مسجد نمازیوں سے کچھا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بادشاہ صفوں کو چیرتا ہوا استاد کی خدمت میں پہنچا اور انتہائی عقیدت سے قدموں میں جھک گیا۔ بادشاہ کو فقیر کے آگے سرنگوں دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو ٹپک پڑے۔

نماز سے فارغ ہو کر ملا احمد بادشاہ کے ساتھ ہاتھی کی عماری پر سوار ہو کر قلعہ معلیٰ میں تشریف لے گئے۔ مغرب تک دیوان خاص میں پر لطف مذاکرہ جاری رہا۔ افطاری کے وقت بادشاہ نے پوچھا۔

"حضور کھانا غلام کے ساتھ کھائیں گے یا لنگر شاہی کو سرفراز فرمائیں گے۔"

فرمایا۔ "تمہارے ساتھ ہی کھانے کی تڑپ ہے۔"

شام کو دونوں شخصیات ساتھ ایک ہی دسترخوان پر جلوہ افروز تھیں۔ ملا احمد کھانا بھی کھا رہے تھے۔ اور شاہ جہاں بادشاہ کے بارے میں استفسارات بھی کرتے جاتے تھے۔ بادشاہ انتہائی ادب سے اپنے بھائیوں کے ساتھ لڑی ہوئی جنگوں کے حالات بیان کر رہا تھا۔

کھانا ختم ہوا تو ہاتھ دھونے کے بعد ملا احمد نے ایک ململ کا سوتی کپڑا پیش کیا فرمایا۔

"یہ میری والدہ نے باوضو اور روزہ میں رہ کر کاتا ہے اور ایک پرہیزگار جولاہے نے اسے بنا ہے۔ بادشاہ سلامت کے لیے لایا ہوں۔"

بادشاہ نے اسے ملازم خاص کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ یہ بابرکت کپڑا ہر وقت میرے ساتھ رہے تاکہ جب مروں تو اسی کا کفن نصیب ہو۔

رمضان میں رات دن اورنگ زیب بادشاہ اور ملا احمد جیون کی یکجا بسر اوقات ہوتی رہی۔ دن کو سہ پہر کے لیے جب دربار لگتا تو اس میں بھی بادشاہ ملا احمد کو ساتھ لے جاتے اور اپنے ساتھ تخت طاؤس پر جگہ دیتے۔ رات کو تراویح کے بعد دیر تک ملا صاحب سے علمی مذاکرہ جاری رہتا۔ جس میں ملا نظام اور پایہ تخت کے دیگر اکابر علماء شریک ہوتے۔

عید الفطر پر ملا احمد نے نماز بادشاہ کے ساتھ ادا کی اور پھر طالب رخصت ہوئے۔

وداع کرتے وقت بادشاہ نے ایک بار پھر پابوسی کا شرف حاصل کیا اور جیب سے ایک دونی (تقریباً "بارہ پیسے") نکال کر نذرانے کے طور پر پیش کی۔ ملا احمد جیون نے بڑی خندہ پیشانی سے اسے قبول کیا اور اخلاق و محبت کی نشاط انگیز فضا میں اپنے بلند اقبال شاگرد کو خدا حافظ کہہ کر گھر کو روانہ ہوئے۔

ان ہی ایام میں جنوبی ہند سے اورنگ زیب کو متوحش خبریں پہنچیں اور بادشاہ فوج قاہرہ کے ساتھ ادھر کو روانہ ہو گیا۔ چودہ برس کامل ان مہمات پر صرف ہو گئے۔ جب بادشاہ دہلی واپس آیا تو وزیر اعظم نے رپورٹ کی کہ ملا احمد جیون بہت بڑے زمین دار بن چکے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو ان سے لگان وصول کیا

جائے۔

اس خبر نے بادشاہ کو حیرت میں ڈال دیا کہ ایک غریب الحال بوریا نشین عالم امیر کبیر کیسے بن سکتا ہے۔ اسے استاد سے ملنے کا اشتیاق تو تھا ہی اس خبر نے اشتیاق کو مزید بڑھا دیا۔ اسی وقت ایک نیاز نامہ اپنے قلم سے ملا احمد کو تحریر کیا کہ حضرت کو ملے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ نیاز مند دکن کی مہمات میں اس قدر الجھا رہا کہ تخت کو بھی دلی نہ آسکا۔ امیدوار ہوں کہ آپ تشریف لا کر مجھے سرفراز فرمائیں۔

بادشاہ کے بلاوے پر ملا احمد دہلی تشریف لے آئے۔ بادشاہ نے انتہائی محبت سے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور رمضان کے لیل و نہار اخلاص و ارادت کے جذبات میں بسر ہونے لگے۔ ملا احمد کا لباس اسی طرح سادہ تھا۔

ان کے لب و لہجہ اور طور و اطوار سے وہی سادگی نمایاں تھی۔ باوجود اشتیاق کے بادشاہ کو یہ جرات نہ ہوئی کہ ملا احمد صاحب سے دریافت کر سکے کہ ان کی بابت تمول کی جو داستان مشہور ہو گئی ہے۔ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

ایک دن خود ملا صاحب نے ہی فرمایا۔

"آپ سے جو دال لے کر گیا تھا۔ وہ کوئی بہت ہی بابرکت تھی۔ میں نے اس سے جو لے خرید کر کپاس کاشت کی۔ خدا عزوجل نے اس میں اتنی برکت ڈالی کہ چند سالوں کے اندر ہی اندر سیکڑوں سے لاکھوں ہو گئے۔"

بادشاہ نے مسکرا کر کہا۔ "اگر ارشاد ہو تو دال کی داستان عرض کی جائے۔"

ملا صاحب کانے اشتیاق سے" فرمایا "ضرور سنوں گا۔"

شہنشاہ نے خواجہ سرا کو حکم دیا کہ سیٹھ اتم چند کو اطلاع دی جائے کہ وہ 1049 ھ کا بہی کھاتہ لا کر پیش کرے۔

خواجہ سرا کو اتم چند کا پتا معلوم نہ تھا اس لیے ذرا رکا اور جہاں پناہ پر نظر کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اتم چند کے بارے میں اور وضاحت چاہتا ہے۔

فرمایا۔ "چاندنی چوک میں مسجد فتح پوری کے بائیں جانب جو کوچہ چلا گیا ہے اس میں چوتھے نمبر کا مکان اسی کا ہے۔"

اورنگ زیب کے سامنے آتے ہوئے بڑے بڑے امراء کا زہرہ آب آب ہوتا تھا۔ اتم چند ایک اوسط درجے کا بنیا تھا۔ اسے جب حاضر ہونے کی اطلاع پہنچی تو وہ سخت فکر مند ہوا۔

1049 ھ کے بہی کھاتے کو اٹھا کر بار بار پڑتال کی۔ اس کے اوراق کو جھاڑا اور صاف ستھرا کر کے بغل میں دبا کر قلعہ کو روانہ ہوا۔ خواجہ سرا اسے اردو بازار اور دیوان عام کی سیر کراتا ہوا دیوان خاص میں لے گیا۔ بادشاہ وظیفہ میں مصروف تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد جب حضور فارغ ہوئے تو اسے پیش کیا۔

بنیا رعب شاہی سے کانپ اٹھا۔ ڈنڈوت کے لیے جھکنا چاہتا تھا۔ مگر خواجہ سرا نے تھام لیا۔

بادشاہ نے مسکرا کر بنیے پر نظر ڈالی اور فرمایا۔

"گھبراؤ نہیں، آگے بڑھو۔ 1049 ھ کا کھاتہ کھول کر خرچ کی تفصیل عرض کرو۔"

بنیے نے بڑبڑا کر روزنامچہ کھولا اور تاریخ اور خرچ کی تفصیل پڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر آکر رک گیا۔

یہاں ایک دال درج تھی۔ مگر اس کے سامنے لینے والے کا نام نہیں تھا۔ شہنشاہ نے ملائمت سے پوچھا۔

"کہو تو یہ دال کہاں گئی۔"

اتم چند نے روزنامچہ بند کر کے رکھ دیا۔ ایک آہ جگر سوز کھینچی اور یوں عرض گزار ہوا۔

"جہاں پناہ یہ ایک درد بھری داستان ہے۔ اگر حضور اجازت دیں تو عرض کی جائے۔"

"ہاں! ملا دولت اسے شوق سے سنیں گے۔" شہنشاہ نے معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے فرمایا۔

"یہ ہو گی ایک تاریک رات کا واقعہ ہے کہ پہر رات گزرے جنوبی جانب سے گھنگھور گھٹا چھا آئی اور دیکھتے

ہی دیکھتے موسلا دھار برسنے لگی۔ میرا مکان اگرچہ پختہ تھا۔ مگر نیا بنا تھا۔ اس نے بارش دیکھی نہ تھی۔ بمشکل دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ اس نے ٹپکنا شروع کر دیا۔ میرا قیمتی سامان بہی کھاتے بال بچے سب اسی میں تھے۔ میں نے بڑی کوشش کی۔ مگر مکان کا ٹپکنا بند نہ ہوا۔ میں نے گھبرا کر باہر جھانکا تو مجھے ایک کوئی سرکاری لالٹین کے نیچے کھڑا نظر آیا۔ میں سخت متعجب ہوا کہ آدھی رات گزرے کون شخص ہو سکتا ہے۔ جو کسی مکان میں پناہ لینے کے بجائے ایسی کھلی جگہ پر کھڑا ہے۔ جہاں بارش کی بوچھاڑ بری طرح سے پڑ رہی ہے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

"بھلے میاں! مزدوری کرو گے؟"

جواب ملا "کیوں نہیں!"

وہ نیک مومن چار گھنٹے انتہائی بہادری اور جفاکشی کے ساتھ کام کرتا رہا تب کہیں جا کر چھت درست ہوئی۔ پھر اس نے اندر کا سامان درست کیا۔ ہم سب حیرت سے کھڑے تکتے رہے اور وہ مشین کی طرح کام میں مصروف تھا۔ اتنے میں فتح پوری مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ اس آدمی نے کام چھوڑ کر اذان سنی اور ہر ہر کلمے کے ساتھ دعا مانگی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"سیٹھ صاحب! آپ کا کام ٹھیک ٹھاک ہو چکا ہے۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ تاکہ میں کپڑے بدل کر کسی مسجد میں نماز ادا کر لوں۔"

میں نے کہا "واقعی میرا کام آپ نے ختم کر دیا ہے۔ لیکن آپ کو دینے کے لیے سوائے دال کے میری جیب میں اور رقم نہیں ہے۔ آپ صبح کو دکان پر تشریف لائیں، میں منہ مانگا انعام دوں گا۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "مجھے یہی دال کافی ہے۔ میں پھر حاضر نہیں ہو سکتا کیونکہ مجھے کسی اور جگہ جا کر کام کرنا ہے۔"

مجبوراً میں نے جیب سے دال نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی اور وہ لے کر صبح کے دھندلکے میں جانب ہو گیا۔ ہم دیر تک کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھتے رہے۔ وہ فتح پوری مسجد کی طرف ہی گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے بہتیرا ڈھونڈا۔ مزدوروں میں جا کر تلاش کیا۔ مگر وہ نہیں ملا۔ چند برس ہو چکے ہیں۔ پر وہ رات "مکان کا ٹپکنا" ابھی تک ساری رات کام کرنا اور پھر دال لے کر گم ہو جانا نہیں بھولتا۔ رہ رہ کر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے کہ اگر روپے نہ تھے، اشرفیاں تو موجود تھیں۔ ایک اشرفی ہی دے سکتا تھا۔"

اتم چند نے یہ داستان ختم کرنے کے بعد ہاتھ جوڑ کر شہنشاہ کو پرنام کیا۔ بادشاہ نے دست مبارک سے خلعت فاخرہ مرحمت کر کے اتم چند کو رخصت فرمایا۔ جب وہ روانہ ہو گیا تو بادشاہ نے مسکرا کر ملا احمد پر نظر ڈالی۔ ملا صاحب فرط محبت سے جھوم اٹھے بولے۔

"واہ اورنگ زیب تو نے کمال کر دیا۔ میرا پہلے سے ہی خیال تھا کہ شاگرد بلند اقبال نے یہ خود کما کر ہی نذر گزاری ہے۔ ورنہ اس سے سیکڑوں اور لاکھوں کیوں کر بنتے۔"

بادشاہ نے انتہائی عقیدت سے عرض کی کہ یہ حضرت کے فیض تربیت کا ہی نتیجہ ہے کہ اورنگ زیب ذاتی خرچ کے لیے خود کما لیتا ہے اور خزانہ عامہ سے کچھ نہیں لیتا۔ اگر حضرت کی دعا شامل حال نہ ہوتی تو مجھے یہ توفیق کیونکر ہوتی۔"



ادارہ

حسین دانت

شخصیت کی دلکشی اور متناسب چہرے کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ دلکش اور حسین مسکراہٹ میں پنہاں ہے۔ حسین مسکراہٹ دانتوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ اس لیے دانتوں کی صفائی اور خوب صورتی کا خاص خیال رکھیں۔ دانت انسان کے چہرے پر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ باتیں کرتے اور مسکراتے وقت نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں اور اگر یہ گندے ہوں تو اس سے دیکھنے والے پر شخصیت کا تاثر خراب ہوتا ہے نیز دانتوں کی صفائی نہ کرنے سے معدے اور مسوڑھوں کی بہت سی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اس لیے دانتوں کو چمک دار اور خوب صورت بنانے کے لیے متوازن غذا کا استعمال کریں جس میں دودھ، انڈے، سبزیاں، پھل، گوشت اور اناج خاص طور پر ضروری ہیں۔

☆ دانتوں کی صفائی اور خوب صورتی کے لیے ٹوتھ برش یا مسواک باقاعدگی سے استعمال کریں۔ یہ عمل دانتوں کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں بیماریوں سے محفوظ رکھے گا۔

☆ کڑوے تیل میں نمک ملا کر دانت صاف کریں۔ اگر تیل کی بو سے ہچکچاہٹ محسوس کریں تو اس کے بعد منجن یا ٹوتھ پیسٹ استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے دانتوں میں چمک اور خوب صورتی پیدا ہوتی ہے۔

☆ دس گرام پھٹکری، بیس گرام شہد اور چالیس گرام سرکہ لیں۔ ان تینوں چیزوں کو اچھی طرح ملا کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب اچھی طرح پک جائیں تو اتار لیں اور ٹھنڈا کر کے کسی بوتل میں ڈال لیں اور حسب ضرورت استعمال کریں۔ اس سے دانت صاف، شفاف اور مضبوط ہو جائیں گے اور اگر آپ کے دانت ہلتے ہیں تو وہ بھی ہلنا بند ہو جائیں گے۔

☆ صبح یا شام کے وقت مغز پستہ اور پوست والے لال چھلکے سمیت ایک سے تین دانے آہستہ آہستہ چبا کر کھانے سے چند روز میں مسوڑھے مضبوط اور دانت صاف ہو جائیں گے۔

☆ دانتوں کو مضبوط کرنے کے لیے آدھی پیالی سرکہ میں ایک کھانے کا چمچہ شہد ملائیں اور اس سے روزانہ کلیاں کریں۔

☆ اگر آپ کے دانتوں سے خون آتا ہو تو پھٹکری ایک تولہ، نمک ایک تولہ، کالی مرچ ایک تولہ لے کر تینوں کو پیس لیں اور پھر دانتوں پر ملیں۔ بیس منٹ بعد گرم پانی سے کلی کر لیں۔ چند ہی دنوں میں دانتوں سے خون آنا بند ہو جائے گا۔

☆ پوٹاشیم پرمینگنیٹ جسے لال دوائی بھی کہتے ہیں۔ تھوڑی مقدار میں لے کر ایک گلاس پانی میں حل کر لیں اور پھر اس سے غرارے کریں۔ اس سے بھی دانتوں سے خون آنا بند ہو جائے گا۔

☆ اگر مسوڑھوں میں ورم آ جائے تو مشک کافور ایک تولہ، نوشادر ایک تولہ لے کر دونوں کو خوب باریک پیس لیں۔ یہ منجن مسوڑوں پر ملنے سے چند دنوں میں آرام آ جائے گا۔

☆ اگر دانتوں میں درد ہو یا منہ سے بدبو آتی ہو تو گرم پانی میں نمک ملا کر کلی کرنے سے دانتوں کی تکلیف اور منہ سے بدبو بھی دور ہو جاتی ہے۔

☆ لونگ کا تیل بار بار لگانے سے بھی دانتوں کے کیڑے مر جاتے ہیں۔